قرآن حکیم اور ہم

ڈاکٹر اسرار احمد

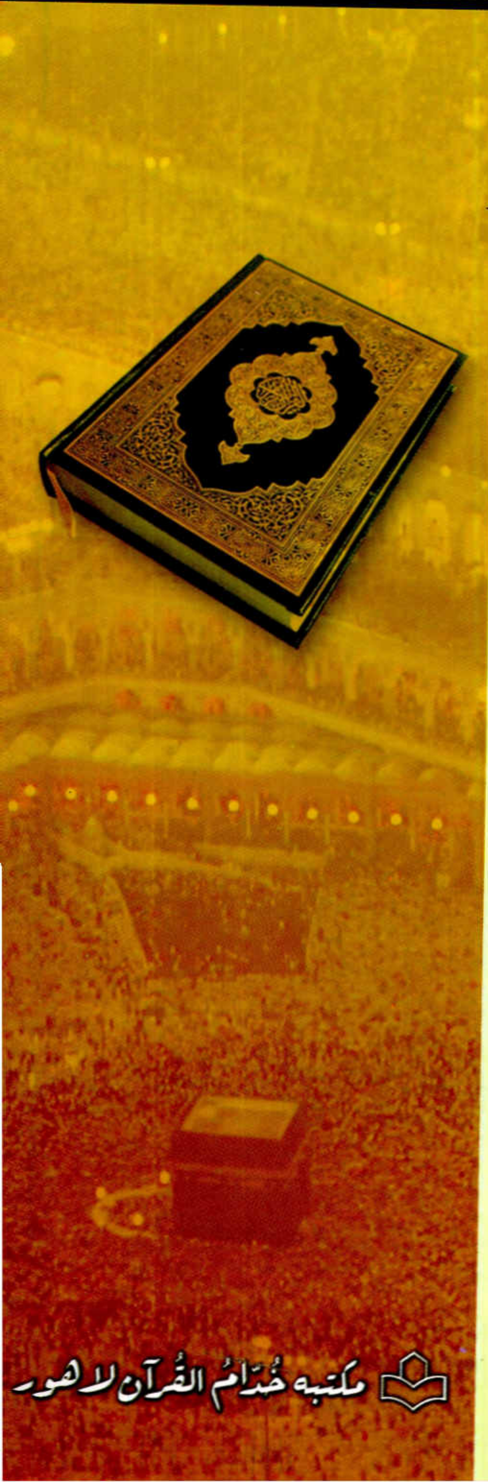

مکتبہ خُدّامُ القُرآن لاہور

قرآن حکیم اور ہم

ڈاکٹر اسرار احمد

کے 8 مقالات کا مجموعہ

مکتبہ خدّام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 3-35869501

مرحوم ومغفور مؤسس انجمن خدام القرآن جناب ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی تاحیات خواہش اور عمل کے عین مطابق' مرحوم کے قانونی جانشین تمام حضرات کو ڈاکٹر صاحب مرحوم کی طبع شدہ تصنیفات / تالیفات' آڈیوز' ویڈیوز کو طبع / تیار کر کے' چاہے قیمتاً ہو یا مفت' تقسیم کرنے کی کھلی اجازت دیتے ہیں اور اس کے لیے کسی پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں۔ ہمارا کسی قسم کی رائلٹی یا ''محفوظ حقوق'' کا تقاضا بھی نہیں ہے' البتہ تیار کردہ مواد (آڈیوز یا ویڈیوز) اور کتب کے چند نسخے ہمارے ریکارڈ کے لیے بھیج دیے جائیں تو ہم ممنون ہوں گے۔ تاہم ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی مذموم کوشش مثلاً تبدیلی الفاظ' غلط اقتباس' سیاق وسباق سے الگ کر کے جملے کا حوالہ یا اس کا ایسا استعمال جس سے ڈاکٹر صاحب مرحوم اور ہمارے موقف کی صحیح ترجمانی نہ ہو اور جس سے ہماری عزت وشہرت پر حرف آئے' تو ہم اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا مکمل حق رکھتے ہیں۔

نام کتاب ——— قرآن حکیم اور ہم

طبع اوّل تا سوم (فروری 2012ء تا جولائی 2013ء) ——— 6,500

طبع چہارم (ستمبر 2015ء) ——— 1100

ناشر ——— ناظم نشر واشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

فون: 3-35869501

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس' لاہور

قیمت (اشاعت عام) ——— 300 روپے

ISBN : 978 - 969 - 606 - 020-8

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

پیش لفظ

ربِ کائنات نے انسان کی تخلیق اور اس کے ہبوطِ ارضی کے ساتھ ہی اس کی دنیوی واخروی فوز وفلاح کے لیے راہنمائی کا انتظام بھی فرمادیا تھا۔ چنانچہ بنی نوع انسان کا اوّلین فرد پہلا نبی بھی تھا جس نے اپنی اولاد کو اپنے خالق و مالک کی بندگی کا درس دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انسانوں ہی میں سے انتخاب کر کے انبیاء و رسل کا سلسلہ جاری فرمایا جو اپنے ابنائے نوع کو اللہ کی بندگی اور دین اسلام کی پیروی کی دعوت دیتے رہے۔ ان پیغمبروں پر گاہے بگاہے آسمانی کتب اور صحائف کا نزول بھی ہوتا رہا۔ لیکن ہر دور میں ایسا ہوتا رہا کہ پیغمبروں کی دعوت کو قبول کر لینے والے لوگ بھی رفتہ رفتہ بگاڑ کا شکار ہو جاتے اور اپنے پاس موجود آسمانی ہدایت میں من مرضی کی تحریفات کر کے اسے مسخ کر دیتے۔ بالآخر ربِ کائنات نے نبی آخر الزماں محمد عربی ﷺ کو مبعوث فرمایا اور ان پر اپنا آخری اور تکمیلی پیغامِ ہدایت ’’قرآن حکیم‘‘ کی صورت میں نازل فرمایا اور قیامت تک اس کی حفاظت کا انتظام بھی فرمادیا۔ ؎

نوعِ انساں را پیامِ آخریں　　حاملِ او رحمۃٌ للعالمیں ﷺ

قرآن حکیم کو محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت و تبلیغ میں مرکز و محور کی حیثیت حاصل تھی اور آپؐ نے اس کی راہنمائی میں نوعِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا فرمادیا۔

عصر حاضر میں بانی تنظیم اسلامی و مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم ہوا کہ انہیں اپنی کتاب سے خصوصی تعلق و نسبت عطا فرمائی اور آپ نے اپنی پوری زندگی قرآن حکیم کے علم و حکمت کی نشر و اشاعت اور اس کی انقلابی دعوت کو عام کرنے میں صرف کر دی۔

پیش نظر کتاب ’’قرآن حکیم اور ہم‘‘ محترم ڈاکٹر صاحب کی آٹھ کتابوں کو یکجا کر کے تیار کی گئی ہے، جن میں آپ نے قرآن حکیم کا تعارف پیش کیا ہے، قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی عظمت کو اجاگر کیا ہے اور مسلمانوں سے قرآن کے مطالبات اور تقاضے بیان کیے ہیں۔

قرآن حکیم بلاشبہ نوعِ انسانی کے لیے خالق کائنات کا سب سے بڑا انعام اور سب سے عظیم نعمت ہے۔ اس حوالے سے اس کتاب کا آغاز محترم ڈاکٹر صاحب کے ایک خطاب ’’دنیا کی عظیم ترین نعمت، قرآن حکیم‘‘ سے کیا گیا ہے جو آپ نے ۲۹/رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ کو سمن آباد میں نماز تراویح میں دورۂ ترجمہ قرآن کے ایک پروگرام کی اختتامی تقریب میں فرمایا تھا۔

’’عظمت قرآن‘‘ محترم ڈاکٹر صاحب کے خصوصی دلچسپی کے موضوعات میں سے ایک تھا اور اس موضوع پر آپ نے متعدد بار اظہار خیال فرمایا تھا۔ اس ضمن میں آپ کے دو خطبات شامل کتاب

کیے گئے ہیں' ایک ''عظمت قرآن: بزبان قرآن و صاحب قرآن ﷺ'' اور دوسرا ''عظمت قرآن: قرآن و حدیث کے آئینے میں'' (''تعارفِ قرآن'' کے ضمیمے کے طور پر)

''قرآن حکیم کی قوت تسخیر'' محترم ڈاکٹر صاحب کا اظہارِ تشکر اور تحدیث نعمت پر مشتمل ایک اہم خطاب ہے جو ۱۹۹۲ء میں ایک ایسے موقع پر ہوا جب آنجناب کے قائم کردہ قرآن کے انقلابی فکر پر مبنی دو اداروں یعنی مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور اور تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماعات کا انعقاد پہلو بہ پہلو ہوا۔ جس سیشن میں یہ خطاب ہوا' اس میں دونوں اداروں کے وابستگان جمع تھے۔

''تعارف قرآن'' محترم ڈاکٹر صاحب کے چند سلسلہ وار خطابات کا مجموعہ ہے' جو آٹھ ابواب اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے۔

''قرآن اور امن عالم'' محترم ڈاکٹر صاحب کا ستمبر ۱۹۶۸ء کا ایک خطاب ہے' جو فیصل آباد کے ایک دینی ادارے کے سالانہ تربیتی اجتماع میں ہوا۔ امن و امان کی موجودہ عالمی صورت حال کے تناظر میں اس تحریر کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور اسے بڑے پیمانے پر عام کرنے کی ضرورت ہے۔

''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' محترم ڈاکٹر صاحب کے دو خطاباتِ جمعہ پر مبنی مضمون ہے جو جنوری ۱۹۶۸ء میں جامع مسجد خضراء' سمن آباد لاہور میں ہوئے اور بعد ازاں آپ نے انہیں خود مرتب کر کے کتابچے کی صورت دی۔ اس کتابچے کو دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز کی حیثیت حاصل ہے اور یہ اب تک لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکا ہے۔

''انفرادی نجات اور اجتماعی فلاح کے لیے قرآن کا لائحہ عمل'' محترم ڈاکٹر صاحب کے ایک خطاب عام پر مشتمل کتابچہ ہے جو آپ نے ۳۱ دسمبر ۲۰۰۰ء کو قرآن آڈیٹوریم لاہور میں فرمایا اور اس میں اپنے دینی فکر کو جامع اور مانع شکل میں پیش کر کے اُمت کے لیے عملی رہنمائی کا اہتمام فرمایا۔

''جہاد بالقرآن اور اس کے پانچ محاذ'' محترم ڈاکٹر صاحب کے ۱۹۸۴ء کے تین خطابات پر مبنی ایک معرکۃ الآراء کتاب ہے' جنہیں شیخ جمیل الرحمٰن مرحوم نے ترتیب و تسوید کے مراحل سے گزارا۔

پیش نظر کتاب میں شامل بعض خطابات' خصوصاً ''تعارفِ قرآن'' کی ترتیب و تسوید کی سعادت راقم الحروف کے حصے میں آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس خدمت قرآنی کو شرفِ قبول عطا فرما کر اسے محترم ڈاکٹر صاحب کے لیے صدقۂ جاریہ اور رفع درجات کا ذریعہ بنائے' اور اس کی ترتیب و تدوین اور اشاعت و طباعت کی خدمات سرانجام دینے والوں کے لیے اسے دنیوی و اخروی فوز و فلاح کا باعث بنائے۔

حافظ خالد محمود خضر

مدیر شعبہ مطبوعات' قرآن اکیڈمی لاہور

۱۵/ فروری ۲۰۱۲ء

ترتیب

- دنیا کی عظیم ترین نعمت' قرآن حکیم ـــــــ 7
- عظمتِ قرآن بزبانِ قرآن وصاحبِ قرآنؐ ـــــــ 37
- قرآن حکیم کی قوتِ تسخیر ـــــــ 67
- تعارفِ قرآن مع عظمت قرآن ـــــــ 111
- قرآن اور امنِ عالم ـــــــ 277
- مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق ـــــــ 295
- انفرادی نجات اور اجتماعی فلاح کے لیے قرآن کا لائحہ عمل ـــــــ 355
- جہاد بالقرآن اور اس کے پانچ محاذ ـــــــ 405

دُنیا کی عظیم ترین نعمت،

قرآنِ حکیم

عنوانات

- ہدایت کے دو پہلو 9
- دُنیا کی سب سے بڑی نعمت 16
- عظمتِ قرآن' بزبانِ قرآن 17
- تحریک رجوع الی القرآن 23
- عظیم ترین نعمت کے تقاضے 27
- التزامِ جماعت کی ضرورت واہمیت 30
- جماعت سازی کی مسنون اساس 32

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ (البقرة: ۱۸۵)

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا''۔ اور قرآن کیا ہے؟ ﴿وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ﴾ ''ہدایت اور فرقان کی بینات''۔ اس ترکیب میں جو تین الفاظ آئے ہیں اس میں سب سے پہلے لفظ ''ہدایت'' پر توجہ دیجیے کہ ''ہدایت'' سے مراد کیا ہے؟ اس کا ہم عام ترجمہ تو رہنمائی اور راستہ بتانا کرتے ہیں' لیکن ذرا گہرائی میں سمجھئے کہ ''ہدایت کسے کہتے ہیں؟

ہدایت کے دو پہلو

ہدایت کے دو حصے ہیں: ایک ہے انسان کے لیے نظری' فکری اور علمی ہدایت اور ایک ہے عملی' اخلاقی اور زندگی کے معمولات کے ضمن میں ہدایت۔ نظری' فکری اور علمی ہدایت کے اہم ترین حصے کو ہندی میں ''سَت اَسَت وویک'' کہتے ہیں۔ یعنی انسان میں یہ تمیز پیدا ہو جائے کہ کیا چیز حق ہے اور کیا باطل ہے۔ ہندو جب اپنے مُردوں کی ''اَرتھی'' لے کر جاتے تھے تو کہتے تھے: ''رام نام ست ہے''۔ تو ''ست'' کے معنی ''حق'' کے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ﴾۔ اسی طرح ہندی میں اس حق کے لیے لفظ ''ست'' ہے۔ ہندی میں بعض الفاظ کے شروع میں اگر سابقے کے طور پر ''الف'' کا اضافہ کر دیں تو معنی اُلٹے ہو جاتے ہیں' مثلاً ''ٹل'' سے ''اٹل''۔ اسی طرح ''مر'' سے ''امر'' اور ''ست'' سے ''است''۔ ''است'' وہ شے ہے جو نظر تو آ رہی ہے لیکن حقیقی نہیں ہے' جبکہ ''ست'' وہ شے ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔ سب سے بڑی بات یہی ہے۔ انگلستان کے بہت بڑے فلسفی ''بریڈلے'' نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب "Appearance and Reality"

میں اسی حقیقت کو بیان کیا ہے کہ ''جو کچھ نظر آتا ہے وہ حقیقت نہیں ہے' بلکہ حقیقت اس کے پیچھے ہے''۔ جو کوئی محض آنکھوں سے نظر آنے والی چیزوں میں الجھ گیا وہ درحقیقت باطل (falsehood) کا شکار ہے' جب تک کہ اس ظاہر کے پردے کو چیر کر باطن کو نہ دیکھا جائے۔ اقبال نے کہا ہے ؂

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

عربی کا ایک شعر ہے ؂

كُلُّ مَا فِي الْكَوْنِ وَهْمٌ اَوْ خَيَالٌ
اَوْ عُكُوْسٌ فِي الْمَرَايَا اَوْ ظِلَالٌ

''کائنات میں یہ جو کچھ ہے وہم ہے یا خیال ہے' یا جیسے شیشوں کے اندر عکس ہوتا ہے یا جیسے سایہ ہوتا ہے۔''

اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ مادی دُنیا اور مادی عالَم بڑا ٹھوس نظر آتا ہے' یہ محسوس بھی ہوتا ہے' اس میں ہمیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو فوراً محسوس ہو جاتی ہے اور اس کی مسرت بھی فوراً محسوس ہوتی ہے۔ ہم اس کی تکلیف سے بھی متاثر ہوتے ہیں اور اس کی راحت سے بھی' لیکن اصل بات یہ ہے کہ انسان سمجھ لے کہ یہ نمودِ بے بود ہے' یعنی اس کی نمود تو ہے' حقیقت کوئی نہیں۔ حقیقت صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ﴾ ''الحق اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔''

انسان کے اندر یہ تمیز پیدا ہو جانا اس کی بھی درحقیقت مختلف corollaries ہیں۔ دراصل ہمارا ایک جسم ہے جو نظر آتا ہے' وزن رکھتا ہے اور اس کے تقاضے ہیں جو محسوس ہوتے ہیں۔ بھوک لگتی ہے تو اس کا احساس ہوتا ہے۔ پھنسی نکلتی ہے تو درد ہوتا ہے۔ اس کی مسرّت بھی اور اس کی تکلیف بھی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن ہمارا حقیقی وجود یہ نہیں ہے' حقیقی وجود وہ روحانی وجود ہے جو نظر نہیں آتا۔ وہ reality ہے' یہ appearance ہے۔ یعنی یہ ظاہر ہے اور وہ اصل حقیقت ہے۔ اسی طرح یہ دنیا کی زندگی ہے' عظیم کائنات ہے' کہکشائیں (galaxies) ہیں' ایسے ایسے ستارے ہیں جو سائز میں ہمارے سورج سے

لاکھوں گنا بڑے ہیں۔ پوری کائنات کی وسعت کو دیکھیں تو یہ ہمارا سورج بھی ایک ذرّہ معلوم ہوتا ہے' اور ذرّے کا دل چیریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر پورا سورج موجود ہے ع ''لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں!'' ان ذرات کا دل چیر کر ایٹمی توانائی نکالی گئی ہے ع ''مہر درخشاں ذرۂ فانی' ذرۂ فانی مہر درخشاں!'' لیکن یہ سب appearance ہے' حقیقت نہیں ہے۔

اگر یہ بات دل میں ٹھک جائے تو گویا انسان کی نظری' فکری اور علمی رہنمائی ہوگئی' اور اگر نگاہیں یہیں الجھی ہوئی ہیں اور دلچسپیاں انہی ظاہری چیزوں میں ہیں اور بھاگ دوڑ انہی کے لیے ہے' انہی کو زندگی سمجھا ہے' اپنے آپ کو اسی ظاہری جسم سے تعبیر کیا ہے تو آدمی چاہے فلسفی ہو' پی ایچ ڈی ہو' مفسّر' محدّث' فقیہہ اور مفتی ہو' وہ درحقیقت اندھیروں (ظلمات) ہی میں ہے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے: ﴿يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ (البقرۃ:۲۵۷) یعنی اللہ اہلِ ایمان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔

یہ جو ظواہر (appearances) ہیں ان کی بجائے حقائق پر توجہ اور نگاہیں مرکوز ہوں تو یہ نظری ہدایت ہے جس کے لیے رسول اللہ ﷺ کی بڑی پیاری دعا ہے: ((اَللّٰهُمَّ اَرِنِیْ حَقِيْقَةَ الْاَشْيَاءِ كَمَا هِیَ)) ''اے اللہ! مجھے تو چیزوں کی حقیقت دکھا جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں''۔ ظاہر تو سب کو نظر آ رہا ہے۔ کتا بھی کار کو اگر اپنی طرف آتا دیکھ لیتا ہے تو راستہ بدل لیتا ہے۔ اگر ہم نے بھی یہ کر لیا تو کون سا بڑا تیر مار لیا۔ تو پہلی بات یہ سمجھ لیجئے کہ نظری ہدایت یہی ہے کہ اس سے ظاہر و باطن کا فرق معلوم ہو جائے' حق اور باطل (reality and falsehood) پوری طرح واضح ہو جائیں۔ یہی بات سورۃ الکہف میں بھی بیان ہوئی ہے۔ جب حقیقت پر باطل کا ملمع ہو جائے تو یہی دجالیت ہے۔ دجل کسے کہتے ہیں؟ حقیقت پر کسی اور شے کا پردہ ڈال دینا۔ اسی اعتبار سے یہ دجالیت ہے کہ ان تین حقیقتوں یعنی ذاتِ باری تعالیٰ' روحِ انسانی اور حیاتِ اُخروی پر ان تین ظواہر یعنی کائنات' جسمِ حیوانی اور حیاتِ دنیوی کا پردہ پڑ جائے' اور یہی دجل اور فریب ہے۔ اور جیسے جیسے سائنس ترقی کر رہی ہے یہ دجل بڑھتا چلا جا رہا ہے' اس ظاہر کی دلکشی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ یہ appearance اور زیادہ دل کو موہ لینے والی چیز بنتی چلی جا رہی ہے۔ اس کی

رونقیں بڑھتی جا رہی ہیں اور اس کی چمک دمک میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!

یہ جھوٹ اور "falsehood" ہے' حقیقت نہیں ہے۔

بہرحال پہلی بات نظری' فکری اور علمی ہدایت ہے۔ میں نے اس وقت دینی اصطلاحات یعنی ایمان باللہ' ایمان بالرسالت اور ایمان بالآ خرۃ کے حوالے سے بات نہیں کی' بلکہ ایک نئے زاویے سے وضاحت کی کوشش کی ہے۔ اگر انسان میں سَت اَسَت و ویک' reality and falshood' reality and appearance کے مابین فرق و امتیاز' حق اور باطل میں امتیاز کا وصف قائم ہو گیا تو اسے نظری' فکری اور علمی ہدایت حاصل ہو گئی۔

دوسری ہدایت عملی ہے۔ اس معاملے میں بھی قرآن کا فلسفہ سمجھ لیجئے کہ عملی ہدایت کا ایک درجہ انفرادی سطح پر ہے کہ میں کیا کروں کیا نہ کروں؟ اللہ تعالیٰ نے یہ انفرادی ہدایت ہر انسان کے دل میں ودیعت کر کے اسے دُنیا میں بھیجا ہے۔ اسے بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ خیر ہے اور یہ شر ہے' یہ نیکی ہے اور یہ بدی ہے' یہ بھلائی ہے اور یہ برائی ہے: ﴿وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ۝۸﴾ (الشمس) نفسِ انسانی کو معلوم ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا برا ہے' وعدہ کر کے پورا کرنا اچھا ہے اور وعدہ خلافی کرنا بُری بات ہے۔ بڑوں کی خدمت اور عزت کرنا اچھی بات ہے اور ان کے ساتھ بے عزتی کا معاملہ کرنا بری بات ہے' والدین کے ادب اور خدمت پر مبنی رویہ اچھا ہے اور اگر ان کا لحاظ نہ ہو تو یہ بری بات ہے۔ اسے کون نہیں جانتا؟ یہ دوسری بات ہے کہ انسان کا مزاج ہی بگڑ گیا ہو تو اس وجہ سے وہ اپنے اندر کی اس ہدایت سے فائدہ نہیں اٹھا پاتا۔ لیکن جس وقت وہ غلط کام کر رہا ہوتا ہے اسے اندر سے ضمیر متنبہ کرتا ہے کہ تم غلط کر رہے ہو۔ اسی کا نام ''نفسِ لوّامہ'' ہے کہ جس کی قسم کھائی گئی: ﴿لَاۤ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ۝۱ وَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ ۝۲﴾ (القیٰمۃ) ''نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔ اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی۔''

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اس انفرادی معاملے پر اتنا زیادہ زور نہیں دیا گیا' بلکہ

انہیں معروف و منکر کہا گیا ہے کہ جو چیزیں معروف اور جانی پہچانی ہیں یہی اچھائیاں اور بھلائیاں ہیں‘ پس ان کی پیروی کرو۔ منکر وہ ہیں جن سے انسان کا نفس خود ہی نفرت کرتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انسان اپنے کسی مفاد کی وجہ سے یا کسی وقتی جذبے کے تحت کسی منکر کا ارتکاب کر لیتا ہے‘ لیکن اس کی فطرت اس وقت بھی اسے ٹوک رہی ہوتی ہے کہ غلط کام کر رہے ہو۔ انسان کو اصل احتیاج اجتماعی زندگی میں ہدایت کی ہے۔ یہاں آ کر جو پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں ان کا حل عقلِ انسانی کے لیے محال مطلق اور ناممکن ہے۔ دُنیا میں آج تک تین اجتماعی مسائل کی نشاندہی ہوئی ہے:

۱) عورت اور مرد کے درمیان حقوق و فرائض کے ضمن میں کیا توازن ہو؟ بیوی کے کیا حقوق ہوں اور شوہر کے کیا حقوق ہوں؟ یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ انسان اس معاملے میں افراط و تفریط کا شکار رہا ہے۔

۲) دوسرا مسئلہ اجتماعی نظامِ ریاست و حکومت کا ہے کہ ایک فرد اور عام شہری کو کتنی آزادی ہونی چاہیے اور اس پر کتنا جبر ہونا چاہیے؟ اور اجتماعیت کو کتنا اختیار ہونا چاہیے اور checks and balances کا کیا نظام ہونا چاہیے؟ پولیٹکل سائنس ساری کی ساری اسی مسئلے کے گرد گھومتی ہے۔

۳) اسی طرح سرمایہ اور محنت‘ کارخانے دار اور مزدور کے حقوق و فرائض میں کیا توازن ہونا چاہیے؟ اس میں ذرا سے عدمِ توازن سے ظلم و استحصال کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دار غریب کا خون چوستا ہے ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب\
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب!

’’سرمایہ دار نے مزدور کے خون سے شراب کشید کی ہے جسے وہ شام کو کلب میں بیٹھ کر پیتا ہے۔ اور زمیندار اور لینڈ لارڈ کے ظلم و ستم سے کاشتکار کی کھیتی خراب ہے کہ اس کا بچہ فاقے سے ہے‘ حالانکہ محنت و مشقت اسی کاشتکار نے کی ہے۔‘‘

یہاں آ کر انسان بالکل گھٹنے ٹیک کر اللہ سے ہدایت کا طالب بنتا ہے۔ سورۃ الفاتحہ کے قرآن مجید کے بالکل شروع میں ہونے کی حکمت بھی یہی ہے کہ انسان پہلے خود کہہ رہا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝

اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُؕ

''تمام شکر اُس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ جزا وسزا کے دن کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔''

ان حقائق تک تو وہ خود پہنچ گیا ہے' لیکن اس کے بعد آگے کہتا ہے:

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَۙ

''اے اللہ! ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت دے۔''

اس اجتماعی معاملے کو کہیں قرآن ''صراطِ مستقیم'' کہتا ہے' کہیں ''صراط السَّوِیّ'' اور کہیں ''سواء السبیل''۔ مختلف الفاظ آئے ہیں۔ ان تمام پیچیدگیوں میں سے درمیانی' معتدل اور عدل پر مبنی راہ' جس میں افراط وتفریط نہ ہو' یہ اصل ہدایت ہے جس کے لیے قرآن نازل ہوا۔

اس بحث کے حاصل کلام کے طور پر جان لیجئے کہ ہدایت نظری کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے سامنے حق اور باطل appearance and reality 'ست' اَست کے درمیان امتیاز واضح ہو جائے۔ اللہ حق ہے' آخرت حق ہے۔ آپ نے وہ دعا پڑھی ہو گی: ((اَنْتَ الْحَقُّ وَوَعْدُكَ الْحَقُّ وَلِقَاؤُكَ حَقٌّ وَقَوْلُكَ حَقٌّ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ حَقٌّ وَالنَّبِيُّوْنَ حَقٌّ وَمُحَمَّدٌ ﷺ حَقٌّ))(متفق علیه) یہ تمام امور حق ہیں۔ باقی جو نظر آ رہا ہے یہ سب باطل ہے۔ سورۃ الحشر میں متنبہ کیا گیا: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۹) ''ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی جانوں سے غافل کر دیا۔''

ہم اپنے مادی جسم کو محسوس کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم ہیں' حالانکہ حقیقت میں تو کوئی اور شے ہے کہ جو ہمارے وجود کی بنیاد بنتی ہے۔ اسی طرح فرمایا: ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ﴾ (الروم:۷) ''یہ دنیا کی زندگی کے ظاہر (appearance) کو ہی جانتے ہیں''۔ حقیقت کو نہیں جانتے۔ دنیا کی زندگی کی حقیقت معنوی کو جانتے تو اللہ کو پہچان لیتے' اور آخرت کو فوراً پہچان لیتے' لیکن یہ صرف دنیا کی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں۔ یہ نظری ہدایت ہے۔

جہاں تک عملی ہدایت کا تعلق ہے تو ہر انسان کے لیے اس کی جبلی ہدایت اس کے اندر موجود ہے' جیسے پیٹ کھانے کو مانگتا ہے' جسم کے دوسرے تقاضے ہیں' ان کو پورا کیا جائے۔

اس میں اسے ہدایت صرف اس بات کی دینا ضروری ہے کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ سڑک کے ذریعے جب آپ مری جاتے ہیں تو ہر موڑ پر نشان لگے ہوتے ہیں کہ یہاں سے آرام سے گزرنا' ورنہ کھائی میں گر جاؤ گے۔ سپیڈ کی حدود معیّن کر دی گئی ہیں۔ اس طرح سے زندگی کے مختلف معاملات میں حدود اللہ معیّن کر دی گئی ہیں کہ ان حدود سے تجاوز نہیں کرنا' باقی یہ کہ خیر وشر کے بارے میں تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ کیا خیر ہے اور کیا شر ہے' کیونکہ تمہیں خود ہی معلوم ہے۔ البتہ اجتماعی زندگی کے اندر تم محتاجِ محض ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت تمہیں ملے۔

اب اگلے لفظ پر آیئے: ﴿بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾ —— فرقان کا مطلب ہے حق و باطل میں فرق' ست است میں فرق' appearance and reality میں فرق۔ ''بینات'' وہ ہیں جو از خود روشن ہوں۔ سورۃ العنکبوت میں فرمایا: ﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ (آیت ۴۹) ''بلکہ یہ (قرآن) تو وہ آیاتِ بینات ہیں جو اہلِ علم کے سینوں میں (پہلے سے) موجود ہیں''۔ اسی لیے قرآن اپنے آپ کو تذکرہ و تبصرہ کہتا ہے۔ ''تبصرہ'' کہتے ہیں کسی کو آنکھ کھول کر دکھا دینا اور ''تذکرہ'' کے معنی ہیں یاد دلا دینا کہ تمہارے اندر یہ سب کچھ موجود ہے۔ تمہارے اندر حق ہے' تمہارے اندر ذاتِ باری تعالیٰ کی تجلّی ہے ؎

ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے!

چنانچہ قرآن مجید جو ''بینات'' کا لفظ لاتا ہے تو وہ اس اعتبار سے کہ یہ انسانی روح کے لیے جانی پہچانی شے ہے' اس میں کوئی نئی شے نہیں ہے۔ اسی لیے بڑے پیارے انداز میں مولانا روم نے کہا ؎

خشک تار و خشک مغز و خشک پوست
از کجا می آید ایں آوازِ دوست!

قرآن مجید کو سنتے ہوئے وہ شخص جس کا دل قوی اور زندہ ہو اور روح بیدار ہو تو وہ یوں محسوس کرتا ہے جیسے یہ میرے دوست کی آواز آ رہی ہے' اور گویا یہ تو میرے اپنے دل کی آواز

ہے۔حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''قرآن کے پڑھنے والے بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جب وہ قرآن کو پڑھ رہے ہوتے ہیں تو یہ نہیں سمجھتے کہ ہم مصحف میں سے پڑھ رہے ہیں' بلکہ ایسے محسوس کرتے ہیں کہ جیسے قرآن ہمارے لوحِ قلب پر لکھا ہوا ہے اور ہم وہاں سے پڑھ رہے ہیں۔''

فطرتِ انسانی اور قرآن حکیم میں اس قدر ہم آہنگی اسی لیے ہے۔ یہ قرآن ﴿بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾ ہے اور یہ ایسی روشن آیات ہیں جو علم والوں کے سینوں میں محفوظ ہیں۔

دُنیا کی سب سے بڑی نعمت

اب آیئے اس بات کی طرف کہ یہ قرآن سب سے بڑی نعمت کیوں ہے؟ دراصل ہمارا نعمتوں کا تصور دولت' شہرت' اقتدار' جائیداد' اولاد' صحت وغیرہ تک محدود ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی شے بھی نعمت نہیں ہے' نعمت صرف ایک ہے اور وہ ہدایت ہے۔ ہدایت ہوگی تو دولت بھی نعمت ہے' صحت بھی نعمت ہے' ہدایت کی بنا پر آپ دولت اور صحت سے نیکیاں کمائیں گے۔ اور اگر ہدایت نہیں ہے تو اسی صحت کی بنیاد پر بدمعاشیاں کریں گے۔ تو ظاہر ہے کہ ایسی صحت نعمت نہیں بلکہ زحمت ہے۔ ہدایت ہے تو زندگی نعمت ہے' زندگی کا ایک ایک لمحہ نعمت ہے' ہدایت نہیں ہے تو زندگی لعنت ہے۔ ہدایت ہے تو اولاد نعمت ہے' اسے آپ دین کے کام میں لگائیں گے اور اسے صدقہ جاریہ بنائیں گے۔ ہدایت نہیں ہے تو اولاد لعنت ہے جو آپ کے لیے عذاب کا باعث بنے گی۔ آپ نے حرام کے ذریعے سے جو کچھ کما کر جمع کیا ہے اس کو اللوں تللوں میں اُڑائے گی اور ان کی بدمعاشیوں کا حساب آپ کے کھاتے میں جمع ہوتا رہے گا۔ قرآن مجید میں دو جگہ کہا گیا ہے:

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (التوبہ:۵۵' اور قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ التوبہ:۸۵)

''ان کے مال اور ان کی اولاد (کی کثرت) تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے' اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے ان کو دنیا کی زندگی میں عذاب دینا چاہتا ہے۔''

اگر ہدایت نہیں تو نہ دولت نعمت ہے' نہ اولاد نعمت ہے' نہ صحت نعمت ہے' بلکہ یہ سب ہماری تباہی کا سامان ہے' ہمارے جہنم میں جانے کے لیے تمہید ہے۔ ہاں پارس وہ شے ہے جس

سے کوئی چیز چھو جائے تو وہ سونا بن جاتی ہے۔ اسی طرح ہدایت وہ شے ہے کہ اس کے ساتھ صحت بھی نعمت ہے' زندگی بھی نعمت ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر کچھ کوتاہیاں ہو جائیں تو ان کی تلافی کا امکان ہے۔ انسان توبہ کے ذریعے اپنی غلطیوں کی تلافی کر لیتا ہے۔ ہدایت کے ساتھ اگر اقتدار نصیب ہو جائے تو خلقِ خدا کی بہتری کا سامان ہو جائے گا۔ اگر اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آ جائے جن کے پاس ہدایت نہیں تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ خلق خدا انہیں کو سے گی اور یہ خلقِ خدا کو لعنت کریں گے۔ تو معلوم یہ ہوا کہ اس دُنیا میں' اس آسمان کے نیچے اور اس زمین کے اوپر حقیقتاً نعمت صرف ایک ہے اور وہ ہدایت ہے' جو کہ مطلقاً نعمت ہے' سرتاپا نعمت ہے اور جو ہر نعمت کو نعمت بنانے والی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر کوئی شے نعمت نہیں ہے۔

عظمتِ قرآن' بزبانِ قرآن

اس نعمت ہدایت کی عظمت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی عجیب بات کی طرف میرے ذہن کو متوجہ کیا۔ وہ یہ کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنے کلام کی جو عظمت بیان کی ہے اس کے ضمن میں سورۃ الحشر کی ایک بڑی عظیم آیت ہے اور پھر دو آیات سورۂ یونس کی' چار سورۃ الرحمٰن کی' چھ سورۂ عبس کی اور آٹھ سورۃ الواقعہ کی۔ گویا ایک' دو' چار' چھ' آٹھ سیڑھیاں ہیں۔ پھر ایک عظیم آیت سورۃ الجمعہ کی ہے جو کہ سورۃ الواقعہ میں بیان کردہ منفی کردار کو مزید واضح کرتی ہے۔ میں اس وقت ان قرآنی آیات کے حوالے سے عظمت قرآن کی طرف صرف اشارہ کروں گا' کیونکہ قرآن کی عظمت فی نفسہٖ کیا ہے؟ یہ ہم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ سورۃ الحشر میں ارشاد ہوتا ہے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ
وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اُتار دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کے خوف سے۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کے غور و فکر کے لیے بیان کر دیتے ہیں۔''

قرآن کے بیان کا مقصد یہ ہے کہ یہ مضمون اتنا لطیف ہے کہ تمہارے ذہن کی گرفت میں نہیں آ سکتا۔ اس تمثیل کے ذریعے سے جو بھی کچھ سمجھ سکتے ہو' سمجھ لو۔ قرآن کی عظمت اپنی جگہ ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو ایک اور انداز میں کہا ہے ۔

فاش گویم آں چہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں
زندہ و پائندہ و گویا ست ایں!

''اس کتاب کے بارے میں جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہی شے ہے۔ جیسے اللہ کی ذات الحق ہے ویسے ہی یہ الحق ہے اور جو صفات اللہ کی ہیں' یعنی زندہ و پائندہ اور گویا (متکلم) وہی صفات اس قرآن کی بھی ہیں۔''

آگے چلئے' دو آیات سورۂ یونس کی ملاحظہ ہوں:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۝

''اے لوگو! دیکھو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت بھی آ گئی ہے اور تمہارے سینوں کے اندر جو روگ ہیں ان کی دوا بھی آ گئی ہے' اور یہ ہدایت اور رحمت ہے اہلِ ایمان کے حق میں۔''

دل اگر سخت ہو گئے ہیں تو ان کو نرم کرنے کے لیے نصیحت بھی قرآن ہے' اور پھر یہ کہ دل کے روگ کون سے ہیں؟ ان میں دنیا کی محبت ہے۔ یہ material world' مال و زر (ہندی میں اسے مایہ کہتے ہیں) حقیقت میں کچھ نہیں ہے۔ اس کی محبت میں انسان گرفتار ہو گیا تو یہی ضلالت ہے اور یہی گمراہی ہے۔ اس مایہ کی محبت کو دل سے نکالنا' اسے اَست کے چکر سے نکال دینا ہی درحقیقت اس کا علاج ہے۔ قرآن اس حوالے سے یہ کام کرتا ہے کہ لوگوں کے سینوں میں جو روگ ہیں' یعنی مال کی محبت' شہرت کی محبت' اقتدار' دولت و جائیداد کی محبت' ان محبتوں کو کھرچ کھرچ کر نکال دیتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی محبت کو دل میں اس طرح داخل کرتا ہے کہ اصل محبوب اللہ تعالیٰ ہو جائے۔ اور پھر قرآن اہلِ ایمان کے حق میں ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی۔ لیکن اصل بات دل کے ٹھکنے کی ہے۔

ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ اگر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ نے قرآن دیا ہو اور پھر بھی وہ کسی دوسرے شخص کے بارے میں یہ سوچے کہ اس پر اللہ کا فضل و کرم مجھ سے زیادہ ہوا ہے (کہ

اس کو اللہ نے محل دیا ہے' اتنی لمبی کار دی ہے) تو اس نے قرآن کی بہت ناقدری کی۔ اسے معلوم ہی نہیں کہ اس کے پاس کتنی بڑی دولت ہے۔ کسی شخص کے پاس کوہِ نور ہیرا ہو اور وہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا رہا ہو تو اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اسے پتا ہی نہیں کہ اس کے پاس کیسا گراں قدر ہیرا ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ نے مجھے ہندی کا ایک دوہا سنایا تھا۔ بھیکا ایک ہندی شاعر تھا' وہ کہتا ہے ؎

بھیکا بھوکا کوئی نہیں' سب کی گدڑی لال
گرہ کھول جانے نہیں اس بِدیے کنگال

یعنی کوئی انسان بھوکا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں اپنی معرفت گویا کوہِ نور ہیرے کی صورت میں رکھی ہوئی ہے' تو پھر وہ بھوکا اور مفلس کیسے ہو گیا! صرف دل کی گرہ کھولنے کی ضرورت ہے۔ چونکہ انسان اپنے دل کی گرہ کو کھولتا نہیں ہے' اس لیے محسوس کرتا ہے کہ بھوکا ہو گیا ہے' مفلس اور کنگال ہو گیا ہے۔ سورۂ یونس کی دوسری آیت ہے:

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝

''کہہ دیجیے کہ یہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہے' پس اس (نعمت) پر چاہیے کہ خوشیاں مناؤ۔ وہ بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔''

چنانچہ اس قرآن پر فخر کرو کہ اللہ نے ہمیں اتنی بڑی دولت دی ہے!

سورۃ الرحمٰن کی چار آیات ملاحظہ ہوں:

اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝

''الرحمٰن' اس نے قرآن سکھایا' انسان کو تخلیق کیا' اسے بیان سکھایا۔''

چار چیزیں جو سب سے چوٹی کی ہیں اللہ تعالیٰ نے ان چار آیتوں میں جمع کر دی ہیں۔ اللہ کے ناموں میں سب سے پیارا نام ''الرحمٰن'' ہے۔ اہلِ عرب میں ''اللہ'' کا لفظ زیادہ معروف تھا' اور وہ ''رحمٰن'' کے لفظ سے بدکتے تھے' لیکن قرآن نے آ کر جس نام کو زیادہ نمایاں کیا وہ ''رحمٰن'' ہے' کہ سب سے زیادہ محتاج ہم اللہ کی رحمت ہی کے ہیں۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا: ''جب تک رحمت خداوندی دستگیری نہیں فرمائے گی میں بھی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا!'' ہمارا تمہارا کیا معاملہ ہے۔

﴿عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؁﴾ ''اس نے قرآن سکھایا''۔ ویسے تو انسان کو سارے کا سارا علم اللہ تعالیٰ ہی نے دیا ہے۔ فزکس' الجبرا' جیومیٹری کس نے سکھائی ؟ کیمسٹری کس نے پڑھائی ؟ لیکن سب سے اونچا علم قرآن کا ہے۔

﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ ؂﴾ ''اس نے انسان کو تخلیق کیا''۔ ویسے تو ساری کائنات اللہ تعالیٰ ہی نے بنائی' فرشتے' جن' آسمان' زمین' سیارے اور ستارے بنائے' لیکن ان سب میں سب سے چوٹی کی مخلوق انسان ہے۔

﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ؃﴾ ''اس نے اسے بیان سکھایا''۔ اسے بہت کچھ سکھایا ہے' سماعت' بصارت دی ہے اور بہت صلاحیتیں دے رکھی ہیں' لیکن چوٹی کی چیز ''بیان'' ہے ـــــ اس کا ایک نتیجہ نکلتا ہے' اور وہ یہ کہ اس چوٹی کے مصرف کو یعنی قوتِ بیانیہ کو چوٹی کی شے پر خرچ کرو۔ یعنی اس کو قرآن کے پڑھنے پڑھانے' سیکھنے سکھانے' سمجھنے سمجھانے میں صرف کرو۔ چنانچہ اسی قافیہ میں وہ حدیث آ جاتی ہے جو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((خَيْرُ كُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ)) (رواه البخاری)

''تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں۔''

سیکھنے سکھانے کے مختلف مراحل و مدارج ہیں۔ قرآن کا صرف ناظرہ پڑھنا' سیکھنا سکھانا بھی ٹھیک ہے' حفظ اور تجوید بھی ٹھیک ہے۔ اور قرآن کو سمجھنا ہے تو اس کے لیے عربی سیکھنی پڑے گی۔ پھر ایک تو اس کا سرسری طور پر سمجھنا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کی گہرائیوں میں اترنا ہے' اس کے فلسفے اور حکمت کو سمجھنا ہے' اسی سے اپنی معاشی زندگی کے لیے ہدایت اخذ کرنی ہے اور اسی سے اپنی سیاسی وسماجی زندگی کے لیے رہنمائی لینی ہے' تو یہ اس کے مختلف مدارج ہیں۔ لیکن بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن پڑھیں اور پڑھائیں' سیکھیں اور سکھائیں۔

اب چھ آیات سورۂ عبس کی ہیں:

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍۢ بَرَرَةٍ ۝

''کوئی نہیں! یہ قرآن یاد دہانی ہے۔ پس جو چاہے یاد دہانی حاصل کر لے۔ یہ

قرآن بڑے ہی باعزت' بلند اور پاکیزہ صحیفوں میں ہے' اور اس کے کاتب ملائکہ مقربین ہیں' جو کہ بہت ہی باعزت اور نہایت نیک ہیں۔''

یہ قرآن کی ایک اور اعتبار سے مدح ہے۔ قرآن تو صرف یاددہانی ہے۔ تمہاری روح کے اندر وہ سارا علم موجود ہے' تمہاری روح میں دبی ہوئی چنگاری موجود ہے۔ جیسے چنگاری کے اوپر راکھ آجاتی ہے اسی طرح تمہاری روح کے اندر موجود چنگاری پر راکھ آگئی ہے۔ قرآن صرف اس راکھ کو ہٹانے کے لیے آیا ہے' یہ دلوں کے زنگ کو دور کرنے کے لیے آیا ہے۔ قرآن اندر کے سوئے ہوئے شعور کو بیدار کرنے کے لیے آیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا: قرآن بہت ہی باعزت صحیفوں میں ہے جو کہ بہت ہی بلند ہیں۔ ایک جگہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝﴾ (الزخرف) ''یہ قرآن تو ہمارے پاس اُمّ الکتاب میں ہے' یہ بہت بلند مرتبہ اور حکمت و دانائی کی کتاب ہے''۔ تمہارے پاس تو قرآن کی گویا مصدّقہ نقلیں ہیں' جس کی عبارت وہی ہے جو ''اُمّ الکتاب'' اور ''لوح محفوظ'' میں موجود ''قرآن مجید'' کی ہے۔ ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝﴾ (البروج) ''بلکہ یہ قرآن ہے بڑی شان والا' لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔''

اب آیئے' ملاحظہ کیجیے آٹھ آیات (۷۵تا۸۲) سورۃ الواقعہ کی:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝

''نہیں! مجھے قسم ہے ان مقامات کی جہاں ستارے گرتے ہیں' اور اگر تمہیں علم ہو تو یہ بہت بڑی قسم ہے جو ہم نے کھائی ہے۔''

آج شاید انسان کو پتا چلا ہے کہ اس کائنات کے اندر بہت بڑے بڑے black holes ہیں' جو کہ ''مَوَاقِعِ النُّجُوْمِ'' ہیں۔ یہ تو ماہرین فلکیات (astronomists) سے پوچھیں کہ یہ black holes کیا ہیں اور کس بلا کا نام ہیں؟ کوئی بڑے سے بڑا سیارہ قریب سے گزر جائے تو وہ ان میں دھنس جائے گا اور فنا ہو جائے گا۔

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝

''یہ بڑا باعزت قرآن ہے' چھپی ہوئی کتاب میں ہے۔ (وہ کتاب اللہ کے پاس لوحِ محفوظ میں ہے) اسے تو چھو ہی نہیں سکتے مگر صرف وہ کہ جو انتہائی پاک ہیں (یعنی فرشتے جو اسے چھوتے ہیں)۔''

اگرچہ علماء نے اس آیت سے فقہی حکم نکال لیا ہے کہ بغیر وضو قرآن کو ہاتھ نہ لگایا جائے‘ لیکن یہاں اصل مفہوم کچھ اور ہے‘ اور وہ یہ کہ قرآن کے باطن تک انسان کی رسائی اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کا باطن بالکل پاک نہ ہو جائے‘ ورنہ وہ قرآن کے بھی ظاہر کے اندر الجھا رہے گا کہ یہ اسم ہے‘ یہ فعل ہے‘ اس کا مادہ یہ ہے۔ اس بات کو مولانا روم اس طرح فرماتے ہیں ؎

ما ز قرآں مغزہا برداشتیم
استخواں پیشِ سگاں انداختیم

یعنی قرآن سے اس کا اصل مغز تو ہم نے لے لیا ہے اور خالی ہڈی کتوں کے آگے ڈال دی ہے‘ وہ خالی ہڈیوں میں لڑتے رہتے ہیں۔ پس اگر اندر پاک ہو گیا ہو تو قرآن کے باطن تک رسائی ہو گی‘ ورنہ آپ تفسیر لکھ دیں گے‘ لیکن آپ کی رسائی قرآن کے باطن تک نہیں ہو گی۔ تفسیریں تو غیر مسلم بھی لکھ دیتے ہیں۔ لوگوں نے بڑی بڑی کتابیں لکھ دی ہیں‘ حدیث کے بڑے بڑے انڈکس غیر مسلموں نے مرتب کر دیے ہیں‘ لیکن قرآن کے باطن تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی۔

تَنۡزِیۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴿۸۰﴾

’’پھر اس کا اتارا جانا ہے (لوحِ محفوظ‘ کتابِ مکنون‘ اُمّ الکتاب سے) اُس ہستی کی طرف سے جو تمام جہانوں کا ربّ ہے۔‘‘

آگے اب منفی پہلو ہے۔ اب تک کی باتیں آپ کو اچھی لگ رہی تھیں‘ اب کڑوی بات ہے:

اَفَبِهٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَنۡتُمۡ مُّدۡهِنُوۡنَ﴿۸۱﴾

’’کیا اس قرآن جیسی چیز سے تم بے اعتنائی برت رہے ہو؟‘‘

بے توجہی کر رہے ہو‘ اسے پڑھتے نہیں‘ پڑھتے ہو تو سمجھتے نہیں‘ سمجھتے ہو تو عمل نہیں کرتے۔ اتنی عظیم شے! کائنات کی عظیم ترین نعمت سے یہ سلوک! انگریزی ہم نے اتنی پڑھ لی کہ انگریزوں کو پڑھا دیں‘ لیکن عربی نہیں سیکھ سکے کہ قرآن سمجھ سکیں۔ آخر اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے؟ پی ایچ ڈی میں‘ فزکس‘ کیمسٹری میں‘ ڈاکٹری میں نہ جانے کتنے کتنے سال لگا کر لوگ ڈگریاں لیتے ہیں کہ آدھی عمر گزر چکی ہوتی ہے۔ سب کچھ پڑھ لیتے ہیں‘ لیکن اتنی عربی

نہیں پڑھ سکتے کہ قرآن سمجھ سکیں۔ اب یہ سمجھ لو قرآن اس کو کیا کہتا ہے:

وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ۝

''اور تم نے اپنا نصیب یہ ٹھہرا لیا ہے کہ قرآن کو جھٹلا رہے ہو!''

اگرچہ زبان سے نہیں کہتے کہ قرآن جھوٹا ہے' لیکن اگر تم قرآن کو سچا اور حق سمجھتے تو کیا اس کے ساتھ یہ سلوک کرتے!

یہ ہے وہ شے جس کو میں نے reverse گیئر سے تعبیر کیا ہے' جو میرے اور آپ کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ اس کے لیے میں پھر ایک آیت کا حوالہ دے رہا ہوں اور وہ ہے سورۃ الجمعہ کی آیت ۵۔ اللہ تعالیٰ نے سابقہ اُمتِ مسلمہ ــــ جو **مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ** اور **ملعون** ہیں (یعنی یہودی) ــــ کی مثال دی ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ (الجمعة: ٥)

''مثال ان لوگوں کی جو حامل تورات بنائے گئے' پھر انہوں نے اس کو نہیں اٹھایا (اس کی ذمہ داری ادا نہیں کی) اس گدھے کی سی ہے جس پر (کتابوں کا) بوجھ لدا ہوا ہو۔''

اگر ہم نے بھی وہی رویہ اختیار کیا تو گویا پھر یہ ہماری ہی مثال ہے۔

تحریک رجوع الی القرآن

اس ساری گفتگو کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ پوری قوت کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی سطح پر قرآن کی طرف رجوع کی ایک زبردست تحریک چلنی چاہیے' جس میں لوگوں کو دعوت دی جائے کہ آؤ قرآن پڑھو پڑھاؤ' سیکھو سکھاؤ' سمجھو سمجھاؤ' اس کا علم حاصل کرو اور عام کرو۔ اب ۲۰۰۰ء شروع ہو چکا ہے۔ میں ۱۹۶۵ء میں دوبارہ لاہور منتقل ہوا تھا' یعنی اس تحریک کو شروع ہوئے ۳۵ برس گزر چکے ہیں۔ ۱۹۶۷ء سے اس سمن آباد سے دعوت رجوع الی القرآن کا آغاز ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ع ''شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم!'' بڑا اطمینان اور سکون ہے کہ زندگی اسی کام میں لگی ہے۔ اپنی بہتر صلاحیت' بیشتر وقت' بہتر توانائیاں صرف اس کام میں صرف کی ہیں کہ قرآن پڑھو پڑھاؤ' سیکھو سکھاؤ' سمجھو سمجھاؤ!

سورۃ الفتح کے آخر میں ایک نقشہ کھینچا گیا ہے: ﴿كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ﴾ جیسے ایک کسان نے کھیتی لگائی' ہل چلایا' بیج ڈالا' پانی دیا' یا یہ کہ بارانِ رحمت آ گئی تھی' اب اس نے دیکھا کہ بیج پھوٹ رہے ہیں اور پتیاں نکل رہی ہیں' پھر اس نے اپنا پٹھہ اٹھایا ہے' پھر ذرا اس کو گدرا کیا ہے' پھر وہ کھیتی اپنی نال پر کھڑی ہو گئی ہے۔ ﴿يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ (آیت ۲۹) اس کاشتکار کو وہ منظر بہت بھلا اور بہت اچھا لگتا ہے' وہ خوش ہوتا ہے اور اس کا دل باغ باغ ہوتا ہے کہ میری محنت بار آور ہو رہی ہے۔ یہی معاملہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا تھا۔ ۲۳ برس کی دن رات کی محنت شاقہ میں ایسے ایسے مرحلے آئے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انتقال سے چند دن پہلے جس وقت آپ ﷺ مرضِ وفات کی کیفیت میں تھے اور جماعت میں شریک نہیں ہو رہے تھے اس حالت میں آپؐ کو بہت شدید تکلیف رہی ہے۔ سر میں درد بہت شدید تھا۔ جس وقت ذرا سا افاقہ ہوا تو حجرے کے دروازے کا پردہ اٹھا کر دیکھا تو مسجد میں نماز ہو رہی تھی' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ امامت کرا رہے تھے۔ آپ ﷺ کے چہرے پر یہ سوچ کر تبسم آیا کہ یہ میری کھیتی ہے جو میں نے لگائی ہے' آج یہ فصل میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اور پھر اس کے بعد پردہ ڈال دیا۔

اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اسی تمثیل کا ایک عکس میں اپنی تحریک رجوع الی القرآن کی صورت میں دیکھ رہا ہوں۔ میں نے ۳۵ برس پہلے جس کام کا آغاز کیا تھا آج میں اس کھیتی کو اپنی نگاہوں کے سامنے پروان چڑھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس وقت اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی سو سے کم تعداد ہو گی جو اس قرآنی فکر کو درس و تدریس کے ذریعے عام کر رہے ہیں' اور یہ نوجوان بھی اب ادھیڑ عمر میں پہنچ رہے ہیں۔ یہ نصف صدی کا قصہ ہے' دو چار برس کی بات نہیں۔ میرے دو بیٹے اب چالیس کی دہائی میں ہیں اور میرے ساتھی نوجوان جو میرے ساتھ میرے درس میں شریک ہوتے تھے وہ پچاس کی دہائی میں پہنچ گئے ہیں۔ اتنے لوگ ہیں کہ جو اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ قرآن کا پڑھنا پڑھانا' سیکھنا سکھانا' سمجھنا سمجھانا ہو رہا ہے۔

میرے پردادا حافظ نور اللہ صاحب کی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے جائیداد ضبط کر لی

تھی۔ چنانچہ وہ اپنے آبائی علاقے ضلع مظفر نگر (یوپی) کو چھوڑ کر مشرقی پنجاب کے قصبہ حصار میں منتقل ہو گئے۔ بعد ازاں دو نسلیں تو ہماری ایسی گزری ہیں کہ جن میں کوئی قابلِ ذکر دینی کام نظر نہیں آتا۔ مسائل روزگار ہی اتنے گھمبیر تھے کہ ع ''دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا'' والا معاملہ رہا۔ لیکن پھر اللہ کا شکر ہے کہ اس کے بعد تیسری نسل سے یہ کام شروع ہو گیا۔ آج میں سوچ رہا تھا کہ اللہ کے فضل و کرم سے میرے دو بیٹے حافظ ہیں۔ میرے تین چھوٹے بھائی ہیں اور تینوں کا ایک ایک بیٹا حافظ ہے۔ خاص طور پر میں یہاں برادرم اقتدار احمد مرحوم (اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے) کا تذکرہ ضرور کرنا چاہوں گا۔ ان کے پاس میں خود یہ فرمائش لے کر گیا تھا کہ تم اپنا ایک بیٹا میرے حوالے کرو جو قرآن اکیڈمی میں ایک سالہ کورس کرے اور پھر اس کام میں لگے۔ انہوں نے اپنے منجھلے بیٹے حمید احمد کو اس کام کے لیے وقف کر دیا' لیکن وہ سعادت مند بچہ جلد ہی ایک حادثے میں انتقال کر گیا۔ اب میرے اندر اس بات کی ہمت نہیں تھی کہ میں ان سے کسی دوسرے بیٹے کا مطالبہ کرتا' کیونکہ کاروبار کے تقاضے بھی ہوتے ہیں' لیکن میری کسی توقع یا مطالبے کے بغیر فوری طور پر اقتدار احمد مرحوم نے کہا کہ میرے چھوٹے بیٹے رشید ارشد کو اس کام میں لگا لیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اسی حسن نیت کا نتیجہ نکلا ہے کہ اس بچے نے چھوٹی سی عمر میں یہاں دورۂ ترجمہ قرآن مکمل کیا ہے۔ یہ حافظ بھی ہے۔ بحمد اللہ میرے تین بیٹے بھی دورۂ ترجمہ قرآن کر چکے ہیں۔ عزیزم عاکف سعید' اللہ کے فضل و کرم سے چار پانچ مرتبہ یہ سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ ابھی امریکہ کے قلب شکاگو سے دورۂ ترجمہ قرآن کر کے آ رہے ہیں۔ میرے ایک اور شاگرد اس وقت نیویارک میں دورۂ ترجمہ قرآن کی ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ اسی طرح پورے پاکستان کے اندر بہت بڑے پیمانے پر یہ کام ہو رہا ہے۔ یہ سب اللہ کا فضل ہے ﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿١١﴾﴾ (الضحیٰ) ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کا کوئی خاص انعام ہو تو اس کا تذکرہ بھی کیا کریں اور شکر کیا کریں۔ بحمد اللہ میرے دو بیٹے' دو پوتے اور ساڑھے پانچ نواسے حافظ ہیں۔ ایک نے چونکہ پندرہ پارے کیے ہیں' اس لیے ساڑھے پانچ کہا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کے فضل و احسان کا مظہر ہے۔

۱۹۴۷ء کی بات ہے' اگست یا ستمبر کا مہینہ تھا' ہم حصار میں محصور تھے۔ ہندو باہر سے

الظّٰلِمُوْنَ۝ ...... هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝ (المائدۃ)

''جو اللہ کی اُتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں

وہی تو ظالم ہیں (وہی تو مشرک ہیں)...... وہی تو فاسق ہیں۔''

ہم کیا ہیں؟ انفرادی طور پر (اللہ کا شکر ہے) ہم مسلمان ہیں' اجتماعی طور پر ہم کافر ہیں! ہمارا نظام کافرانہ ہے' ہماری معیشت سود پر مبنی ہے۔ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف بغاوت ہے۔ ہمارے خلاف اللہ اور اس کے رسول کا اعلانِ جنگ ہے۔ ہمارے معاشرے میں فحاشی' عریانی اور بے حیائی ہے۔ چنانچہ سوچ لیجیے کہ قرآن کے فیصلے کے مطابق ہمارا شمار کن لوگوں میں ہوتا ہے!

قرآن مجید کی دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ سارے نبیوں نے کہا: ﴿یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾ ''اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو' جس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں''۔ اور ﴿اَعْبُدُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ۝﴾ ''اللہ کی بندگی کرو اور میری اطاعت کرو''۔ اللہ کی بندگی اور پرستش کرو' لیکن اس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے: ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ﴾ (البینة:٥) ''اور انہیں اللہ تعالیٰ کی بندگی ہی کا حکم دیا گیا تھا اطاعت کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے یکسو ہو کر۔''

اب ہماری بندگی تو ادھوری ہے' اور ادھوری بھی کہاں ہے؟ ہماری پوری اجتماعی زندگی تو اسلام و قرآن کے خلاف ہے۔ انفرادی زندگی میں ٹھیک ہے میں شراب نہیں پیتا' سود نہیں کھاتا' نماز پڑھتا ہوں' روزہ رکھتا ہوں' لیکن اس سے آگے اجتماعیت کا پہلا قدم شروع ہوتے ہی کفر شروع ہو گیا۔ آج ہمارے کتنے گھر ہیں جن میں شرعی پردہ ہے؟ میں رواجی پردے کی بات نہیں کر رہا' شرعی پردے کی بات کر رہا ہوں۔ اگر گھر میں شرعی پردہ نہیں ہے تو اجتماعیت کا تو پہلا قدم ہی غلط ہو گیا۔ کتنے لوگ ہیں جو حلال کھا رہے ہیں؟ کتنے کاروباری ہیں جو اپنے آپ کو بینک کے اوورڈرافٹس سے بچائے ہوئے ہیں اور کتنے لوگ ہیں جنہوں نے سودی قرضہ لے کر مکان نہیں بنائے ہیں؟ اس سارے کفر کے خلاف جب تک جدوجہد نہ ہو' سعی و محنت اور جہاد نہ ہو' ہماری یہ جزوی ہدایت اللہ کے ہاں قبول نہیں۔ سورۃ المائدہ ہی میں فرمایا:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ

أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ (آیت ۶۸)

''(اے نبیﷺ!) کہہ دیجیے: اے کتاب والو (یہودیو' نصرانیو) تمہاری کوئی حیثیت ہماری نگاہ میں نہیں ہے جب تک کہ تم تورات اور انجیل کو اور جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے قائم نہیں کرتے۔''

تمہارا منہ نہیں ہے کہ ہم سے بات کر سکو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ہم سے فرماتے ہیں کہ کس منہ سے تم نماز پڑھ رہے ہو جب کہ تم نے اللہ کی کتاب کو قائم نہیں کیا۔ گویا: ''یٰاَھْلَ الْقُرْاٰنِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا ''الْقُرْاٰنَ'' وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِنْ رَبِّکُمْ'' یعنی ''اے قرآن والو! تمہاری کوئی حیثیت نہیں جب تک کہ تم قرآن کو اور جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے اسے قائم نہیں کرتے۔''

چنانچہ اب ہمارے لیے کرنے کا کام کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ میں اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سو پچاس یا ہزار دو ہزار آدمی مل کر بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن جدوجہد اور کوشش تو کر سکتے ہیں۔ اپنی توانائیاں' صلاحیتیں' قوتیں' اپنے اوقات' اپنے وسائل اور اپنی اولاد کو تو اس کام کے لیے لگا سکتے ہیں۔ اگر ہم یہ بھی نہیں کرتے تو پھر یقیناً اس وعید کا شکار ہو جاتے ہیں کہ:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (البقرۃ)

''کیا تم ہماری کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک حصے کو نہیں مانتے؟ (یعنی کچھ احکام پر عمل کرتے ہو اور کچھ پر نہیں کرتے؟) تو جان لو کہ تم میں سے جو کوئی یہ حرکت کرے اس کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسے دنیا میں ذلیل وخوار کر دیا جائے اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔''

اس سے بچنے کی ایک ہی شکل ہے۔ وہ یہ کہ غلبہ چونکہ باطل اور طاغوت کا ہے اور اللہ کا دین مغلوب ہے' میں اور آپ اس کے تحت رہنے پر مجبور ہیں' ہم سودی نظام کے اندر سانس لے رہے ہیں' میرے اور آپ کے سانس کے ساتھ سود اندر جا رہا ہے' تو پھر اس سب کے

کفّارے کے لیے ہمیں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے؟ جواب اس کا صرف یہ ہے کہ یہاں رہتے ہوئے ہمیں اپنی توانائیوں' قوتوں' صلاحیتوں' اوقات اور وسائل و ذرائع کا کم سے کم حصہ اپنی ذات پر اور اپنے اہل وعیال پر اور زیادہ سے زیادہ حصہ ایسی جدّوجُہد میں لگا دینا چاہیے جس کے ذریعے دین کے نظام کو قائم کیا جا سکے۔ اگر یہ کر لیا تو کفّارہ ادا ہو جائے گا' جو گناہ اندر جا رہا ہے وہ دھل جائے گا۔ اسے آپ اقامت دین یا نظام خلافت کہہ لیں' قرآن کا قائم کرنا کہہ لیں' دین کا قیام یا نظامِ مصطفیٰ ﷺ کا قیام کہہ لیں۔ یہ نام مختلف ہو سکتے ہیں' لیکن کام کی نوعیت ایک ہی ہے۔ ''عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُکَ وَاحِدٌ''۔

پھر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اگر آپ باطل نظام کے تحت زندگی گزار رہے ہیں تو اس صورت میں آپ پر اقامت دین کی جدّوجہد فرضِ عین ہے۔ میں یہ بات سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ میری پوری زندگی قرآن مجید کے پڑھنے پڑھانے میں گزری ہے۔ یہ بات میں اپنے مطالعہ قرآنی کی روشنی میں کہہ رہا ہوں کہ جو آدمی اس جدّوجہد میں شریک نہیں ہے' اس کی نماز' نماز نہیں ہے' روزہ' روزہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب تک طاغوت کا کفر نہیں کرتا اس وقت تک اس کا اللہ پر ایمان معتبر ہی نہیں ہوتا۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى
(البقرة: ٢٥٦)

''پھر جو کوئی طاغوت کا کفر کرے اور اللہ پر ایمان لائے تو اس نے ایک مضبوط کنڈے کو تھام لیا۔''

طاغوت کا کفر پہلے ہے اور اللہ پر ایمان بعد میں ہے۔ اگر انسان طاغوت کے خلاف جدّوجہد نہیں کر رہا اور اس کے تحت پھلنے' پھیلنے اور پھولنے کی کوشش کر رہا ہے' جائیداد بنا رہا ہے' کاروبار بڑھا رہا ہے' تو اس کا مطلب ہے طاغوت کے ساتھ اس کی ہم آہنگی ہے' وہ اسے ذہناً قبول کر چکا ہے اور دل سے اسے مان چکا ہے۔ لہٰذا اس کی نماز منہ پر دے ماری جائے گی۔

التزامِ جماعت کی ضرورت واہمیت

میرے مطالعے کا حاصل یہی ہے کہ دین کے لیے یہ جدّوجہد ہم پر فرض ہے۔ اس ضمن میں یہ چار باتیں اپنے پلّے باندھ لیں:

۱) اس جدّوجہد کے لیے کسی جماعت میں شامل ہونا لازم ہے۔ کیونکہ یہ کام بغیر جماعت کے ممکن نہیں۔ یہ کام افراد نہیں کر سکتے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَةِ))(سنن الترمذی) ''(مسلمانو!) تم پر جماعت سے وابستہ رہنا ضروری ہے''۔((یَدُ اللّٰہِ مَعَ الْجَمَاعَةِ)) (سنن الترمذی) ''اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔''

اور ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے صاف فرمادیا:

((اَنَا آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ' اَللّٰہُ اَمَرَنِیْ بِھِنَّ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْھِجْرَةِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ)) (مسند احمد)

''مسلمانو! میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دے رہا ہوں' جن کا مجھے اللہ نے حکم دیا ہے: جماعت کا' سننے اور ماننے کا' اللہ کے راستے میں ہجرت اور جہاد کا۔''

جماعت کا التزام ہو اور جماعت بھی سمع وطاعت والی ہو' اور یہ جماعت پھر ہجرت اور جہاد کے مراحل سے گزر کر اللہ کے دین کو قائم کرے۔ اس جماعت کا معین ہدف اقامتِ دین کی جدّوجہد ہونا چاہیے۔ کوئی چھوٹا کام مثلاً تعلیمی' تبلیغی اور اصلاحی نوعیت کا نہیں ہونا چاہیے۔ ویسے تو یہ کہ اگر کوئی سگریٹ نوشی کے خلاف بھی مہم چلائے تو وہ بھی اچھا کام ہے۔ تمباکو نوشی سے لوگوں کو بچانا' یہ بھی اچھا ہے' برا نہیں۔ آپ اپنے محلے کی صفائی کے لیے ''انجمن حفظانِ صحت'' بنالیں تو یہ بھی بہت اچھی بات ہے۔ لیکن اس جماعت کا declared goal اقامت دین اور غلبۂ دین کی جدوجہد ہونا چاہیے۔

۲) وہ جماعت انتہائی منظم (disciplined) ہونی چاہیے۔

۳) یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس جماعت کا طریقہ کار کیا ہے۔ ایک بات طے ہے کہ اگر وہ طریقہ کار رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کار سے ماخوذ اور مستنبط نہیں ہے تو آپ کبھی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔

خلافِ پیمبرؐ کسے راہ گزید
کہ ہر گز بمنزل نہ خواہد رسید!

چنانچہ راستہ وہی اختیار کرنا ہوگا۔ بقول امام مالکؒ :((لَا یَصْلُحُ آخِرُ ھٰذِہِ الْاُمَّةِ

اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِہٖ اَوَّلُھَا)) ''اس اُمت کے آخری حصے کی اصلاح نہیں ہو گی مگر صرف اسی طریقے پر جس پر کہ پہلے حصے کی اصلاح ہوئی ہے۔''

۴) آپ کے لیے جس طرح بھی ممکن ہو اُس جماعت کی قیادت کے قریب ہو کر دیکھ لیں کہ دل کیا گواہی دیتا ہے کہ کیا یہ لوگ مخلص ہیں یا بہروپیے ہیں؟ یہ دین کے نام پر دُنیا کی کوئی دکان تو نہیں چمکا رہے؟ اگر دل ان لوگوں کے خلوص کی گواہی دے دے اور یہ جماعت بقیہ شرطیں بھی پوری کر رہی ہو تو پھر اس جماعت میں شامل ہونا فرضِ عین ہے۔ اگر باطل کے غلبے کے تحت زندگی گزارنے والے شخص کے لیے دین کے غلبے کی جدوجہد فرضِ عین ہے تو پھر اس فرضِ عین کو پورا کرنے کے لیے جماعت کا التزام بھی فرضِ عین ہے۔ یہ بات سمجھ لیجئے کہ جس طرح نماز کے لیے وضو فرض ہے' اس لیے کہ وضو کے بغیر نماز نہیں' اسی طرح چونکہ جماعت کے بغیر دین کی اقامت ممکن نہیں' لہٰذا اگر اقامت دین فرض ہے تو التزامِ جماعت بھی فرض ہے۔

جماعت سازی کی مسنون اساس

جماعت سازی کے کئی طریقے ہیں۔ ایک طریقہ ہمارے ہاں انگریزوں کے ساتھ آیا۔ مثلاً جب نئی تہذیب آئی تو میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھانا بھی اس کے ساتھ آیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ہماری تہذیب تو نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا طریقہ تو حدیث میں یوں مذکور ہوا ہے: ((مَا اَكَلَ النَّبِیُّ ﷺ عَلٰی خِوَانٍ))(صحیح البخاری) کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی خوان پر رکھ کر کھانا نہیں کھایا۔ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں میز کرسی تو تھی نہیں' البتہ اونچے گھرانوں میں ایک رواج تھا کہ ان کے پاس چھ سات انچ اونچی چوکیاں ہوتی تھیں۔ زمین پر بیٹھ کر کھا رہے ہوتے لیکن آگے چھ انچ اونچی چوکی رکھی ہوتی' جسے ''خِوان'' کہتے تھے۔ اب بھی بعض گھرانوں میں یہ رواج موجود ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے کبھی ''خِوان'' پر بھی کھانا نہیں کھایا' لیکن اس کرسی میز کو کسی نے حرام نہیں کہا۔ یہ نئی شے تو ہے لیکن حرام نہیں ہے۔ کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس میں اس کی ممانعت آ گئی ہو۔

اسی طرح ہندوستان میں انگریزوں کے آنے کے بعد جماعتیں بنانے کا طریقہ یہ بنا کہ پہلے اس کے مقاصد (aims) اور اہداف (objects) لکھ لیے جائیں۔ اس کے

اور قواعد وضوابط کا تعین کرلیا جائے۔ گویا پورا دستور articles of association (constitution) بنالیا جائے۔ اب جو شخص بھی اس دستور کو مان لے گا وہ اس جماعت کا رکن بن جائے گا۔ پھر یہ ارکان اس جماعت کے امیر یا صدر کا انتخاب دو یا چار سال کے لیے کریں گے۔ جماعت بنانے کے اس طریقے کو بھی میں مباح و جائز سمجھتا ہوں۔ اگرچہ یہ مسنون نہیں ہے' لیکن حرام بھی نہیں ہے۔ جیسے میز کرسی پر کھانا کھانا مسنون نہیں ہے لیکن حرام بھی نہیں ہے' اسی طرح یہ طریقہ نہ مسنون ہے' نہ منصوص ہے اور نہ ماثور ہے' لیکن حرام بھی نہیں ہے۔ دستوری تنظیم (constitutional organization) بھی ٹھیک ہے' اگر منظم اور سمع و طاعت والی ہو۔ لیکن جس جماعت کا قرآن' حدیث' سیرت' سنت' خلافتِ راشدہ اور ہماری پوری تاریخ میں ذکر ہے وہ بیعت کا نظام ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ ایسا ہو جس پر آپ کو اعتماد ہو کہ یہ آدمی مخلص ہے' دین کو جانتا ہے اور حقیقتاً یہ دین کی خدمت کرنا چاہتا ہے تو آپ اس سے شخصی طور پر بیعت کرلیں کہ میں آپ کا ساتھی ہوں' جو حکم آپ مجھے دیں گے میں کروں گا۔ میں خود بھی مشورہ دوں گا' اپنی رائے دوں گا' لیکن یہ کہ فیصلہ گنتی سے نہیں ہوگا کہ یہ اکثریت ہے اور یہ اقلیت ہے' نو آدمیوں کی رائے لازماً غلط ہے اور دس کی لازماً صحیح ہے۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آٹھ آدمیوں کی رائے صحیح ہو اور بیس کی غلط ہو۔ نظامِ بیعت میں فیصلہ امیر کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ......
فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ (التوبة: ١١١)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اور مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں .... پس اس بیع پر کہ جو تم نے اللہ سے کی ہے خوشیاں مناؤ۔''

یہ بیعت اللہ سے بھی ہے اور اللہ کے نبی ﷺ سے بھی۔ سورۃ الفتح میں دو جگہ ذکر آگیا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ (آیت ۱۰)

''بے شک جن لوگوں نے آپؐ سے بیعت کی تو یقیناً انہوں نے اللہ سے بیعت کی۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔''

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (آیت ۱۸)

''بے شک اللہ مؤمنوں سے اس وقت راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپؐ

سے بیعت کر رہے تھے۔''

سورۃ المُمتحنۃ میں خواتین کی بیعت کا ذکر آیا ہے۔ یہ نظام ہے کہ جو قرآن نے دیا' حدیث نے دیا اور سیرت میں بھی یہی نظام ہے۔ بیعت عقبہ اولیٰ اور عقبہ ثانیہ ہوئیں' بیعت رضوان بیعت علی الموت ہو رہی ہے۔ اسی بیعت پر خلافت راشدہ کا نظام چلا۔ حضرات ابوبکر' عمر' عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کی بیعت ہوئی' اور جس وقت خلافت ملوکیت میں بدلنے لگی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ میدان میں آئے تو انہوں نے بھی بیعت لی کہ آؤ میرے ساتھ' ہم اس ملوکیت کے راستے کو بند کریں۔ یہ دوسری بات ہے کہ بیعت کرنے والے گھبرا گئے اور ابن زیاد کے تشدّد سے خوف زدہ ہو کر انہوں نے بیعت توڑ دی۔ اس کا کوئی الزام حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر تو نہیں۔ ہمارا یہ نظام تھا جس کو ہم نے انگریزوں کے آنے کے بعد پس پشت ڈال دیا۔ حالانکہ ۱۹۱۳ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جماعت ''حزب اللہ'' بنائی تو وہ بیعت کی بنیاد پر تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد بیس کی دہائی میں شیخ حسن البنّاءؒ نے مصر میں جو جماعت ''الاخوان المسلمون'' بنائی وہ بھی بیعت کی بنیاد پر تھی۔ لیکن مولانا مودودیؒ نے جب جماعت اسلامی بنائی وہ بیعت کی بنیاد پر نہیں تھی۔ البتہ ۱۹۳۰ء میں جب قادیانی فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے علماء جمع ہوئے اور انہوں نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو امیرِ شریعت بنایا تو ان سے بیعت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو بیعت لی اس کے الفاظ سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ وہ کتنی گھمبیر بیعت ہے۔ یہ روایت صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ ' فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ ' وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ ' وَعَلٰی اَثَرَةٍ عَلَیْنَا ' وَعَلٰی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ ' وَعَلٰی اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَ مَا كُنَّا ' لَا نَخَافُ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ

''ہم نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی کہ آپؐ کا ہر حکم سنیں گے اور مانیں گے (اطاعت کریں گے) چاہے کتنا ہی مشکل ہو اور خواہ آسان ہو' چاہے ہماری طبیعتیں آمادہ ہوں اور چاہے ہمیں اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے' چاہے آپ ہم پر دوسروں کو ترجیح دے دیں (ہم یہ نہیں کہیں گے کہ میں آپ کا پرانا ساتھی تھا' آپ

نے نو وارد کو مجھ پر امیر بنا دیا) جنہیں آپ امیر بنائیں گے ہم ان سے جھگڑیں گے نہیں' اور جہاں بھی ہوں گے حق بات ضرور کہیں گے (اپنی رائے پیش کر دیں گے)۔ اور اللہ تعالیٰ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے۔''

اسی بیعت کے نظام پر ہم نے تنظیم اسلامی قائم کی ہے۔ ہماری بیعت میں صرف ایک لفظ کا اضافہ ہے۔ وہ اس طرح کہ حضور ﷺ کا ہر حکم واجب الاطاعت تھا۔ حضور ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بھی ہر حکم واجب الاطاعت نہیں ہے۔ ان سے بھی کتاب وسنت کی دلیل پوچھی جائے گی۔ کتاب وسنت کے خلاف وہ کوئی حکم نہیں دے سکتے۔ چنانچہ ہم نے بیعت کے الفاظ یہ رکھے ہیں: ''اِنِّیْ اُبَایِعُكَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْمَعْرُوْفِ'' یعنی اس میں صرف دو لفظ (فِی الْمَعْرُوْفِ) بڑھا دیے ہیں' باقی وہی بات ہے۔

اس بیعت کے بارے میں اب میں آخری بات کہہ رہا ہوں۔ مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً))

''جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہیں تھا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔''

گویا یہ بیعت ایسے ہی ہے جیسے آپ نے اپنی بکری کے گلے میں رسی ڈالی ہوئی ہے اور رسّی کا ایک سرا آپ کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ اب وہ بکری آپ کے پاس سے کہاں جا سکتی ہے؟ اس طرح سے گویا رسّی کا ایک سرا بیعت کرنے والے کی گردن میں ہے اور دوسرا بیعت لینے والے کے ہاتھ میں ہے۔ صاف صاف بات کر رہا ہوں کہ گردن میں بیعت کے قلادے کے بغیر موت اسلام کی موت نہیں' بلکہ جاہلیت کی موت ہے۔

میری ان گزارشات کا تجزیہ کریں تو ظاہر ہو جائے گا کہ اقامت دین کے حوالے سے عملاً دو ہی صورتیں ممکن ہیں: یا تو اسلام کا نظام قائم ہے' نظام خلافت ہے' تو جو خلیفہ ہے اس کے ہاتھ پر بیعت ہوگی۔ اگر نہیں کریں گے تو جہنم میں جائیں گے۔ اور اگر اسلام کا نظام قائم نہیں ہے تو ظاہر ہے وہ نظام خود بخود تو نہیں آئے گا' اس کے لیے محنت کرنا پڑے گی' جماعت بنانا ہوگی' کوشش کرنا ہوگی' چنانچہ جماعت کے امیر سے بیعت کرنا ہوگی۔ ان دو کے علاوہ تیسری

شکل ممکن نہیں۔ اگر نظام خلافت ہے تو خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت' جیسے حضرات ابوبکر' عمر' عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے ہاتھ پر بیعت کی گئی تھی۔ اور اگر نظام خلافت نہیں ہے تو جو جماعت اس کو قائم کرنے کے لیے کھڑی ہو اس کے امیر کے ہاتھ پر بیعت ہو گی۔ پس ثابت ہوا کہ اگر کوئی مسلمان ہے اور وہ اسلام کی موت مرنا چاہتا ہے تو اسے بیعت کرنا ہو گی:

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴿۱۶۲﴾ (الانعام)

''بیشک میری نماز' میری قربانی' میری زندگی میری موت اللہ ربّ العالمین ہی کے لیے ہے۔''

میں نے جو دین کا تقاضا سمجھا وہ آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب آپ میں سے ہر شخص کے دل و دماغ کا فیصلہ ہے۔ دل و دماغ گواہی دیں کہ بات ٹھیک ہے تو اس کو قبول کرنا آپ پر لازم ہے۔ اور اگر بات سمجھ میں نہیں آئی تو بے شک رد کر دیں' یا اگر بات سمجھ میں آ گئی ہے کہ یہ کام تو صحیح ہے لیکن یہ تنظیم صحیح نہیں ہے تو کسی اور تنظیم کو دیکھیں۔ کسی نبی کی تنظیم تو آج موجود نہیں ہے۔ لہٰذا آپ کو اس کام کے لیے جو بھی بہتر نظر آئے اور آپ کے خیال میں جو بھی جماعت بہتر طریقے پر جدّوجُہد کر رہی ہے اس میں شریک ہو جایئے' لیکن کوئی شخص اپنے آپ کو اس سے فارغ نہ سمجھے۔ اس لیے کہ غلبۂ باطل کے تحت زندگی گزارنے والے شخص کے لیے اقامت دین اور غلبۂ دین کی جدّوجُہد فرضِ عین ہے۔ اور یہ وہ فرض ہے کہ اگر اس کی طرف انسان توجہ نہیں دے رہا اور اس کے ضمن میں اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر رہا تو میرے نزدیک ایسا شخص باقی فرائض کی ادائیگی کے باوجود اللہ کے ہاں اپنی اس کوتاہی پر جواب دہ ہو گا۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○

عظمتِ قرآن

بزبانِ قرآن وصاحبِ قرآن

عنوانات

قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند گوہری	'39
الرحمٰن: محبوب ترین صفاتی نام	40
انسان: تخلیقِ کائنات کا نقطۂ عروج	44
قوّتِ بیان: انسان کی امتیازی صلاحیت	45
قوّتِ بیان کا بہترین مَصرف	47
لسانِ نبوّت میں ''بہترین'' کون؟	48
صحابہ کرامؓ کی درخشاں مثالیں	49
سورۂ عبس کی چار آیات	53
مسلمانوں کے عروج وزوال کی حقیقت	56
حکیم الاُمّت کی نبض شناسی	59
شیخ الہندؒ کا نتیجۂ فکر	61
کرنے کا اصل کام	62
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست!	64

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

امّا بعد۔ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ○ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ ﴿۴﴾

وقال تبارك و تعالیٰ:

فِیۡ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ ﴿ۙ۱۳﴾ مَّرۡفُوۡعَۃٍ مُّطَہَّرَۃٍۭ ﴿ۙ۱۴﴾ بِاَیۡدِیۡ سَفَرَۃٍ ﴿ۙ۱۵﴾ کِرَامٍۭ بَرَرَۃٍ ﴿ؕ۱۶﴾

صدق اللّٰہ العظیم

رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ○ وَیَسِّرۡ لِیۡۤ اَمۡرِیۡ○ وَاحۡلُلۡ عُقۡدَۃً مِّنۡ لِّسَانِیۡ○

یَفۡقَہُوۡا قَوۡلِیۡ○

اَللّٰھُمَّ اَلۡھِمۡنِیۡ رُشۡدِیۡ وَاَعِذۡنِیۡ مِنۡ شُرُوۡرِ نَفۡسِیۡ

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الۡحَقَّ حَقًّا وَارۡزُقۡنَا اتِّبَاعَہ وَاَرِنَا الۡبَاطِلَ بَاطِلًا وَارۡزُقۡنَا

اجۡتِنَابَہٗ — آمین یا ربَّ العَالَمِین!

حضرات! میری آج کی یہ گفتگو دو حصوں پر مشتمل ہو گی۔ پہلے حصے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ تعلیم و تعلّمِ قرآن یعنی قرآن حکیم کے پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے کی کیا اہمیت ہے' اور دوسرے حصے میں مجھے اپنے موجودہ حالات کے حوالے سے رُجوع الی القرآن یعنی قرآن حکیم کی طرف از سرِ نو راغب ہونے کی اہمیت کو بیان کرنا ہے۔

قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

پہلے مضمون کے ضمن میں میں نے اس وقت سورۃ الرحمٰن اور سورۂ عبس کی چار چار آیات کی تلاوت کی ہے۔ ان کے حوالے سے مَیں چاہوں گا کہ قرآن مجید کی جو عظمت ہمارے سامنے آتی ہے اس پر ہم غور کریں۔ اسی ضمن میں میں نبی اکرم ﷺ کی چند

احادیث بھی آپ کو سنانا چاہتا ہوں تاکہ عظمتِ قرآن کا بیان جہاں ہم خود کلامِ الٰہی سے سمجھیں وہاں نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے بھی یہ بات ہمارے سامنے آئے کہ اس کلام کی کیا عظمت ہے۔ فارسی کا ایک مصرعہ ہے ع ''قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری'' یعنی موتی اور ہیرے کی قدر و قیمت کو جاننے والا یا تو بادشاہ ہوتا ہے اور یا جوہری! ایک عام دیہاتی کے ہاتھ پر اگر آپ ایک ہیرا یا قیمتی موتی رکھ دیں تو ہوسکتا ہے کہ وہ اسے کانچ کا ایک ٹکڑا سمجھے۔ تو اسی طرح قرآن مجید کی عظمت سے اصلاً تو وہ ہستی واقف ہے جس کا یہ کلام ہے اور پھر دوسرے نمبر پر اس کی عظمت سے صحیح معنوں میں واقف وہ ہستی ہے کہ جس پر یہ قرآن نازل ہوا' یعنی محمد رسول اللہ ﷺ!

سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی چار آیات بڑی مختصر ہیں۔ پہلی آیت صرف ایک لفظ پر مشتمل ہے: ﴿اَلرَّحۡمٰنُ ۝۱﴾ اس کے بعد کی تین آیات دو دو الفاظ پر مشتمل ہیں: ﴿عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ۝۲ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۝۳ عَلَّمَهُ الۡبَیَانَ ۝۴﴾ لیکن اگر ہم ان الفاظ پر تدبر کریں' غور وفکر کریں' سوچ بچار سے کام لیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان مختصر ترین الفاظ میں جو مضامین پنہاں ہیں ان مضامین کا بیان کرنا کسی ایک تقریر میں ممکن ہی نہیں۔ ہر اعتبار سے ایک چوٹی کا مضمون ہے جو ہر آیت میں آیا ہے۔

الرحمٰن: محبوب ترین صفاتی نام

پہلی آیت' جیسا کہ میں نے عرض کیا' صرف ایک لفظ ''اَلرَّحۡمٰنُ'' پر مشتمل ہے۔ ''الرحمٰن'' اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے نام وارد ہوئے ہیں اور حدیث شریف میں بھی ان کا ذکر ہے۔ ویسے تو قرآن مجید سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ''فَلَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی'' یعنی جس جتنے بھی اچھے نام ہیں سب اللہ کے ہیں۔ جتنی اچھی صفات کا ہم تصور کر سکتے ہیں وہ تمام صفات ذاتِ باری تعالیٰ میں بتمام وکمال موجود ہیں۔ جس اچھائی' جس خوبی' جس خیر اور جس کمال کا ہمارے ذہن میں خیال آ سکتا ہے وہ اللہ پاک کی ذات میں موجود ہے۔ لیکن تعین کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام وہی ہیں جو قرآن مجید میں یا حدیث شریف میں وارد ہوئے ہیں۔ ان ناموں میں سب سے زیادہ محبوب نام ''اللہ'' ہے اور اس سے قریب

ترین نام ''رحمٰن'' ہے۔ چنانچہ تلاوتِ قرآن مجید کا آغاز بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سے کیا جاتا ہے۔ پھر سورۃ الفاتحہ کی پہلی آیت کے الفاظ بھی یہ ہیں: ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝﴾ اور دوسری آیت ہے: ﴿اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝﴾

واقعہ یہ ہے کہ لفظ ''اللہ'' تو عرب میں بہت معروف تھا۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل بھی اہلِ عرب ''اللہ'' کے نام سے بخوبی واقف تھے۔ وہ اللہ سے دعائیں کرتے تھے اور اپنے تمام شرک کے باوجود اس حقیقت کو مانتے تھے کہ اس کائنات کے تخلیق کرنے میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس پوری کائنات کا خالق تنہا وہی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آتا ہے: ﴿وَلَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ ؕ﴾ (لقمان: ۲۵) ''(اے نبی ﷺ) اگر آپ ان سے سوال کریں کہ یہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کیے تو وہ لازماً کہیں گے کہ اللہ نے!'' لیکن اللہ تعالیٰ کے دوسرے ناموں میں سب سے زیادہ نمایاں اور ایک خاص پہلو سے سب سے زیادہ پیارا نام ''رحمٰن'' ہے۔ قرآن مجید میں جب یہ نام بار بار آیا تو اہلِ عرب نے اعتراض کیا کہ یہ ''رحمٰن'' کون ہے؟ سورۂ بنی اسرائیل کے آخر میں فرمایا گیا: ﴿قُلِ ادۡعُوا اللّٰہَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ ؕ اَیًّامَّا تَدۡعُوۡا فَلَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی ۚ﴾ (آیت ۱۱۰) ''(اے نبی ﷺ) ان سے کہیے چاہے اللہ کہہ کر پکارلو چاہے رحمٰن کہہ کر پکارلو پس (یہ جان لو کہ جس کو پکار رہے ہو) تمام اچھے نام اُسی کے ہیں''۔ تو اس سے بھی ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ''اللہ'' کے قریب ترین جو نام آتا ہے وہ ''رحمٰن'' ہے۔

لیکن میں نے جو عرض کیا کہ ایک دوسرے پہلو سے یہ سب سے زیادہ پیارا نام ہے تو اس بات کو بھی سمجھ لیجیے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ صفاتی نام اس کی صفتِ رحمت سے بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت وہ صفت ہے جس کے ہم سب سے زیادہ محتاج ہیں۔ ہمارا معاملہ تو بہت دُور کی بات ہے، خود نبی اکرم ﷺ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ضرورت مند ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک بار آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((لَنۡ یُّدۡخِلَ اَحَدًا عَمَلُہُ الۡجَنَّۃَ)) ''کوئی شخص بھی محض اپنے عمل کی بنا پر ہرگز جنت میں داخل نہ ہو سکے گا''۔ اس پر کسی صحابیؓ نے ہمت کر کے یہ سوال کرلیا: ''حضور کیا آپ بھی نہیں؟'' تو حضور

ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((وَلَا اَنَا' اِلَّا اَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِفَضْلٍ وَّرَحْمَةٍ))(۱) ''ہاں میں بھی نہیں' مگر یہ کہ اللہ مجھے اپنے خصوصی فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے''۔ اب آپ اندازہ کیجیے کہ اگر اللہ کے نبیوں' پیغمبروں اور سیّد المرسلین سیّد الاوّلین والآخرین محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو رحمتِ خداوندی کی احتیاج ہے تو ہم اس سے کس طرح مستغنی ہو سکتے ہیں؟ ہم سب اللہ تعالیٰ کی رحمت کی شدید احتیاج رکھتے ہیں۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر آتا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ﴾ (فاطر) ''اے لوگو! تم سب کے سب اللہ کی ذات کے فقیر (محتاج) ہو۔ غنی اور حمید ذات تو صرف اللہ ہی کی ہے''۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے جان بچا کر نکلے اور پا پیادہ پورا صحرائے سینا عبور کر کے تن تنہا مدین پہنچے تو آبادی کے باہر کنوئیں پر بیٹھ گئے۔ آپؑ اس وقت انتہائی کسمپرسی کے عالم میں تھے' وہاں آپؑ کی کوئی جان پہچان تک نہ تھی۔ اس حال میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانِ مبارک پر جو دعا آئی وہ قرآن حکیم میں بایں الفاظ منقول ہے: ﴿رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ﴾ (القصص) ''پروردگار! میں ہر اُس خیر کا محتاج ہوں جو تو میری جھولی میں ڈال دے''۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مخلوق کا معاملہ اللہ کے سامنے اسی فقر اور احتیاج کا ہے' اور ہم رحمتِ خداوندی کے ہر آن محتاج ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی اس صفت رحمت سے اس کے دو نام بنے ہیں: رحمٰن اور رحیم! اور یہ واحد صفت ہے جس سے اللہ کے دو نام آتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ان میں رحمت کی دو شانوں کا ظہور ہو رہا ہے۔ ''رحیم'' فعیل کے وزن پر صفتِ مشبّہ ہے جو اس کیفیت کو ظاہر کر رہا ہے جو اس دریا کی مانند ہے جو مسلسل بہہ رہا ہو — جس میں سکون' دوام اور پائیداری ہو اور ''رحمٰن'' رحمتِ خداوندی کی اس شان کو ظاہر کرتا ہے جو ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی مانند ہے' جس میں ایک ہیجان کی کیفیت ہے۔ فعلان کے وزن پر عربی زبان کے جو بھی الفاظ آتے ہیں ان میں یہ شدت پائی جاتی ہے' ایک ہیجانی اور طوفانی کیفیت ان کا خاصہ ہے۔ عرب کہے گا: ''اَنَا عَطْشَانٌ'' کہ میں بہت پیاسا ہوں۔ یعنی پیاس سے جان نکل رہی ہے۔ بھوک سے کوئی شخص مر رہا ہے تو وہ کہے گا: ''اَنَا

(۱) صحیح البخاری' کتاب المرضیٰ' باب تمنی المریض الموت۔ وصحیح مسلم' کتاب صفة القیامة والجنة والنار' باب لن یدخل احد الجنة بعمله بل برحمة اللّٰه تعالیٰ۔

جَوْعَانُ'' اسی طرح ''غَضْبَانُ'' کے معنی ہیں بہت زیادہ غضبناک۔ اسی طرح یہ لفظ ''رحمٰن'' بنا ہے' یعنی انتہائی رحم فرمانے والا' جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت گویا انتہائی پیاری اور محبوب صفت ہے' اور اس میں بھی شانِ رحمانیت ایک عجیب کیفیت کی حامل ہے۔

اسی شانِ رحمانیت کے حوالے سے فرمایا گیا:

اَلرَّحْمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴿۲﴾

''اُس رحمٰن نے تعلیم دی ہے قرآن کی!''

قرآن کی عظمت کو اس سے سمجھو کہ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت سے ہے۔ اگر فرمایا جاتا: ''اَللّٰهُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ'' تو بھی بات مکمل ہو جاتی' لیکن قرآن کا ذکر اللہ پاک کی صفتِ رحمانیت کے حوالے سے ہو رہا ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ: جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح ہے' اس نے قرآن سکھایا۔ یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اللہ نے صرف قرآن نہیں سکھایا' اس نے تو انسان کو بہت کچھ سکھایا ہے۔ انسان کے پاس جو بھی علم ہے' وہ اللہ ہی کا دیا ہوا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی ابتدا میں حضرت آدم علیہ السلام کا جو قصہ بیان ہوا ہے' اس میں فرمایا گیا: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (آیت ۳۱) ''اور اللہ نے سکھا دیے آدم کو تمام کے تمام نام''۔ اور اس موقع پر فرشتوں کا جواب یہ تھا: ﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ﴾ (آیت ۳۲) ''تو پاک ہے' ہمیں کوئی علم حاصل نہیں سوائے اس کے جو تُو نے ہمیں عطا کیا''۔ تو جن و انس ہوں' ملائکہ ہوں' انبیاء و رسل ہوں، اولیاء اللہ ہوں' یا بڑے سے بڑا سائنسدان اور بڑے سے بڑا فلسفی ہو' جس کے پاس بھی علم کی کچھ رمق موجود ہے' وہ آخر کہاں سے آئی ہے؟ آیۃ الکرسی میں فرمایا گیا: ﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۵۵) یعنی مخلوق میں سے کوئی اس کے علم میں سے کسی شے کا احاطہ نہیں کر سکتا' سوائے اتنے حصے کو جتنا وہ خود کسی کو دینا چاہے۔ بلکہ ایک نومولود بچہ جو دنیا میں آتا ہے' اسے یہ علم ہوتا ہے کہ اس کا رزق کہاں ہے' اس کی روزی کہاں ہے۔ وہ ماں کی چھاتی پر جس طرح مُنہ مارتا ہے' اس کی تربیت اسے کس نے دی ہے؟ یہ شعور وہ کہاں سے لے کر آیا ہے؟ وہ کون سی تربیت گاہ تھی جہاں

سے وہ یہ ٹریننگ لے کر آیا ہے؟ تو معلوم ہوا کہ علم خواہ جبلی ہو' خواہ فطری ہو' خواہ وہ ہمارے نفس میں ودیعت شدہ ہو اور خواہ وہ ہم تعلیم کے نظام کے ذریعے سے حاصل کرتے ہوں' اس کا منبع اور سرچشمہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے اور ہمیں سبھی کچھ اُسی نے سکھایا ہے۔ لیکن اُس نے جو کچھ سکھایا ہے' اس میں چوٹی کی چیز قرآن ہے۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے بہت بلند صفت ہے رحمت ــــ اور اس رحمت کی بہت بلند شان ہے جو لفظ ''رحمٰن'' میں ظاہر ہوتی ہے' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو کچھ سکھایا ہے' اس میں سب سے چوٹی کی چیز جس کی تعلیم دی' وہ قرآن حکیم ہے: اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ

انسان: تخلیق کا نقطۂ عروج

اب تیسری آیت پر آیئے۔ فرمایا:

خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ

''انسان کی تخلیق فرمائی۔''

یہاں پھر وہی بات سامنے آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صرف انسان کی تخلیق نہیں فرمائی' جنوں کو بھی اُسی نے تخلیق فرمایا' ملائکہ کی تخلیق بھی اُسی نے فرمائی' یہ شجر و حجر جو ہیں' یہ بھی اسی کے تخلیق کردہ ہیں' یہ چاند اور سورج بھی تو اُسی نے پیدا کیے ہیں' لیکن یہاں امتیازی طور پر انسان کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا نقطۂ عروج (climax) ہے۔ آج ہمارے سائنسی اور مادّی علوم کا نتیجہ اور ماحصل بھی یہی ہے کہ مخلوقات میں سب سے پہلے جمادات تھے' جمادات کے بعد نباتات اور نباتات کے بعد حیوانات آئے۔ پھر جمادات کے مقابلہ میں نباتات ایک اعلیٰ خلقت کی حامل ہیں۔ نباتات کے اوپر حیوانات کا سلسلہ ہے' اور وہ ایک مزید اعلیٰ درجہ کی تخلیق ہے۔ حیوانات میں اگر ارتقاء (evolution) کے نظریے کو تسلیم کیا جائے تو انسان کا مقام شجرِ ارتقاء (evolution tree) کی چوٹی پر ہے۔ گویا یہ سلسلۂ تخلیق کا نقطۂ عروج ہے۔ اور قرآن سے بھی اس کی گواہی ملتی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝﴾

''اور ہم نے بنی آدم کو عزت و اکرام عطا فرمایا' اور ان کو بحر و بر میں سواریاں دیں' اور پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا فرمایا' اور جتنی مخلوقات ہم نے پیدا کیں' ان میں سے اکثر پر انہیں فضیلت عطا فرمائی۔''

سورۂ ص میں فرمایا:

﴿لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ط﴾ (آیت۷۵)

''جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔''

تورات میں بھی اس طرح کے الفاظ آتے ہیں کہ اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا۔ یہ الفاظ اگرچہ قرآن میں نہیں ہیں' لیکن حدیث صحیح میں موجود ہیں:

((خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ)) (۱)

''اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر تخلیق فرمایا۔''

اس کے لیے اب مزید دلائل کی ضرورت نہیں۔ سورۃ الرحمٰن کی پہلی تین آیات سے ہم نے تین باتیں سمجھی ہیں: (i) صفاتِ باری تعالیٰ میں سے چوٹی کی صفت — رحمٰن۔ (ii) اللہ نے انسان کو جو علم عطا فرمایا' اس میں چوٹی کا علم — قرآن۔ (iii) جو کچھ اس نے پیدا فرمایا اس میں چوٹی کی تخلیق — انسان۔

قوّتِ بیان: انسان کی امتیازی صلاحیت

اب چوتھی آیت آتی ہے:

عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝

''انسان کو اس نے بیان کی تعلیم عطا فرمائی!''

اب ذرا غور کیجیے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی قوتیں اور صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں۔ ان میں سے قوت بیان کا حوالہ کس اعتبار سے دیا گیا ہے؟ واقعہ یہ ہے ہم میں جو بھی جسمانی صلاحیتیں ہیں' وہ اکثر و بیشتر دیگر حیوانات میں بھی ہیں۔ ہم کھانا کھاتے ہیں' اور جو کچھ کھاتے ہیں اسے ہضم کرتے ہیں۔ یہ نظامِ ہضم حیوانات میں بھی ہے۔ ہم میں اگر جنس کا مادہ رکھا گیا ہے اور توالد و تناسل کا سلسلہ جاری کیا گیا ہے تو یہ حیوانات میں بھی ہے۔

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاستیذان' باب بدء السلام۔ وصحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب النهی عن ضرب الوجه۔

ہمیں اگر بینائی عطا کی گئی ہے تو آپ کو پرندوں میں ایسے پرندے بھی مل جائیں گے جن کی بینائی ہم سے ہزاروں گنا زیادہ ہے۔ مثلاً بلندی پر پرواز کرتا ہوا عقاب زمین پر پڑی ہوئی سوئی تک دیکھ لیتا ہے۔ اب ایسے آلے بھی ایجاد کر لیے گئے ہیں جن کی بینائی ہماری بینائی سے کہیں زیادہ ہے۔ کتنے ہی حیوانات ہیں جن کی قوتِ شامہ یعنی سونگھنے کی قوت ہم سے کہیں بڑھ کر ہے۔ تو یہ استعدادات جو ہمارے اندر ہیں' حیوانات میں بھی ہیں۔ البتہ ایک صفت وہ ہے جس کے اعتبار سے اہلِ فلسفہ اور اہلِ منطق نے انسان کو دیگر حیوانات سے ممیّز قرار دیا ہے' اور وہ یہ کہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ اس کو نطق و گویائی کی صفت عطا کی گئی ہے' اسے اظہار ما فی الضمیر کے لیے زبان دی گئی ہے۔ وہ زبان جو اس کے باہمی تبادلۂ خیالات کا ذریعہ بنتی ہے۔ انسانی دماغ کی ساخت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام حیوانات کے مقابلے میں انسانی دماغ اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس میں سب سے بڑا حصہ مرکزِ تکلّم (speech centre) ہے' جو تمام حیوانات کی نسبت سب سے زیادہ ترقی یافتہ (developed) ہے۔ چنانچہ یہاں انسان کی سب سے امتیازی صلاحیت کا حوالہ دیا گیا ہے کہ ہم نے اسے قوتِ بیانیہ عطا کی۔

اب ان چار آیات کا ماحصل ایک بار پھر اپنے سامنے رکھیے:

اَلرَّحْمٰنُ: صفاتِ باری تعالیٰ میں سے چوٹی کی صفت۔

عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ: رحمٰن کی طرف سے سب سے بڑی دولت اور نعمت جو انسان کو عطا کی گئی وہ یہ ہے کہ اسے قرآن سکھایا گیا۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ: اللہ نے انسان کو پیدا کیا' جو اس کی تخلیق کا نقطۂ کمال ہے۔

عَلَّمَهُ الْبَيَانَ: انسان کو اس نے جو صلاحیتیں دی ہیں ان میں سب سے اونچی صلاحیت اس کے بیان کی قوت ہے۔

یہ چار آیات تین جملوں پر مشتمل ہیں' جن کا ترجمہ یہ ہوگا:

(i) رحمٰن نے قرآن سکھایا۔

(ii) اس نے انسان کو تخلیق کیا۔

(iii) اسے قوتِ بیان عطا فرمائی۔

قوتِ بیان کا بہترین مصرف

اب ذرا غور کیجیے کہ ان تین باتوں کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ ریاضی میں نسبت و تناسب کے قاعدے سے تین معلوم اَقدار کی مدد سے چوتھی قدر کا تعین کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی ہمیں چوتھی قدر کا تعین کرنا ہے اور وہ یہ ہو گی کہ انسان کو جو قوتِ گویائی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے' اس کا بہترین مَصرف اگر کوئی ہے تو وہ قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا اور اس کا سیکھنا سکھانا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو قوتِ بیانیہ دی ہے' یہ انسان کے اوصاف میں سے اعلیٰ ترین وصف ہے' اور اس کا بہترین مصرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے ذریعے اللہ کے کلام کو بیان کیا جائے' اللہ کے پیغامِ ہدایت کو عام کیا جائے' اللہ کے اس کلام کی تبلیغ و اشاعت کی جائے۔

سورۃ الرحمٰن کی تین آیات میں سے میں نے یہ جو نتیجہ نکالا ہے یہ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث سے ثابت ہے' جس کے راوی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس سے ہمیں قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ ہمارے ہاں کچھ ایسے محروم لوگ ہیں جو اپنے آپ کو حدیث سے مستغنی سمجھ بیٹھے ہیں اور اس طرح شدید گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے لیے بس قرآن کافی ہے اور نبی کریم ﷺ کے فرمودات کو سمجھنے اور ان سے استفادہ کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر صرف کتاب کافی ہوتی تو نبیوں اور رسولوں کی بعثت کی ضرورت نہیں تھی۔ کتاب کے ساتھ ایک معلّم ضروری ہوتا ہے۔ آپ اعلیٰ سے اعلیٰ کتابیں چھاپ لیجیے' لیکن آپ کا کیا خیال ہے کہ دُنیا کے اندر کوئی نظامِ تعلیم بغیر معلّمین کے بنایا جا سکتا ہے؟ اکبر الٰہ آبادی کا بڑا پیارا شعر ہے کہ ؎

کورس تو لفظ ہی پڑھاتے ہیں   آدمی' آدمی بناتے ہیں!

کورس پڑھنے سے تو انسان انسان نہیں بنتا۔ انسان تو انسان کے بنانے سے بنتا ہے۔ تعلیم کے لیے معلّم کی ضرورت ناگزیر ہے۔ تو یہ جان لیجیے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ معلّم بن کر آئے۔ حضور ﷺ نے خود فرمایا: ((وَاِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا))(۱) ''اور میں تو معلّم ہی بنا کر

---

(۱) سنن ابن ماجه' المقدمة' باب فضل العلماء والحث على طلب العلم۔ وسنن الدارمی' المقدمة' باب فی فضل العلم والعالم۔

بھیجا گیا ہوں''۔قرآن مجید میں حضور ﷺ کے طریقِ کار کے ضمن میں (قدرے تقدیم و تاخیر کے ساتھ) چار جگہ یہ الفاظ ملتے ہیں:

﴿يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾

(البقرۃ:۱۲۹و۱۵۱' آل عمران:۱٦٤' الجمعۃ:۲)

''وہ انہیں اللہ کی آیات تلاوت کر کے سناتا ہے' اور ان کا تزکیہ کرتا ہے' اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

تو اللہ کی کتاب' اللہ کے کلام کے معلّم ہیں محمد رسول اللہ ﷺ۔

لسانِ نبوّت میں ''بہترین'' کون؟

ان چار آیات کی جو میں نے اس قدر تفصیل بیان کی ہے' اور ایک ایک لفظ پر اتنا وقت صَرف کرنے کے بعد آپ کو جس نتیجہ پر پہنچایا ہے' جس کے لیے میں نے نسبت و تناسب کے قاعدے کا حوالہ بھی دیا ہے' وہ نتیجہ محمد رسول اللہ ﷺ نے ایک سادہ سے جملہ میں بیان فرما دیا ہے۔ اس حدیث کے راوی حضرت عثمان غنی ذوالنورین رضی اللہ عنہ ہیں۔ چونکہ میں اسے ان آیات کے ساتھ جوڑ رہا ہوں جن میں چوٹی کے مضامین بیان ہوئے ہیں تو یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ سند کے اعتبار سے یہ حدیث بھی چوٹی کا مقام رکھتی ہے۔ یہ حدیث امام بخاری' امام ترمذی' امام ابوداؤد' امام ابن ماجہ' امام احمد بن حنبل اور امام دارمی وغیرہم (رحمہم اللہ) نے روایت کی ہے۔ صحیح بخاری کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ کتب حدیث میں یہ چوٹی کی حیثیت کی حامل ہے۔ اس کے بارے میں ''اَصَحُّ الْکُتُبِ بَعْدَ کِتَابِ اللّٰہِ'' ہونے پر علمائے کرام کا اتفاق ہے۔ یعنی قرآن حکیم کے بعد یہ دنیا کی صحیح ترین کتاب ہے۔ صحیح بخاری کے علاوہ یہ حدیث دیگر کتب حدیث میں بھی موجود ہے۔ وہ حدیث یہ ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ))(۱)

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب فضائل القرآن' باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ۔ وسنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن' باب ما جاء فی تعلیم القرآن۔ وسنن ابی داؤد' کتاب الصلاۃ' باب فی ثواب قراءۃ القرآن۔ صحیح بخاری' سنن ترمذی' سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں: ((اِنَّ اَفْضَلَكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ)) (حاشیہ از مرتب)

''تم میں سے بہترین وہ ہے جس نے قرآن سیکھا اور اسے (دوسروں کو) سکھایا۔''

یعنی اہلِ ایمان میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں' قرآن پڑھیں اور پڑھائیں۔ اور دیکھئے یہاں ''خَيْرُكُمْ'' کن سے کہا جا رہا ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے! ظاہر بات ہے کہ صحابہ کرامؓ میں بھی فرقِ مراتب ہے' ان میں درجات ہیں: ع ''گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی!'' ہم اہلِ سنّت کا متفق علیہ عقیدہ ہے کہ ''اَفْضَلُ الْبَشَرِ بَعْدَ الْاَنْبِيَاءِ بِالتَّحْقِيْقِ' اَبُوْبَكْرِ الصِّدِّيْقُ رضی اللہ عنہ'' یعنی یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ انبیاء کے بعد افضل البشر ہیں۔ آپؓ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقام ہے' پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ خلفائے اربعہ کے بعد پھر عشرۂ مبشرہ ہیں رضی اللہ عنہم۔ تو ظاہر ہے کہ ع ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است''۔ مزاج میں بہرحال کچھ نہ کچھ فرق ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طبیعت جمالی ہے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جلالی ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اندر رحمت و شفقت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دین کے معاملات میں بہت شدید ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں سچائی اور حیا کا مادہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مقدمات کے فیصلے کرنے میں بہت زِیرک ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَرْحَمُ اُمَّتِیْ بِاُمَّتِیْ اَبُوْبَكْرٍ' وَاَشَدُّهُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰهِ عُمَرُ' وَاَشَدُّهُمْ حَيَاءً عُثْمَانُ' وَاَقْضَاهُمْ عَلِیٌّ ...... الخ)) (۱)

تو ظاہر بات ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی نسبتیں ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرماتے ہیں:

((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ))

''تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور اسے (دوسروں کو) سکھائے۔''

صحابہ کرامؓ کی درخشاں مثالیں

اس حوالے سے میں خاص طور پر نوجوانوں کے لیے عرض کروں گا کہ ان کے دلوں میں قرآن کو سیکھنے سکھانے کی آرزو اور امنگ پیدا ہونی چاہیے۔ جوانی کا دَور آرزوؤں اور امنگوں کا دور ہوتا ہے' لیکن عام طور پر ہم جن آرزوؤں کے پیچھے دوڑتے ہیں ان کا تعلق

(۱) سنن الترمذی' کتاب المناقب' عن انس بن مالك رضی اللہ عنہ۔

اسی دُنیوی زندگی سے ہوتا ہے۔ عمدہ کیریئر' اچھا مکان اور دنیوی آسائشوں کے حصول کی آرزوئیں تو ہر ایک کے دل میں پیدا ہوتی ہیں ۔ لیکن آپ کے دل میں وہ آرزو پیدا ہونی چاہیے جس کے بارے میں علامہ اقبال فرماتے ہیں ۔

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
اور ہو جائے تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!

وہ کون سی آرزو ہے؟ وہ ان چیزوں کی آرزو ہے کہ جن سے اس مادہ پرستی کے دور میں ہماری نگاہیں بالکل ہٹ گئی ہیں۔ کاش کہ یہ آرزو پیدا ہو جائے کہ ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقشِ قدم پر چل سکیں۔ کاش نوجوانوں کے دلوں میں وہ آرزو پیدا ہو کہ اللہ ہمیں جناب ارقم رضی اللہ عنہ یا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے دے۔ یہ دو نام میں نے آپ کو اس لیے سنائے ہیں کہ یہ دونوں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سیکھتے تھے اور پھر جا کر دوسروں کو سکھاتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مکہ میں حالات بڑے دگرگوں اور نامساعد تھے۔ کفر و شرک کا غلبہ تھا۔ کوئی مسجد تو ایسی نہ تھی جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تعلیم دیں۔ ایسا تو ممکن ہی نہ تھا۔ ایک حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کا گھر تھا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کو تعلیم دیتے' اور ظاہر بات ہے کہ سب لوگ وہاں جمع نہیں ہو سکتے تھے۔ لوگوں کی اپنی مصروفیات بھی ہوتیں۔ پھر یہ کہ اگر محسوس ہو جاتا کہ یہاں مرکز بن گیا ہے تو مخالفت شدید ہو جاتی۔ ان حالات میں تعلیم کا طریق کار یہ تھا کہ کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کر دیا تھا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہتے تھے۔ جیسے ہی وحی نازل ہوتی' وہ اسے سیکھ لیتے اور پھر اہلِ ایمان کے گھروں پر جا کر اس وحی کو پہنچاتے تھے۔ اس طریقے سے قرآن کے علم کی تبلیغ جاری تھی۔

انہی نوجوانوں میں سے ایک صحابی حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ وہ صحابی ہیں کہ جن کو دہکتے ہوئے انگاروں پر ننگی پیٹھ لٹایا گیا اور ان کی کمر کی چربی پگھلنے سے وہ انگارے ٹھنڈے ہوئے۔ ایمان لانے کے بعد انہیں ایسی ایسی سختیاں جھیلنی پڑیں' لیکن وہ اس سب کے باوجود اس کام میں ثابت قدمی سے لگے رہے کہ اللہ کا جو کلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا' وہ آپؐ سے سیکھتے اور لوگوں تک پہنچاتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان

لانے کا جو واقعہ آتا ہے اس میں بھی حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کا کردار بہت اہم ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادے سے ننگی تلوار لے کر بڑی جلالی کیفیت میں نکلے تھے۔ راستے میں انہیں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ مل گئے جو اگرچہ ایمان لا چکے تھے‘ لیکن انہوں نے اپنا ایمان ابھی چھپایا ہوا تھا۔ انہوں نے پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟ کہا: میں آج محمدؐ کو قتل کر کے چھوڑوں گا‘ اب یہ قصہ چکا دینا ہے (**نعوذُ باللّٰهِ مِنْ ذٰلك**)۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بڑی حکمت سے رُخ موڑ دیا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرنے جا رہے ہو‘ پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو‘ تمہاری ہمشیرہ اور تمہارے بہنوئی دونوں ایمان لا چکے ہیں! اب آپ تصور نہیں کر سکتے کہ اُس وقت عمرؓ کے غیظ وغضب کا کیا عالم ہوگا۔ وہ غصے میں آگ بگولہ اپنی ہمشیرہ حضرت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا کے گھر پہنچے تو وہاں حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ ‘ آپ کی ہمشیرہ اور آپ کے بہنوئی حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہما کو سورۃ طٰہٰ کی آیات سکھا رہے تھے۔ کاش ہمارے دل میں بھی یہی جذبہ پیدا ہو جائے۔

دوسرا نام میں نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا لیا ہے۔ ان کا ذکر شاید ہمارے دلوں کے اندر کوئی آرزو پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ یہ بڑے لاڈ اور پیار سے پلے تھے۔ ان کے لیے دو دو سو درہم کا جوڑا شام سے تیار ہو کر آتا تھا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ جوانی کے عالم میں پنڈت جواہر لال نہرو کے کپڑے پیرس سے سل کر آیا کرتے تھے۔ ہندوستان میں پہلی کار جو غیر سرکاری طور پر آئی تھی وہ ان کے والد پنڈت موتی لال نہرو کی تھی۔ اپنی پوتی اندرا گاندھی کی پیدائش پر پنڈت موتی لال نہرو نے پورے الٰہ آباد کے لوگوں کی دعوت کی تھی۔ تو جس طرح یہ بات مشہور تھی کہ جواہر لال نہرو کے کپڑے پیرس سے سل کر آتے ہیں اور پیرس سے دُھل کر آتے ہیں‘ اس طرح کا معاملہ تھا حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا۔ ان کے جوڑے شام سے تیار ہو کر آتے تھے اور لباس اس قدر معطر ہوتا تھا کہ جس راستے سے مصعبؓ گزر جاتے‘ پورا راستہ معطر ہو جاتا۔ لیکن وہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تو ان کے گھر والوں نے ان کے بدن سے سارے کپڑے تک اُتروا لیے اور انہیں بالکل برہنہ کر کے گھر سے نکال دیا کہ اگر تم نے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا ہے تو باپ کی کمائی میں سے جو کپڑے ہیں‘ ان پر بھی تمہارا حق نہیں ہے۔ اس کے

بعد دو دو سو درہم کا جوڑا پہننے والے اس نوجوان پر وہ وقت بھی آیا کہ پھٹا ہوا ایک کمبل جسم پر ہے اور اس میں پیوند لگے ہوئے ہیں۔ ایمان لانے کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو تعلیم و تعلّمِ قرآن کے لیے وقف کر دیا۔

انسان کا رُخ جب بدلتا ہے تو اس کی آرزوئیں اور امنگیں بھی بدل جاتی ہیں۔ پہلے وہ اُس معاملہ میں آگے تھے' اب اِس معاملہ میں آگے ہیں۔ اسی کام میں اپنی صلاحیتیں لگا رہے ہیں۔ بیعتِ عقبہ اولیٰ کے موقع پر ایمان لانے والے مدینہ کے بارہ افراد نے آنحضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمیں اپنے کوئی ایسے ساتھی دے دیجیے جو ہمیں قرآن پڑھائیں۔ اُس وقت نبی اکرم ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو مامور کیا کہ تم مدینہ جا کر وہاں کے لوگوں کو قرآن پڑھاؤ۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے وہاں سال بھر قرآن کی تعلیم و تدریس کا کام کیا اور اس عظیم کام کی مناسبت سے وہاں آپ کا نام ہی ''مقری'' (پڑھانے والا) پڑ گیا۔ لوگ آپ کو دیکھتے تو پکار اُٹھتے: ''جَاءَ الْمُقْرِی'' (وہ پڑھانے والے آ گئے)۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی سال بھر کی محنت و کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے سال مدینہ سے ۷۵ اشخاص آئے اور انہوں نے محمد ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ گویا مصعبؓ کی ایک سال کی کمائی تھی۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا ذکر آیا ہے تو میں ان کے بارے میں کچھ مزید عرض کر دوں۔ رسول اللہ ﷺ جب مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے آئے تو ایک روز آپؐ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے کہ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ دروازے کے سامنے سے گزرے۔ اس وقت ان کے جسم پر ایک پھٹا ہوا کمبل تھا جس میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر نبی اکرم ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ یہ مصعبؓ اللہ کے دین کے لیے کہاں سے کہاں پہنچا! غزوۂ احد میں جب یہ شہید ہوئے تو اس وقت ان کے جسم پر بس ایک چادر تھی اور آپ کو معلوم ہے کہ شہید کا کفن وہی لباس ہوتا ہے جس میں اسے شہادت ملے۔ اب تدفین کے وقت یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ مصعبؓ کے جسم پر جو چادر تھی' وہ اتنی چھوٹی تھی کہ اگر اس سے اُن کا سر ڈھانپتے تھے تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں ڈھانپتے تھے تو سر کھل جاتا۔ یہ مسئلہ حضور ﷺ کے سامنے رکھا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ ان کا سر چادر سے

ڈھانپ دو اور ان کے پاؤں پر گھاس ڈال دو۔ یہ ہے آخری لباس جو مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو میسر آیا۔ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی شکل وصورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی مشابہت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ غزوۂ اُحد میں جب آپؓ نے جامِ شہادت نوش کیا تو مشہور ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے۔غزوۂ اُحد میں یہ اسلامی فوج کے عَلم بردار تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس طرح کے واقعات قلب پر گہرا تاثر چھوڑتے ہیں۔ جو بھی مسلمان ہے اگر اس کے سامنے حضرت خباب رضی اللہ عنہ یا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی تصویر سامنے آئے تو کیسے ممکن ہے کہ دل پر اثر نہ ہو! لیکن جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ یہاں ان صاحبِ عزیمت ہستیوں کا ذکر کس حوالے سے ہو رہا ہے! کاش! اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں بھی یہ آرزو پیدا فرما دے کہ جس طرح انہوں نے اپنے آپ کو اس کے لیے وقف کر دیا کہ وہ کلامِ الٰہی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اس کو عام کریں' اس کو پھیلائیں' اسے دوسروں تک پہنچائیں' اسی طرح اسی کے لیے زندگیاں وقف کرنے کی کوئی اُمنگ' کوئی آرزو ہمارے دلوں میں بھی پیدا ہو جائے۔

سورۂ عبس کی چار آیات

سورۂ عبس کی چار آیات' جن کی آغاز میں تلاوت کی گئی' وہ بھی اسی مضمون کی شرح پر مشتمل ہیں۔ارشاد ہوتا ہے:

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ۙ﴿۱۴﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۙ﴿۱۵﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾

ذرا غور کیجیے کہ ان الفاظ میں کس قدر شکوہ ہے۔ کاش کہ قرآن کریم سے ہماری یہ مناسبت بھی پیدا ہو جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کا جو صوتی آہنگ ہے اور اس میں جو ایک ملکوتی غنا اور موسیقی مضمر ہے' اس کی کوئی دوسری نظیر ممکن نہیں۔ ایک موسیقی وہ ہے جس کے ہم عادی ہو گئے ہیں اور ایک یہ ملکوتی موسیقی ہے جو اس قرآن مجید کے صوتی آہنگ میں ہے۔ آپ کو بہت سے ایسے لوگ ملے ہوں گے جنہیں موسیقی سے ہی کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ کوئی اچھے سے اچھا راگ بھی ہو تو انہیں پتا نہیں چلتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اسی طرح ہمارا حال یہ ہے کہ ہم قرآن حکیم کی ملکوتی موسیقی سے بے بہرہ ہیں۔ اس کائنات میں بہترین موسیقی یہ اللہ کا کلام ہے' لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے لیے اس میں کوئی کشش اور دلچسپی نہیں۔

اس پہلو سے قرآن کے ساتھ ہماری ذہنی وقلبی مناسبت پیدا ہونی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے بڑی تاکید کے ساتھ فرمایا ہے کہ:

((زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِاَصْوَاتِكُمْ)) (۱)

''اس قرآن کو اپنی آوازوں سے مزین کیا کرو!''

نبی اکرم ﷺ کے صحابہؓ میں سے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے بہت اچھی آواز عطا کی تھی اور ان کی قراءت کو خود نبی اکرم ﷺ بڑے شوق سے سنتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ رات کے وقت ان کے گھر کے پاس گزرے' اس وقت حضرت ابوموسیٰؓ اپنی خاص کیفیت کے ساتھ قرآن پڑھ رہے تھے۔ حضور ﷺ بڑی دیر تک وہاں کھڑے ہو کر قرآن سنتے رہے اور فجر میں ان سے فرمایا: ((يَا اَبَا مُوْسٰى! لَقَدْ اُوْتِيْتَ مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِيْرِ آلِ دَاوُدَ))(۲) ''اے ابوموسیٰ! تمہیں تو اللہ تعالیٰ نے آلِ داؤد کے سازوں میں سے ایک ساز عطا کیا ہے!'' حضرت داؤد علیہ السلام جب صبح کے وقت زبور کے حمد کے ترانے پڑھا کرتے تھے تو قرآن میں گواہی موجود ہے کہ پرندے بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتے اور پہاڑ بھی وجد میں آ جاتے تھے۔ قرآن حکیم کے الفاظ میں جو پُرشکوہ صوتی آہنگ اور ملکوتی غنا ہے وہ ان چار آیات میں نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید کی عظمت خود قرآن میں جا بجا بیان ہوئی ہے' لیکن آج کی اس نشست میں ہم نے اس کے لیے سورۂ رحمٰن اور سورۂ عبس کی چار چار آیات کا انتخاب کیا ہے۔ سورۂ عبس کی ان آیات میں قرآن مجید کے بارے میں فرمایا گیا:

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾

''یہ کتاب بڑے باعزت صحیفوں میں ہے۔''

یہ لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہے۔ یہاں دنیا میں تو اس کا ایک عکس ہے جو آپ دیکھ رہے

---

(۱) سنن النسائی' کتاب الافتتاح' باب تزیین القرآن بالصوت۔ وسنن ابی داوٗد' کتاب الصلاۃ' باب استحباب الترتیل فی القراءۃ۔ وسنن ابن ماجہ' کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا' باب فی حسن الصوت بالقرآن۔ عن البراء بن عازب رضی اللہ عنہ۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب فضائل القرآن' باب حسن الصوت بالقراءۃ للقرآن۔ وصحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب استحباب تحسین الصوت بالقرآن۔

ہیں۔اصل کتاب تو لکھی ہوئی ہے لوحِ محفوظ میں' بالفاظِ قرآنی:

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿٢١﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿٢٢﴾﴾ (البروج)

ایک دوسری جگہ فرمایا:

﴿فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿٧٨﴾ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿٧٩﴾﴾ (الواقعہ)

کہ یہ کتاب تو ''مکنون'' ہے' جیسے کسی بہت ہی قیمتی ہیرے کو ڈبیہ میں بند کر کے ڈبیہ کو کسی بکس میں رکھا جاتا ہے۔ساتھ ہی فرمایا کہ اسے صرف وہی چھوتے ہیں جو انتہائی پاک و طیب ہیں' یعنی فرشتے۔اس وقت ان سب آیات کی تشریح ممکن نہیں ہے۔میں صرف سورۂ عبس کی آیات کا ترجمہ کر رہا ہوں۔ان باعزت صحیفوں کے بارے میں فرمایا:

مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ﴿١٤﴾

''بہت ہی رفیع الشان اور بہت ہی پاک کیے ہوئے (صحیفے ہیں)۔''

اور کن کے ہاتھوں میں ہیں؟

بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿١٥﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿١٦﴾

''ان لکھنے والوں کے ہاتھوں میں' جو بڑے بلند مرتبہ اور نیکوکار ہیں۔''

اب ان آیات سے متعلق ایک حدیث سن لیجیے۔سورۃ الرحمٰن کی چار آیات کا خلاصہ بھی میں نے آپ کو حدیث شریف سے سنایا ہے اور ان چار آیات کا خلاصہ بھی حدیث میں ہے۔اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس کی راویہ ہیں۔فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ)) (١)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص قرآن کا ماہر ہو جائے' اس کو صحیح طور پر پڑھتا ہو' اس کو سمجھتا ہو' اس کا رتبہ بھی ان فرشتوں کا سا ہے جن کے لیے سورۂ عبس میں ''سَفَرَةٍ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ'' کے الفاظ آئے ہیں۔یعنی لوحِ محفوظ میں قرآن کو لکھنے والے بلند مرتبہ نیکوکار فرشتوں کا جو مقام و مرتبہ ہے' وہی رتبہ ہے ان لوگوں کا جو قرآن کے پڑھنے پڑھانے والے ہیں' سمجھنے سمجھانے والے ہیں' قرآن کی مہارت رکھتے ہیں' پڑھتے ہیں تو صحیح پڑھتے ہیں' اس کے

(١) صحیح البخاری' کتاب تفسیر القرآن' باب عبس وتولی ...... وصحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرها' باب فضل الماهر فی القرآن والذی یتتعتع بہ۔ واللفظ للمسلم۔

مفہوم کو سمجھتے ہیں' اور اسی کے تعلیم و تعلّم میں شب و روز لگے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کے عروج و زوال کی حقیقت

اب میں اپنے موضوع کے دوسرے حصے کی طرف آتا ہوں جس کا تعلق ہمارے موجودہ حالات سے ہے۔ اس ضمن میں ایک حدیث' جس کے الفاظ اگرچہ بہت مختصر ہیں' لیکن یہ ایک بڑی عظیم حقیقت کو بیان کر رہی ہے' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یہ حدیث صحیح مسلم میں وارد ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ آخَرِیْنَ)) (۱)

یعنی اللہ تعالیٰ اسی کتاب کی بدولت قوموں کو اُٹھائے گا' ترقی دے گا' عروج بخشے گا' انہیں اس دنیا میں بلندی سے سرفراز فرمائے گا' اور اسی کتاب کو چھوڑنے کے باعث قوموں کو ذلیل و خوار کرے گا۔ یہ حدیث بڑی اہم ہے۔ میں نے جب اس حدیث پر غور کیا تو یہ بات سامنے آئی کہ اس حقیقت کا تعلق بالخصوص مسلمانوں سے ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کے بموجب مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا مستقل ضابطہ یہ ہے کہ ان میں سے جو قوم بھی قرآن کو لے کر اُٹھے گی اسے اللہ تعالیٰ دنیا میں عروج و سربلندی اور غلبہ عطا فرمائے گا' اور مسلمانوں میں سے جو قوم قرآن کو ترک کر دے گی' قرآن کو چھوڑ دے گی' قرآن کی طرف پیٹھ کر لے گی' اس کو اللہ تعالیٰ ذلیل و رسوا کر دے گا۔ ہمارے موجودہ حالات میں یہ بات ہمارے لیے بڑی قابلِ توجہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رواں صدی یعنی بیسویں صدی عیسوی' یہ دنیا میں ہماری ذلّت و رسوائی کی آخری حد ہے۔ ویسے تو چند سال قبل مجھے یہ گمان ہوا تھا کہ شاید ہماری ذلّت و رسوائی کا دور اب ختم ہو رہا ہے اور شاید اب ہم دنیا میں عروج کی طرف گامزن ہو رہے ہیں۔ وہ جو مولانا حالی نے کہا تھا ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے!

تو یہ قانونِ فطرت ہے کہ جزر کے بعد مد آتا ہے اور مد کے بعد جزر۔ تو ایک خیال یہ آیا تھا کہ شاید ہمارے زوال کا دور اب ختم ہو گیا ہے اور ہمارے عروج کا دور شروع ہو رہا ہے۔

(۱) صحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب فضل من یقوم بالقرآن ویعلمہ...... وسنن ابن ماجہ' المقدمۃ' باب فضل من تعلم القرآن وعلمہ۔ ومسند احمد' ح:۲۲۶۔

یہ دن وہ تھے جب ہمارے یہاں اسلامی سربراہی کانفرنس ہوئی تھی ۔ملّتِ اسلامیہ میں بہت جوش اور ولولہ نظر آ رہا تھا۔ اس زمانے میں شاہ فیصل موجود تھے‘ جو مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز بن گئے تھے ۔عرب حکمرانوں کے اندر بھی اتحاد نظر آ رہا تھا اور عربوں نے علامہ اقبال کے الفاظ میں ؎ ''لڑا دے ممولے کو شہباز سے!'' کے مصداق تیل کا ہتھیار استعمال کر کے امریکہ جیسی طاقت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پھر یہ کہ ترکوں اور عربوں کے درمیان جو دشمنی تھی‘ وہ بھی کچھ کم ہو رہی تھی ۔ چنانچہ بہت سے اعتبارات سے محسوس ہوتا تھا کہ اب شاید اُمتِ مُسلمہ کے دن پھرنے والے ہیں‘ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ غالباً ابھی ہمارے اوپر اللہ کے عذاب کے مزید کوڑے برسنے والے ہیں ۔اب تک ہماری پیٹھ پر عذابِ الٰہی کے کئی کوڑے برس چکے ہیں‘ لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے ان سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ ۱۹۱۹ء کا بالشویک انقلاب کوئی معمولی المیہ نہ تھا‘ جس کے نتیجہ میں روسی ترکستان کا وسیع وعریض علاقہ‘ تاجکستان‘ ازبکستان اور سمرقند و بخارا جیسے ہماری تہذیب وتمدّن کے ایسے بڑے گہوارے سرخ امپریلزم کے شکنجے میں آ گئے اور وہاں کے مسلمانوں کی اس طرح برین واشنگ کی گئی کہ انہیں اپنا مسلمان ہونا بھی یاد نہیں رہا۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے کبھی اپنے عروج وزوال کے ادوار کی طرف نظر تک نہیں کی ۔ہم تو اپنے ماضی سے بالکل منقطع ہو کر رہ گئے ہیں ۔انگریز کے مسلّط کردہ نظامِ تعلیم نے ہمیں اپنے ماضی سے بالکل کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ عربی اور فارسی سے تعلق منقطع ہوا تو اپنے ماضی سے تعلق منقطع ہو گیا ہے۔ کس کو یہ معلوم ہے کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب بنوامیّہ کی فوجیں پورے سپین کو اپنے قدموں تلے روندتی ہوئی عین فرانس کے قلب میں پہنچ گئی تھیں‘ اور ایک وقت وہ بھی آیا تھا کہ ترک افواج پورا مشرقی یورپ فتح کرنے کے بعد اٹلی کے دروازوں پر پہنچی ہوئی تھیں ۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تونے!
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا!

لیکن آج ہم ذلّت و رسوائی کی چکّی میں پِس رہے ہیں۔ ہر طرف سے ہمیں خطرات و خدشات نے گھیرا ہوا ہے۔ سب سے بڑا خطرہ ہمیں اپنے ہندو ہمسائے سے ہے جو

قیامِ پاکستان کے وقت سے ہماری دشمنی پر کمر بستہ ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ پر اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکا دیا ہے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سے بھی ان کے سینے میں انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ ان کے سینے کا اصل ناسور تو سندھ ہے' جسے ''بابُ الاسلام'' بننے کا شرف حاصل ہوا۔ یہیں پر ہندو کو مسلمان کے ہاتھوں سب سے پہلی شکست اُٹھانا پڑی۔ راجہ داہر یہاں پر بہت بڑے علاقے پر حکمران تھا جسے انتہائی ذلت آمیز شکست ہوئی تھی اور سندھ صرف دارالاسلام ہی نہیں' اس پورے برِّعظیم کے لیے باب الاسلام بنا تھا۔ بے چارے مشرقی پاکستان میں تو بہت دیر بعد کہیں اسلام پہنچا تھا۔ چنانچہ سندھ سے بدلہ لینے کی امنگیں تو ان کے دل میں اب بھی موجزن ہیں۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحے پر اندرا گاندھی نے اپنی قوم کو چند ماہ کے اندر ایک اور خوشخبری سنانے کا اعلان بھی کیا تھا اور آپ کو یاد ہوگا کہ اسی زمانے میں یہاں سندھ میں لسانی فسادات کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ ان کی طرف سے تو نقشہ تیار تھا' یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے بچالیا۔

اس وقت پورے عالمِ اسلام کے جو حالات ہیں' ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ذلت ورسوائی کے یہ سائے ابھی اور گہرے ہوتے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے کوڑے جو ہماری پیٹھ پر برسے ہیں' وہ ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار نہیں کر سکے۔ جو کچھ مشرقی پاکستان میں ہوا' جیسی کچھ عربوں کو یہودیوں کے ہاتھوں شکست و ہزیمت ہوئی اور مسجدِ اقصیٰ ہمارے ہاتھ سے نکلی —— اس کا تو آج ہمارے بہت سے لوگوں کے ذہن میں خیال بھی نہیں رہا ہوگا۔ جب شروع شروع میں یہ واقعہ ہوا تھا تو بڑی بے چینی تھی' بڑے جلسے جلوس تھے' قراردادیں پاس کی جاتی تھیں' عالمی رائے عامہ بیدار کرنے کی کوششیں ہوتی تھیں' لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ ہم قبلۂ اوّل پر یہودیوں کا قبضہ ذہنی طور پر تسلیم کر چکے ہیں۔ مستقبل کے بارے میں واضح طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اب کیا صورت ہے جو سامنے آنے والی ہے۔ اگر حالات پر غور کیا جائے تو بڑا ہی تاریک اور بہت ہی مایوس کن نقشہ سامنے آتا ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟

اس ضمن میں سب سے پہلی بات تو یہ سمجھنے کی ہے کہ ہماری اس ذلت و رسوائی اور

پستی وزوال کا سبب کیا ہے؟ ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں!

اس کا کوئی جواب ملنا چاہیے۔ اس کا جواب محمد رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان میں موجود ہے جو میں نے ابھی آپ کے سامنے پیش کیا: ((اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ آخَرِیْنَ))۔ ہمیں سزا مل رہی ہے تو اسی بات کی کہ ہم نے اس قرآن کریم سے دُوری اختیار کر لی۔ حضور ﷺ کے فرمان کے بعد کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لیے سب سے بڑی سند اللہ کا کلام اور محمد رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے' لیکن مزید وضاحت کے لیے اس صدی کی دو عظیم ترین شخصیتوں کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں اہلِ علم کے دو حلقے ہیں۔ ایک حلقہ علماء کا ہے جن کی پوری زندگیاں دار العلوموں میں ''قال اللہ وقال الرّسول'' کے سیکھنے سکھانے میں گزرتی ہیں۔ دوسرے ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلنے والے لوگ ہیں۔ برعظیم پاک و ہند میں دار العلوموں کا سلسلہ دیوبند سے اور کالجوں یونیورسٹیوں کا سلسلہ علی گڑھ سے شروع ہوا ہے۔

حکیمُ الاُمّت کی نبض شناسی

اب آپ ذہن میں رکھیے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلنے والے لوگوں میں سے چوٹی کی شخصیت علّامہ اقبال کی ہے۔ ذہنی وفکری اعتبار سے پورے عالمِ اسلام میں ان کی ٹکر کا آدمی اس صدی میں پیدا نہیں ہوا۔ intellectual level پر وہ بالکل مسلّمہ طور پر بلند ترین شخصیت ہیں جو اس صدی میں پیدا ہوئی۔ اور دینی حلقوں سے' دار العلوموں سے تعلیم یافتہ' قال اللہ وقال الرسول کی فضاؤں میں پلنے بڑھنے والوں میں اس صدی کی عظیم ترین شخصیت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ آپؒ دار العلوم دیوبند کے پہلے طالب علم ہیں اور پھر ایسے ایسے بڑے شاگردوں کے استاد ہیں کہ جن کا نام سن کر انسان کی گردن خود بخود جھک جاتی ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی' مولانا شبیر احمد عثمانی' مولانا اشرف علی تھانوی' مولانا انور شاہ کاشمیری رحمہم اللہ اور یہ سب کے سب شاگرد ہیں مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے۔ لفظ دیوبندی سے ہوسکتا ہے کہ بعض حضرات کو

تھوڑا سا مغالطہ ہو جائے۔ تو میں یہ وضاحت بھی کر دوں کہ مولانا مرحوم اُس وقت جمعیت علمائے ہند کے صدر تھے جبکہ پورے ہندوستان میں ایک ہی جمعیۃ العلماء تھی۔ اُس وقت آج کی طرح دیوبندیوں' بریلویوں اور اہلِ حدیث کی علیحدہ علیحدہ جمعیتیں نہ تھیں۔ جمعیۃ علمائے ہند پورے ہندوستان کے علماء کا متفقہ پلیٹ فارم تھی۔ بریلوی' دیوبندی اور اہلِ حدیث علماء سب اسی میں شامل تھے۔ بالفاظ دیگر دہلی' بدایوں اور اجمیر کے علماء اسی جمعیت میں تھے اور اُس وقت شیخ الہندؒ اس جمعیۃ علمائے ہند کے صدر تھے۔ پھر سیاسی اعتبار سے ان کے قد کاٹھ کا تصور اس سے کیجیے کہ انہوں نے ریشمی رومال کی تحریک چلائی تھی۔ شاید آپ میں سے بہت سوں نے اس تحریک کا نام بھی نہ سنا ہو۔ اُس وقت انگریز کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے جو ایک زبردست ٹیم بنی تھی' اس کے بنانے والے یہی شیخ الہندؒ تھے۔ چنانچہ انگریزوں نے انہیں گرفتار کر لیا۔ آپ اس وقت حجازِ مقدس میں تھے اور شریف حسین جو والیٔ مکّہ تھا' اس نے غداری کر کے آپ کو گرفتار کروا دیا۔ مکہ سے گرفتار کرنے کے بعد انہیں ہندوستان نہیں لایا گیا' بلکہ بحیرۂ روم کے جزیرہ مالٹا میں رکھا گیا۔ گویا ؎

اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو!

اور انہیں اس وقت رہا کیا گیا جب ٹی بی تیسری سٹیج کو پہنچ چکی تھی۔ انگریز کو اندیشہ یہ تھا کہ اگر ہماری قید میں ان کی موت واقع ہو گئی تو طوفان کھڑا ہو جائے گا' لہٰذا رہا کر دیا گیا۔ رہا ہو کر جب ہندوستان پہنچے اور بمبئی کے ساحل پر قدم رکھا تو پہلے دن جو لوگ ملنے کے لیے حاضر ہوئے ان میں مہاتما گاندھی بھی تھا۔ وہ آپ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا تھا۔ اس سے آپ اندازہ کیجیے شیخ الہندؒ کی شخصیت کا۔

شیخ الہندؒ اور علامہ اقبال کا ذکر میں یہاں اس لیے کر رہا ہوں کہ یہ دونوں شخصیتیں اس بات پر متفق ہیں کہ ہمیں جو سزا مل رہی ہے' وہ قرآن کو ترک کرنے کی وجہ سے ہے۔ میں نبی مکرم ﷺ کی حدیث آپ کو سنا چکا ہوں اور ہمارے لیے مستند ترین بات حضور ﷺ کا فرمان ہی ہے' لیکن مزید وضاحت کے لیے اپنے ان بزرگوں کی بات بھی سن لیجیے۔ علامہ اقبال نے جوابِ شکوہ میں فرمایا کہ ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

یہی بات انہوں نے فارسی میں بڑے پُرشکوہ انداز میں کہی ہے ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شُدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شُدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

کہ اے اُمّتِ مُسلمہ تو جو ذلیل ورُسوا ہوئی ہے اور دنیا میں اس طرح پامال کی جارہی ہے' یہ قرآن کو ترک کرنے کی وجہ سے ہے۔ یہاں اقبال نے ''مہجوریٔ قرآن'' کی ترکیب سورۃ الفرقان سے لی ہے' جہاں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا۝۳۰﴾

''اور رسولؐ فریاد کریں گے کہ اے رب! میری قوم نے اس قرآن کو ترک کر دیا تھا۔''

تو یہ ہے علامہ اقبال کی نظر میں ہماری ذلت ونکبت اور پستی و رسوائی کا اصل سبب جو اس نے قرآن پر گہرے غور وخوض کے نتیجے میں اخذ کیا ہے۔

شیخ الہندؒ کا نتیجہ فکر

دوسری طرف شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مفتی محمد شفیع صاحبؒ کو جنہوں نے حضرت شیخ الہندؒ کا واقعہ اپنی کتاب ''وحدتِ اُمت'' میں نقل کر دیا' ورنہ اتنا بڑا اور اہم واقعہ ہمارے علم میں نہ آ سکتا۔ وہ اس واقعے کے عینی شاہد ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ جب مالٹا کی جیل سے رہائی پا کر ہندوستان تشریف لائے تو دارالعلوم دیوبند میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ اس جلسہ میں وہ سب بزرگ موجود تھے جن کے ابھی میں نے نام گنوائے ہیں۔ یعنی مولانا حسین احمد مدنی' مولانا اشرف علی تھانوی' مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا انور شاہ کاشمیری وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم۔ انہی کے ساتھ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے یہ واقعہ

بیان کیا کہ حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ ''ہم نے تو مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں''۔ یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے ۸۰ سال علماء کو درس دینے کے بعد آخری عمر میں جو سبق سیکھے ہیں' وہ کیا ہیں۔ فرمایا:

> ''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا' دوسرے ان کے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے...... اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے!''

(وحدتِ اُمت' ص ۳۹۔۴۰)

اس کے بعد مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے بڑی پیاری بات فرمائی ہے کہ حضرتؒ نے جو دو باتیں فرمائیں اصل میں وہ دو نہیں ایک ہی ہے۔ درحقیقت ہمارے اختلافات میں شدت اس وجہ سے ہوئی کہ ہم نے قرآن کو چھوڑ دیا۔ اس لیے کہ قرآن مرکز تھا' اور جب تک سب مرکز سے جڑے ہوتے تھے تو ایک دوسرے سے بھی جڑے ہوتے تھے۔ جب اس مرکز سے دور ہوتے چلے گئے تو ایک دوسرے سے بھی دور ہوتے چلے گئے۔ بالکل سادہ سی بات ہے۔ تو انہوں نے فرمایا: ''غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قرآن کو چھوڑنے ہی کا لازمی نتیجہ تھی۔ قرآن پر کسی درجے میں بھی عمل ہوتا تو خانہ جنگی یہاں تک نہ پہنچتی''۔ پس اس تباہی کا ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے قرآن کو ترک کر دینا۔

کرنے کا اصل کام

میں آپ کو وہ حدیث سنا چکا ہوں جس میں یہ قانونِ خداوندی بیان ہوا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو اُٹھائے گا تو اسی قرآن کی وجہ سے اُٹھائے گا اور جب گرائے گا تو اسی قرآن کو ترک کرنے کے باعث گرائے گا۔ آج ہم اسی قانونِ خداوندی کی زد میں ہیں۔ قرآن کے معاملے میں اپنا جو حال ہے وہ کسی کو نظر نہیں آ رہا ہے۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے مسلمانوں کے محلوں میں سے گزرتے ہوئے ہر گھر سے قرآن پڑھنے کی

آواز تو آتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگ ٹھیک سے سمجھتے نہیں تھے' لیکن تلاوت تو بہرحال ہوتی تھی۔ اب تو تلاوت بھی نہیں ہے۔ غور وفکر اور سوچ بچار کا تو سوال ہی نہیں۔ عربی کون سیکھے' کون پڑھے؟ عربی سے ہمارا کوئی دنیوی مفاد وابستہ ہو تو ہم سیکھیں۔ ہم انگریزی پڑھیں گے اور ایسی پڑھیں گے کہ انگریزوں کو پڑھا دیں' لیکن عربی سیکھنے کے لیے کوئی بھی وقت نکالنے کے لیے تیار نہیں۔ ہم نے کئی جگہ عربی کلاس کا اجراء کیا۔ شروع میں بڑا ذوق وشوق ہوتا ہے' پچاس ساٹھ افراد شریک بھی ہو جاتے ہیں' لیکن چند دنوں کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ سب چھٹی کر گئے۔ پابندی کے ساتھ وقت نکالنا آسان نہیں جب تک کہ دین کی لگن نہ ہو اور ایک فیصلہ نہ ہو کہ یہ کام مجھے کرنا ہے۔ اور اس طرح کے فیصلے ہم دنیا کے لیے تو کرتے ہیں' دین کے لیے نہیں۔

اس وقت ہمارے جو حالات ہیں' ان میں جگانے کی ضرورت ہے' ہوش میں آنے کی ضرورت ہے۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں کہ وہ ہونا چاہیے' یہ کرنا چاہیے' اس طرح کام ہونا چاہیے۔ میں ان میں سے کسی کی تردید یا تضحیک نہیں کر رہا ہوں۔ ٹھیک ہے' اسلحہ بھی فراہم کرنا ہوگا۔ اس کے لیے حکم ربانی ہے: ﴿وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (الانفال: ٦٠) کہ جس قدر ممکن ہو جمع کیا جائے۔ پھر ہمیں اپنی خارجہ پالیسی پر بھی نظر کرنا ہوگی' دوست و دشمن کی تمیز کرنا ہوگی۔ یہ سارے کام کرنے ہوں گے۔ دعا کریں کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت ملک کی زمام کار ہے' اللہ تعالیٰ انہیں صحیح رائے پر پہنچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ان میں سے کسی شے کی نفی نہیں ہے' لیکن میں جو بات بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ کے ہاں مسلمان کا معاملہ خاص ہے۔ ع ''خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ'' اس کا معاملہ عام دنیا والوں کی طرح کا نہیں ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں حضور ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے بایں الفاظ خطاب فرمایا گیا: ﴿لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ (الاحزاب: ٣٢) کہ تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو۔ تم اگر نیکی کرو گی تو اس کا دُگنا اجر ملے گا اور اگر کوئی غلط حرکت کرو گی تو سزا بھی دُگنی ملے گی۔ کیونکہ تمہاری نیکی اُمت کی لاکھوں عورتوں کے لیے نمونہ بننے والی ہے' اور تمہاری لغزش اُمتِ مسلمہ کی کروڑہا عورتوں کے لیے لغزش کی بنیاد بن سکتی ہے۔ یہی معاملہ اُمتِ مسلمہ کا ہے۔ ہمارے پاس تو اللہ کی کتاب

ہے اور اس کو دنیا تک پہنچانا ہمارے ذمے لگایا گیا ہے۔ اگر ہم ہی اس میں کوتاہی کرتے ہیں تو دوسروں کے پاس تو عذر موجود ہے کہ اے اللہ' ہمیں تو انہوں نے یہ کتاب پہنچائی ہی نہیں۔ یہ بدبخت اس کے اوپر خزانے کا سانپ بن کر بیٹھے رہے' نہ خود پڑھا' نہ ہمیں پڑھنے دیا' نہ خود عمل کیا' نہ اسے ہمارے سامنے رکھا۔ لہٰذا یہ دوہرے مجرم ہیں' ان کو سزا بھی دُگنی ملنی چاہیے۔ چنانچہ یہ وہ سزا ہے جو ہمیں دنیا میں مل رہی ہے اور یہی ہے اس سوال کا جواب کہ ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں!

ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں یہ سوال بھی ابھرتا ہے کہ غیر مسلم اقوام دنیا میں سربلند کیوں ہیں؟ ہم کتنے ہی گئے گزرے سہی' پھر بھی ہم میں سے کوئی نماز پڑھتا ہے' کوئی روزہ رکھتا ہے' کوئی نہ کوئی قرآن بھی پڑھتا ہے' لیکن علامہ اقبال کے الفاظ میں ؎

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر!

والا معاملہ کیوں ہے؟ اس کا جواب یہی ہے کہ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ یہ دوہری سزا کے مستحق ہیں۔ اگر یہ اپنا فرضِ منصبی انجام دیں اور جس پیغام کے یہ علمبردار اور امین بنائے گئے تھے' اس پیغام کو دُنیا میں پیش کریں اور پھیلائیں تو دوہرا اجر ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے: ﴿وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ﴿۱۳۹﴾﴾ (آل عمران) ''اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم حقیقی مومن ہوئے''۔ اور اگر یہ اس میں کوتاہی کریں گے تو اوّلین سزا کے مستحق بھی یہی ہوں گے۔ ان کی پیٹھ پر اللہ کے عذاب کے کوڑے دوسروں سے زیادہ برسیں گے۔ اور آج ہم اسی قانونِ خداوندی کی گرفت میں آئے ہوئے ہیں۔

اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست!

اب میں آپ کے سامنے اس سلسلے کی ایک اور حدیث کا مفہوم پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس حدیث کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ میں نے آپ کو ایک روایت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اور ایک روایت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سنائی ہے' اور اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت

بیان کر رہا ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا' جس میں آپؐ نے فرمایا: ((اِنَّھَا سَتَكُوْنُ فِتْنَةٌ)) ''عنقریب ایک بہت بڑا فتنہ ظاہر ہوگا''۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: مَا الْمَخْرَجُ مِنْھَا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ ''اے اللہ کے رسول! اس فتنے سے نکلنے کا راستہ کیا ہوگا؟'' اس سے بچاؤ کیسے ہوگا' اس فتنے سے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کا طریقہ کون سا ہے؟ اب اس سوال کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((كِتَابُ اللّٰهِ)) یعنی اس فتنے سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے' اور وہ ہے اللہ کی کتاب! یہی اس فتنے سے محفوظ کر سکتی ہے۔ آپؐ نے مزید فرمایا: ((فِیْهِ خَبَرُ مَا قَبْلَكُمْ وَنَبَأُ مَا بَعْدَكُمْ)) کہ اس میں جو تم سے پہلے کے حالات ہیں وہ بھی لکھے ہوئے ہیں اور جو بعد میں آنے والے حالات ہیں ان کا عکس بھی اس کتاب کی آیاتِ بیّنات میں موجود ہے...... یہ حدیث خاصی طویل ہے' لیکن اس کا ایک ٹکڑا میں خاص طور پر یہاں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا: ((ھُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِیْنُ))(۱) کہ یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے!!

موجودہ حالات میں ہر چہار طرف سے مسلمانوں سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ انہیں متحد ہو جانا چاہیے اور انہیں اپنے سارے اختلافات ختم کر لینے چاہئیں۔ یہ بات اصولی طور پر تو درست ہے' لیکن اتحاد کی بات کرنے والے یہ نہیں بتاتے کہ بنائے اتحاد کیا ہو؟ وہ کونسی چیز ہے جس کی بنیاد پر ہم مجتمع ہو سکتے ہیں؟ صرف خطرے کی بنیاد پر جو اتحاد ہوتا ہے وہ منفی اتحاد ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ منفی اتحاد بہت ہوئے ہیں' اور آپ کو معلوم ہے کہ آج تک ان منفی اتحادوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ تو ضرورت مثبت اتحاد کی ہے جس کے لیے کوئی ٹھوس بنیاد ہو' اور قرآن حکیم نے اہلِ ایمان کے لیے اتحاد کی بنیاد یہ بتائی ہے کہ وہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ (آیت ۱۰۳) ''اللہ کی رسی کو مجتمع ہو کر مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو!'' اب غور طلب بات یہ ہے کہ وہ ''حبل اللہ'' کونسی ہے جسے مضبوطی سے تھاما جائے؟ زیرِ نظر حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اسی کی وضاحت ہے: ''ھُوَ

(۱) سنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن' باب ما جاء فی فضل القرآن۔ وسنن الدارمی' کتاب فضائل القرآن' باب فضل من قرأ القرآن۔

حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ'' کہ یہ قرآن مجید ہی اللہ کی وہ مضبوط رسّی ہے جسے تم نے تھامنا ہے۔ یہی وہ مرکز ہے کہ اس کے قریب تر آؤ گے تو ایک دوسرے سے بھی جڑتے چلے جاؤ گے اور اگر اس سے دور ہٹتے جاؤ گے تو تمہارے اندر اضطراب' اختلاف و انتشار اور تشتت بڑھتا چلا جائے گا۔

تو واقعہ یہ ہے کہ ان حالات میں اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن حکیم کی طرف ہمارا رجوع ہو۔ ہماری تقدیر اس وقت تک نہیں بدلے گی جب تک اس قرآن کے ساتھ ہم اپنے تعلق کو از سرِ نو مضبوط نہیں کر لیتے۔ جب تک ہم اس قرآن کا حق ادا نہیں کریں گے' اُس وقت تک صرف ساز و سامان ہمارے لیے مفید نہیں ہوگا۔ ساز و سامان دوسروں کے حق میں مفید ہو سکتا ہے' لیکن اس اُمت کے لیے یہ اس وقت مفید ہوگا جب یہ اپنے مرکز کے ساتھ بھی وابستہ ہو جائے۔ اور ہمارا مرکز' جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' قرآن ہے۔ ہمارے اتحاد کی اگر کوئی بنیاد ہے تو قرآن ہے' ہمارے عروج و بلندی کے لیے اگر کوئی زینہ ہے تو قرآن ہے' اور ذلّت و رسوائی سے نجات کا کوئی راستہ ہے تو قرآن ہے۔ ہماری قسمت اسی کتاب کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر کوئی راستہ کھلے گا تو اسی کے ذریعے سے کھلے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی اس کتاب کو حرزِ جان بنانے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کے جو جملہ حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں' ان کی ادائیگی کی توفیق عطا فرمائے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات OO

قرآنِ حکیم کی قوّتِ تسخیر

اظہارِ تشکّر اور تحدیثِ نعمت

پر مشتمل ایک اہم خطاب

عنوانات

- قرآن حکیم کی قوت تسخیر 69
- تحریک میں تسلسل اور دوام - ایک لائق شکر بات 69
- توازن واعتدال - ایک اہم صفت 72
- ''اتمامِ نور'' اور ''غلبہ دین حق'': گاڑی کے دو پہیے 73
- ایک قابل لحاظ فرق 75
- اتمامِ نور کے ضمن میں ہماری ذمہ داری 76
- گاڑی کا دوسرا پہیہ: غلبہ دین کی جدوجہد 78
- تحریک رجوع الی القرآن کا تسلسل برقرار رہے گا! 80
- ایک اور لائق شکر اور قابل اطمینان پہلو 80
- ذیلی انجمنوں اور ان کے تحت اکیڈمیز کا قیام 81
- دورۂ ترجمہ قرآن: تحریک رجوع الی القرآن کا ایک اہم سنگ میل 82
- اب تک کی گفتگو کا خلاصہ 83
- ہماری تحریک اور شجرۂ طیبہ کی مثال 85
- قرآن حکیم کی بے مثال تاثیر اور قوت تسخیر 86
- قرآن حکیم کی شان 87
- دو آیات — دو عظیم بشارتیں 88
- میری زندگی کے دو عجیب واقعات 91
- ذہن و قلب پر قرآن حکیم کا تسلط اور اس کے مظاہر 93
- رسول اور کتاب — ایک حیاتیاتی وحدت 94
- دیوانہ بکار خویش ہوشیار! 96
- قرآن سے بے اعتنائی کی مختلف وجوہات 97
- اصل فیصلہ کن شے قرآن ہے 98
- در بغل داری کتاب زندۂ 99
- جہاد بالقرآن — وقت کی اہم ضرورت 101
- بھارت کے خلاف ہمارا اصل ہتھیار — شمشیر قرآنی 104
- چند عملی نکات 108

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا سالانہ اجلاسِ عام ۲۰/اپریل (۱۹۹۲ء) کی شام کو منعقد ہوا اور اس سے قبل مسلسل چار دن تک تنظیم اسلامی کا سترہواں سالانہ اجتماع جاری رہا۔ یوں سمجھئے کہ تحریکِ قرآنی کے اس قافلے نے جو مرکزی انجمن خدام القرآن کے نام سے محوِ سفر ہے' اپنی زندگی کے بیس برس مکمل کر لیے۔ اسی طرح تنظیم اسلامی کی عمر بھی اب سترہ برس ہوگئی ہے۔ اس عرصے کے دوران جو خیر بھی بن آیا ظاہر بات ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق اور اُس کی نصرت و اعانت کے طفیل ہوا' اِس پر اُس کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ احباب جانتے ہیں کہ گزشتہ ایک سال کے دوران متعدد مواقع پر میں چند خاص حقائق کے حوالے سے بعض امور پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی شکر ادا کرتا رہا ہوں۔ آج پھر میں چاہتا ہوں کہ انہیں یکجا کر کے اور مرتب انداز میں آپ کے سامنے پیش کروں۔

تحریک میں تسلسل اور دوام —— ایک لائق شکر بات

سب سے پہلا شکر ہم پر اس اعتبار سے واجب ہے کہ ہمارے اس کام میں' جس کے یہ دو نمایاں تنظیمی مظہر ہیں' یعنی انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی' الحمد للہ کہ گزشتہ بیس برس سے تسلسل بھی ہے اور تواتر بھی۔ گو ہماری رفتار کوئی بہت زیادہ تیز نہیں رہی' لیکن اس میں جو تسلسل اور تواتر کا پہلو ہے وہ میرے نزدیک بہت اہمیت کا حامل ہے۔ طوفان کی طرح اٹھنے والی تحریکیں بسا اوقات بہت جلد جھاگ کی مانند بیٹھ بھی جاتی ہیں' لیکن جس کام میں تسلسل اور دوام ہو اور جو پیہم کیا جائے اصل میں وہی پائیدار بھی ہوتا ہے اور اسی کے نتیجے میں کوئی حقیقتاً مؤثر اور وقیع کام سرانجام پا سکتا ہے۔ میں نے حالیہ

سالانہ اجتماع کے دوران بھی اس ضمن میں دو الفاظ ایک انگریزی محاورے کے حوالے سے استعمال کیے تھے: i) slow اور ii) steady۔ ہمارے اب تک کے کام پر یہ دونوں الفاظ منطبق ہوتے ہیں۔ اس میں یقیناً ہمارے لیے اطمینان بلکہ بشارت کا بہت کچھ سامان موجود ہے اور ہمیں اس پر تہہ دل سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

اسی طرح شکر کے لائق ایک اور بات یہ ہے کہ ہماری اس اجتماعیت میں اس بیس سال کے عرصے میں کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوا' کوئی بڑا اختلاف رونما نہیں ہوا۔ انجمنوں اور اداروں کی زندگیوں میں بڑے بڑے طوفان آتے ہیں اور ایسے بڑے اختلافات اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں کہ بعض اوقات ادارے کی بساط تک لپیٹنے کی نوبت آ جاتی ہے۔ اس لیے کہ عام طور پر انجمنوں کا نظام بڑا ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے' اس میں بالعموم کچھ سرکردہ شخصیتوں کا ٹکراؤ ہو جایا کرتا ہے اور باہم کھینچ تان عام طور پر جاری رہتی ہے جو نہایت مضر اثرات کی حامل ہوتی ہے۔ الحمد للہ' ثم الحمد للہ ہمارا یہ ادارہ اس نوع کی خرابیوں سے بالکل محفوظ رہا ہے۔ یہ قرآن اکیڈمی انجمن کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز رہی ہے اور یہاں آس پاس کے رہنے والے بخوبی واقف ہیں کہ ایسا کوئی ناخوشگوار واقعہ الحمد للہ یہاں کبھی پیش نہیں آیا۔ گزشتہ بیس سال کے دوران مرکزی انجمن کے کسی بھی فنکشن میں' خواہ وہ عمومی اجلاس ہو اور خواہ مجلس منتظمہ کی خصوصی میٹنگ ہو' کبھی کوئی تلخی نہیں ہوئی' کبھی کسی تو تکار کی نوبت نہیں آئی۔ یہ اللہ کا بہت بڑا فضل و کرم ہے — شکر کے بارے میں میں نے بارہا اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ جب تک انسان کو پورا شعور حاصل نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر کتنا بڑا فضل اور انعام ہوا ہے' اس وقت تک اس کے متناسب اور proportionate شکر ادا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ادراک اور شعور کہ مجھ پر اللہ کا کتنا بڑا احسان اور کتنا عظیم فضل ہوا ہے' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جتنا یہ شعور اور احساس گہرا ہو گا جذبۂ تشکر بھی اتنی ہی گہرائی سے برآمد ہو گا اور اسی قدر قوت کے ساتھ یہ جذبۂ تشکر ایک چشمہ کی مانند قلب کی گہرائیوں سے اُبلے گا۔

کم و بیش اسی طرح کا معاملہ الحمد للہ تنظیم اسلامی کا بھی ہے کہ کوئی بڑا اختلاف اور

انتشار وہاں بھی رونما نہیں ہوا۔ ظاہر بات ہے کہ انسانوں کی جماعت میں کچھ نہ کچھ لوگوں کا اختلاف کرنا یا اِکا دُکا لوگوں کا جماعت سے علیحدہ ہو جانا بالکل فطری امر ہے' کوئی بھی جماعت اس سے خالی نہیں رہی' یہاں تک کہ انبیاء کرام ﷺ کی جماعتوں میں بھی ایسے لوگ نکل آتے تھے کہ جو ساتھ چھوڑ جاتے تھے' تو تنظیم اسلامی کے اندر بھی اس طرح کے چند واقعات کا ہونا موجب حیرت یا باعث تشویش نہیں ہونا چاہیے۔ آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں کئی مواقع ایسے آئے کہ بعض لوگ متزلزل ہوئے یا ساتھ چھوڑ گئے۔ سیرت کی کتابوں میں یہ بات مذکور ہے کہ واقعۂ معراج کے بعد ایسے متعدد مسلمان جو نئے نئے ایمان لائے تھے اور ابھی ایمان میں پختہ نہیں ہوئے تھے' متزلزل ہو گئے تھے۔ اسی طرح حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کے شوہر جو صاحب ایمان تھے اور اپنی اہلیہ سمیت حبشہ کی جانب ہجرت کر گئے تھے' وہاں جا کر مرتد ہو گئے۔ شوہر کے مرتد ہو جانے کے بعد حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا چونکہ اس کے نکاح میں نہیں رہیں تو پھر حضور ﷺ نے ان کی دلجوئی کے لیے مدینہ منورہ سے نکاح کا پیغام بھجوایا' اس لیے کہ وہ قریش کے ایک بہت بڑے سردار ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) کی صاحبزادی تھیں اور اس حوالے سے ان کا جو مقام و مرتبہ تھا اس کے پیش نظر حضور ﷺ نے مناسب سمجھا کہ ان سے خود نکاح کریں۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ حضور ﷺ کی طرف سے مہر بھی حضرت نجاشی رحمہ اللہ نے ادا کیا تھا۔ اس لیے کہ بوقتِ نکاح حضور ﷺ مدینہ میں تھے اور حضرت اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا ابھی حبشہ ہی میں تھیں' وہ پھر بعد میں مدینہ تشریف لائی تھیں۔

بہرحال میں نے یہ چند مثالیں دی ہیں کہ تحریکوں اور جماعتوں میں کچھ نہ کچھ لوگوں کی تو اس طرح آمد و رفت رہتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے دور میں یہ بہت کم تھی اور آج کے دور میں غلبہ و اقامتِ دین کے لیے جو بھی تحریک اٹھے گی اس میں یقیناً ایسے واقعات نسبتاً زیادہ ہوں گے' لیکن الحمدللہ تنظیم اسلامی کو قائم ہوئے سترہ برس ہو چکے ہیں' اس میں کوئی بڑا ہنگامہ یا کوئی بڑا اختلاف رونما نہیں ہوا' کسی بڑی تعداد میں لوگوں کی اس سے علیحدگی کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا' اور یہ چیز یقیناً ایسی ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے اس

احسان کا ادراک اور شعور کرتے ہوئے کہ ہمارے اس کام کی رفتار گو کم رہی لیکن اس میں دوام' تسلسل اور تواتر رہا ہے' اپنے قلب کی گہرائیوں سے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر یہ قافلہ اسی دوام اور تسلسل سے چلتا رہے تو میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ پائیدار نتائج کے برآمد ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

توازن و اعتدال —— ایک اہم وصف

دوسری بات جس پر ہمیں صمیمِ قلب کے ساتھ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور خاص طور پر میں اپنی ذات کے حوالے سے بار بار اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں' یہ ہے کہ جیسے ہماری تنظیم میں تسلسل اور تواتر موجود ہے اسی طرح یہاں توازن اور اعتدال کا وصف بھی الحمدللہ پایا جاتا ہے۔ یہ وصف اپنی جگہ نہایت ضروری بھی ہے اور اہم بھی۔ اکثر تحریکوں میں یہ ہوتا ہے کہ ایک مرحلے کے بعد جب وہ تحریک دوسرے مرحلے میں داخل ہوتی ہے تو پہلے مرحلے کی اہمیت نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک انسان جب سیڑھی کے ذریعے چھت پر چڑھ جائے تو پھر سیڑھی کی اہمیت اس کی نگاہ میں نہیں رہتی' اس لیے کہ جو مقصد اس سے حاصل کرنا تھا وہ حاصل کر لیا۔ الحمدللہ کہ ذاتی طور پر میں اس معاملے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ میں نے دعوت رجوع الی القرآن کا جو کام شروع کیا تھا اس میں ابتدائی چھ سات برس میں نے تن تنہا کام کیا۔ اُس وقت انجمن خدام القرآن کا وجود نہیں تھا۔ اس کے بعد ۱۹۷۲ء میں یہ انجمن قائم ہوئی۔ پھر ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ تو درحقیقت میرے پیش نظر یہ دو کام ہیں جو قریباً متوازی اور متساوی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میری زندگی میں ان میں سے کس کو زیادہ اہمیت حاصل ہے' بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کا معاملہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ایک گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ ان میں سے پہلے کام کا عنوان ''دعوت رجوع الی القرآن'' ہے جس کے لیے مرکزی انجمن خدام القرآن وجود میں آئی اور دوسرا کام جس کے لیے تنظیم اسلامی تشکیل دی گئی ہے' غلبہ و اقامتِ دین کی جِدّوجُہد سے عبارت ہے۔ رفقاء و احباب جانتے ہیں کہ اب بھی میری توانائیوں کا کافی بڑا حصہ پہلے کام یعنی

دعوت رجوع الی القرآن میں کھپ رہا ہے۔ ایسا نہیں ہوا کہ میں نے سمجھا ہو کہ اس کام کا تعلق تو میرے جہادِ زندگانی کے ابتدائی مرحلے سے تھا اور اب مجھے تحریک‘ تنظیم اور انقلاب ہی کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جانا چاہیے۔ الحمد للہ کہ اس معاملے میں میرا طرزِ عمل توازن واعتدال پر مبنی رہا ہے۔

’’اتمامِ نور‘‘ اور ’’غلبۂ دین حق‘‘: گاڑی کے دو پہیے

اس سال ملتان میں دورۂ ترجمہ قرآن کے دوران پہلی مرتبہ میرا ذہن اس حقیقت کی جانب منتقل ہوا کہ قرآن مجید میں دو مقامات پر گاڑی کے ان دو پہیوں کا ذکر ساتھ ساتھ آیا ہے۔ یہ محاورہ کہ گاڑی دو پہیوں پر چلتی ہے اس اعتبار سے بڑا معنی خیز ہے کہ اگر ایک پہیہ جام ہو جائے تو گاڑی گھومنے لگے گی‘ آگے نہیں بڑھے گی۔ اس کے دونوں پہیے چل رہے ہوں تو پھر گاڑی کے لیے ممکن ہو گا کہ وہ ایک خطِ مستقیم میں آگے کی طرف پیش قدمی کر سکے۔ گاڑی کے جن دو پہیوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کا تذکرہ سورۃ التوبہ میں بھی اور سورۃ الصف میں بھی بالکل ساتھ ساتھ آیا ہے۔ سورۃ الصف کی یہ آیات تو اکثر حضرات کو یاد ہوں گی اور ان کا مفہوم بھی ذہن میں ہو گا:

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۝

اور سورۃ التوبہ کے الفاظ یہ ہیں:

يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۝

ذرا غور کیجیے‘ قرآن حکیم کے یہ دونوں مقامات اسلوب کے اعتبار سے کتنے مشابہ ہیں‘ بلکہ الفاظ بھی کم وبیش بالکل ایک سے ہیں‘ صرف پہلی آیت کے بعض الفاظ ایک دوسرے سے کچھ مختلف نظر آتے ہیں‘ ورنہ آیت کا مفہوم ایک ہی ہے۔ یہاں دو مقاصد کا ذکر ہے

اور اللہ تعالیٰ نے دوٹوک الفاظ میں فرمایا کہ یہ دونوں کام اب پورے ہو کر رہیں گے' چاہے مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو اور چاہے کافروں کو کتنا ہی ناپسند ہو!! ایک مقصد ہے اتمامِ نور' جس کے لیے سورۃ الصّف میں الفاظ آئے: ''وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ'' کہ اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا خواہ یہ بات کافروں کو کتنی ہی ناپسند ہو۔ اور دوسرا کام یا دوسرا مقصد اگلی آیت میں بیان ہوا' جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اس لیے بھیجا ہے کہ وہ دینِ حق کو غالب کرے خواہ یہ چیز مشرکوں کو کتنی ہی ناپسند ہو! —— مؤخر الذکر بات سورۃ التوبہ میں بھی بعینہٖ انہی الفاظ میں آئی ہے' ایک شوشے کا بھی فرق نہیں ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾ پہلی آیت میں تھوڑا سا لفظی فرق موجود ہے۔ سورۃ الصّف میں فرمایا: ''یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا'' جبکہ سورۃ التوبہ میں ''یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا'' کے الفاظ آئے۔ یعنی ایک حرفِ ناصب کی جگہ دوسرا حرفِ ناصب آ گیا۔ اسی طرح سورۃ الصّف میں ''وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ'' کے الفاظ ہیں جبکہ سورۃ التوبہ میں اسی مفہوم کو ''وَیَاْبَی اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ'' کے الفاظ میں بیان فرمایا گیا' جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ بہرطور اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا' خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناپسند ہو!

گاڑی کے انہی دونوں پہیوں کو سورۃ المائدۃ کی اس عظیم آیت میں بھی جمع کیا گیا جو بڑی مشہور ہے اور جس کے بارے میں یہود کے بعض علماء نے کہا تھا کہ اے مسلمانو' یہ آیت جو تمہیں عطا ہوئی ہے اگر ہمیں عطا ہوتی تو ہم اس کے یومِ نزول کو اپنا سالانہ جشن اور سالانہ عید قرار دیتے۔ اس آیت کے الفاظ پر توجہ مرکوز کیجیے۔ فرمایا:

﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ﴾ (آیت ۳) وہی دونوں چیزیں یہاں جمع کر دی گئیں: ''اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ'' کہ آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے ''دین'' کو کامل کر دیا' یعنی وہ دینِ حق جس کا غلبہ و اظہار بعثتِ محمدیؐ کا اصل مقصد ہے' آج مکمل ہو گیا' ''وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ'' اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام فرما دیا۔ اس سے مراد نورِ ہدایت کا اتمام اور

تکمیل ہے جس کا ذکر سورۃ الصّف میں ''وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ'' کے الفاظ میں وارد ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اتمامِ نور یعنی اتمامِ ہدایت ہی درحقیقت اتمامِ نعمت ہے۔ گویا اصل نعمت ہے ہی نعمتِ ہدایت! دنیا کی کوئی شے نعمت نہیں ہے جب تک نعمت ہدایت اس کے ساتھ شامل نہ ہو۔ نعمتِ ہدایت کے بغیر دولت' صحت' اولاد' اقتدار غرضیکہ کوئی شے نعمت نہیں ہے' بلکہ یہ سب عذاب کا موجب بن جانے والی چیزیں ہیں' ان کا غلط استعمال انسان کو ہلاکت و بربادی سے دوچار کر دے گا۔ ہاں اگر ہدایت موجود ہو تو پھر اولاد بھی نعمت ہے' پھر دولت بھی ایک عظیم نعمت سے کم نہیں کہ انسان اسے زیادہ سے زیادہ اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا۔ اسی طرح ہدایت اگر موجود ہو تو صحت بھی نعمت ہے کہ انسان اللہ کے دین کے لیے بھاگ دوڑ کرے گا' محنت اور مجاہدہ کرے گا۔ نعمتِ ہدایت کے ساتھ ذہانت بھی ایک نعمت شمار ہوگی کہ اس کا استعمال اللہ کے دین کے لیے ہوگا' ورنہ یہی ذہانت انسان کو evil genius بنا دے گی اور انسان کی اُخروی تباہی کا ذریعہ بن جائے گی ـــــ تو معلوم ہوا کہ اصل نعمت ہے ہی نعمتِ ہدایت!

ایک قابلِ لحاظ فرق

اب یہ بات نوٹ کیجیے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں تو نورِ ہدایت بھی مکمل ہو گیا اور دین حق کا غلبہ و اظہار بھی سرزمین عرب کی حد تک مکمل ہو گیا' گویا گاڑی کے یہ دونوں پہیے مساوی انداز میں ساتھ ساتھ چلتے اور آگے بڑھتے رہے' لیکن حضور اکرم ﷺ کے دور کے بعد ان دونوں چیزوں کے درمیان ایک فرق واقع ہو گیا۔ اس فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

دیکھئے اتمامِ نور تو قرآن کی شکل میں ہوا کہ ۲۳ برس میں قرآن حکیم کا نزول مکمل ہوا۔ اس طرح اتمامِ نور ہو گیا اور اس نور کو قیامت تک کے لیے محفوظ کر لیا گیا' اس میں اب کہیں کوئی تحریف نہیں ہو سکتی۔ لیکن اقامت دین کے مرحلہ کی تکمیل کا کام جس کے لیے سورۃ الصّف میں ''اظہار دین الحقّ علی الدّین کُلِّہ'' کی اصطلاح آئی ہے' حضور ﷺ کے زمانے میں ایک حد تک مکمل ہو گیا تھا کہ اندرونِ ملک عرب دین حق کا

پرچم لہرانے لگا۔ پھر دورِ خلافت راشدہ میں اس کی توسیع بڑے بھرپور انداز میں ہوئی۔ لیکن پھر ایک وقت آیا کہ یہ عمل رک گیا' بلکہ رفتہ رفتہ دین کی یہ عالیشان عمارت منہدم ہونے لگی' یہاں تک کہ بالکل زمین بوس ہوگئی۔ اب صورت یہ ہے کہ اسلام محض ایک مذہب کے طور پر تو باقی ہے لیکن دینِ حق اور نظامِ اسلام اپنی صحیح صورت میں زمین کے کسی ایک خطے میں بھی قائم و نافذ نہیں' اور اب غلبہ و اقامتِ دین کی جدّوجہد ہمیں از سرِ نو کرنی ہوگی —— تو یہ ہے وہ بڑا فرق جو اس معاملے میں واقع ہوا کہ دونوں کام جو نبی اکرم ﷺ کے دور میں گاڑی کے دو پہیوں کی مانند ساتھ ساتھ چل رہے تھے' بعد میں ہم آہنگ نہ رہ سکے۔

اِتمامِ نور کے ضمن میں ہماری ذمہ داری

جہاں تک نورِ ہدایت کے اتمام کا تعلق ہے ہم مسلمانوں کے لیے یہ کتنی بڑی سہولت ہے کہ ہمیں پورا یقین اور اعتماد ہے کہ اس ''کتاب'' میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا کلام ہے اور اس کا ایک حرف بھی ضائع نہیں ہوا۔ اس لیے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لیا ہے: ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴿۹﴾﴾ (الحجر) ''ہم ہی نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔ قرآن حکیم اپنی جگہ خود بھی اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت ہے' اور اللہ کا مزید فضل و کرم ہم پر یہ ہوا کہ اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اُس نے لے لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمیں اس نعمت کی قدر نہیں ہے اور ہم دنیا کی حقیر سی چیزوں کو اس نعمتِ عظمیٰ پر ترجیح دیتے ہیں۔ بہرکیف پہلے کام یعنی ''اِتمامِ نور'' کے ضمن میں ہمارے ذمے صرف ایک کام باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ نورِ ہدایت موجود ہے' اسے عام کیا جائے' اس کا افشا کیا جائے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ چراغ جلا کر بلندی پر رکھا جاتا ہے' اسے نیچے کہیں چھپا کر نہیں رکھا کرتے۔ چراغ اگر بلندی پر ہوگا تو ماحول کو منور کرے گا' اس کی روشنی پھیلے گی۔ تو نورِ ہدایت کا عام کرنا' اس سے ماحول کو منور کرنا اور اس کا افشا کرنا ہمارے ذمے ہے۔ یہی بات اس حدیث نبویؐ میں آئی ہے جو حضرت عبیدہ ملیکی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ)) ''اے قرآن والو' قرآن کو تکیہ نہ بنا لینا''۔ اسے محض

ذہنی سہارا نہ بنا لینا۔ بلکہ ((وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ)) ''اور اس کی تلاوت کیا کرو جیسے کہ اس کی تلاوت کا حق ہے' رات اور دن کے اوقات میں''۔ ((وَأَفْشُوْهُ)) ''اور اسے عام کرو''۔ اسے پھیلاؤ' چہار دانگ عالم تک اس کا نور پہنچا دو! ((وَتَغَنَّوْهُ)) ''اور اس کو خوش الحانی سے حظ لیتے ہوئے پڑھا کرو''۔ ((وَتَدَبَّرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ))(۱) ''اور اس پر غور و فکر کرو' تا کہ تم فلاح پاؤ۔''

اسی بات کا ایک منطقی نتیجہ اور بھی نکلتا ہے جس کا ذکر عظمت قرآن کے بیان میں اس طویل حدیث میں آیا ہے جس کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ((وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى مِنْ غَيْرِهٖ اَضَلَّهُ اللّٰهُ))(۲) کہ جو شخص اس قرآن کو چھوڑ کر کہیں اور ہدایت تلاش کرے گا اللہ اسے لازماً گمراہ کر دے گا۔ جب ہدایت و رہنمائی کا اتنا حتمی اور یقینی منبع و سرچشمہ اور اتنا مکمل ذریعہ (source) تمہارے پاس موجود ہے' تو اس کے ہوتے ہوئے ہدایت و رہنمائی کے لیے دائیں بائیں دیکھنا گویا انتہا درجے کی ناقدری ہی نہیں قرآن مجید کی توہین کے مترادف ہے۔ البتہ اس کا یہ مفہوم سمجھنا بھی درست نہ ہوگا کہ قرآن کے سوا اور کچھ پڑھنا ہی نہیں چاہیے! اور چیزوں کا مطالعہ کیجیے' تورات پڑھیے' انجیل پڑھیے' لیکن انہیں منبع و سرچشمۂ ہدایت سمجھ کر نہیں بلکہ محض اپنی معلومات میں اضافے کے لیے ان کا مطالعہ کیجیے۔ وہ اسی کتاب ہدایت کے سابقہ ایڈیشن ہیں جس کا تکمیلی ایڈیشن قرآن حکیم ہے۔ اسی طرح دوسرے علوم بھی اپنی معلومات میں اضافے کے لیے پڑھے جا سکتے ہیں' بلکہ دوسرے علوم کو قرآن مجید کے فہم کا ذریعہ سمجھ کر سیکھیے اور پڑھیے' اس لیے کہ انسانی ذہن کا ظرف جتنا وسیع اور کشادہ ہوگا اسی کی مناسبت سے قرآن مجید سے ہدایت اور علم و معرفت کے موتی انسان اپنے دامن میں سمیٹ سکے گا۔ دامن ہی اگر تنگ ہو تو انسان کے حصے میں حکمت و معرفت کے موتی

---

(۱) رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔ مشکاۃ المصابیح ' کتاب فضائل القرآن' باب آداب التلاوۃ ودروس القرآن۔

(۲) سنن الترمذی' ابواب فضائل القرآن' باب ما جاء فی فضل القرآن۔ وسنن الدارمی' کتاب فضائل القرآن' باب فضل من قرء القرآن۔

بھی کم ہی آئیں گے۔ گویا ع ''پھول کھلے ہیں گلشن گلشن' لیکن اپنا اپنا دامن!'' قرآن مجید کے اندر تو ہدایت' علم اور معرفت کی کوئی کمی نہیں' ان کے جواہر سے یہ معدن بھرا پڑا ہے' لیکن تمہاری اپنی تنگ دامانی آڑے آ جائے تو اس کا کیا علاج؟

واضح رہے کہ دوسرے علوم کے ذریعے سے قرآن مجید کی حقانیت کا مزید مبرہن ہو جانا خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ سورۃ حٰم السجدۃ میں فرمایا گیا: ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ﴾ (آیت ۵۳) ''ہم انہیں اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی اور انفس میں بھی' حتیٰ کہ یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ یہ (قرآن مجید) ہی سراسر حق ہے''۔ گویا جتنا انسان کے علم کا دائرہ وسیع ہو گا قرآن مجید کی حقانیت اسی درجے میں مزید مبرہن ہو جائے گی' اسی قدر اس کا اثبات زیادہ ہو گا۔ ان اعتبارات سے دوسرے علوم سے اعتنا کرنے یا ان سے دلچسپی رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن ایک بندۂ مؤمن کے لیے یہ احساس وشعور لازم ہے کہ منبع ہدایت سوائے قرآن کے اور کوئی نہیں! حضور اکرم ﷺ کی یہ وارننگ ہمیشہ اس کے پیش نظر رہنی چاہیے: ((وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى مِنْ غَيْرِهٖ اَضَلَّهُ اللّٰهُ))۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اس اعتبار سے تو اتمامِ نور ہو گیا کہ قرآن حکیم کا نزول حضور اکرم ﷺ پر مکمل ہوا اور اللہ نے قیامت تک کے لیے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا' لیکن اس ضمن میں ایک کام ہمارے ذمے باقی ہے اور وہ ہے اس نورِ ہدایت کا عام کرنا' جس کے لیے حدیث میں ''وَاَفْشُوْهُ'' کا لفظ آیا ہے کہ اسے پھیلاؤ اور عام کرو —— اور یہ افشا ہر سطح پر ہو گا' عوام کی سطح پر بھی اسے پھیلانا ہو گا اور خواص کی سطح پر بھی' فلسفیوں اور دانشوروں تک بھی اس کے ابلاغ کا حق ادا کرنا ہو گا اور شریر اور جھگڑالو لوگوں پر بھی مجادلۂ حسنہ کے ذریعے حجت قائم کرنی ہو گی۔ یہ سب افشا ہی کی مختلف سطحیں ہیں!

گاڑی کا دوسرا پہیہ: غلبۂ دین کی جدّوجہد

اس گاڑی کا جو دوسرا پہیہ ہے یعنی غلبۂ دین حق' اس کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ''وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ

لِلّٰہِ'' کی شان ظاہر ہوئی اور دین حق کا غلبہ ملک عرب کی حد تک مکمل ہو گیا۔ پھر خلافت راشدہ کے دوران کرۂ ارضی کے ایک بہت بڑے رقبے پر دین حق غالب و نافذ ہوا اور اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ لیکن پھر اس معاملے میں زوال کا آغاز ہو گیا اور تدریجاً زوال کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے۔ یوں سمجھئے کہ سب سے پہلے قصرِ اسلام کی چھٹی منزل گری' پھر پانچویں منزل منہدم ہوئی' پھر چوتھی اور پھر تیسری' اور اس طرح آج سے قریباً ڈیڑھ دو سو برس قبل پوری عمارت زمین بوس ہو گئی۔ چنانچہ اب اس کی تعمیر از سرِ نو کرنی ہو گی۔ بہر کیف اس وقت صرف اسی نکتے کی جانب متوجہ کرنا مقصود تھا کہ یہ دو کام بالکل متوازی (parallel) ہیں' قرآن مجید نے دونوں مقامات پر یعنی سورۃ التوبہ اور سورۃ الصف میں ان دونوں کو باہتمام یکجا بیان کیا ہے' اور اس کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ ان دونوں کو متوازی اور متساوی انداز میں آگے بڑھایا جائے۔ ان میں توازن و اعتدال برقرار رہنا چاہیے۔ اس پر بھی میں اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ اُس کے فضل و کرم کے طفیل یہ دونوں چیزیں ہمارے یہاں بالکل متساوی اور متوازی شکل میں چل رہی ہیں۔ مرکزی انجمن خدام القرآن اور اس کے تحت قائم ہونے والی قرآن اکیڈمی اور اسی طرح ذیلی انجمنیں اور ذیلی اکیڈمیز جو وجود میں آ رہی ہیں' یہ سب درحقیقت ہماری گاڑی کے ایک پہیے کے مظاہر ہیں' جو الحمدللہ نہ صرف یہ کہ ایک تسلسل کے ساتھ رواں دواں ہے بلکہ اس کی رفتار میں بتدریج اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ دوسرا پہیہ تنظیم اسلامی سے عبارت ہے جس کی حرکت کو تیز کرنے کے لیے ہم نے ''تحریک خلافت'' کا عنوان اختیار کیا ہے۔ لیکن تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت اصلاً ایک ہی کام کے دو گوشے یا دو مرحلے ہیں اور اس تمام تر کام کا ہدف ایک ہی ہے' یعنی دین حق کا غلبہ و اقامت۔ چنانچہ فی الاصل کام دو ہی ہیں جو ایک دوسرے کے متوازی ہیں۔ ایک ہے رجوع الی القرآن کی دعوت جس کے لیے مرکزی انجمن سرگرم عمل ہے اور دوسرا ہے اقامتِ دین کی جدّوجہد جس کی خاطر تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت برسرِ عمل ہیں۔

تحریک رجوع الی القرآن کا تسلسل برقرار رہے گا!

ایک اور لائقِ شکر اور قابلِ اطمینان پہلو

تیسری بات جس پر میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہتا ہوں اور جس کا میں نے بارہا ذکر بھی کیا ہے‘ یہ ہے کہ اس کام کے باقی اور جاری رہنے کا اہتمام اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہو گیا ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں یہ نظر آ رہا ہے اور مجھے یہ اطمینان حاصل ہے کہ اس کام کا تسلسل ان شاء اللہ برقرار رہے گا۔ یہ بھی یقیناً اللہ کا بہت بڑا فضل ہے‘ ورنہ بعض بڑی نامور ہستیاں ایسی ہو گزری ہیں کہ جنہوں نے اپنی زندگیوں میں بڑے بڑے کام کر کے دکھائے لیکن ان کے جانے کے بعد اس کام کا تسلسل قائم نہیں رہ سکا۔ ایک آدمی منظر سے ہٹا اور کام ختم ہو گیا۔ تو میرے لیے یہ بات بڑے اطمینان کی ہے اور اس پر بھی میں جتنا اللہ کا شکر ادا کروں کم ہے اور میرے ساتھیوں کو بھی اس پر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہیے۔ بالخصوص یہ جو بنیادی کام دعوت رجوع الی القرآن کا ہے اس کے حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ بحمد اللہ اب ایک ایسی نسل ثانی تیار ہو چکی ہے اور کم وبیش چالیس پچاس نوجوانوں پر مشتمل ایک ایسی ٹیم وجود میں آ چکی ہے جو درسِ قرآن کے اس تسلسل کو ان شاء اللہ برقرار رکھے گی جس کا میں نے کبھی ۱۹۶۵ء میں آغاز کیا تھا۔ مجھے اطمینان ہے کہ دروس قرآن کے حوالے سے قرآن کا انقلابی فکر اور اس کا صغریٰ کبریٰ ان کے ذہن وفکر کی گرفت میں آ چکا ہے‘ اس میں جو منطقی ترتیب (logical sequence) ہے اسے انہوں نے خوب اچھی طرح سے سمجھ لیا ہے اور وہ اب اس قابل ہیں کہ اسے بیان بھی کر سکیں۔ ظاہر بات ہے کہ صلاحیتِ بیان میں نکھار تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور اس صلاحیت کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لانے ہی سے پیدا ہو گا‘ لیکن اصل شے بنیادی فکر اور اس کے طرزِ استدلال کا ذہن کی گرفت میں آنا ہے‘ جو الحمد للہ انہیں حاصل ہے۔ اس کے بعد تو پھر اپنی اپنی محنت اور کوشش ہے۔ اس فکر قرآنی کو عام کرنے اور بیان کرنے میں جتنی محنت اور جس درجے پیہم کوشش ہو گی اسی نسبت سے ان کی صلاحیت

نکھرے گی۔ چنانچہ گزشتہ سالانہ اجتماع کے موقع پر میرا کوئی درسِ قرآن نہیں ہوا تھا‘ بلکہ درسِ قرآن میرے نوجوان ساتھیوں نے دیا۔ اس سال بھی سالانہ اجتماع میں انہی نوجوان ساتھیوں نے دروسِ قرآن دیے۔

ذیلی انجمنوں اور ان کے تحت اکیڈمیز کا قیام

اسی طرح یہ بات بھی بڑی خوش آئند اور لائق تشکر ہے کہ مرکزی انجمن کی کوکھ سے اب تک کئی منسلک اور ذیلی انجمنیں برآمد ہو چکی ہیں۔ اس سال ۲۰/اپریل (۱۹۹۲ء) کو مرکزی انجمن کا جو اجلاس عام ہوا اس میں پہلی مرتبہ بہت سے حضرات کے سامنے یہ بات آئی ہو گی کہ پاکستان کے کئی شہروں میں مرکزی انجمن کے طرز پر منسلک انجمنیں قائم ہو چکی ہیں۔ یہ پہلی بار ہوا کہ ہمارے اس اجلاسِ عام میں ذیلی انجمنوں کے نمائندے بھی شریک ہوئے اور انہوں نے بھی اپنے اپنے علاقے کی انجمن خدام القرآن کا مختصر تعارف کرایا اور خدمت قرآنی کے میدان میں اپنی پیش رفت کا بھی اختصار کے ساتھ ذکر کیا۔ اس سے بھی بڑھ کر مقامِ شکر یہ ہے کہ ان انجمنوں کے زیر اہتمام قرآن اکیڈمیز کی تعمیر کا کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ قرآن اکیڈمی کراچی کی نہ صرف یہ کہ تعمیر ایک حد تک مکمل ہو چکی ہے بلکہ وہاں دینی تعلیم کے ایک سالہ کورس کی تدریس کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ پہلی مرتبہ کسی کام کا شروع کرنا مشکل ہوتا ہے‘ لیکن ایک بار محنت کرنے سے جب ایک pattern اور عملی نمونہ سامنے آ جاتا ہے تو اس کام کا کرنا مشکل نہیں رہتا۔ اس اعتبار سے ظاہر بات ہے کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تشکیل اور قرآن اکیڈمی کے قیام میں محنت بھی زیادہ صرف ہوئی اور وقت بھی بہت لگا۔ لاہور میں مسلسل پانچ چھ برس میں نے فکر قرآنی کی اشاعت کا کام تن تنہا کیا جس کے نتیجے میں بحمد اللہ ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن وجود میں آئی۔ پھر مزید پانچ سال بعد قرآن اکیڈمی کی پہلی اینٹ رکھنے کی نوبت آئی۔ عمارت کی تعمیر بھی مرحلہ وار ہوئی۔ آغاز میں صرف دفاتر یا رہائشی بلاک کی تعمیر عمل میں آئی۔ پھر کئی برس بعد جا کر قرآن

اکیڈمی میں دینی تعلیم کے دوسالہ کورس کا آغاز ہوا۔اس طرح یہ داستان برسوں پر محیط ہے۔اس لیے کہ یہ کام پہلی بار ہو رہا تھا۔لیکن اب جبکہ اس کام کا ایک ہیولیٰ اور ابتدائی خاکہ بن چکا ہے اور اس کے بہت سے مراحل طے ہو چکے ہیں تو قوی امید ہے کہ بقیہ جگہوں پر مرکزی انجمن کی نہج پر جو کام ہو رہے ہیں ان میں اتنا وقت نہیں لگے گا بلکہ تیز رفتاری کے ساتھ انجمن کی تاسیس سے لے کر قرآن اکیڈمی کی تعمیر اور آغازِ تدریس تک کے مراحل طے کیے جاسکیں گے۔چنانچہ کراچی میں بحمداللہ کام کی رفتار تیز ہے۔اب ملتان میں بھی اللہ کے فضل وکرم سے ایک اکیڈمی وجود میں آ چکی ہے' اس سال رمضان میں وہاں میرا دورۂ ترجمۂ قرآن بھی ہوا ہے اور اب امید ہے کہ زیادہ سے زیادہ ایک سال میں وہاں قرآن کالج کا آغاز ہو جائے گا۔فیصل آباد میں منسلک انجمن موجود ہے۔وہاں اکیڈمی کے لیے بعض مخیّر خواتین نے ایک خاصا وسیع قطعۂ زمین ہمیں ہبہ کیا ہے اور اب وہاں بھی تعمیر کا کام شروع ہوا چاہتا ہے۔مجھے پوری توقع ہے کہ اس سالانہ اجلاس عام کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ ان شاءاللہ العزیز پشاور' رحیم یار خان' حیدر آباد اور اسلام آباد میں بھی بہت جلد ذیلی انجمنوں کا قیام عمل میں آ جائے گا۔اور ہوسکتا ہے کہ اسی سال کے دوران وہاں اکیڈمیز کا کام بھی شروع ہو جائے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ!

دورۂ ترجمہ قرآن: تحریک رجوع الی القرآن کا ایک اہم سنگ میل

اسی طرح یہ بات بھی بڑی خوش آئند ہے کہ اس سال ماہِ رمضان المبارک میں دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام قریباً گیارہ بارہ جگہوں پر ہوا ہے۔اس کے ضمن میں تو مجھے کبھی کبھی حفیظ کا یہ شعر یاد آتا ہے کہ۔

کیا پابندِ نَے نالے کو میں نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری!

یہ بات میں نے بغیر کسی عُجب کے محض امرِ واقعہ کے طور پر عرض کی ہے' ورنہ واقعہ یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ہے کہ اس نے میرے ذہن کو ادھر منتقل کیا۔ہم نے جب نمازِ تراویح کے ساتھ بیان القرآن کا آغاز کیا تو شروع میں تراویح کے اختتام پر یا کبھی بیچ بیچ

میں پندرہ بیس منٹ یا آدھ گھنٹے کا بیان ہوتا تھا۔ اس کے بعد میرا ذہن اس حقیقت کی جانب منتقل ہوا کہ احادیث مبارکہ میں تو رمضان المبارک کے دوگونہ پروگرام کا ذکر ملتا ہے' یعنی دن کا روزہ اور رات کا قیام قرآن حکیم کے ساتھ' یہ دونوں بالکل متوازی پروگرام ہیں۔ اس پہلو سے محض نماز تراویح ادا کرنے یا ایک آدھ گھنٹے میں خلاصۂ مضامین کے بیان سے تو رمضان المبارک کا حق ادا نہیں ہوتا۔ چنانچہ پھر (۱۹۸۴ء میں) دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام شروع کیا گیا' اور بحمد اللہ اس بار آٹھواں یا نواں موقع تھا کہ مجھے دورۂ ترجمۂ قرآن کی تکمیل کی سعادت حاصل ہوئی — اس سال یہ پروگرام پانچ جگہوں پر ہوا۔ ایک جگہ میں نے قرآن کا ترجمہ بیان کیا اور چار دیگر جگہوں پر میرے شاگردوں نے مکمل ترجمۂ قرآن بیان کیا۔ مزید برآں دورانِ رمضان نماز تراویح کے ساتھ چار پانچ جگہوں پر ویڈیو کے ذریعے یہ پروگرام لوگوں نے دیکھا اور سنا۔ رجوع الی القرآن کی یہ لہر الحمد للہ بڑھ رہی ہے اور اس میں لوگوں کا قرآن سے شغف اور تعلق بڑھ رہا ہے۔ پوری رات قرآن حکیم اور اس کا مفہوم سننے اور سمجھنے میں جو لذت ہے اس کا اس سے پہلے لوگوں کو تجربہ نہیں تھا۔ ع ''چوں معاملہ نہ دارد سخن آشنا نہ باشد!'' جب تک باہم محبت کا رشتہ نہ ہو اس وقت تک گفتگو کے اندر بھی وہ لوچ اور مٹھاس پیدا نہیں ہوتی۔ ہاں جب قرآن پاک سے تعارف ہو جائے اور اس سے ایک تعلق خاطر پیدا ہو جائے تو معاملہ بالکل مختلف ہو جاتا ہے' پھر پوری رات انسان قرآن پڑھنے پڑھانے یا سننے سنانے میں گزار دیتا ہے اور یہ چیز اس پر ہرگز گراں نہیں گزرتی!

اب تک کی گفتگو کا خلاصہ

اب تک کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ الحمد للہ ہمارے اس کام میں پیش رفت ہو رہی ہے اور تین اعتبارات سے معاملہ بہت اطمینان بخش ہے۔ ایک یہ کہ گو ہمارے کام کی رفتار کچھ زیادہ تیز نہیں رہی تاہم الحمد للہ' ثم الحمد للہ' اس میں تسلسل اور تواتر موجود ہے۔ طوفان کے مانند اٹھنے اور بگولے کی طرح رخصت ہو جانے کے مقابلے میں یہ سست رفتاری کہیں بہتر ہے اور ''سہج پکے سو میٹھا ہو'' کے مصداق توقع ہے کہ اس سے ان شاء اللہ پائیدار

نتائج پیدا ہوں گے۔ دوسری بات یہ کہ گاڑی کے دو پہیوں کی مانند ہمارے اس کام کے بھی دو بڑے بڑے گوشے ہیں اور الحمد للہ کہ ان کے مابین توازن و اعتدال برقرار ہے۔ ایک گوشہ رجوع الی القرآن کی تحریک کا ہے، جس کے پیش نظر قرآن حکیم کے نورِ ہدایت کو پھیلانا اور اس کے انقلابی فکر کو عام کرنا ہے۔ اس نور کا اتمام اللہ تعالیٰ نے فرما دیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لے لیا' اب ہمارا کام اس کا افشا کرنا ہے۔ یعنی اسے چہاردانگ عالم تک پھیلانا اور ہر ممکن طریقے سے اس کا ابلاغ کرنا اب ہمارے ذمے ہے۔ اس کے لیے جہاں عوامی سطح پر قرآن کے ذریعے وعظ و نصیحت کا کام ضروری ہے وہاں دانشوروں اور intellectuals کے لیے ان کی علمی سطح کے مطابق اس کا ابلاغ بھی اسی قدر ضروری اور لازمی ہے —— دوسرا گوشہ اقامتِ دین کی جدوجہد کا ہے کہ قرآن کا پڑھنا پڑھانا اور سیکھنا سکھانا محض ایک مشغلہ بن کر نہ رہ جائے بلکہ اس تعلیم و تعلّمِ قرآن کے ساتھ ساتھ اس کا دوسرا پہیہ بھی متوازی چلنا چاہیے۔ غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد اور اس کے لیے تنظیم اور تحریک کا کام بھی متوازن انداز میں آگے بڑھنا چاہیے۔ الحمد للہ کہ یہ دونوں کام بہت حد تک متوازن انداز میں آگے بڑھ رہے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ آئندہ کے تسلسل کے بارے میں بھی مجھے اطمینان ہے کہ یہ کام ان شاء اللہ العزیز جاری رہے گا۔ ویسے بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں اب عمر کے جس حصے میں ہوں اس کے بعد تو ''نَافِلَۃً لَّکَ'' کا درجہ رہ جاتا ہے۔ اس لیے کہ ۲۶/اپریل کو میری عمر کے ساٹھ برس مکمل ہو رہے ہیں اور مسنون عمر تو کل اکسٹھ یا ساڑھے اکسٹھ برس ہی بنتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی عمر ۶۳ برس قمری حساب سے تھی' شمسی حساب سے یہ قریباً ۶۱ برس بنتے ہیں۔ میری اس بات کو غلط مفہوم میں نہ لیا جائے کہ معاذ اللہ میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ اپنی کوئی مشابہت ثابت کرنا چاہتا ہوں' بلکہ میں دیانتاً یہ سمجھتا ہوں اور اپنے ان قریبی ساتھیوں سے اکثر یہ بات کہتا ہوں جو اس عمر کو پہنچے ہوئے ہوں ساٹھ اکسٹھ برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد آدمی کو یہ سمجھنا چاہیے کہ مسنون عمر تو پوری ہوئی' اب بقیہ زندگی بونس ہے' یہ ''نَافِلَۃً لَّکَ'' کے درجے کی چیز ہے۔ اس کا ایک ایک لمحہ اللہ کے دین کی خدمت کے لیے صرف ہونا چاہیے۔

ہماری تحریک اور شجرۂ طیبہ کی مثال

اس ضمن میں ایک اور نکتہ اشارتاً عرض کیے دیتا ہوں اور اس میں بھی میرے لیے اطمینان کا بہت کچھ سامان مضمر ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ایک پاکیزہ درخت کی جو مثال آئی ہے وہ ہمارے اس کام پر بحمد اللہ بہت حد تک صادق آتی ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ﴿۲۴﴾﴾ — کسی بھی شجرۂ طیبہ یعنی پاکیزہ درخت کی یہ مثال ہے کہ اس کی جڑ مضبوطی کے ساتھ زمین میں قائم ہو اور اس کی شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں۔ الحمد للہ کہ ہمارے کام کی بھی یہی شان ہے۔ دعوت رجوع الی القرآن کا کام اس پوری تحریک کی جڑ کے مانند ہے جو مضبوطی کے ساتھ زمین میں پیوست ہے۔ اس میں ہماری صلاحیتیں اور ہمارے وسائل بھرپور طور پر صرف ہو رہے ہیں۔ تنظیم اسلامی اس شجرۂ طیبہ کے تنے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے برگ و بار اور اس کی شاخوں کا مقام تحریک خلافت کو حاصل ہے۔ اللہ کو اگر منظور ہوا تو یہ کام ضرور آگے بڑھے گا۔

میں نے اپنا یہ تجزیہ کئی مواقع پر آپ کے سامنے رکھا ہے کہ پاکستان کے استحکام اور اس کے بقا کا اگر کوئی راستہ ہے تو یہی ہے کہ یہاں وہ صحیح اور مکمل اسلامی نظام قائم ہو جس کا عنوان ''نظامِ خلافت'' ہے۔ اگر پاکستان اور اہلِ پاکستان کے لیے اللہ نے کسی خیر کا ارادہ فرمایا ہے تو قوی امید ہے کہ یہ تحریک آگے بڑھے گی اور سرزمین پاکستان پر نظامِ خلافت کا قیام و نفاذ ہو گا۔ اس لیے کہ پوری دنیا کے اوپر اسلام کا جو غلبہ ہونا ہے جس کی صریح پیشین گوئیاں حضور اکرم ﷺ کی احادیث میں موجود ہیں' ظاہر بات ہے کہ اس عمل کا آغاز کسی ایک خطۂ زمین ہی سے ہو گا' اور اگر یہ اللہ کی مشیت میں ہے کہ اس عمل کا نقطۂ آغاز سرزمین پاکستان ہے تو یقیناً غلبہ و اقامت دین کی یہ جدوجہد آگے بڑھے گی اور اس کی شاخیں آسمان سے باتیں کریں گی۔ ہاں ہم میں سے ہر شخص کو اپنی انفرادی حیثیت میں یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ اس جدوجہد میں اس کا ذاتی حصہ (contribution) کتنا ہے۔ اس لیے کہ اللہ کے ہاں تو حساب کتاب انفرادی بنیادوں پر ہو گا: ﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا﴿٩٥﴾ (مریم) وہاں تو ہر شخص انفرادی حیثیت میں پیش ہوگا۔ ہر شخص کو اس کا اعمال نامہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا جائے گا اور حکم ہوگا: ﴿اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا﴿١٤﴾﴾ (بنی اسرائیل)۔ یہ تمہاری بیلنس شیٹ موجود ہے' اسے پڑھو اور آج اپنے حساب کے لیے تم خود ہی کافی ہو۔ تو ہم میں سے ہر شخص کو اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ دین کی جانب سے اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ انہیں ادا کر رہا ہے یا نہیں!

قرآن حکیم کی بے مثال تاثیر اور قوتِ تسخیر

اب تک جو باتیں میں نے عرض کی ہیں وہ اس سے پہلے بھی مختلف مواقع پر' بالخصوص ماہِ رمضان المبارک کے دوران مختلف اجتماعات میں' بیان کر چکا ہوں۔ آج میں ایک اور اہم بات آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں جو مرکزی انجمن خدام القرآن کے حالیہ سالانہ اجلاس کے موقع پر میں بطورِ تحفہ شرکاءِ اجتماع کے سامنے رکھنا چاہتا تھا' لیکن چونکہ وہاں ذیلی انجمنوں کے نمائندگان کی تقاریر زیادہ طویل ہو گئیں تو وقت کی کمی کے پیش نظر میں نے اپنی اس گفتگو کو ملتوی کر دیا۔ چنانچہ وہ تحفہ میں آپ کی خدمت میں اب پیش کر رہا ہوں' اور اس کا تعلق قرآن مجید کی قوتِ تسخیر اور اس پر اعتماد اور توکّل سے ہے۔

یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ بندۂ مؤمن کے لیے اصل سہارا اللہ کی ذات ہے' اور خواہ کوئی ظاہری اور مادی سہارا موجود نہ ہو اور بظاہر ہر طرف سے مایوسی نظر آتی ہو' ایک بندۂ مؤمن اللہ ہی پر توکّل کرتا ہے اور اس کی رحمت کی آس لگائے رکھتا ہے۔ قرآن حکیم میں جا بجا اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے: ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۝﴾ یعنی اہلِ ایمان کو تو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔ لیکن میں آج جان بوجھ کر قرآن حکیم پر اعتماد اور توکل کے الفاظ استعمال کر رہا ہوں تا کہ لوگ چونکیں' ان کے ذہنوں میں سوال اٹھے اور وہ توجہ سے اس بات کو سنیں کہ قرآن کی قوتِ تسخیر اور اس پر توکل و اعتماد کے بارے میں وہ کیا بشارتیں ہیں کہ جو خود قرآن مجید میں وارد ہوئی ہیں۔

قرآن حکیم کی شان

کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ بات آ سکتی ہے کہ توکل کے لفظ کا قرآن حکیم کے ساتھ اس طور پر استعمال شاید کچھ غیر مناسب ہے۔ چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ اس بات کو پوری وضاحت سے بیان کروں۔ دیکھئے' قرآن مجید ہی سے یہ بات ثابت ہے کہ جو تاثیر تجلی ذاتِ باری تعالیٰ کی ہے وہی تاثیر قرآن مجید کی بھی ہے۔ سورۃ الاعراف میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ ربّ العزت میں درخواست کی: ﴿رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ ط﴾ کہ اے پروردگار! میں تجھے بچشمِ سر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ بات سمجھانے کی غرض سے کہ وہ تجلیٔ ذاتِ حق کا تحمل نہ کر پائیں گے' اپنی ایک تجلی پہاڑ پر ڈالی۔ قرآن حکیم نے اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے: ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا ج﴾ (آیت ۱۴۳) کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی تجلی ذات کے بالواسطہ مشاہدے کا تحمل بھی نہ کر سکے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ یہی بات قرآن مجید کی عظمت کے بارے میں ایک تمثیل کے پیرائے میں سورۃ الحشر میں آئی ہے: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ط﴾ (الحشر: ۲۱) ''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اُتار دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کی خشیت سے''۔ تو درحقیقت جو تاثیر تجلیٔ باری تعالیٰ کی ہے وہی ہیبت اور وہی دبدبہ کلامِ باری تعالیٰ کا ہے۔ ان دونوں میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ اس حقیقت کو بھی علامہ اقبال نے خوب سمجھا اور بڑی خوبصورتی سے اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے۔ میرے علم کی حد تک اس دور میں اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے ذہن کی رسائی یہاں تک ہوئی ہو۔ فرماتے ہیں: ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں
زندہ و پائندہ و گویاست ایں

کہ میں تم سے صاف ہی کہہ دوں جو کچھ میرے دل میں ہے' یہ کتاب نہیں کچھ اور شے ہے۔ اسے عام معنوں میں کتاب نہ سمجھو' یہ ''چیزے دگر'' ہے۔ یعنی جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات الظاھر بھی ہے اور الباطن بھی' اسی طرح یہ کتاب بھی بیک وقت ان دونوں متضاد صفات کی حامل ہے۔ اور جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات الحی اور القیوم ہے اسی طرح اس کا کلام بھی زندہ و پائندہ ہے۔ قرآن حکیم کے لیے ''کتاب زندہ'' کے الفاظ تو اقبال نے اور بھی کئی مقامات پر استعمال کیے ہیں۔ مثلاً ؎

این کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ اُو لایزال است و قدیم

بہر حال حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کی قوتِ تسخیر کے بارے میں ہم نے بڑی ناقدری کا معاملہ کیا ہے۔ ہمیں نہ تو قرآن حکیم کی عظمت کا ادراک حاصل ہے اور نہ اس کی قوت تسخیر پر اعتماد۔ ہمیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ کتنی بڑی نعمت اور کیسی عظیم قوت ہے جو اللہ نے قرآن حکیم کی صورت میں ہمیں عطا فرمائی ہے۔

دو آیات —— دو عظیم بشارتیں

اسی ضمن میں سورۂ طٰہٰ کی ابتدائی دو آیات اور سورۃ القصص کی آیت ۸۵ کے حوالے سے بھی میں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ سورۂ طٰہٰ کی پہلی آیت حروف مقطعات پر مشتمل ہے: ﴿طٰهٰ ①﴾ جبکہ دوسری آیت: ﴿مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ②﴾ میں ایک عظیم حقیقت کا بیان ہے۔ یہاں خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے کہ اے نبی' ہم نے آپ پر یہ قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ ناکام ہوں یا بے مراد ہوں —— یہاں ایک تھوڑی سی تفسیری وضاحت ضروری ہے۔ اکثر مفسرین نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''اے نبی' یہ قرآن ہم نے آپ پر اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں''۔ لفظ ''تَشْقٰی'' کا مادہ ''ش ق ی'' ہے جس سے ''شقی'' کا لفظ بنا ہے۔ یہ لفظ ''سعید'' کے مقابلے میں آتا ہے۔ چنانچہ شقی اس کو کہتے ہیں جو بدبخت ہو' ناکام ہو' بے مراد ہو۔ یعنی وہ شخص جس کی جدّوجہد لاحاصل رہے' نتیجہ خیز نہ

ہو رہی ہو' وہ شقی ہے۔ جبکہ مشقت کا لفظ ''ش ق ق'' کے مادے سے بنتا ہے۔ یہ دونوں مادے چونکہ ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اور اسی قرب کے باعث ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال ہو جاتے ہیں' شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر مترجمین نے ''لِتَشْقٰی'' کا ترجمہ ''مشقت'' سے کیا ہے۔ تاہم مجھے ان سے اختلاف ہے۔ یہاں درحقیقت یہ بات کہی جا رہی ہے کہ اے محمد (ﷺ) یہ قرآن آپ پر اس لیے نازل نہیں ہوا کہ آپؐ ناکام ہوں' یہ تو کامیابی کی ضمانت ہے۔ اس قرآن میں جو قوت تسخیر اور جو تاثیر مضمر ہے اس کے پیش نظر یہ ممکن نہیں ہے کہ اس سب کے ہوتے ہوئے آپؐ ناکامی سے دوچار ہو جائیں۔ آپؐ یقیناً کامیاب ہوں گے اور منزل مراد تک پہنچیں گے۔ اس دنیا میں بھی آپؐ کی جدوجہد کامیابی سے ہم کنار ہو گی اور آخرت میں بھی آپؐ کے مراتب بلند سے بلند تر ہوں گے۔ شقاوت آپؐ کے حصے میں نہیں آ سکتی' نہ اس دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ یہ قرآن آپؐ کی کامیابی کی ضمانت ہے' یہ شقاوت کی ہر اعتبار سے نفی کرنے والا ہے۔ اب آپ غور کیجیے کہ اس میں ہر اس شخص کے لیے جو قرآن مجید کی کسی بھی درجے میں خدمت کر رہا ہو' کس قدر بشارت ہے اور اس کی دلجوئی کا کتنا کچھ سامان اس میں مضمر ہے: ﴿مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی ۝۲﴾ اس قرآن کی شمشیر کو ہاتھ میں لو' اس کے حقوق کو ادا کرنے کے لیے کمربستہ ہو جاؤ' تم خود اپنی آنکھوں سے اس کی قوتِ تسخیر کا مشاہدہ کرو گے۔ اس کے اندر جو ہیبت پنہاں ہے اور اس میں جو بے پناہ تاثیر پوشیدہ ہے' قدم قدم پر اس کے مظاہر تمہارے سامنے آئیں گے اور تم بچشم سر ان کا مشاہدہ کر سکو گے۔

اس ضمن میں تیسری آیت جس کا میں حوالہ دینا چاہتا ہوں' سورۃ القصص کے آخری حصے میں وارد ہوئی ہے۔ تفسیری اعتبار سے اس آیت کے مفہوم کی تعیین میں بھی کچھ اختلاف کیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ﴾ (آیت ۸۵) ''(اے نبی ﷺ!) جس ہستی نے آپ پر یہ قرآن لازم کیا ہے' (اس قرآن کی تبلیغ اور اس کے ابلاغ کا فرض جس نے آپ پر عائد کیا ہے) وہ آپ کو لازماً

لوٹائے گا ایک اعلیٰ لوٹنے کی جگہ کی جانب'' — بعض حضرات نے یہاں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ''معاد'' سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ ان حضرات کے نزدیک اس آیت کا تعلق آپؐ کے سفرِ ہجرت سے ہے کہ جب آپؐ ہجرت کے لیے مدینہ تشریف لے جا رہے تھے تو مشرکین مکہ کے تعاقب سے بچنے کے لیے کچھ دور تک آپؐ نے عام شاہراہ سے ہٹ کر ایک مشکل راستہ اختیار کیا تھا۔ اس لیے کہ اگر آپؐ عام شاہراہ پر سفر کرتے تو تعاقب کرنے والوں کی نگاہ میں آ جاتے۔ چنانچہ آپؐ نے وہ پہاڑی راستہ اختیار کیا جو بالکل غیر مستعمل اور غیر مانوس تھا۔ لیکن تقریباً ایک تہائی سفر طے کرنے کے بعد آپؐ پھر اسی شاہراہ پر آ گئے جو مکہ سے مدینہ کی طرف جاتی تھی۔ جب آپؐ وہاں پہنچے تو چونکہ وہاں آپؐ کے لیے ایک دوراہے کی صورت بن گئی تھی کہ ایک راستہ مکہ کو جاتا تھا اور دوسرا مدینہ کی جانب' تو دل میں ہوک سی اٹھی' گویا مکہ نے پھر اپنی طرف کھینچا' بیت اللہ اور حرم مکی سے جو محبت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو تھی' اس نے آپؐ کو وقتی طور پر بے چین کیا' اُس وقت دلجوئی کے لیے یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ﴾ کہ اے نبی ﷺ! آپ گھبرائیے نہیں' مکہ اور بیت اللہ سے آپ کی یہ جدائی عارضی ہوگی' ہجر کا یہ معاملہ مستقل نہیں رہے گا' یقیناً وہ ربّ جس نے آپؐ پر قرآن مجید کی تبلیغ اور اس کی دعوت کا فریضہ عائد کیا ہے وہ آپ کو لوٹا کر لے جائے گا لوٹنے کی جگہ یعنی مکہ مکرمہ!

میرے نزدیک یہ بات اپنی جگہ ایک لطیف خیال کے درجے میں تو صحیح ہے' لیکن اگر سورۃ القصص کے زمانۂ نزول کو دیکھا جائے اور بعض دیگر قرائن کو پیش نظر رکھا جائے تو اس آیت کی یہ تاویل مطابقِ واقعہ معلوم نہیں ہوتی۔ سورۃ القصص اپنے مضامین اور اسلوب کے اعتبار سے ان سورتوں میں شمار ہوتی ہے جو حضور اکرم ﷺ کے مکی دور کے درمیانی عرصے میں نازل ہوئیں۔ پھر یہ بات بھی بڑی قابل لحاظ ہے کہ فتح مکہ کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ مکہ میں قیام اختیار نہیں فرمایا' حالانکہ فتح مکہ کے بعد اگر آپؐ چاہتے تو وہیں قیام فرماتے' مدینہ مراجعت اختیار نہ فرماتے۔ اس اعتبار سے بھی وہ تاویل خلافِ واقعہ بنتی ہے۔ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ ''معاد'' سے مراد ہے آپؐ کا

مقام‘ آپؐ کے لوٹنے کی جگہ‘ اعلیٰ انجام۔ جیسے کہ سورۂ بنی اسرائیل میں بشارت کے طور پر فرمایا گیا: ﴿عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا﴾ کہ آپؐ کو تو آپ کا رب مقامِ محمود پر فائز فرمائے گا۔ اس لیے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص قرآن کی دعوت و تبلیغ میں لگا ہوا ہو‘ لوگوں کو قرآن حکیم کی طرف بلانے میں وہ رات دن ایک کر رہا ہو اور پھر وہ ناکام ہو جائے! نہیں‘ ایسا نہیں ہے‘ بلکہ ﴿اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ﴾ اے نبی ﷺ! یقیناً آپؐ بہت اعلیٰ انجام سے دوچار ہوں گے‘ آپؐ کی جدّوجہد کا بہت اعلیٰ نتیجہ نکلے گا جس سے کہ آپ ہم کنار ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں آیات قرآن مجید کے بارے میں بڑی عظیم بشارتوں پر مشتمل ہیں۔

میری زندگی کے دو عجیب واقعات

اس دوسری آیت کے بارے میں غور و فکر کرتے ہوئے مجھے اپنی زندگی کا ایک واقعہ یاد آیا۔ بلکہ چونکہ آج دو چیزوں کا تذکرہ چل رہا ہے یعنی مرکزی انجمن اور تنظیم اسلامی تو اس مناسبت سے دو ہی واقعات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ان دونوں کا تعلق ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۵ء تک کے عرصے سے ہے‘ جب مرکزی انجمن خدام القرآن قائم ہوئی اور تنظیم اسلامی کے قیام کے لیے میدان ہموار ہو رہا تھا۔ ان میں سے ایک واقعہ دراصل ایک خواب ہے جس کا تذکرہ میں کچھ ڈرتے اور جھجکتے ہوئے کر رہا ہوں کہ کہیں لوگ یہ خیال نہ کریں کہ اب یہ بھی خوابوں کی دنیا میں آ گیا۔ یہ خواب آج سے بیس برس پہلے کا ہے اور اس سے قبل میں نے بعض قریبی احباب کو سنایا بھی ہے۔ جس زمانے میں‘ میں تنظیم اسلامی کے قیام کے بارے میں سوچ بچار کر رکھا تھا اور تقریباً اس کے قیام کا فیصلہ کر چکا تھا میں نے یہ عجیب و غریب خواب دیکھا۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں مر گیا ہوں اور میں اپنے جنازے کا منظر بھی ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے خود کھڑا دیکھ رہا ہوں۔ میں اپنی موت کے تمام مراحل یہاں تک کہ قبر میں اتارے جانے کا بھی خود مشاہدہ کر رہا ہوں۔ یہ ایک عجیب تجربہ تھا کہ میری نگاہوں کے سامنے مجھے قبر میں اتارا جا رہا تھا۔ میں نے اسی وقت بعض بزرگوں سے اس خواب کا تذکرہ کیا تو انہوں نے کہا کہ یہ

ایک بہت بڑی بشارت ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ تمہاری زندگی کا ایک دور ختم ہو گیا ہے اور دوسرا دور اب شروع ہوا چاہتا ہے۔ یعنی ایک عزمِ مصمم کے ساتھ اقامتِ دین کی تحریک کے از سرِ نو آغاز کا جو ارادہ کر لیا ہے یہ درحقیقت اس بات کے مترادف ہے کہ ایک زندگی ختم ہوئی اور ایک بالکل نیا دور اب شروع ہو رہا ہے۔ (واللہ اعلم!)

دوسرا واقعہ بھی میری ایک ایسی کیفیت سے متعلق ہے جو بیداری اور نیند کے بین بین تھی۔ واقعے کے سرور اور لذت کا ابھی تک مجھے احساس ہوتا ہے۔ یہ خواب نہیں تھا بلکہ ایک خاص کیفیت تھی جو نیم غنودگی کی حالت میں مجھ پر طاری ہوئی۔ کچھ ''بَيْنَ النَّوْمِ وَالْيَقْظَة'' کا سا معاملہ تھا۔ نیند اور بیداری کے مابین ایک کیفیت میں' میں محسوس کرتا ہوں کہ لگاتار ایک آواز میرے کان میں آ رہی ہے۔ کوئی مسلسل مجھے یہ الفاظِ قرآنی سنا رہا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ﴾ ۔ اس کے بعد جب میں پوری طرح بیدار ہوا تو ایک عجیب سرور' انبساط اور انشراح کی کیفیت جس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں' مسلسل کئی روز تک بلکہ کافی عرصے تک مجھ پر طاری رہی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس وقت مجھے تلاش کرنا پڑا تھا کہ یہ آیت قرآن حکیم کے کس حصے اور کس سورۃ میں ہے۔ اس لیے کہ میرا معاملہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا باضابطہ مطالعہ تو اگرچہ بحمد اللہ زمانہ طالب علمی سے جاری ہے لیکن زیادہ تفصیلی غور و فکر کا اصل موقع مجھے اپنے سلسلہ وار درسِ قرآن حکیم کے ساتھ ملا' بالخصوص تفسیری اختلافات اور مختلف آراء کے مابین اپنی آخری رائے میں نے زیادہ تر اپنے مسلسل درس کے دوران ہی قائم کی ہے۔ اور اُس وقت جبکہ میں اِس دلفریب تجربے سے گزرا میرا درس' قرآن حکیم کے اس مقام تک نہیں پہنچا تھا۔ اگر تو ایسا ہوتا کہ سورۃ القصص انہی دنوں میرے زیرِ درس آئی ہوتی اور اس وجہ سے میرے ذہن پر یہ کیفیت طاری ہوتی تو شاید میں اس کی کوئی دوسری تاویل کرتا' لیکن چونکہ یہ بات نہیں تھی لہٰذا اسے میں نے اپنے حق میں بہت بڑی بشارت سمجھا۔ سرور و انبساط کی کیفیت دیر تک مجھ پر طاری رہی اور ان الفاظِ قرآنی کی مٹھاس اور حلاوت کا تاثر ایک عرصے تک میرے قلب و ذہن کو فرحت بخشتا رہا۔

ذہن وقلب پر قرآن حکیم کا تسلّط اور اس کے مظاہر

قرآن حکیم کی قوتِ تسخیر کے ضمن میں میں ایک اصطلاح استعمال کیا کرتا ہوں کہ قرآن اپنے طالب کو possess کر لیتا ہے‘ اس کے ذہن وقلب کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ میرے بعض ساتھی یہی لفظ میرے لیے استعمال کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ میرا اپنا احساس یہ ہے کہ میں اگر اس کیفیت سے نکلنا یا نکلنے کی غرض سے ہلنا بھی چاہوں تو ہل نہیں سکتا۔ اس لیے کہ اللہ کے فضل وکرم سے میں جس طرح اس کام میں لگا ہوں اس طور سے کام اپنے کسی ارادے اور منصوبے کے تحت نہیں ہوا کرتے۔ ایسی کیفیت تو اسی شخص کی ہوسکتی ہے جو کسی عظیم قوتِ تسخیر کے زیر اثر کسی شکنجے میں آ گیا ہو‘ جکڑا گیا ہو۔ حالانکہ ایسا بھی ہوا کہ کئی کام جو میں نے بالارادہ شروع کیے‘ کوشش کے باوجود میں انہیں مکمل نہیں کر سکا۔ مثلاً ایک موقع پر میں نے اپنے ذاتی حالات لکھنے شروع کیے لیکن وہ سلسلہ بیچ ہی میں کہیں رک گیا۔ خدمتِ قرآنی کا کام بھی اگر میں محض اپنے ارادے کے تحت کرتا تو اس طور سے ہرگز نہ کر پاتا جیسا کہ اللہ نے مجھ سے کروایا ہے۔ اللہ کی تائید و توفیق قدم قدم پر میرے شامل حال رہی۔ میں نے جب اپنی میڈیکل پریکٹس بند کی تو کوئی ذریعہ معاش تھا نہ کوئی جائیداد میرے پاس موجود تھی۔ لیکن میں نے توفیقِ الٰہی سے یہ طے کر لیا تھا کہ اب جسم وجان میں جو بھی توانائی کی رمق باقی ہے وہ اسی کام میں لگے گی۔ میرے پاس کرشن نگر میں اپنی رہائش کے لیے بس ایک مکان تھا (جسے بعد میں بیچ کر قرآن اکیڈمی کے سامنے مکان بنوایا) اس کے سوا اور کوئی جائیداد میرے پاس موجود نہیں تھی‘ لیکن اللہ نے ہمت دی اور میں نے طے کر لیا کہ آئندہ زندگی کا کوئی لمحہ اب تلاش معاش میں صرف نہیں ہوگا‘ سارا وقت اور صلاحیتیں معاد کے حصول میں صرف ہوں گی۔

ظاہر بات ہے کہ یہ فیصلہ آسان نہیں تھا۔ میرے پاس اگر وسائل ہوتے‘ جاگیریں ہوتیں اور ان کے بل پر میں یہ فیصلہ کرتا تو معاملہ مختلف ہوتا۔ الحمد للہ میرے چار بھائی ہیں اور بعض نے مختلف مواقع پر مجھ سے تعاون بھی کیا ہے‘ لیکن اتفاق کی بات ہے کہ اُس وقت بھائیوں میں سے کسی کا بھی تعاون مجھے حاصل نہیں تھا۔ البتہ چھوٹے

بھائی اقتدار احمد نے تعاون کیا' لیکن اس کی نوبت بہت بعد میں آئی(1)۔ انہوں نے بعد میں ایک موقع پر جب مجھے یہ پیشکش کی کہ میں آپ کے کام میں شریک ہونا چاہتا اور آپ کے ساتھ تعاون کرنا چاہتا ہوں تو پہلی بات میں نے ان سے یہ کہی کہ اگر تو صرف بھائی ہونے کے ناطے سے تعاون کرنا چاہتے ہو تو مجھے قبول نہیں' ہاں اگر تمہیں میرے اس مشن کے ساتھ کوئی دلچسپی ہے اور اس میں تعاون کرنا چاہتے ہو تو سر آنکھوں پر۔ بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ یہ قرآن کی قوتِ تسخیر ہی کا اثر تھا کہ کسی قسم کے معاشی وسائل نہ رکھتے ہوئے بھی اور کسی دُنیوی سہارے کے موجود نہ ہوتے ہوئے بھی میں نے اپنی میڈیکل پریکٹس کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا اور دعوت رجوع الی القرآن کے کام میں ہمہ وقت مشغول ہو گیا۔ اسے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ قرآن ہی نے مجھے possess کر لیا تھا اور میرے ذہن وقلب کو پورے طور پر اپنی گرفت میں لے لیا تھا!

رسول اور کتاب —— ایک حیاتیاتی وحدت

اسی ضمن میں ایک اور بات کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں' اگرچہ یہ ایک نازک سا مسئلہ ہے۔ میرے درسِ قرآن سننے والے اکثر حضرات کے علم میں ہے کہ اہم مضامین قرآن مجید میں تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم مضمون یہ بھی ہے کہ ''رسول'' اور ''کتاب'' دونوں مل کر ایک حیاتیاتی اکائی (organic whole) کی مانند ایک وحدت بنتے ہیں' اور دنیا میں جو بھی خیر وجود میں آتا ہے اور جو بھی انفرادی یا اجتماعی تبدیلی رونما ہوتی ہے وہ درحقیقت ان دونوں کی مشترک تاثیر کا نتیجہ ہے۔ اب میں قرآن حکیم کے ان دو مقامات کا حوالہ دوں گا جہاں رسول اور کتاب کو ایک وحدت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ البینہ میں فرمایا گیا: ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝﴾ ''نہیں تھے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا مشرکین میں سے اور اہلِ کتاب میں

(1) واضح رہے کہ یہ خطاب ۱۹۹۲ء کا ہے۔ تاہم بعد ازاں بحمد اللہ وبعونہ تمام بھائیوں نے دعوتِ قرآنی کی اس تحریک میں اپنے اپنے انداز سے اپنا اپنا حصہ ڈالا۔

سے باز آنے والے جب تک کہ ان کے پاس ''بیّنہ'' (یعنی واضح دلیل) نہ آ جاتی''۔
اگلی آیت 'بیّنہ' کی وضاحت پر مشتمل ہے: ﴿رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ﴿٢﴾ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ﴿٣﴾﴾ ''(یعنی) ایک رسول اللہ کی طرف سے پڑھتا ہوا (اللہ کے) پاکیزہ صحیفوں کو جن میں محکم کتابیں ہیں۔''

گویا ''رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ'' اور ''صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ'' یہ دونوں مل کر ''بیّنہ'' بنتے ہیں۔ اس کی دوسری مثال سورۃ الطلاق میں ہے' جہاں فرمایا گیا:

﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ﴿١٠﴾ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ (آیت ۱۱)

''ہم نے تمہاری طرف ایک ذکر نازل کر دیا ہے (یعنی) ایک رسول جو تمہیں پڑھ کر سناتا ہے اللہ کی واضح آیات تاکہ وہ ان لوگوں کو جو ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کریں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے!''

تو معلوم ہوا کہ ''ذکر'' بھی رسول اور کتاب دونوں کا مرکب ہے اور ''بیّنہ'' بھی۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ دو اجزاء پر مشتمل کسی مرکب کے ایک جزو کو اگر آپ زیادہ اہمیت دے دیں گے تو دوسرے جزو کی اہمیت اسی نسبت سے کم ہو جائے گی۔ اگر آپ ایک جزو کو زیادہ emphasize کر دیں گے تو اس کا منطقی نتیجہ نکلے گا کہ دوسرا جزو پس منظر میں چلا جائے گا اور ان دونوں اجزاء کی جو مشترک تاثیر ہے وہ برقرار نہیں رہے گی۔ یہی حادثہ اس اُمت کے اندر بھی پیش آیا اور ''رسول'' اور ''کتاب'' پر مشتمل مرکب کے دونوں اجزاء کی اہمیت میں دو اعتبارات سے کمی بیشی کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ ایک انتہا پر منکرینِ حدیث اور منکرینِ سنت ہیں جو رسول کی اہمیت کم کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصل شے کتاب ہی ہے اور رسول کی حیثیت گویا محض ڈاک کے ہرکارے کی ہے۔ جیسے چٹھی رسان کا کام چٹھی پہنچانا ہوتا ہے جو اصل اہمیت کی حامل ہوتی ہے' اسی طرح رسول کا کام اللہ کا پیغام پہنچا دینا ہے سو وہ اس نے پہنچا دیا' اب اصل شے یہ قرآن ہے' لہٰذا اصل اہمیت اسی کی ہے۔ یہ بات بظاہر بڑی دل کو لگتی ہے' لیکن یہ درحقیقت ''کَلمةُ حَقٍّ اُرید

بِهِ الباطل'' والا معاملہ ہے' یعنی بات تو درست ہے' لیکن اس سے جو نتیجہ نکالا جانا مقصود ہے وہ باطل ہے۔ اس لیے کہ اس طرح نبی مکرم ﷺ کی ذات کی نفی کی جا رہی ہے' ان کی سُنّت کی حُجیّت کا انکار کیا جا رہا ہے' اور قرآن کی جو تشریح و توضیح آپ ﷺ نے اپنے قول و عمل سے فرمائی ہے اس کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

اس مسئلہ کا دوسرا پہلو بھی اسی درجے انتہا پسندانہ ہے۔ یہ بات ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب نے اپنی کتاب میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کی ہے کہ یہ جو مرکب ہے رسول اور قرآن کا' عام مسلمانوں نے اس میں سے رسول کی ذات کو اتنی زیادہ اہمیت دی ہے کہ دوسرے جزو یعنی قرآن کی اہمیت کی نفی ہو گئی ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ جو بھی تربیتی' اصلاحی اور انقلابی کام ہوا وہ رسول ﷺ کی صحبت ہی سے ہوا۔ اس تاثر سے قرآن کی تاثیر کی نفی ہو جاتی ہے۔ یہ بات ذرا باریک بھی ہے اور نازک اور حساس بھی' لیکن میں چاہتا ہوں کہ ان حقائق کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اس سے ایک مسلمان کو یہ مغالطہ لاحق ہو سکتا ہے کہ شاید اس طرح حضور ﷺ کی توہین کی جا رہی ہے' معاذ اللہ ثم معاذ اللہ' لیکن دراصل اس معاملے میں توازن کی ضرورت ہے۔

دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار!

عوامی سطح پر ہمارے جو دینی تصورات ہیں ان میں عمل سے فرار کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ نبی مکرم ﷺ کو اتنا اونچا کرو' اتنا اونچا کرو' کہ خدا کے برابر بٹھا دو۔ تو جب خدا کے برابر بٹھا دو گے تو اب اتباع کا سوال ہی نہیں ہے۔ اب تو حمد ہی ہو سکتی ہے' تعریف ہی ہو سکتی ہے' آپؐ کی شان میں نعت کہی جا سکتی ہے' لیکن آپؐ کا اتباع تو نہیں ہو سکتا۔ اتباع تو کسی انسان ہی کا ہو سکتا ہے' کسی معبود کا تو نہیں ہو سکتا۔ آپ اللہ کی اطاعت کریں گے' عبادت کریں گے' اتباع تو نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ جو کیا گیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا بنا دیا گیا یہ بھی درحقیقت انسان کی وہی چالاکی ہے کہ اگر ہم نے انہیں انسان کی سطح پر رکھا پھر تو ان کی پیروی لازم ہو جائے گی۔ اگر وہ انسان ہی تھے پھر تو ان کا اتباع ضروری ہے' پھر تو ان کے نقشِ قدم پر چلنا لازم ہو گا۔ لہٰذا انہیں اٹھاؤ اور اٹھا

کر معبودوں کی فہرست میں شامل کر دو۔ اسے کہتے ہیں ''دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار!''
چنانچہ یہ یوں ہی نہیں ہوا ہے کہ بس نعتیں پڑھ لیں تو حضور ﷺ کا حق ادا ہو گیا' باقی کہاں ہم کہاں حضور ﷺ کا مقام! ہم سے آپؐ کا اتباع کیسے ممکن ہے؟ یہ کہا اور فارغ ہوئے۔
ع ''عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ!''

قرآن سے بے اعتنائی کی مختلف وجوہات

اس کے علاوہ متعدد دیگر عوامل ہیں جو قرآن کریم کی اہمیت کو کم کرنے اور اسے مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل رکھنے کا سبب بنے ہیں اور یہ ایک منظّم سازش کے تحت کیا گیا ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے ''مسلمانوں کے قرآن حکیم سے بُعد و بیگانگی کے اسباب'' کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر کیا تھا جو ماہنامہ میثاق میں شائع بھی ہوا تھا' جس میں انہوں نے دلائل سے یہ بات ثابت کی تھی کہ یہ معاملہ از خود نہیں ہوا بلکہ قرآن کو منظر سے ہٹانے کی اور اس کی تعلیمات کو مسلمانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کی دانستہ کوششیں کی گئیں۔ عوام الناس پر ظلم ڈھانے والے اور ان کے حقوق غصب کر کے خود عیاشیاں کرنے والے سلاطین وملوک اور جاگیردار و سرمایہ دار نہیں چاہتے تھے کہ قرآن کا انقلابی فکر لوگوں کے سامنے آئے۔ ع ''چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب!'' انہیں اندازہ تھا کہ اگر یہ کتاب اور اس کی روشن تعلیمات لوگوں کی نگاہوں میں آ گئیں تو ہم ننگے ہو جائیں گے' لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں گی اور ہمارے استحصالی نظام کے بخیے اُدھڑ جائیں گے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اسے بند رکھو' اسے صرف حصولِ ثواب کا ذریعہ بنا دو' گاہے بگاہے ختم قرآن یا ایصالِ ثواب کی محفلیں منعقد کر لی جائیں' کچھ کھانے پینے کا سلسلہ ہو جائے' اللہ اللہ اور خیر سلا! تو یہ سب کچھ درحقیقت ایک سازش کے تحت ہوا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک معاملہ یہ بھی ہوا کہ جب تاثیر قرآن کی طرف سے توجہ ہٹ گئی اور ایمان کے حصول کا صرف ایک ہی ذریعہ یعنی تاثیر صحبتِ محمدی ﷺ ذہنوں میں باقی رہ گیا تو یہ مسئلہ کھڑا ہوا کہ صحبتِ محمدی ﷺ تو ہمیں حاصل نہیں ہے' اب کیا کیا

جائے! — چنانچہ اس کی تلافی کے لیے یہ مراقبے' یہ سارے اوراد و اَشغال اور یہ تپسیائیں اور ریاضتیں' غرضیکہ ایک لمبا چوڑا طومار وجود میں لایا گیا۔ یہ سب کچھ محض اس دلیل پر ہوا کہ جو اصل عامل تھا یعنی تاثیر صحبت نبویؐ وہ تو ہمیں حاصل نہیں ہے' لہٰذا اس کا کوئی نہ کوئی بدل ہونا چاہیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ اَشغال اور ریاضتیں اور یہ چالیس چالیس برس کی بادیہ پیمائی اور نفس کشی کے یہ مختلف انداز' یہ سب چیزیں ہمارے عوام میں اعلیٰ اقدار شمار ہونے لگیں۔ لوگوں کی دینداری کو اسی پیمانے سے ناپا جانے لگا اور اس چیز نے ہمارے دینی فکر کو اس کے اصل مرکز و محور یعنی قرآن حکیم سے ہٹا دیا۔ اس کا اصل سبب یہی ہے کہ ہم نے رسول اور کتاب کے مرکب میں سے کتاب کی قوتِ تاثیر کو منہا کر دیا۔ یہ ہم سب کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اصل فیصلہ کن شے قرآن ہے!

اب آیئے اس سلسلے کی تیسری آیت کی طرف جو سورۂ بنی اسرائیل کے آخری حصے میں وارد ہوئی ہے:

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝

''(اے نبی ﷺ!) ہم نے اس قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا اور یہ حق کے ساتھ ہی نازل ہوا ہے' اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر بشیر اور نذیر بنا کر۔''

یہاں بھی آپ دیکھئے کہ قرآن حکیم اور نبی اکرم ﷺ دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہے۔ بالخصوص قرآن حکیم کا ذکر جس زوردار اور فیصلہ کن انداز میں یہاں آیا ہے وہ بہت قابل توجہ ہے۔ قرآن حکیم کے لیے ''بِالْحَقِّ'' کی تکرار اس کی غیر معمولی اہمیت و عظمت کو ظاہر کر رہی ہے۔ اس حوالے سے میں آپ کو اسی نکتے کی جانب متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ اصل فیصلہ کن شے یہ قرآن ہے۔ چنانچہ یہی وہ شے ہے جس کے لیے بقا اور دوام ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں قرآن حکیم میں ایک مقام پر یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝﴾ (الزمر) ''(اے نبی) آپؐ کا بھی انتقال ہو جائے گا اور یہ لوگ بھی مر جائیں گے''۔ لیکن نوعِ انسانی کا تسلسل تو قیامت تک باقی ہے' ان کی ہدایت و

رہنمائی کے لیے اصل شے کون سی شے ہے؟ یہی قرآن' جس کو بقا اور دوام حاصل ہے۔ اصل قوت تسخیر اس قرآن میں ہے۔ یہ قرآن لوگوں کو possess کرے گا۔ ان کے ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے کر ان کے باطن میں انقلاب برپا کرے گا۔ جو اس قرآن کی راہنمائی سے فائدہ اٹھائیں ان کے لیے بشارتیں بھی اس قرآن میں موجود ہیں اور جو اس سرچشمۂ ہدایت کو رد کر دیں ان کے لیے تنبیہہ اور وارننگ ہے کہ ایک دردناک عذاب ان کا منتظر ہے:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (بنی اسرائیل)

حاصل کلام یہ ہے کہ اصل تاثیر اور قوت تسخیر اس قرآن میں ہے جس کے لیے الفاظ آئے: ﴿وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ﴾ اور حضور اکرم ﷺ کے بارے میں فرمایا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝﴾ کہ اے نبی بشارت دینا اور انذار کرنا آپ ﷺ کا کام ہے۔ گویا اصل قوت اور طاقت اس قرآن میں ہے جو اللہ کا کلام ہے!

در بغل داری کتاب زندہؑ

قرآن حکیم کی قوت تسخیر کے حوالے سے ایک آخری بات مجھے مزید عرض کرنی ہے۔ دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو معجزات عطا ہوئے ان میں اہم ترین عصا کا معجزہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام جب اسے زمین پر ڈالتے تھے تو وہ ایک بڑے سانپ یا اژدھے کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ قرآن حکیم میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ فرعون نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کے لیے جادوگروں کو جمع کیا تو انہوں نے بھی تقریباً وہی کچھ کر کے دکھا دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا سانپ بن جاتا تھا۔ جادوگروں نے جب اپنی رسیاں اور چھڑیاں پھینکیں تو وہ بھی سانپ بن کر جنبش کرنے لگیں۔ اُس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وقتی طور پر خوف طاری ہو گیا اور تھوڑی دیر کے لیے یہ حقیقت ان کے ذہن سے محو ہو گئی کہ ان کی اپنی بغل میں اللہ کا عطا کردہ ایک عظیم معجزہ یعنی عصا موجود ہے۔

اس کی قوتِ تسخیر کا خیال ان کے ذہن سے نکل گیا۔ تاہم یہ ایک عارضی سی کیفیت تھی جو جادوگروں کے باندھے ہوئے سحر کے زیر اثر ان پر طاری ہوئی۔

اس واقعے سے میرا ذہن اس بات کی طرف منتقل ہوا کہ ہمارے آج کل کے جدید دانشور اور منکرینِ حدیث بڑے شدّومدّ کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ نبی پر جادو کا اثر نہیں ہوتا' حالانکہ بخاری شریف میں حضور اکرم ﷺ پر جادو کی روایت موجود ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ یہ بات عصمتِ انبیاء کے منافی ہے کہ نبی پر جادو کا کچھ اثر واقع ہو' لہٰذا یہ حدیث صحیح نہیں ہو سکتی۔ اس طرح کے بے بنیاد استدلال قائم کر کے وہ صحیح بخاری ہی نہیں پورے ذخیرۂ احادیث پر سے عوام الناس کا اعتماد ختم کرنے کے درپے ہیں۔ یہ وہ ہتھکنڈے ہیں جو آج کل منکرینِ حدیث کی جانب سے استعمال ہو رہے ہیں۔ میں اس کا جواب قرآن سے دیتا ہوں۔ قرآن حکیم سے ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جادو کا اثر ہوا۔ دوسرے لوگوں کی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی وہ چھڑیاں اور رسیاں دوڑتے ہوئے سانپوں ہی کی صورت میں نظر آئیں۔ یہی تو جادو کا اثر تھا' اسی کا نام نظر بندی ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں صراحت موجود ہے: ﴿فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی﴿۶۷﴾﴾ ''پس موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں خوف محسوس کیا''۔ آپ اس صورتِ حال کو اپنے اوپر طاری کر کے سوچیے۔ دل میں خیال آیا ہوگا کہ یہی تو میرے پاس اصل ہتھیار تھا' ان جادوگروں نے بھی وہی کچھ کر کے دکھا دیا جو میں عصا کے حوالے سے پیش کرتا ہوں۔ اب تو لوگوں کے سامنے زیادہ سے زیادہ یہ بات آئے گی کہ یہ بڑا جادوگر ہے اور وہ چھوٹے جادوگر۔ چنانچہ ان پر خوف طاری ہوا۔ ﴿قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی﴿۶۸﴾﴾ ''ہم نے فرمایا: اے موسیٰ! مت ڈرو' یقیناً تم ہی سربلند ہو گے''۔ یعنی کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ ﴿وَاَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ﴾ (آیت ۶۹) ''اور ذرا زمین پر ڈالو تو سہی اس چیز کو جو تمہارے داہنے ہاتھ میں ہے' یہ (عصا) ان سب کو نگل جائے گا (اور یہ سوانگ جو انہوں نے رچایا ہے اس کی قلعی کھل جائے گی)''۔ یہی اسلوب اقبال نے بھی مستعار لیا ہے اور اپنے اس شعر میں یہی پیغام اُمت کو پہنچایا ہے ؎

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ!

کہ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بغل میں عصا موجود تھا' لیکن جادوگروں کی رسیوں اور چھڑیوں سے وقتی طور پر جو ایک منظر سامنے آیا اس سے ان پر خوف طاری ہوگیا' آج بعینہٖ وہی حال اُمتِ مسلمہ کا ہے کہ اس کے پاس قرآن مجید کی شکل میں سب سے بڑا ''ایٹم بم'' موجود ہے' لیکن انہیں شعور ہی نہیں کہ اللہ کا کتنا عظیم معجزہ ان کی بغل میں موجود ہے' جس کی قوتِ تسخیر کے سامنے کوئی شے نہیں ٹھہر سکتی! حقیقت یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہمارے تمام مسائل کا حل اگر کسی ایک شے میں ہے تو وہ اللہ کی کتاب ہے۔ آپ حضرات یہ حدیث متعدد مرتبہ سن چکے ہوں گے جس کے راوی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ آخَرِیْنَ))(۱) کہ اللہ تعالیٰ اسی کتاب کی بدولت بہت سی اقوام کو بلندی عطا کرے گا اور اس کے ترک کرنے کی پاداش میں بہت سی قوموں کو زوال سے دوچار کرے گا۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ بنی اسرائیل میں ان الفاظ میں وارد ہوئی: ﴿وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ﴾ (آیت ۱۰۵) اور سورۃ الطارق میں بایں الفاظ بیان ہوئی: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿۱۳﴾ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿۱۴﴾﴾ کہ یہ تو قولِ فیصل ہے' فیصلہ کن کلام ہے' کوئی شاعرانہ تک بندی نہیں ہے۔ یہ ہے درحقیقت قرآن کی تاثیر اور قوتِ تسخیر — ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم قرآن حکیم پر اعتماد نہیں کرتے۔ قرآن مجید کی عظمت سے اگر ہم حقیقتاً واقف ہو جائیں اور اس کے اندر جو قوتِ تسخیر پنہاں ہے اس کا ہمیں کسی درجے میں اندازہ ہو جائے تو ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں۔

جہاد بالقرآن — وقت کی اہم ضرورت

اسی حوالے سے میرا ذہن منتقل ہوا کہ چند سال قبل میں نے جہاد بالقرآن کے موضوع

(۱) صحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب فضل من یقوم بالقرآن ویعلمه وفضل من تعلم حکمة۔ وسنن الدارمی' کتاب فضائل القرآن' باب ان اللّٰہ یرفع بھذا القرآن اقواما ویضع به آخرین۔

پر دو تقریریں کی تھیں۔ سورۃ الفرقان میں نبی اکرم ﷺ کو جہاد بالقرآن کا حکم بایں الفاظ دیا گیا ہے: ﴿فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ کہ اے نبی ﷺ! ان کافروں کی باتوں پر آپ توجہ نہ دیجیے‘ ان کی پیروی کا خیال دل میں نہ لائیے اور ان کے ساتھ جہاد کرتے رہیے اس قرآن کے ذریعے سے بڑا جہاد! —— اپنی توانائیاں اور اپنی قوتیں اس قرآن کے افشا اور اس کے ابلاغ پر لگا دیجیے‘ کھپا دیجیے‘ لگے رہیے اسی کام میں۔ یہی درحقیقت آپ کی طاقت کا اصل راز ہے‘ آپ کی کامیابی کی اصل ضمانت یہی قرآن مجید ہے۔ ﴿اِنَّ الَّذِىْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ﴾

جہاد بالقرآن ہی کے موضوع پر بعد میں‘ میں نے ایک اور تقریر کی تھی اور اس میں جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ معیّن کیے تھے۔ اگر آپ اپنے ماحول کا جائزہ لیں تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارے معاشرے میں ایک محاذ تو جدید ملحدانہ نظریات کا ہے۔ اس زہر کا توڑ اسی قرآن مجید میں ہے۔ پھر ہمارے عوام کی ایک عظیم اکثریت مشرکانہ اوہام اور عقائد کا شکار ہے۔ اس کا توڑ بھی یہی قرآن ہے‘ بلکہ اس گمراہی کا توڑ تو اس میں زیادہ نمایاں اور جلی انداز میں ہے۔ اس لیے کہ جب قرآن نازل ہوا تو وہاں یہی گمراہی سب سے زیادہ تھی‘ لہٰذا اس کی نفی اور تردید بھی سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ ہوئی۔ باقی جہاں تک جدید باطل نظریات اور ملحدانہ افکار و خیالات کا تعلق ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس کے توڑ کے لیے تو قرآن حکیم میں غوطہ زنی کرنی پڑے گی‘ کچھ گہرائی میں اتر کر حکمت و معرفت کے موتی اور ہیرے نکالنے ہوں گے۔ لیکن قدیم جاہلیت کا توڑ تو اس میں گویا بالکل سطح پر (on the surface) موجود ہے۔

ہمارا تیسرا سب سے بڑا مسئلہ تفرقہ اور فرقہ واریت ہے۔ اس تفرقے کا ایک ہی علاج ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾(آل عمران:۱۰۳) جتنا اس قرآن کے قریب آئیں گے اتنی ہی باہمی ہم آہنگی ہوگی۔ یوں بھی سوچا جائے کہ انسان چونکہ حیوانِ ناطق ہے اور عقل رکھنے والا حیوان ہے‘ لہٰذا انسانوں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی اگر ہوگی تو باہم اتحاد بھی ہوگا‘ ورنہ آپ اتحاد کے موضوع پر وعظ کہتے رہیے‘

اتحاد کے لیکچر دیتے رہیے' اس پر مضامین لکھ کر چھاپتے رہیے' اتحاد نہیں ہو سکتا۔ باہم ذہنی اور فکری ہم آہنگی اگر پیدا ہو گی تو بامعنی اور پائیدار اتحاد جنم لے گا ـــــ اور اس کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ اللہ کی رسی یعنی قرآن کو مل جل کر مضبوطی سے تھام لیا جائے ؎

ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست!

ہمارا ایک مرض اور بھی ہے' اور وہ ہے بے یقینی۔ یعنی باطل نظریات کا بھی اگرچہ ذہن پر تسلط نہیں ہے' کوئی گمراہ کن اوہام بھی نہیں ہیں' لیکن جسے یقین کہتے ہیں وہ شے موجود نہیں ہے' اور یقین کی پونجی اگر پاس نہ ہو تو عمل کا کیا سوال؟ ـــ قرآن حکیم میں کچھ لوگوں کا قول نقل ہوا ہے: ﴿اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ﴿۳۲﴾﴾ (الجاثیۃ) کہ اے محمد (ﷺ) جو کچھ تم کہہ رہے ہو لگتا ہے کہ ٹھیک کہہ رہے ہو' بات وزنی معلوم ہوتی ہے لیکن یقین نہیں آتا' اس پر دل نہیں ٹھکتا! ـــــ اور ظاہر بات ہے کہ عمل تو یقین کے تابع ہے' یقین بدلے گا تو عمل بدلے گا۔ بقول اقبال ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں' یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

جان لیجیے کہ اس یقین کا سرچشمہ اور منبع بھی یہی قرآن ہے اور یہی ہے کہ جو ''شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ'' ہے۔ یعنی باطنی اور روحانی بیماریوں کا مؤثر اور تیر بہدف علاج یہی قرآن حکیم ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جن پر میں نے ''جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ'' کے موضوع پر اپنے خطابات میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ میری یہ دونوں تقریریں اب کتابی صورت میں شائع ہوتی ہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے فریضۂ رسالت کی ادائیگی اور غلبہ و اقامتِ دین کے مشن کے لیے جو بے مثال جدوجہد کی اسے دو عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ آپؐ نے مسلسل بارہ برس مکہ مکرمہ میں قرآن کے ساتھ جہاد کیا اور پھر دس برس مدینہ منورہ میں یہ جہاد تلوار کے ساتھ ہوا! ـــــ یہ دو ہی تو جہاد ہیں جو محمد عربی ﷺ کے جہادِ زندگانی میں

سب سے نمایاں ہیں۔ ایک کا عنوان جہاد بالقرآن ہے جو بارہ یا تیرہ برس مکہ میں ہوا کہ جس میں شمشیر قرآنی کے سوا اور کوئی دوسری شمشیر نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کے ہاتھ میں نظر نہیں آتی' اور دوسرا جہاد بالسیف ہے' جس کا آغاز ہجرت کے بعد ہوا اور جو آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری سانس تک جاری رہا۔ یہ بات نوٹ کیجیے کہ جہاد بالسیف کے لیے جو طاقت درکار ہوتی ہے' فدائین کی جو جمعیت اور سرفروشوں کی جو جماعت درکار ہوتی ہے' وہ کہاں سے آئے گی؟ — یہ سرفروش جہاد بالقرآن کے نتیجے میں فراہم ہوں گے۔ قرآن حکیم اگر انہیں مسخر کر لے اور ان کے اندر سرایت کر جائے تو یہی لوگ ہیں جو باطل کے مقابلے میں بنیانِ مرصوص ثابت ہوں گے اور باطل نظام کو الٹ کر رکھ دیں گے۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

اس اعتبار سے جہاد بالقرآن گویا جہاد بالسیف سے اہم تر ہے۔ اس لیے کہ پہلی منزل اہم تر ہوتی ہے۔ پہلی منزل موجود ہوگی تو اس کے اوپر دوسری منزل کی تعمیر ممکن ہوگی۔ جہاد بالقرآن ہوگا تو جہاد بالسیف کا امکان ہوگا!

بھارت کے خلاف ہمارا اصل ہتھیار — شمشیرِ قرآنی

اس ضمن میں ایک بات میں مزید کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے داخلی طور پر تو پانچ محاذ گنوا دیے جن کے لیے قرآن ہمارا سب سے بڑا اور مؤثر ہتھیار ہے' خارجی اعتبار سے ہمارے لیے اہم ترین مسئلہ بھارت کا ہے۔ آج سے دو یا تین سال قبل میں نے مرکزی انجمن کے سالانہ اجلاس عام ہی میں اس ایشو پر ایک تقریر کی تھی' میں نے عرض کیا تھا کہ بھارت کے مقابلے میں بھی ہمارا سب سے بڑا ہتھیار قرآن حکیم ہے۔ اس لیے کہ فکر اور نظریے کے میدان میں بھارت کے پاس کچھ نہیں ہے۔ ہندو قوم کے پاس اپنا کوئی جاندار نظریہ نہیں ہے' نہ مذہب کے میدان میں اور نہ فلسفے کے میدان میں۔ مذہب کے نام پر ان کے ہاں جو ایک تحریک چل رہی ہے وہ محض چند سیاسی مقاصد کے لیے چلائی گئی ہے' ورنہ دراصل ہندو ازم صرف ایک کلچر ہے' کچھ رسومات ہیں اور کچھ ایسی سماجی

تقریبات ہیں جن کے حوالے سے وہ کچھ جشن منا لیتے ہیں' باقی کوئی شے ان کے پاس نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پورے طور پر مغرب کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں' فلسفہ و فکر بھی انہوں نے مغرب سے مستعار لیا ہے اور ان کے تہذیب و تمدّن پر بھی مغرب کا رنگ غالب ہے۔ چنانچہ ان کا نظامِ حکومت ہو یا تصورِ قانون سارے کا سارا اور جوں کا توں مغرب سے درآمد شدہ ہے۔ یہی سبب تھا کہ متحدہ ہندوستان میں دُنیوی اعتبار سے ہندو ہم سے آگے نکل گیا تھا۔ اس لیے کہ اس کے باوجود کہ مسلمانوں میں بہت سے لوگ مغربی رو کے اندر بہہ گئے تھے لیکن ان میں ایک بڑا مؤثر طبقہ ایسا بھی تھا جن کے ذہنوں میں مغربی تہذیب کے خلاف ایک ردِعمل پروان چڑھا اور انہوں نے اس تہذیب کو ذہناً اور عملاً قبول نہیں کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری قوتیں منقسم ہو گئیں۔ علماءِ دیو بند ڈٹ گئے کہ نہ انگریزی پڑھیں گے نہ انگریزی تہذیب اختیار کریں گے۔ انہوں نے انگریز' انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب سب سے لاتعلقی اور بیزاری کا اعلان کیا۔ گویا مکمل بائیکاٹ کی صورت بن گئی۔ ہندو کے لیے ظاہر بات ہے کہ ایسی کوئی رکاوٹ موجود نہیں تھی۔ اس کا کوئی تمدن تھا نہ تہذیب' ان کے ہاں اپنے کوئی نظریات تھے نہ افکار' لہٰذا انہوں نے بلاجھجک اور بلاتوقف انگریز کی تہذیب' اس کے تمدن' اس کی زبان' ہر شے کو اختیار کر لیا۔ انہیں اس کا اضافی فائدہ یہ ہوا کہ انہیں انگریز کا قرب بھی حاصل ہو گیا۔ ظاہر بات ہے کہ حکمرانوں کا قرب حاصل کرنے کا اس سے بہتر راستہ کوئی نہیں کہ آپ انہی کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگ دیں۔ جبکہ مسلمانوں کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔

بہرحال یہ تو ایک ماضی کا معاملہ تھا' مجھے اصلاً مستقبل کے حوالے سے بات کرنی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ بحیثیت ملک پاکستان کا اصل مقابلہ بھارت کے ساتھ ہے' بھارت وہ ملک ہے جس کے ساتھ ہماری پیدائشی دشمنی ہے۔ مادی قوت کے اعتبار سے اگرچہ ہم بھارت سے بہت پیچھے ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے خلاف نظریاتی طور پر ہمارے پاس بہت بڑی قوت موجود ہے۔ اس فکر کو اگر ہم پھیلا سکیں تو اس شمشیرِ قرآنی سے ہم دشمن کو گھائل کر سکتے ہیں۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے فضل و کرم کی

ہے کہ ہمارے اور ہندوستانی قوم کے درمیان زبان کی کوئی لمبی چوڑی خلیج حائل نہیں ہے۔ حالانکہ اگر ہم مغرب کی طرف چلے جائیں' ایران یا عرب ممالک میں جا کر اپنی بات پہنچانا چاہیں تو وہاں اردو زبان ابلاغ کا ذریعہ نہیں بنتی۔ لیکن یہ جو ایک بہت بڑا ملک ہے' پوری نوعِ انسانی کی ۱/۵ تعداد جہاں آباد ہے' آج بھی اس ملک کے کونے کونے میں اردو زبان سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ خواہ وہ تامل ناڈو کا علاقہ ہو خواہ ملیالم کا' اور خواہ بنگال کا خطہ ہو' ہر جگہ اردو سمجھنے والے موجود ہیں۔ اس بات کو میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہی مظاہر میں سے شمار کرتا ہوں جن کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ اس برعظیم پاک و ہند سے اللہ تعالیٰ کو کوئی خاص خدمت لینی ہے' اور مستقبل کی جو بھی اس کی منصوبہ بندی ہے اس میں کوئی نہ کوئی اہم مقام اور اہم رول اس خطے کا ضرور ہے کہ یہیں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے' اسی خطے سے اس عظیم قرآنی تحریک کا آغاز ہوا جو تین سو برس پرانی تحریک ہے' کوئی آج کی تحریک نہیں ہے۔ اس کا آغاز تو شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فارسی ترجمے اور ان کی ''الفوز الکبیر'' سے ہوا تھا۔ پھر ان کے چاروں بیٹوں (رحمۃ اللہ علیہم) کے تراجم قرآن اور تفسیروں سے یہ تحریک آگے بڑھی۔ اُس وقت سے جو سلسلہ شروع ہوا تو درحقیقت یہی ہے کہ جو بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچا کہ آج ہم بھی اس تحریک میں بقدر ہمت اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں اور خدمت قرآنی کے اس کام میں اپنی بساط کے مطابق شریکِ عمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے شرفِ قبول فرمائے۔ بہرکیف اردو زبان کو ذریعہ ابلاغ بنا کر اگر قرآن کے فکر و فلسفہ اور قرآن کی حکمت و ہدایت کو ہندوستان میں بسنے والے لوگوں میں بھرپور طریقے سے پیش کیا جا سکے تو اس سے بڑا اور کوئی ہتھیار نہیں! —— شاہ ولی اللہؒ ہی نے ''تفہیماتِ الٰہیہ'' میں یہ بات لکھی ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ ہندوستان کے اونچی ذات کے ہندوؤں کی اکثریت اسلام قبول کر لے گی۔ یہ ایک پیشین گوئی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے حق میں تمام شواہد موجود ہیں۔

بدقسمتی سے ہندوستان کے ساتھ آج تک ہماری قومی جنگ جس نوعیت کی رہی ہے اس میں مادی نقطۂ نظر اور جذباتیت پسندی کو زیادہ دخل رہا ہے' چنانچہ اس کے نتیجے میں ہم

خود ہندو قوم اور قرآن کے درمیان اپنے وجود سے ایک آڑ اور حجاب بن گئے ہیں۔ وہ قرآن مجید کی ہدایت کی طرف رجوع کیسے کریں جبکہ وہ ایک دشمن قوم کی کتاب ہے۔ یہ وہ حجاب اور barrier ہے جس کی وجہ سے نوعِ انسانی کی ایک بہت بڑی تعداد قرآن مجید سے محجوب ہے۔ اگر ہم کسی طریقے سے اس بیریر کو ختم کر کے قرآن کے پیغام اور اس میں مضمر ہدایت کو بیک وقت اعلیٰ ترین علمی سطح پر بھی اور عوام الناس کی سطح پر بھی پیش کر سکیں تو واقعہ یہ ہے کہ ہماری سب سے بڑی قوتِ تسخیر یہی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس کی طرف سے ہم غافل ہیں اور مغربی افکار و نظریات اور تہذیب و تمدن کی ظاہری چمک دمک نے خود ہماری آنکھوں کو خیرہ کر رکھا ہے۔ جیسے عارضی طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام جادوگروں کی ڈالی ہوئی رسیوں اور چھڑیوں کو سانپوں کی شکل میں دیکھ کر ڈر گئے تھے' آج ہم بھی اہل مغرب کی ڈالی ہوئی ان رسیوں اور چھڑیوں کے بنے ہوئے سانپوں سے مرعوب اور خوف زدہ ہیں۔ یہ رسیاں چاہے افکار اور نظریات کی ہوں' خواہ تہذیب و تمدن کی ہوں اور خواہ سائنسی ترقی کے روپ میں ہمیں مرعوب کر رہی ہوں' سب انسانی ذہن کی تراشیدہ ہیں۔ اس سے کہیں بڑھ کر وہ قوتِ تسخیر ہے جو قرآن حکیم کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ الحمد للہ ہماری یہ تحریک قرآنی جو انجمن خدام القرآن کے نام سے برسرِ عمل ہے' اسی قرآن کے پیغام اور اس کی ہدایت کو عام کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ اور فی الاصل' جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا' میری یہ تقریر اللہ تعالیٰ کی جناب میں ہدیۂ تشکر پیش کرنے کے لیے ہے کہ اس انجمن کو قائم ہوئے بیس برس ہو گئے' اس دوران جو کام اب تک ہم سے ہوا اسی کے فضل سے ہوا۔ تو جہاں ہمیں اپنے قلب کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا چاہیے وہاں ہمیں اس کام کی اہمیت کا صحیح صحیح شعور بھی ہونا چاہیے اور اس حوالے سے قرآن مجید کی قوتِ تسخیر پر اعتماد اور توکل میں مزید پختگی آنی چاہیے کہ اصل شے یہ ہے' اس پر محنت کرو' اسے عام کرنے اور پھیلانے کے لیے جدوجہد کرو: ﴿وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ (المطففین) چاہیے کہ اربابِ ہمت و عزیمت اپنی عزیمتوں اور ہمتوں کے اظہار کے لیے اس میدان کا انتخاب کریں اور اپنی سعی و جُہد کا مرکز و محور قرآن حکیم کو بنائیں۔

چند عملی نکات

اب میں وہ چند عملی باتیں آپ سے عرض کروں گا جو میں نے انجمن کے سالانہ اجلاس میں بھی کہی تھیں — پہلی بات یہ کہ اس انجمن میں آپ کی شمولیت (participation) عملاً بڑھنی چاہیے۔ بطور خاص آپ سے یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جیسا کہ میں نے دورانِ تقریر بھی عرض کیا' بہر حال اب میں تو آخرت کی دہلیز پر کھڑا ہوں۔ بحمداللہ بیس برس میں نے اس ادارے کو چلایا ہے اور یہ سب کچھ اسی کے فضل وکرم سے ہوا۔ اس میں عافیت یہ بھی رہی ہے کہ صدر مؤسس ہونے کے ناطے اس ادارے میں مجھے خصوصی اختیارات حاصل تھے' میرے پاس ویٹو کا حق تھا اور اب بھی ہے۔ لہٰذا کسی بڑے ہنگامے کے کھڑا ہونے یا بحران کے پیدا ہونے کا یہاں کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ لیکن آئندہ اس کا امکان یقیناً ہوگا' اس لیے کہ میرے بغیر کسی صدر کو ویٹو پاور حاصل نہیں ہوگی۔ آئندہ کا نظام طے شدہ دستور کے مطابق چلے گا۔ لہٰذا جن حضرات کو بھی اس کام اور اس قرآنی فکر سے دلچسپی ہے اور جو چاہتے ہیں کہ پچھلے بیس برس میں جو کام ہوا ہے وہ کہیں غلط رخ پر نہ پڑ جائے یا غلط ہاتھوں میں نہ چلا جائے تو انہیں چاہیے کہ اس انجمن کے ساتھ اپنی وابستگی کو فعال بنائیں۔ اپنے اوقات کا کچھ حصہ اس کے لیے ضرور نکالیں اور یہ خیال ذہن میں نہ لائیں کہ یہ کام تو خود بخود چل رہا ہے ہماری اس میں کیا ضرورت ہے! — جن حضرات کے ذہنوں میں بھی ایسا کوئی خیال تھا انہیں اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دینا چاہیے اور اس کام سے دلچسپی رکھنے والے تمام حضرات کو چاہیے کہ اس کام میں عملی شمولیت کو بڑھانے کی طرف توجہ دیں۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس کام کے لیے قبول فرمائے!

دوسری بات — اور یہ بات مجھے خاص طور پر انجمن کے پرانے وابستگان سے کہنی ہے کہ ان میں وہ بھی ہیں کہ جو میرے دروسِ قرآن اور تقاریر کی مجالس میں پہلی صفوں میں بیٹھے نظر آتے ہیں' لیکن مجال ہے کہ انہوں نے تنظیمِ اسلامی یا تحریکِ خلافت کی جانب ایک قدم بھی آگے بڑھایا ہو۔ ان حضرات کو اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کرنی

چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ یہ سارا کام کیا محض مشغلے کے طور پر ہو رہا ہے؟ —— یہ ہرگز کوئی فرقہ (cult) نہیں ہے! یہ کوئی ہندوؤں کے طریقے پر رشی منی کا کوئی سلسلہ نہیں ہے!! یہ ایک اہم دینی کام ہے' یہ ایک انقلابی مشن ہے۔ اور کوئی بھی ایسا کام کہ جس میں انقلاب کے بیج موجود ہوں لیکن وہ پھلیں پھولیں نہیں' برگ و بار نہ لائیں تو وہ کام اپنی معنویت کھو دے گا۔ محض پڑھنے پڑھانے تک خود کو محدود رکھنا اور اس کے عملی تقاضوں سے گریز کرنا دینی اعتبار سے نفع بخش نہیں ہے۔ الحمد للہ کہ میری زندگی میں صرف پڑھنا پڑھانا نہیں رہا بلکہ میں نے اللہ کے فضل و کرم سے آگے قدم بڑھایا اور اسی اعتبار سے اس کام میں معنویت برقرار رہی۔ تو جو لوگ بھی اس کام میں ذہنی دلچسپی رکھتے ہیں انہیں چاہیے کہ آگے بڑھیں' تنظیم اور تحریک کی طرف عملاً پیش قدمی کریں اور اس میں شمولیت اختیار کریں۔

تیسری بات جو میں خاص طور پر نوٹ کرا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ دعوت رجوع الی القرآن کے ایک سالہ کورس کی میرے نزدیک خصوصی اہمیت ہے۔ میں اراکین انجمن اور خصوصی طور پر اس آبادی کے لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ انہیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس کورس میں شمولیت کرنی چاہیے۔ ہمارا یہ کورس چار چار ماہ کے دو سمسٹرز پر مشتمل ہے۔ چنانچہ جو حضرات پورا سال فارغ نہ کر سکتے ہوں وہ چار مہینے تو ضرور نکالیں اور پہلا سمسٹر کر لیں' دوسرا سمسٹر اگر کچھ وقفے کے بعد بھی ہو سکے تو کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن بہرحال اس کے لیے ایک سال کا ارادہ ضرور کر لیں —— ہم میں سے ہر شخص کو' خاص طور پر پڑھے لکھے لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ ہمیں اللہ کے حضور اس بات کی جواب دہی کرنا ہو گی کہ ہم نے سب کچھ پڑھا' لیکن اتنی عربی نہ سیکھی کہ اس کے کلام کو براہِ راست سمجھ سکتے۔ اس کوتاہی کا ہمارے پاس کیا جواز ہے؟ ہم نے انگریزی اتنی پڑھ لی کہ انگریزوں کو پڑھا سکتے ہیں' مختلف فنون حاصل کر لیے' سائنسی علوم میں بڑی سے بڑی ڈگریاں حاصل کر لیں' لیکن نہیں پڑھی تو عربی نہیں پڑھی۔ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کے اس سوال کا کیا جواب ہو گا کہ تم نے میرے کلام کی کیا

قدر کی؟ خود میری کیا قدر کی؟؟ قرآن حکیم میں مشرکین کے بارے میں فرمایا گیا ہے:﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ (الانعام: ۹۱) کہ انہوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسی کہ اس کی قدر کرنی چاہیے۔ ہمیں اس بات کی فکر کرنی چاہیے کہ ہم کہیں ان الفاظ کا مصداق نہ ٹھہریں۔ چنانچہ اس ضمن میں جو بھی کمی رہ گئی ہے ہمیں اس کی تلافی کرنی چاہیے۔ اگر کسی کے والدین کی کوتاہی ہو اور وہ اللہ کے ہاں پہنچ گئے ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کی تلافی وہ اب بھی کر سکتا ہے۔ آپ اب اس کام کے لیے وقت فارغ کریں اور اللہ کے حضور یہ دعا کریں کہ اے اللہ! میں اپنے والدین کی کوتاہی کی اب تلافی کر رہا ہوں' میرے والدین کو بخش دے' انہیں معاف فرما دے۔ اے اللہ! میں اب اس کے لیے وقت نکال رہا ہوں' میری اس جدّوجہد کو اور میرے اس وقت کو جو میں صرف کر رہا ہوں میرے والدین کی طرف سے کفّارے کے طور پر قبول کر لے! ـــــ میں بتکرار و اعادہ توجہ دلا رہا ہوں کہ یہ کام کرنے کا ہے' اس میں دیر نہ کیجیے' تاخیر نہ کیجیے!!

اقول قولی هذا واستغفر اللّٰه لی ولکم ولسائر المُسلمین والمُسلماتoo

تعارفِ قرآن

مع عظمتِ قرآن

فہرست

باب اوّل:	**قرآن کے بارے میں ہمارا عقیدہ**	**115**
	(۱) قرآن: اللہ تعالیٰ کا کلام	115
	کلامِ الٰہی: جملہ صفاتِ الٰہیہ کا مظہر	116
	تورات کی گواہی	120
	لوحِ محفوظ اور مصحف میں مطابقت	121
	کلامِ الٰہی کی تین صورتیں	123
	(۲) قرآن کا رسول اللہ ﷺ پر نزول	126
	نزولِ قرآن کی دو کیفیتیں: انزال اور تنزیل	127
	حکمتِ تنزیل	129
	قرآن کریم کا زمانۂ نزول اور ارضِ نزول	132
	(۳) قرآن حکیم کی محفوظیت	133
باب دوم:	**چند متفرق مباحث**	**137**
	قرآن مجید کی زبان	137
	قرآن کے اسماء وصفات	141
	لفظ قرآن کی لغوی بحث	143
	قرآن کا اسلوبِ کلام	145
باب سوم:	**قرآن مجید کی ترکیب و تقسیم**	**151**
	آیات اور سورتوں کی تقسیم	151
	قرآن حکیم کی سات منازل	154
	رکوعوں اور پاروں کی تقسیم	157
	ترتیبِ نزولی اور ترتیبِ مصحف کا اختلاف	159

باب چهارم: تدوینِ قرآن 167

باب پنجم: قرآن مجید کا موضوع 175

باب ششم: فہمِ قرآن کے اصول 189

۱) قرآن کریم کا اسلوبِ استدلال 189

۲) قرآن حکیم میں محکم اور متشابہ کی تقسیم 191

۳) تفسیر اور تأویل کا فرق 193

۴) تأویل عام اور تأویل خاص 195

۵) تذکر و تدبر 196

۶) عملی ہدایات اور مظاہر طبیعی کے بارے میں متضاد طرزِ عمل 203

۷) فہم قرآن کے لیے جذبۂ انقلاب کی ضرورت 205

۸) قرآن کے منزّل من اللہ ہونے کا ثبوت 208

باب هفتم: اعجازِ قرآن کے اہم اور بنیادی وجوہ 211

قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ کا باہمی تعلق 211

محمد رسول اللہ ﷺ کا اصل معجزہ: قرآن حکیم 213

قرآن کا دعویٰ اور چیلنج 218

قرآن کس کس اعتبار سے معجزہ ہے؟ 220

عہد حاضر میں اعجازِ قرآن کا مظہر: علامہ اقبال 227

باب هشتم: قرآن مجید سے ہمارا تعلق 235

قرآن ''حبل اللہ'' ہے! 235

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق 242

❁❁❁

باب اوّل

قرآن کے بارے میں ہمارا عقیدہ

تعارفِ قرآن مجید کے سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کے بارے میں ہمارا ایمان' یا اصطلاحِ عام میں ہمارا عقیدہ کیا ہے؟

قرآن حکیم کے متعلق اپنا عقیدہ ہم تین سادہ جملوں میں بیان کر سکتے ہیں:

۱) قرآن اللہ کا کلام ہے۔

۲) یہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے۔

۳) یہ ہر اعتبار سے محفوظ ہے' اور کُل کا کُل مِن وعَن موجود ہے' اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔

یہ تین جملے ہمارے عقائد کی فہرست کے اعتبار سے' قرآن حکیم کے بارے میں ہمارے عقیدے پر کفایت کریں گے۔ لیکن انہی تین جملوں کے بارے میں اگر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے اور دقّتِ نظر سے ان پر غور کیا جائے تو کچھ علمی حقائق سامنے آتے ہیں۔ تمہیدی گفتگو میں ان میں سے بعض کی طرف اجمالاً اشارہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) قرآن: اللہ تعالیٰ کا کلام

سب سے پہلی بات کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے' خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ چنانچہ سورۃ التوبہ کی آیت ۶ میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے فرمایا:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ

''اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تا کہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے' پھر اسے

اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دو۔‘‘

جب سورۃ التوبہ کی پہلی چھ آیات نازل ہوئیں‘ جن میں مشرکین عرب کو آخری الٹی میٹم دے دیا گیا کہ اگر تم ایمان نہ لائے تو چار ماہ کی مدّت کے خاتمے کے بعد تمہارا قتل عام شروع ہو جائے گا‘ تو اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کو ایک ہدایت یہ بھی دی گئی کہ یہ الٹی میٹم دیے جانے کے بعد اگر مشرکین میں سے کوئی آپؐ کی پناہ طلب کرے تو وہ آپؐ کے پاس آ کر مقیم ہو اور کلام اللہ کو سنے‘ جس پر ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی ہے‘ پھر اسے اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دیا جائے۔ یعنی ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ وہیں اس سے مطالبہ کیا جائے کہ فیصلہ کرو کہ آیا تم ایمان لاتے ہو یا نہیں۔ اس وقت میں نے اس آیت کا حوالہ صرف ’’کلام اللہ‘‘ کے الفاظ کے لیے شہادت کے طور پر دیا ہے۔

کلامِ الٰہی: جملہ صفاتِ الٰہیہ کا مظہر

قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے میں ہی اس کی اصل عظمت کا راز مضمر ہے۔ اس لیے کہ کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے اور اس میں متکلّم کی پوری شخصیت ہویدا ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ کسی بھی شخص کا کلام سن کر اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کے علم اور فہم وشعور کی سطح کیا ہے۔ آیا وہ تعلیم یافتہ انسان ہے‘ مہذب ہے‘ متمدن ہے یا کوئی اجڈ یا گنوار ہے۔ اس اعتبار سے درحقیقت یہ کلام اللہ‘ اللہ تعالیٰ کی جملہ صفات کا مظہر ہے‘ اسی حقیقت کو علامہ اقبال نے نہایت خوبصورت انداز میں بیان کیا۔ ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست‘ چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں!
زندہ و پائندہ و گویا ست ایں!

(جو بات میرے دل میں چھپی ہوئی ہے وہ میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ یہ (قرآن حکیم) کتاب نہیں ہے‘ کوئی اور ہی شے ہے۔ چنانچہ یہ حق تعالیٰ کی ذات کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی ہے۔ نیز یہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے

والا بھی ہے اور یہ کلام بھی کرتا ہے۔)

مختلف مفاہیم و معانی کے لیے اس شعر کا حوالہ دے دیا جاتا ہے' لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ اس میں اس کے ''چیزے دیگر'' ہونے کا کون سا پہلو اُجاگر کیا جا رہا ہے۔ اس میں درحقیقت سورۃ الحدید کے اس مقام کی طرف اشارہ ہو گیا ہے کہ: ﴿هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ (آیت ۳) یعنی اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ الاوّل بھی ہے اور الآخر بھی' وہ الظاہر بھی ہے اور الباطن بھی۔ اسی طرح علامہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کی بھی یہی شان ہے۔ نیز جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفت الحیّ القیّوم (آیت الکرسی' سورۃ البقرۃ) ہے اسی طرح یہ کلام بھی زندہ و پائندہ ہے' ہمیشہ رہنے والا ہے۔ پھر یہ صرف کلام نہیں' خود متکلّم ہے۔

یہاں کلام اور متکلم کے مابین فرق کے حوالے سے متکلّمین کی اس بحث کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ذاتِ حق کی صفات' ذات سے علیحدہ اور مستزاد ہیں یا عین ذات؟ علامہ اقبال نے بھی اپنی مشہور نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں اس بحث کا ذکر کیا ہے ؎

ہیں صفاتِ ذاتِ حق' حق سے جدا یا عینِ ذات؟
اُمّتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

یہ علم کلام کا ایک نہایت ہی پیچیدہ' غامض اور عمیق مسئلہ ہے' جس پر بڑی بحثیں ہوئیں اور بالآخر متکلّمین کا اس پر تقریباً اجماع ہوا کہ ''لَا عَيْنٌ وَلَا غَيْرٌ '' یعنی اللہ کی صفات کو نہ اس کی ذات کا عین قرار دیا جا سکتا ہے نہ اس کا غیر۔ اگر اس حوالے سے غور کریں تو قرآن حکیم بھی' جو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے' اسی کے ذیل میں آئے گا' یعنی نہ اسے اللہ کا غیر کہا جا سکتا ہے نہ اس کا عین۔ چنانچہ اس حوالے سے سورۃ الحشر کی آیت ۲۱ قرآن مجید کی فی نفسہٖ عظمت کے ضمن میں اہم ترین ہے :

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتار دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خشیت

اور خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا' اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تا کہ وہ غور کریں۔''

اس تمثیل کو سورۃ الاعراف کی آیت ۱۴۳ کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طلبی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہِ طور پر حاضر ہونے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ یہ وہی طلبی تھی جس میں آپ علیہ السلام کو تورات عطا کی گئی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطبہ و مکالمہ سے سرفراز فرمایا تو ان کی آتش شوق کچھ اور بھڑکی اور انہوں نے فرمائش کرتے ہوئے کہا: ﴿رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ ؕ﴾ ''اے پروردگار! مجھے اپنا دیدار عطا فرما''۔ مخاطبہ و مکالمہ کے شرف سے تو نے مجھے مشرف فرمایا ہے' اب ذرا مزید کرم فرما۔ اس پر جواب ملا: ﴿لَنۡ تَرٰىنِیۡ﴾ ''(موسیٰ) تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے!'' ﴿وَلٰکِنِ انۡظُرۡ اِلَی الۡجَبَلِ﴾ ''لیکن ذرا اس پہاڑ کی طرف دیکھو' مَیں اس پر اپنی ایک تجلی ڈالوں گا۔ ﴿فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَکَانَہٗ فَسَوۡفَ تَرٰىنِیۡ ۚ﴾ ''چنانچہ اگر وہ پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہ جائے تو پھر تم بھی گمان کر لینا کہ تم مجھے دیکھ سکو گے''۔ ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلۡجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّ خَرَّ مُوۡسٰی صَعِقًا ۚ﴾ ''پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو وہ ''دَکًّا دَکًّا'' ہو گیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔''

یہاں ''دَکًّا'' کے دونوں ترجمے کیے جا سکتے ہیں' یعنی ریزہ ریزہ ہو جانا' ٹوٹ پھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا' یا کوٹ کوٹ کر کسی شے کو ہموار کر دینا' برابر کر دینا۔ جیسے سورۃ الفجر کی آیت ﴿کَلَّاۤ اِذَا دُکَّتِ الۡاَرۡضُ دَکًّا دَکًّا ﴿ۙ۲۱﴾﴾ میں ان معنوں میں وارد ہوا ہے۔ وہی لفظ یہاں پہاڑ کے بارے میں آیا ہے۔ یعنی وہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا یا دب گیا' زمین کے ساتھ بیٹھ گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی یہ تجلّی دیکھی جو بالواسطہ تھی' یعنی براہِ راست حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نہیں بلکہ پہاڑ پر تھی اور حضرت موسیٰؑ بالواسطہ اس کا نظارہ کر رہے تھے' لیکن خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کیفیت یہ ہوئی کہ ﴿خَرَّ مُوۡسٰی صَعِقًا﴾ ''حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بے ہوش ہو کر گر پڑے۔''

یہاں ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کی بحث کا ایک عقدہ حل ہو جاتا ہے کہ جیسے اللہ

تعالیٰ نے اپنی ذات کی تجلّی پہاڑ پر ڈالی تو وہ پہاڑ دب گیا یا پھٹ گیا‘ ریزہ ریزہ ہو گیا‘ اسی طرح قرآن مجید کے متعلق فرمایا:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ

یعنی کلام اللہ کی بھی وہی کیفیت اور تاثیر ہے جو کیفیت و تاثیر تجلیٔ ذاتِ الٰہی کی ہے۔ اس کہ قرآن اللہ کا کلام اور اللہ کی صفت ہے۔ تو تجلیٔ صفات اور تجلیٔ ذات میں کوئی فرق نہیں۔

البتہ علامہ اقبال نے ایک جگہ اس بارے میں ذرا مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ علامہ نے حضور ﷺ کی مدح فرماتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کیے کہ ؎

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری و تبسمی!

علامہ حضرت محمد ﷺ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تقابل کر رہے ہیں کہ وہ تو تجلیٔ صفات کے بالواسطہ نظارے ہی سے بے ہوش ہو کر گر گئے‘ لیکن اے نبیؐ! آپ نے عینِ ذات کا دیدار کیا اور تبسم کی کیفیت میں کیا۔ اس میں دو اعتبارات سے مغالطہ پایا جاتا ہے۔ اوّل تو وہ تجلی‘ تجلیٔ صفات نہیں تجلیٔ ذات تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فرمائش پر اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر ڈالی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ﴾ گویا یہاں اللہ تعالیٰ کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے کہ وہ خود متجلی ہوا۔ دوسرے یہ کہ یہ خیال بھی مختلف فیہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے شب معراج میں ذاتِ الٰہی کا مشاہدہ کیا۔ اگرچہ ہمارے اسلاف میں یہ رائے بھی ہے کہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے‘ لیکن اکثر و بیشتر کی رائے اس کے برعکس ہے‘ اس لیے کہ وہاں بھی ''آیات'' کا ذکر ہے۔ جیسا کہ سورۃ النجم میں آیا: ﴿لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ⑱﴾ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ آیات‘ جو وہاں حضور نبی اکرم ﷺ نے دیکھیں‘ اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین آیات میں سے ہیں۔

اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ⑯ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ⑰ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ⑱

''اُس وقت بیری پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ چندھیائی نہ حد سے

متجاوز ہوئی۔اور اُس نے اپنے ربّ کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔''

اب اُس سے زیادہ بڑی آیات اور اس سے زیادہ بڑی تجلّیٔ الٰہی اور کہاں ہوگی؟ لیکن دونوں اعتبار سے اس شعر میں مبالغہ ہے۔ البتہ اس آیۂ مبارکہ کے حوالے سے علامہ کے اس شعر ؎

مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں!
زندہ و پائندہ و گویا ست ایں!

میں میرے نزدیک قطعاً کوئی مبالغہ نہیں ہے۔اور اس آیت مبارکہ کے حوالے سے وہ بات کہی جاسکتی ہے جو علامہ اقبال نے اس شعر میں کہی ہے۔

تورات کی گواہی

اب ذرا قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کے حوالے سے ایک اور بات ذہن نشین کر لیجیے۔تورات میں کتابِ استثناء یا سِفر استثناء جو صحفِ موسیٰ میں سے ایک صحیفہ ہے' کے اٹھارہویں باب میں نبی اکرم ﷺ کے لیے جو پیشین گوئی بیان کی گئی ہے اس میں الفاظ یہی ہیں کہ:

''میں ان کے بھائیوں میں سے ان کے لیے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اس کے مُنہ میں اپنا کلام ڈالوں گا اور وہ اُن سے وہی کچھ کہے گا جو مَیں اس سے کہوں گا۔''

مَیں نے یہاں خاص طور پر ان الفاظ کا حوالہ دیا ہے کہ ''مَیں اُس کے مُنہ میں اپنا کلام ڈالوں گا۔'' یہاں ایک تو لفظ کلام آیا ہے جیسے کہ قرآن حکیم کی اس آیت میں آیا: ﴿حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ پھر ''کلام مُنہ میں ڈالنا'' کے حوالے سے قرآن مجید میں ایک لفظ دو مرتبہ آیا ہے' وہ لفظ ''قول'' ہے' یعنی قرآن کو قول قرار دیا گیا ہے۔

سورۃ الحاقہ میں ہے:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝

اور سورۃ التکویر میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿19﴾ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿20﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ
اَمِيْنٍ ﴿21﴾ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿22﴾

اور اسی میں آگے چل کر آیا:

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿25﴾

قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ ان دو مقامات میں سے مؤخر الذکر کے متعلق تقریباً اجماع ہے کہ یہاں حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں۔ گویا قرآن کو اُن کا قول قرار دیا گیا۔ اور سورۃ الحاقہ میں اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول قرار دیا جا رہا ہے۔ اب ظاہر ہے یہاں جن چیزوں کی نفی کی جا رہی ہے کہ ''یہ کسی شاعر کا قول نہیں'' اور ''یہ کسی کاہن کا قول نہیں'' ان سے یقیناً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اللہ کا کلام پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام پر نازل ہوا۔ اگر مَیں کتاب استثناء کے الفاظ استعمال کروں تو یہاں ''اللہ نے اپنا کلام ان کے مُنہ میں ڈالا''۔ تاہم ''اُن کے مُنہ'' کا ہم کوئی تصور نہیں کر سکتے' وہ نہایت جلیل القدر فرشتے ہیں۔ بہرحال قول کا لفظ قرآن مجید کے لیے استعمال ہوا ہے جس سے ظاہر ہے کہ ابتداءً کلامِ الٰہی حضرت جبرئیلؑ کے قول کی شکل میں اترا اور پھر حضرت جبرئیلؑ کے ذریعے سے حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنہ میں ڈالا گیا' اور وہاں سے یہ قولِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں لوگوں کے سامنے آیا' اس لیے کہ یہ آپؐ ہی کی زبانِ مبارک سے ادا ہوا' لوگوں نے اُسے صرف آپ ہی کی زبانِ مبارک سے سنا۔ گویا یہ قول' قولِ شاعر نہیں' یہ قولِ کاہن نہیں' یہ قولِ شیطان رجیم نہیں' بلکہ یہ قولِ رسولِ کریم ہے اور رسولِ کریم اوّلاً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں' یہ لوگوں کے سامنے ان کے قول کی حیثیت سے آیا۔ پھر ثانیاً یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا قول ہے' اس لیے کہ انہوں نے یہ قول حضورؐ کو پہنچایا۔ اور اس کو آخری درجے تک پہنچانے پر یہ اللہ کا کلام ہے جس کے متعلق تورات میں الفاظ آئے کہ ''مَیں اس کے مُنہ میں اپنا کلام ڈالوں گا۔''

لوحِ محفوظ اور مصحف میں مطابقت

کلام ہونے کے حوالے سے تیسری بات یہ نوٹ کیجئے کہ کلام اللہ کی صفت ہے اور

اللہ کی صفات قدیم ہیں۔ اللہ کی ذات کی طرح اس کی صفات کا بھی یہی معاملہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ مادیت اور جسمانیت سے ماوراء ہے۔ یہی معاملہ اللہ کی صفات کا بھی ہے۔ چنانچہ کلام اللہ' جسے حرف وصوت کی محدودیت سے اعلیٰ وارفع خیال کیا جاتا ہے' اسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے حروف واصوات کا جامہ پہنایا اور سید المرسلین صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے قلبِ مبارک پر بطریقِ تنزیل نازل فرمایا۔ یہی کلام لوحِ محفوظ میں اللہ کے پاس مندرج ہے جسے اُمّ الکتاب یا کتابِ مکنون بھی کہا گیا ہے۔ ہمارے پاس موجود قرآن مجید یا مصحف کی عبارت بعینہٖ وہی ہے جو لوحِ محفوظ یا اُم الکتاب میں ہے' بالکل اسی طرح جیسے کسی دستاویز کی مصدقہ نقل ہو' جو بغیر کسی شوشے کے فرق کے اصل کے مطابق ہو۔ چنانچہ سورۃ البروج میں فرمایا:

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿٢١﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿٢٢﴾

''یہ قرآن نہایت بزرگ و برتر ہے اور یہ لوحِ محفوظ میں ہے۔''

اسی کے متعلق سورۃ الواقعہ میں ارشاد فرمایا گیا:

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿٧٧﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿٧٨﴾ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿٧٩﴾

''یہ تو ایک کتاب ہے بڑی کریم' بہت باعزت' اور ایک ایسی کتاب ہے جو چھپی ہوئی ہے۔ جسے چھو ہی نہیں سکتے مگر وہی جو بہت ہی پاک کر دیے گئے ہیں۔''

یعنی ملائکہ مقربین' جن کے بارے میں ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿١٣﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿١٤﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿١٥﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿١٦﴾ (عبس)

''یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہیں' بلند مرتبہ ہیں' پاکیزہ ہیں' معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔''

درحقیقت یہ کتاب مکنون ان فرشتوں کے پاس ہے' وہ تمہاری رسائی سے بعید و ماوراء ہے۔ یہی بات سورۃ الزخرف میں کہی گئی ہے:

وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿٤﴾

''یہ تو درحقیقت اصل کتاب میں ہمارے پاس محفوظ ہے' بڑی بلند مرتبہ اور حکمت

سے لبریز۔‘‘

اُمّ کا لفظ جڑ اور بنیاد کے لیے آتا ہے۔ اسی لیے ماں کے لیے بھی عربی میں لفظ ’’اُمّ‘‘ استعمال ہوتا ہے‘ کیونکہ اسی کے بطن سے اولاد کی ولادت ہوتی ہے‘ وہ گویا کہ بمنزلۂ اساس ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی اصل اساس لوحِ محفوظ میں ہے‘ کتابِ مکنون میں ہے۔ مزید وضاحت کر دی گئی کہ ’’لَدَیْنَا‘‘ یعنی وہ اُمّ الکتاب جو ہمارے پاس ہے‘ اس میں یہ قرآن درج ہے۔ ’’ لَعَلِیٌّ حَکِیْمٌ ‘‘ اس قرآن کی صفات یہ ہیں کہ وہ بہت بلند و بالا اور حکمت والا ہے‘ مستحکم ہے۔ وہ اللہ کا کلام اور نہایت محفوظ کتاب ہے۔ اسے لوحِ محفوظ کہیں‘ کتابِ مکنون کہیں‘ یا اُمّ الکتاب کہیں‘ اصل کلام وہاں ہے —— اُسی عالم غیب میں‘ اُسی عالمِ امر میں —— جسے سوائے اُن پاک باز فرشتوں کے جن کی رسائی لوحِ محفوظ تک ہو‘ کوئی مَس نہیں کر سکتا‘ یعنی اس لوحِ محفوظ کے مضامین پر مطلع نہیں ہو سکتا۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر اپنے اس کلام کی تنزیل فرمائی اور اس کی عبارت کو تا قیامِ قیامت مصاحف میں محفوظ فرما دیا اور ناپاک ہاتھوں سے چھونے سے منع فرما دیا۔

کلامِ الٰہی کی تین صورتیں

جب میں نے عرض کیا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سے کس طرح ہم کلام ہوتا ہے! قرآن مجید میں اس کی تین شکلیں بیان ہوئی ہیں:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ (الشوریٰ)

’’کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے روبرو بات کرے۔ اس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے‘ یا پردے کے پیچھے سے‘ یا پھر وہ کوئی پیغامبر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔ یقیناً وہ برتر اور صاحبِ حکمت ہے۔‘‘

نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ اللہ کے لیے یہ ممکن نہیں ہے‘ اللہ تو ہر شے پر

قادر ہے' وہ جو چاہے کر سکتا ہے' اللہ کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں ہے' بلکہ کہا کہ انسان کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے براہ راست کلام کرے' کسی بشر کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے' سوائے تین صورتوں کے' یا تو وحی یعنی مخفی اشارے کے ذریعے سے' یا پردے کے پیچھے سے یا وہ کسی رسول (رسولِ مَلَک) کو بھیجتا ہے جو وحی کرتا ہے اللہ کے حکم سے جو اللہ چاہتا ہے۔

اب کلامِ الٰہی کی مذکورہ تین شکلیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ ان میں سے دو کے لیے لفظ وحی آیا ہے۔ درمیان میں ایک شکل ''مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ'' بیان ہوئی ہے۔ اس کا تذکرہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۴۳ کے ذیل میں ہو چکا ہے۔ اور یہ تو امر واقعہ ہے ہی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے متعدد مواقع پر اس صورت میں کلام فرمایا۔

پہلی مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب آگ کی تلاش میں کوہِ طور پر پہنچے تو وہاں مخاطبہ ہوا۔ یہ مخاطبہ اور مکالمۂ الٰہی حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ''مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ'' ہوا تھا' اسی لیے تو وہ آتش شوق بھڑکی تھی کہ ؎

کیا قیامت ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں' سامنے آتے بھی نہیں!

ظاہر ہے کہ جب ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے تو ایک قدم اور باقی ہے کہ مجھے دیدار بھی عطا ہو جائے' لیکن یہ مخاطبہ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی مخاطبہ شب معراج میں پردے کے پیچھے سے ہوا۔ بعض حضرات کی رائے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ (یعنی ذاتِ الٰہی) کا دیدار حاصل ہوا' لیکن میری رائے سلف میں سے ان حضرات کے ساتھ ہے جو اس کے قائل نہیں ہیں۔ ان میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بڑی اہمیت کی حامل ہیں' انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لازماً ان چیزوں کے بارے میں استفسار کیا ہوگا' چنانچہ ان کی بات کے متعلق تو ہم یقین کے درجے میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع ہے۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ''نُوْرٌ اَنّٰی یُرٰی؟'' یعنی اللہ تو نور ہے' اسے کیسے دیکھا جا سکتا ہے؟ (مسلم' کتاب الایمان' عن ابی ذر رضی اللہ عنہ)

نور تو دوسری چیزوں کو دیکھنے کا ذریعہ بنتا ہے' نور خود کیسے دیکھا جا سکتا ہے! بہرحال میری رائے ہے کہ یہ گفتگو بھی من وراء حجاب تھی۔ وہ وراء حجاب گفتگو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر مکالمہ ومخاطبہ میں نصیب ہوئی' اسی وراء حجاب ملاقات اور گفتگو سے اللہ تعالیٰ نے محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں ''عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى'' مشرف فرمایا۔

البتہ وحی براہِ راست بھی ہے' یعنی بغیر فرشتہ کے واسطہ کے۔ دوسری قسم کی وحی فرشتے کے ذریعے سے ہے اور قرآن مجید سے جس بات کی طرف زیادہ راہنمائی ملتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن وحی ہے بواسطہ ''مَلَک''۔ جیسے قرآن مجید میں ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿١٩٣﴾ عَلٰى قَلْبِكَ......﴾ (الشعراء:۱۹۴) ''اسے لے کر آپ کے دل پر روحِ امین اترا ہے......'' اور:﴿فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ﴾ (البقرۃ:۹۷) ''پس اسے جبریل نے ہی آپ کے قلب پر نازل کیا ہے''۔ البتہ فرشتے کے بغیر وحی' یعنی دل میں کسی بات کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست ڈال دیا جانا' یعنی ''الہام'' کا ذکر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے اور اس کے لیے حدیث میں ''نَفَثَ فِي الرَّوْعِ'' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ یعنی کسی نے دل میں کوئی بات ڈال دی' کسی نے پھونک مار دی بغیر اس کے کہ کوئی آواز سننے میں آئی ہو۔ ایک کیفیت صلصلۃ الجرس کی بھی تھی۔ حضورؐ کو گھنٹیوں کی سی آواز آتی تھی اور اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر وحی نازل ہو جاتی تھی۔

بہرحال تیقّن کے ساتھ تو مَیں نہیں کہہ سکتا' لیکن میرا گمانِ غالب ہے کہ دوسری قسم کی وحی (بذریعۂ فرشتہ) پر پورے کا پورا قرآن مشتمل ہے۔ اور وحی براہِ راست یعنی ''القاء'' تو درحقیقت وحی خفی ہے' جس کی وضاحت انگریزی کے دو الفاظ کے درمیان فرق سے بخوبی ہو جاتی ہے۔ ایک لفظ ہے inspiration اور دوسرا revelation' اس کے ساتھ ایک اور لفظ verbal revelation بھی اہم ہے۔ inspiration میں ایک مفہوم' ایک خیال یا تصور انسان کے ذہن وقلب میں آ جاتا ہے' جب کہ revelation باقاعدہ کسی چیز کے کسی پر reveal کیے جانے کو کہتے ہیں۔ اور اس میں بھی عیسائیوں کے ہاں ایک بڑی بحث چل رہی ہے۔ وہ revelation کو مانتے ہیں

لیکن verbal revelation کو نہیں مانتے' بلکہ ان کے نزدیک صرف مفہوم ہی انبیاء کے قلوب پر نازل کیا جاتا تھا' جسے وہ اپنے الفاظ میں ادا کرتے تھے۔ جبکہ ہمارے ہاں اس بارے میں مستقل اجماعی عقیدہ ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ یہ لفظاً بھی وحی ہے اور معناً بھی' لفظاً بھی اللہ کا کلام ہے اور معناً بھی' یعنی یہ verbal revelation ہے۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ لاہور ہی میں غالباً ایف سی کالج کے پرنسپل اور علامہ اقبال کے درمیان پیش آیا تھا۔ وہ دونوں کسی دعوت میں اکٹھے تھے کہ ان صاحب نے حضرتِ علامہ سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ بھی verbal revelation کے قائل ہیں! اس پر علامہ نے اُس وقت جو جواب دیا وہ اُن کی ذہانت پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جی ہاں' میں verbal revelation کو نہ صرف مانتا ہوں' بلکہ مجھے تو اس کا ذاتی تجربہ حاصل ہے۔ چنانچہ خود مجھ پر جب شعر نازل ہوتے ہیں تو وہ الفاظ کے جامے میں ڈھلے ہوئے آتے ہیں' میں کوئی لفظ بدلنا چاہوں تو بھی نہیں بدل سکتا' معلوم ہوتا ہے کہ وہ میری اپنی تخلیق نہیں ہیں بلکہ مجھ پر نازل کیے جاتے ہیں۔ تو یہ درحقیقت کسی کو جواب دینے کا وہ انداز ہے جس کو عربی میں ''الاجوبة المُسكتة'' یعنی چپ کرا دینے والا جواب کہا جاتا ہے۔ یہ وہ جواب ہے جس کے بعد فریق ثانی کے لیے کسی قیل وقال کا موقع ہی نہیں رہتا۔

بہرحال کلامِ الٰہی واقعتاً verbal revelation ہے جس نے اوّلاً قولِ جبرائیل کی شکل اختیار کی۔ حضرت جبرائیلؑ کے ذریعے قول کی شکل میں نازل ہوا۔ اور پھر زبانِ محمدؐ سے قولِ محمدیؐ کی شکل میں ادا ہوا۔ تو یہ درحقیقت revelation ہے' inspiration نہیں اور محض revelation بھی نہیں بلکہ verbal revelation ہے' یعنی معانی' مفہوم اور الفاظ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور یہ بحیثیت مجموعی اللہ کا کلام ہے۔

(۲) قرآن کا رسول اللہ ﷺ پر نزول

قرآن مجید کے محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر نزول کے ضمن میں بھی چند باتیں نوٹ

لیں۔ پہلی بحث تو ''نزول'' کی لغوی بحث سے متعلق ہے۔ یہ لفظ نَزَلَ' یَنْزِلُ ثلاثی مجرد میں بھی آتا ہے۔ تب یہ فعل لازم ہوتا ہے' یعنی ''خود اترنا''۔ قرآن مجید کے لیے ان معنوں میں یہ لفظ قرآن میں متعدد بار آیا ہے۔ مثلاً: ﴿وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ﴾ (بنی اسرائیل:۱۰۵) ''ہم نے اس قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ حق کے ساتھ نازل ہوا ہے''۔ یہاں یہ فعل لازم آ رہا ہے' یعنی نازل ہوا۔ عام طور پر فعل لازم کو متعدی بنانے کے لیے اس فعل کے ساتھ کسی صلہ' (preposition) کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ فعل نَزَلَ ''بِ'' کے ساتھ متعدی ہو کر بھی قرآن مجید میں آیا ہے' بمعنی اُس نے اتارا' جیسے جَاءَ ''وہ آیا'' سے جَاءَ بِہٖ ''وہ لایا''۔ مثلاً: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿١٩٣﴾ عَلٰى قَلْبِكَ......﴾ (الشعراء) یعنی رُوح الامین (جبرائیل) نے اس قرآن کو اُتارا ہے محمد ﷺ کے قلبِ مبارک پر۔

نزولِ قرآن کی دو کیفیتیں: اِنزال اور تنزیل

ثلاثی مزید فیہ کے دو ابواب یعنی بابِ افعال اور باب تفعیل سے یہ لفظ قرآن مجید میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ دونوں ابواب سے یہ فعل متعدی کے طور پر بمعنی ''اتارنا'' استعمال ہوتا ہے' یعنی اَنْزَلَ' یُنْزِلُ' اِنْزَالاً اور نَزَّلَ' یُنَزِّلُ' تَنْزِیْلًا۔ ان دونوں کے مابین فرق یہ ہے کہ بابِ افعال میں کوئی فعل دفعۃً اور یک دم کر دینے کے معنی ہوتے ہیں جبکہ باب تفعیل میں وہی فعل تدریجاً' اہتمام' توجہ اور محنت کے ساتھ کرنے کے معنی ہوتے ہیں۔ ان دونوں کے مابین فرق کو ''اِعلام'' اور ''تعلیم'' کے معنی کے فرق کے حوالے سے بہت ہی نمایاں طور پر اور جامعیت کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔ ''اِعلام'' کے معنی ہیں بتا دینا۔ یعنی آپ نے کوئی چیز پوچھی تو جواب دے دیا گیا۔ چنانچہ ''Information Office'' کو عربی میں ''مکتب الاعلام'' کہا جاتا ہے۔ جبکہ ''تعلیم'' کے معنی ذہن نشین کرانا اور تھوڑا تھوڑا کر کے بتانا ہے۔ یعنی پہلے ایک بات سمجھا دینا' پھر دوسری بات اس کے بعد بتانا اور اس طرح درجہ بدرجہ مخاطب کے فہم کی سطح بلند سے بلند تر کرنا۔

اگر چہ قرآن مجید کے لیے لفظ ''اِنْزَال'' اور اس سے مشتق مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں' لیکن بکثرت لفظ ''تنزیل'' استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید کی اصل شان تنزیلی شان ہے' یعنی یہ کہ اس کو تدریجاً' رفتہ رفتہ' تھوڑا تھوڑا اور نجماً نجماً نازل کیا گیا۔ چنانچہ قرآن مجید کے حضور ﷺ پر نزول کے لیے صحیح تر اور زیادہ مستعمل لفظ قرآن حکیم میں تنزیل ہے' تاہم دو مقامات پر لَيْلَةُ الْقَدْرِ اور لَيْلَةٌ مُّبٰرَكَةٌ کے ساتھ انزال کا لفظ آیا ہے ۔ فرمایا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ①﴾ (القدر) اور: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ (الدُّخان:۳) اسی طرح ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) میں بھی لفظ ''انزال'' استعمال ہوا ہے۔ پھر حضور ﷺ پر نزول کے لیے بھی کہیں کہیں لفظ ''انزال'' آیا ہے' اگرچہ اکثر و بیشتر لفظ ''تنزیل'' ہی آیا ہے۔ اس کی تقریباً مجمع علیہ تاویل یہ ہے کہ پورا قرآن دفعۃً لوح محفوظ سے سمائے دنیا تک لیلۃ القدر میں نازل کر دیا گیا' جسے ''لیلۂ مبارکہ'' بھی کہا گیا ہے جو کہ رمضان المبارک کی ایک رات ہے۔ لہٰذا جب رمضان مبارک کی لیلۃ القدر یا لیلۂ مبارکہ میں قرآن کے نزول کا ذکر ہوا تو لفظ انزال استعمال ہوا۔ قرآن مجید سمائے دنیا پر ایک ہی بار مکمل پورطور پر نازل ہونے کے بعد وہاں سے تدریجاً اور تھوڑا تھوڑا کر کے محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ لہٰذا حضور ﷺ پر نزول کے لیے اکثر و بیشتر لفظ تنزیل استعمال ہوا ہے۔

لفظ تنزیل کے ضمن میں سورۃ النساء کی آیت ۱۳۶ نہایت اہم ہے۔ ارشاد ہوا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ

''اے ایمان والو! ایمان لاؤ (جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے) اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اُس کتاب پر بھی جو اُس نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمائی اور اس کتاب پر بھی جو اُس نے پہلے نازل کی۔''

تورات تختیوں پر لکھی ہوئی' مکتوب شکل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی۔ وہ چونکہ دفعۃً اور جُملۃً واحدۃً دے دی گئی' اس لیے اِس کے لیے لفظ اِنزال آیا ہے' جبکہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے بائیس تیئیس برس میں نازل ہوا۔ لہٰذا اسی کے ضمن میں لفظ

''نَزَّلَ'' استعمال ہوا۔ چنانچہ متذکرہ بالا آیت میں ''تنزیل'' اور ''انزال'' ایک دوسرے کے بالکل مقابلے میں آئے ہیں۔ گویا یہاں ''تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا'' (چیزیں اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں) کا اصول درست بیٹھتا ہے۔

حکمتِ تنزیل

اب ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ تنزیل کی حکمت کیا ہے؟ یہ تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل کیا گیا اور ایک ہی بار کیوں نہ نازل کر دیا گیا؟ قرآن مجید میں اس کی دو حکمتیں بیان ہوئی ہیں۔

ایک تو یہ کہ لوگ شاید اس کا تحمل نہ کر سکتے۔ چنانچہ لوگوں کے تحمل کی خاطر تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا گیا تا کہ وہ اس کو اچھی طرح سمجھیں' اس پر غور کریں اور اسے حرزِ جان بنائیں اور اسی کے مطابق ان کے ذہن وفکر کی سطح بلند ہو۔ یہ حکمت سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰۶ میں بیان کی گئی ہے:

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا۝

''اور ہم نے قرآن کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں منقسم کر دیا تا کہ آپ تھوڑا تھوڑا کر کے اور وقفہ وقفہ سے لوگوں کو سناتے رہیں اور ہم نے اسے بتدریج اتارا۔''

اس حکمت کو سمجھنے کے لیے بارش کی مثال ملاحظہ کیجیے۔ بارش اگر ایک دم بہت موسلا دھار ہو تو اس میں وہ برکات نہیں ہوتیں جو تھوڑی تھوڑی اور تدریجاً ہونے والی بارش میں ہوتی ہیں۔ بارش اگر تدریجاً ہو تو زمین کے اندر جذب ہوتی چلی جائے گی' لیکن اگر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو تو اس کا اکثر و بیشتر حصہ بہتا چلا جائے گا۔ یہی معاملہ قرآن مجید کے انزال و تنزیل کا ہے۔ اس میں لوگوں کی مصلحت ہے کہ قرآن ان کے فہم میں' ان کے باطن میں' ان کی شخصیتوں میں تدریجاً سرایت کرتا چلا جائے۔ سرایت کے حوالے سے مجھے پھر علامہ اقبال کا شعر یاد آیا ہے۔ ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

''(یہ قرآن) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے' اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے!''

تو جب یہ قرآن کسی کے اندر اس طرح اتر جاتا ہے جیسے بارش کا پانی زمین میں جذب ہوتا ہے تو اس کی شخصیت میں سرایت کر جاتا ہے اور اس کے سرایت کرنے کے لیے اس کا تدریجاً تھوڑا تھوڑا نازل کیا جانا ہی حکمت پر مبنی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات سورۃ الفرقان میں کہی گئی ہے' اس لیے کہ وہاں کفارِ مکہ بالخصوص سردارانِ قریش کا باقاعدہ ایک اعتراض نقل ہوا ہے۔ فرمایا:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ۝

''منکرین کہتے ہیں: اس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا؟ —— ہاں' ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کو ہم اچھی طرح آپؐ کے ذہن نشین کرتے رہیں اور اس کو ہم نے بغرضِ ترتیل تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے۔ اور (اس میں یہ مصلحت بھی ہے کہ) جب کبھی وہ آپ کے سامنے کوئی نرالی بات (یا عجیب سوال) لے کر آئے' اُس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے آپ کو دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی۔''

اعتراض یہ تھا کہ یہ پورا قرآن یک دم' یک بارگی کیوں نہیں نازل کر دیا گیا؟ اس اعتراض میں جو وزن تھا' پہلے اس کو سمجھ لیجیے۔ انہوں نے جو بات کی درحقیقت اس سے مراد یہ تھی کہ جیسے ہمارا ایک شاعر دفعۃً پورا دیوان لوگوں کو فراہم نہیں کر دیتا' بلکہ وہ ایک غزل کہتا ہے' قصیدہ کہتا ہے' پھر مزید محنت کرتا ہے' پھر کچھ اور طبع آزمائی کرتا ہے' پھر کچھ اور کہتا ہے' اس طرح تدریجاً دیوان بن جاتا ہے' اسی طریقے سے محمد (ﷺ) کر رہے ہیں۔ اگر یہ اللہ کا کلام ہوتا تو پورے کا پورا یک دم نازل ہو سکتا تھا۔ یہ تو درحقیقت انسان کی کیفیت ہے کہ پوری کتاب دفعۃً produce نہیں کر دیتا۔ پورا دیوان تو کسی شاعر

نے ایک دن کے اندر نہیں کہا بلکہ اسے وقت لگتا ہے' وہ مسلسل محنت کرتا ہے' کچھ تکلف بھی کرتا ہے' کبھی آمد بھی ہو جاتی ہے' لیکن وہ کلام دیوان کی شکل میں تدریجاً مدوّن ہوتا ہے۔ تو یہ تو اسی طرح کی چیز ہے۔ ﴿لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً﴾ ''کیوں نہیں یہ قرآن اس پر یک دم نازل ہو گیا؟''

اب اس کا جواب دیا گیا: ﴿كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ﴾ ''یہ اس لیے کیا ہے تاکہ اے نبیؐ ہم اس کے ذریعے سے آپ کے دل کو تثبیت (جماؤ) عطا کریں۔'' یعنی وہ بات جو عام انسانوں کی مصلحت میں ہے وہ خود محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی مصلحت پر مبنی ہے کہ آپ کے لیے بھی شاید قرآن مجید کا یک بارگی تحمل کرنا مشکل ہو جاتا۔ سورۃ الحشر کے آخری رکوع میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ ''اگر ہم پورے کے پورے قرآن کو دفعۃً کسی پہاڑ پر نازل کر دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا''۔ (نوٹ کیجیے کہ یہاں لفظ ''انزال'' آیا ہے)۔ معلوم ہوا کہ قلبِ محمدیؐ کو جماؤ اور ٹھہراؤ عطا کرنے کے لیے اسے بتدریج نازل کیا گیا ہے۔ ﴿وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا﴾ ''اور ہم نے اس کو بغرضِ ترتیل تھوڑا تھوڑا کر کے اُتارا ہے''۔ ''رتل'' چھوٹے پیمانے کو' چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے کو کہتے ہیں۔

اگلی آیت میں جو ارشاد ہوا اس کے دونوں مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اے نبی! جو اعتراض بھی یہ ہم پر کریں گے ہم اس کا بہترین جواب آپ کو عطا کر دیں گے۔ لیکن دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ یہ ایک مسلسل کشاکش ہے جو آپ کے اور مشرکین عرب کے درمیان چل رہی ہے۔ آج وہ ایک بات کہتے ہیں' اگر اسی وقت اس کا جواب دیا جائے تو وہ درحقیقت آپ کی دعوت کے لیے موزوں ہے۔ اگر یہ سارے کا سارا کلامِ الٰہی ایک ہی مرتبہ نازل ہو جاتا تو حالات کے ساتھ اس کی مطابقت اور ان کی طرف سے پیش ہونے والے اعتراضات کا بروقت جواب نہ ہوتا اور اس کے اندر جو اثر انداز ہونے کی کیفیت ہے وہ حاصل نہ ہوتی۔ اس تدریج میں اپنی جگہ موزونیت ہے اور اس کی اپنی

تاثیر ہے۔اس اعتبار سے قرآن مجید کو تدریجاً نازل کیا گیا۔

قرآن کریم کا زمانۂ نزول اور ارضِ نزول

رسول اللہ ﷺ پر قرآن کے نزول کے ضمن میں اب دو چھوٹی چھوٹی چیزیں اور نوٹ کر لیجیے۔ یہ صرف معلومات کے ضمن میں ہیں۔اس کا زمانۂ نزول کیا ہے؟ ہم جس حساب (سن عیسوی) سے بات کرنے کے عادی ہیں' اسی حساب سے ہمارے ذہن کا صغریٰ کبریٰ بنا ہوا ہے۔اس اعتبار سے نوٹ کر لیجیے کہ قرآن حکیم کا زمانۂ نزول ۶۱۰ء سے ۶۳۲ء تک ۲۲ برس پر مشتمل ہے۔قمری حساب سے یہ ۲۳ برس بنیں گے۔۴۰ عام الفیل سے شروع کریں تو ۱۲ سال قبل ہجرت اور ۱۱ ہجری سال مل کر ۲۳ سال قمری بنیں گے' جن کے دوران یہ قرآن بطرزِ تنزیل تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔صحیح احادیث میں یہ شہادت موجود ہے کہ پہلے سورۃ العلق کی پانچ آیات نازل ہوئیں' پھر تین سال کا وقفہ آیا۔سورۃ العلق کی یہ پانچ آیات بھی چونکہ قرآن مجید کا حصہ ہیں' لہٰذا صحیح قول یہی ہے کہ قرآن حکیم کا زمانۂ نزول ۲۳ قمری یا ۲۲ شمسی سال ہے۔

اب یہ کہ نزول کی جگہ کون سی ہے؟ اس ضمن میں صرف ایک لفظ نوٹ کر لیجیے کہ تقریباً پورے کا پورا قرآن ''حجاز'' میں نازل ہوا۔اس لیے کہ آغازِ وحی کے بعد حضور اکرم ﷺ کا کوئی سفر حجاز سے باہر ثابت نہیں ہے۔آغازِ وحی سے قبل آپ نے متعدد سفر کیے ہیں۔آپؐ شام کا سفر کرتے تھے' یقیناً یمن بھی آپؐ جاتے ہوں گے۔اس لیے کہ الفاظِ قرآنی ''رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ'' کی رو سے قریش کے سالانہ دو سفر ہوتے تھے۔گرمیوں کے موسم میں شمال کی طرف جاتے تھے' اس لیے کہ فلسطین کا علاقہ نسبتاً ٹھنڈا ہے' اور سردیوں کے موسم میں وہ جنوب کی طرف (یمن) جاتے تھے' اس لیے کہ وہ گرم علاقہ ہے۔تو حضور اکرم ﷺ نے بھی تجارتی سفر کیے ہیں۔بعض محققین نے تو یہ امکان بھی ظاہر کیا ہے کہ آپؐ نے اُس زمانے میں کوئی بحری سفر بھی کیا اور گلف کو عبور کر کے مکران کے ساحل پر کسی جگہ آپؐ تشریف لائے (واللہ اعلم!)۔یہ بات میں نے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے ایک لیکچر میں سنی تھی جو انہوں نے حیدر آباد (سندھ) میں دیا تھا'

لیکن بعد میں اس پر جرح ہوئی کہ یہ بہت ہی کمزور قول ہے اور اس کے لیے کوئی سند موجود نہیں ہے۔ البتہ ''الخُبر'' جہاں آج آباد ہے وہاں پر تو ہر سال ایک بہت بڑا تجارتی میلہ لگتا تھا اور حضور ﷺ کا وہاں تک آنا ثابت ہے۔ بہرحال آپ کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ آغازِ وحی کے بعد دس سال تک تو مکہ مکرمہ میں رہے‘ اس کے بعد طائف کا سفر کیا ہے۔ پھر آس پاس ''عکاظ'' کا میلہ لگتا تھا اور منڈیاں لگتی تھیں‘ ان میں آپ نے سفر کیے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی ہے۔ اس کے بعد سب جنگیں حجاز کے علاقے ہی میں ہوئیں‘ سوائے غزوۂ تبوک کے۔ لیکن تبوک بھی اصل میں حجاز ہی کا شمالی سرا ہے۔ اس اعتبار سے حجاز ہی کا علاقہ ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا تھا۔ تاہم دو آیتیں اس اعتبار سے مستثنٰی قرار دی جاسکتی ہیں کہ وہ زمین پر نہیں بلکہ آسمان پر نازل ہوئیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں روایت موجود ہے کہ شب معراج میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو تین تحفے عطا کیے‘ ان میں نماز کی فرضیت اور دو آیاتِ قرآنی شامل ہیں۔ یہ سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات ہیں جو عرش کے دو خزانے ہیں جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو شب معراج میں عطا ہوئے۔ تو یہ دو آیتیں مستثنٰی ہیں کہ یہ زمین پر نازل نہیں ہوئیں بلکہ آپ ﷺ کو سدرۃ المنتہٰی پر دی گئیں اور خود آپ ساتویں آسمان پر تھے‘ جبکہ باقی پورا قرآن آسمان سے زمین پر نازل ہوا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے حجاز کا علاقہ مہبط وحی ہے۔

(۳) قرآن حکیم کی محفوظیت

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کے بارے میں تین بنیادی اور اعتقادی چیزیں ہیں:
اوّل‘ یہ اللہ کا کلام ہے۔ دوم‘ یہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ سوم‘ یہ مِن وعَن کُل کا کُل محفوظ ہے۔ اس میں نہ کوئی کمی ہوئی ہے نہ کوئی بیشی ہوئی ہے۔ نہ کمی ہوسکتی ہے نہ بیشی ہو سکتی ہے۔ نہ کوئی تحریف ہوئی ہے نہ کوئی تبدیلی۔ یہ گویا ہمارے عقیدے کا جزوِ لاینفک ہے۔ اس میں کچھ اشتباہ اہل تشیع نے پیدا کیا ہے‘ لیکن ان کی بات بھی میں کچھ یقین کے

ساتھ اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ ان کا یہ قول بھی سامنے آتا ہے کہ ''ہم اس قرآن کو محفوظ مانتے ہیں''۔ البتہ عوام میں جو چیزیں مشہور ہیں کہ قرآن سے فلاں آیات نکال دی گئیں' فلاں سورت حضرت علی ؓ کی مدح اور شان میں تھی' وہ اس میں سے نکال دی گئی وغیرہ' ان کے بارے میں مَیں نہیں کہہ سکتا کہ یہ ان میں سے عوام کالانعام کی باتیں ہیں یا ان کے اعتقادات میں شامل ہیں۔ لیکن یہ کہ بہرحال اہلِ سنت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ یہ قرآن حکیم محفوظ ہے اور کُل کا کُل مِن وعَن ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کے لیے خود قرآن مجید سے جو گواہی ملتی ہے وہ سب سے زیادہ نمایاں ہو کر سورۃ القیامۃ میں آئی ہے۔ فرمایا: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿١٦﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿١٧﴾﴾ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ازراہِ شفقت فرمایا کہ ''آپ اس قرآن کو یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔ اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے''۔ آپؐ مشقت نہ جھیلیں' یہ ذمہ داری ہماری ہے کہ ہم اسے آپؐ کے سینہ مبارک کے اندر جمع کر دیں گے اور اس کی ترتیب قائم کر دیں گے' اس کو پڑھوا دیں گے۔ جس ترتیب سے یہ نازل ہو رہا ہے اس کی زیادہ فکر نہ کیجیے۔ اصل ترتیب جس میں اس کا مرتب کیا جانا ہمارے پیش نظر ہے' جو ترتیب لوحِ محفوظ کی ہے اسی ترتیب سے ہم پڑھوا دیں گے۔ ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿١٩﴾﴾ پھر اگر آپ کو کسی چیز میں ابہام محسوس ہو اور وضاحت کی ضرورت ہو تو اس کی توضیح اور تدوین بھی ہمارے ذمہ ہے۔

یہ ساری ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے۔ اگر ان آیات کو کوئی شخص قرآن مجید کی آیات مانتا ہے تو اس کو ماننا پڑے گا کہ قرآن مجید پورے کا پورا جمع ہے' اس کا کوئی حصہ ضائع نہیں ہوا۔ صراحت کے ساتھ یہ بات سورۃ الحجر کی آیت ۹ میں مذکور ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿٩﴾﴾ ''ہم نے ہی اس ''الذکر'' کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔ یہ گویا ہمیشہ ہمیش کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے گارنٹی ہے کہ ہم نے اسے نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے خوبصورت شعر میں بیان کیا ہے: ع

حرفِ اُو را ریب نے ' تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

''اس کے الفاظ میں نہ کسی شک وشبہ کا شائبہ ہے نہ ردّ و بدل کی گنجائش۔ اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں۔''

اس شعر میں تین اعتبارات سے نفی کی گئی ہے: (۱) قرآن کے حروف میں یعنی اس کے متن میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ مِن وعَن محفوظ ہے۔ (۲) اس میں کہیں کوئی تحریف ہوئی ہو' کہیں تبدیلی کی گئی ہو' قطعاً ایسا نہیں۔ (۳) کیا اس کی آیات کی الٹ سلٹ تاویل بھی کی جا سکتی ہے؟ نہیں! یہ آخری بات بظاہر بہت بڑا دعویٰ معلوم ہوتا ہے' اس لیے کہ تاویل کے اعتبار سے قرآن مجید کے معنی میں لوگوں نے تحریف کی' لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں اگر کہیں معنوی تحریف کی کوشش بھی ہوئی ہے تو وہ قطعاً درجۂ استناد کو نہیں پہنچ سکی' اسے کبھی بھی استقلال اور دوام حاصل نہیں ہو سکا' قرآن نے خود اس کو ردّ کر دیا۔ جس طرح دودھ میں سے مکھی نکال کر پھینک دی جاتی ہے' ایسی تاویلات بھی اُمت کی تاریخ کے دوران کہیں بھی جڑ نہیں پکڑ سکی ہیں اور اسی طرح نکال دی گئی ہیں۔ اس بات کی سند بھی قرآن میں موجود ہے۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیت ۴۲ میں ہے: ﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ﴾

''باطل اس (قرآن) پر حملہ آور نہیں ہو سکتا' نہ سامنے سے نہ پیچھے سے' یہ ایک حکیم وحمید کی نازل کردہ چیز ہے۔''

یہ بات سرے سے خارج از امکان ہے کہ اس قرآن میں کوئی تحریف ہو جائے' اس کا کوئی حصہ نکال دیا جائے' اس میں کوئی غیر قرآن شامل کر دیا جائے —— سورۃ الحاقۃ کی یہ آیات ملاحظہ کیجیے جہاں گویا اس امکان کی نفی میں مبالغے کا انداز ہے:

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ﴿٤٤﴾ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ﴿٤٥﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ﴿٤٦﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ﴿٤٧﴾﴾

''(کوئی اور تو اس میں اضافہ کیا کرے گا) اگر یہ (ہمارے نبی محمد ﷺ) خود بھی

(بفرضِ محال) اپنی طرف سے کچھ گھڑ کر اس میں شامل کر دیں تو ہم انہیں داہنے ہاتھ سے پکڑیں گے اور ان کی شہ رگ کاٹ دیں گے۔ پھر تم میں سے کوئی (بڑے سے بڑا محافظ ان کا حامی و مددگار) نہیں ہو گا کہ جو انہیں ہماری پکڑ سے بچا سکے۔"

یہاں تو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی اس شدت کے ساتھ نفی کر دی گئی۔ کفار و مشرکین کی طرف سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ آپ اس قرآن میں کچھ نرمی اور لچک دکھائیں' یہ تو بہت rigid ہے' بہت ہی uncompromising ہے' بہر حال دنیا میں معاملات "کچھ لو کچھ دو" (give and take) سے طے ہوتے ہیں' لہٰذا کچھ آپ نرم پڑیں کچھ ہم نرم پڑتے ہیں۔ اس کے بارے میں فرمایا: ﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ﴾ (القلم) "وہ تو چاہتے ہیں کہ آپ کچھ ڈھیلے ہو جائیں تو یہ بھی ڈھیلے ہو جائیں گے"۔ اور سورۂ یونس میں ارشاد ہوا:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾

"جب انہیں ہماری آیاتِ بیّنات سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے' کہتے ہیں کہ اس قرآن کے بجائے کوئی اور قرآن لائیے یا اس میں کچھ ترمیم کیجئے۔ (اے نبی! ان سے) کہہ دیجیے میرے لیے ہرگز ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے خیال اور ارادے سے اس کے اندر کچھ تبدیلی کر سکوں۔ میں تو خود پابند ہوں اس کا جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔ اگر میں اپنے ربّ کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔"

یہ ہے قرآن مجید کی شان کہ یہ لفظاً' معناً' متناً کُلّی طور پر محفوظ ہے۔ ○○

باب دوم

چند متفرّق مباحث

قرآن مجید کی زبان

اب آیئے اگلی بحث کی طرف کہ قرآن مجید کی زبان کیا ہے اور اس زبان کی شان کیا ہے۔ یہ بات بھی قرآن مجید نے بہت تکرار و اعادہ کے ساتھ بیان کی ہے کہ یہ قرآن عربی مبین میں ہے' یعنی شستہ' صاف' سلیس' کھلی اور واضح عربی میں ہے۔

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ اس نے جن حروف و اصوات کا جامہ پہنا' وہ حروف و اصوات لوحِ محفوظ میں ہیں۔ اس کے بعد وہ کلامِ الٰہی' قولِ جبرائیل علیہ السلام اور قولِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن کر نازل ہوا اور لوگوں کے سامنے آیا۔ چنانچہ سورۃ الزخرف کے آغاز میں ارشاد ہوا:

حٰمٓ ۝١ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝٢ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝٣

''حٰم۔ قسم ہے اس واضح کتاب کی! ہم نے اسے قرآنِ عربی بنایا ہے تا کہ تم سمجھ سکو۔''

قرآن کی مخاطب اوّل قوم حجاز میں آباد تھی۔ اس سے کہا جا رہا ہے کہ ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں بنایا۔ اس نے اوّلاً حروف و اصوات کا جامہ پہنا ہے' پھر تمہاری زبان عربی کا جامہ پہن کر تمہارے سامنے نازل کیا گیا ہے تا کہ تم اس کو سمجھ سکو۔

یہی بات سورۃ یوسف کے شروع میں کہی گئی ہے:

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝١ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝٢

''ا' ل' ر۔ یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے۔

ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم سمجھ سکو۔"

سورۃ الشعراء میں فرمایا:

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ﴿﴾

"صاف صاف عربی زبان میں (نازل کیا گیا)۔"

سورۃ الزمر میں ارشاد فرمایا:

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴿﴾

"ایسا قرآن جو عربی زبان میں ہے' جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے' تاکہ وہ بچ کر چلیں۔"

اس میں کہیں کجی نہیں' کہیں کوئی اینچ پینچ نہیں' اس کی زبان بہت سلیس' شستہ اور بالکل واضح زبان ہے۔ اس میں کہیں پہیلیاں بجھوانے کا انداز نہیں ہے۔

اب نوٹ کیجیے کہ قرآن کی عربی کون سی عربی ہے؟ اس لیے کہ عربی زبان ایک ہے مگر اس کے dialects اور اس کی بولیاں بے شمار ہیں۔ خود جزیرہ نمائے عرب میں متعدد بولیاں تھیں' تلفظ اور لہجے مختلف تھے۔ بعض الفاظ کسی خاص علاقے میں مستعمل تھے اور دوسرے علاقے کے لوگ ان الفاظ کو جانتے ہی نہیں تھے۔ آج بھی کہنے کو تو مصر' لیبیا' الجزائر' موریطانیہ اور حجاز کی زبان عربی ہے' لیکن اُن کے ہاں جو فصیح عربی کہلاتی ہے وہ تو ایک ہی ہے۔ وہ درحقیقت ایک اس لیے ہے کہ قرآن مجید نے اسے دوام عطا کیا ہے۔ یہ قرآن مجید کا عربی زبان پر عظیم احسان ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں دوسری کوئی زبان بھی ایسی نہیں ہے جو چودہ سو برس سے ایک ہی شان اور ایک ہی کیفیت کے ساتھ باقی ہو۔ اردو زبان ہی کو دیکھئے۔ ۱۰۰ اور ۲۰۰ برس پرانی اردو آج ہمارے لیے ناقابلِ فہم ہے۔ دکن کی اردو ہمیں سمجھ میں نہیں آ سکتی' اس میں کتنی تبدیلی ہوئی ہے۔ اسی طرح فارسی زبان کا معاملہ ہے۔ ایک وہ فارسی تھی جو عربوں کی آمد اور اسلام کے ظہور کے وقت تھی۔ عربوں کے ہاتھوں ایران فتح ہوا تو رفتہ رفتہ اس فارسی کا رنگ بدلتا گیا۔ اب اس کو پھر بدلا گیا ہے اور اس میں سے عربی الفاظ نکال کر اس کے لہجے بھی بدل دیے گئے ہیں۔

ایک فارسی وہ ہے جو افغانستان میں بولی جاتی ہے' وہ ہماری سمجھ میں آتی ہے۔ اس لیے کہ جو فارسی یہاں پڑھائی جاتی تھی وہ یہی فارسی تھی۔ آج جو فارسی ایران میں پڑھائی جارہی ہے وہ بہت مختلف ہے' اپنے لہجے میں بھی اور اپنے الفاظ کے اعتبار سے بھی۔ لیکن عربی ''فصیح زبان'' ایک ہے۔ یہ اصل میں حجاز کے بدوؤں کی زبان تھی۔ پورا قرآن حکیم حجاز میں نازل ہوا۔ حجاز میں بادیہ نشین تھے۔ عربوں کا کہنا تھا کہ خالص زبان بادیہ نشینوں کی ہے' شہر والوں کی نہیں۔ جبکہ مکہ شہر تھا اور وہاں باہر سے بھی لوگ آتے رہتے تھے۔ قافلے آ رہے ہیں' جا رہے ہیں' ٹھہر رہے ہیں۔ جہاں اس طرح کی آمد و رفت ہو وہاں زبان خالص نہیں رہتی اور اس میں غیر زبانوں کے الفاظ شامل ہو کر مستعمل ہو جاتے ہیں اور بول چال میں آ جاتے ہیں۔ خاص اسی وجہ سے مکّہ کے شرفاء اپنے بچوں کو پیدائش کے فوراً بعد بادیہ نشینوں کے پاس بھیج دیتے تھے۔ ایک تو دودھ پلانے کا معاملہ تھا۔ دوسرا یہ کہ ان کی زبان صاف رہے' خالص عربی زبان رہے اور وہ ہر ملاوٹ سے پاک رہے۔ تو قرآن مجید حجاز کے بادیہ نشینوں کی زبان میں نازل ہوا۔

البتہ یہ ثابت ہے کہ قرآن مجید میں کچھ الفاظ دوسرے قبائل اور دوسرے علاقوں کی زبانوں کے بھی آئے ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے ایسے الفاظ کی فہرست مرتب کی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ غیر عربی الفاظ بھی قرآن مجید میں آئے ہیں جو مُعرّب ہو گئے ہیں۔ ابراہیم' اسمٰعیل' اسرائیل' اسحاق' یہ تمام نام درحقیقت عبرانی زبان کے الفاظ ہیں۔ لفظ ''اِیل'' عبرانی زبان میں اللہ کے لیے آتا ہے اور یہ لفظ ہمارے ہاں قرآن مجید کے ذریعے آیا ہے۔ اسی طریقے سے ''سِجّیل'' کا لفظ فارسی سے آیا ہے۔ صحرا میں کہیں بارش کے نتیجے میں ہلکی سی پھوار پڑی ہو تو بارش کے قطروں کے ساتھ ریت کے چھوٹے چھوٹے دانے بن جاتے ہیں اور پھر تیز دھوپ پڑنے پر وہ ایسے پک جاتے ہیں جیسے بھٹے میں اینٹوں کو پکا دیا گیا ہو۔ یہ کنکر ''سجیل'' کہلاتے ہیں جو ''سنگِ گل'' کا معرب ہے۔ باقی اکثر و بیشتر قرآن مجید کی زبان جس میں یہ نازل ہوا' وہ حجاز کے علاقے کے بادیہ نشینوں کی عربی ہے' جس میں فصاحت و بلاغت نقطۂ عروج پر ہے اور اس کا لوہا

مانا گیا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں ایک صوتی آہنگ ہے۔ اس کا ایک ''ملکوتی غنا'' (Divine Music) ہے' اس کی ایک عذوبت اور مٹھاس ہے۔ یہ دونوں چیزیں عرب میں پورے طور پر تسلیم کی گئی ہیں اور لوگوں پر سب سے زیادہ مرعوبیت قرآن حکیم کی فصاحت' بلاغت اور عذوبت ہی سے طاری ہوئی۔ ان کی اپنی زبان میں ہونے کے اعتبار سے ظاہر بات ہے کہ قرآن کے بہترین ناقد بھی وہی ہو سکتے تھے۔ واضح رہے کہ ادب میں ''تنقید'' دونوں پہلوؤں کو محیط ہوتی ہے۔ کسی چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا' اسے جانچنا' پرکھنا۔ اس میں کوئی خامی ہو تو اس کو نمایاں کرنا' اور اگر کوئی محاسن ہوں تو ان کو سمجھنا اور بیان کرنا۔ اس اعتبار سے اس کی فصاحت و بلاغت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ عربی زبان آج بھی مختلف علاقوں میں مختلف لہجوں اور بولیوں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایک علاقے کی عامی (colloquial) ربی دوسرے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ خود نزولِ قرآن کے زمانے میں نجد کے لوگوں کی زبان حجاز کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس کی وضاحت ایک حدیث میں بھی ملتی ہے کہ نجد سے کچھ لوگ آئے اور وہ حضور ﷺ سے گفتگو کر رہے تھے جو بڑی مشکل سے سمجھ میں آ رہی تھی اور لوگ اسے سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ آج بھی نجد کے لوگ جو گفتگو کرتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ عربی سے واقفیت ہونے کے باوجود ان کی عربی ہماری سمجھ میں نہیں آتی' ان کا لب و لہجہ بالکل مختلف ہے۔ قرآن حکیم کی زبان حجاز کے بادیہ نشینوں کی ہے۔ لہٰذا اگر تحقیق و تدبر قرآن کا حق ادا کرنا ہو تو جاہلیت کی شاعری پڑھنا ضروری ہے۔ ائمہ لغت نے ایک ایک لفظ کی تحقیق کر کے اور بڑی گہرائیوں میں اتر کر جاہلی شاعری کے حوالے سے جتنے بھی استشہاد ہو سکتے تھے ان کو کھنگال کر قرآن میں مستعمل الفاظ کے مادوں کے مفہوم معیّن کر دیے ہیں۔ ایک عام قاری کو' جو قرآن سے تذکر کرنا چاہے' صرف ہدایت حاصل کرنا چاہے' اس کھکیڑ میں پڑنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ البتہ تدبر قرآن

کے لیے جب تحقیق کی جاتی ہے تو جب تک کسی ایک لفظ کی اصل پوری طرح معلوم نہ کی جائے اور اس کے بال کی کھال نہ اتار لی جائے تحقیق کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے شعر جاہلی کی زبان کو سمجھنا تدبر قرآن کے لیے یقیناً ضروری ہے۔

قرآن کے اَسماء وصفات

اگلی بحث قرآن حکیم کے اسماء وصفات کی ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں قرآن حکیم کے اسماء وصفاتِ قرآن حکیم ہی سے لے کر پچپن (۵۵) ناموں کی فہرست مرتب کی ہے۔ میں نے جب اس پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ بھی کامل نہیں ہے' مثلاً لفظ ''برہان'' ان کی فہرست میں شامل نہیں ہے۔ درحقیقت قرآن مجید کی صفات' اس کی شانوں اور اس کی تاثیر کے لیے مختلف الفاظ کو جمع کیا جائے تو ۵۵ ہی نہیں اس سے زیادہ الفاظ بن جائیں گے' لیکن میں نے انہیں دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک تو وہ الفاظ ہیں جو مفرد کی حیثیت سے اور معرفہ کی شکل میں قرآن مجید میں قرآن کے لیے وارد ہوئے ہیں' جبکہ کچھ صفات ہیں جو موصوف کے ساتھ آ رہی ہیں۔ مثلاً ''قرآن مجید'' میں ''مجید'' قرآن کا نام نہیں ہے' درحقیقت صفت ہے۔ اسی طرح ''القرآن المجید'' میں اگرچہ ''الف لام'' کے ساتھ ''المجید'' آتا ہے' لیکن یہ چونکہ موصوف کے ساتھ مل کر آیا ہے لہٰذا یہ بھی صفت ہے۔

قرآن مجید کے لیے جو الفاظ بطور اسم آئے ہیں' ان میں سے اکثر و بیشتر وہ ہیں جن کے ساتھ لام تعریف لگا ہوا ہے۔ قرآن کے لیے اہم ترین نام جو اس کا امتیازی اور اختصاصی (The exclusive) نام ہے ''القرآن'' ہے۔ (میں بعد میں اس کی وضاحت کروں گا)۔ اس کے بعد کثرت سے استعمال ہونے والا نام ''الکتاب'' ہے۔ قرآن کی اصل حقیقت پر روشنی ڈالنے والا اہم ترین نام ''الذکر'' ہے۔ قرآن مجید کی افادیت کے لیے سب سے زیادہ جامع نام ''الھدیٰ'' ہے۔ قرآن مجید کی نوعیت اور حیثیت کے اعتبار سے اہم ترین نام ''النور'' ہے۔ قرآن مجید کی ایک انتہائی اہم شان جو

ایک لفظ کے طور پر آئی ہے ''الفرقان'' ہے۔یعنی (حق و باطل میں) فرق کر دینے والی شئے' دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا کر دینے والی شئے۔قرآن کا ایک نام ''الوحی'' بھی آیا ہے:﴿قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ﴾ (الانبیاء:۴۵)۔اسی طرح ''کلام اللہ'' کا لفظ بھی خود قرآن میں آیا ہے :﴿حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ:۶) چونکہ یہاں کلام مضاف واقع ہوا ہے' لہٰذا یہ بھی معرفہ بن گیا۔میرے نزدیک جنہیں ہم قرآن کے نام قرار دیں' وہ تو یہی بنتے ہیں۔اگر چہ' جیسا کہ میں نے عرض کیا' جو لفظ بھی قرآن کے لیے صفت کے طور پر یا اس کی شان کو بیان کرنے کے لیے قرآن میں آ گیا ہے علامہ جلال الدین سیوطی نے اس کو فہرست میں شامل کر کے ۵۵ نام گنوائے ہیں' لیکن یہ فہرست بھی مکمل نہیں۔

قرآن کریم کی مختلف شانوں اور صفات کے لیے یہ الفاظ آئے ہیں: (۱) كَرِيْمٌ: ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ﴾ (الواقعۃ) (۲) اَلْحَكِيْمُ: ﴿يٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝﴾ (یٰسٓ) (۳) اَلْعَظِيْمُ: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝﴾ (الحجر) (۴) مَجِيْدٌ اور اَلْمَجِيْدُ : ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝﴾ (البروج) اور ﴿قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝﴾ (قٓ) (۵) اَلْمُبِيْنُ: ﴿حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝﴾ (الزخرف) (۶) رَحْمَةٌ: ﴿هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (یونس) (۷) عَلِيٌّ: ﴿وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝﴾ (الزخرف) (۸) بَصَآئِرُ: ﴿قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ﴾ (الانعام:۱۰۴) (۹'۱۰) بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا: (حٰمٓ السجدۃ:۴) [اگر چہ یہ الفاظ انبیاء کے لیے آتے ہیں لیکن یہاں خود قرآن کے لیے بھی آئے ہیں۔ قرآن اپنی ذات میں فی نفسہٖ بشیر بھی ہے' نذیر بھی ہے] (۱۱) بُشْرٰى: ﴿وَبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾ (النحل:۸۹'۱۰۲) (۱۲) عَزِيْزٌ: ﴿وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝﴾ (حٰمٓ السجدۃ) (۱۳) بَلٰغٌ: ﴿هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ﴾ (ابراھیم:۵۲) (۱۴) بَيَانٌ: ﴿هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ﴾ (آل عمران:۱۳۸) (۱۵) مَوْعِظَةٌ (۱۶) شِفَآءٌ: ﴿قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ (یونس:۵۷) (۱۷) اَحْسَنُ

الْقَصَصِ:﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾ (یوسف:۳) (۱۸) اَحْسَنُ الْحَدِيْثِ (۱۹) مُتَشَابِه (۲۰) مَثَانِيَ:﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ﴾ (الزمر:۲۳) (۲۱) مُبَارَكٌ:﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ﴾ (ص:۲۹) (۲۲) مُصَدِّقٌ (۲۳) مُهَيْمِنٌ:﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾(المائدۃ:۴۸) (۲۴) قَيِّم: ﴿قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِنْ لَّدُنْهُ﴾ (الکھف:۲) یہ مختلف الفاظ ہیں جو قرآن حکیم کی مختلف شانوں کے لیے آئے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں' جو اس کی مختلف شانوں کو ظاہر کرتے ہیں' اسی طرح حضور ﷺ کے ناموں کی فہرست بھی آپ نے پڑھی ہوگی۔ آپ ﷺ کی مختلف شانیں ہیں' اس کے اعتبار سے آپ بشیر بھی ہیں' نذیر بھی ہیں' ہادی بھی ہیں' معلم بھی ہیں۔ قرآن مجید کے بھی مختلف اسماء وصفات ہیں۔

لفظ ''قرآن'' کی لغوی بحث:

قرآن مجید کے ناموں میں سب سے اہم نام ''القرآن'' ہے' جس کے لیے میں نے لفظ exclusive استعمال کیا تھا کہ یہ کسی اور کتاب کے لیے استعمال نہیں ہوا' ورنہ تورات کتاب بھی ہے' ہدایت بھی تھی' اور اس کے لیے لفظ نور بھی آیا ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ﴾ (المائدۃ:۴۴) ''ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت بھی ہے اور نور بھی''۔ خود قرآن مجید ہدایت بھی ہے' نور بھی ہے' رحمت بھی ہے۔ تو بقیہ تمام اوصاف تو مشترک ہیں' لیکن القرآن کے لفظ کا اطلاق کتب سماویہ میں سے کسی اور کتاب پر نہیں ہوتا۔ یہ امتیازی' اختصاصی اور استثنائی نام صرف قرآن مجید کے لیے ہے۔ اسی لیے ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسم علم ہے' اور اسم جامد ہے' اسم مشتق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام ''اللہ'' کے بارے میں بھی ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسم ذات ہے' اسم علم ہے' اسم جامد ہے' مشتق نہیں ہے' یہ کسی اور مادے سے نکلا ہوا نہیں ہے۔ جبکہ ایک رائے یہ ہے کہ یہ بھی صفت ہے' جیسے اللہ تعالیٰ کے دوسرے صفاتی نام ہیں۔ جیسے ''علیم'' اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور ''العلیم'' نام ہے' رحیم صفت ہے اور ''الرحیم''

نام ہے' اسی طرح الٰہ پر ''ال'' داخل ہوا تو ''الالٰہ'' بن گیا اور دو لام مدغم ہونے سے یہ ''اللہ'' بن گیا۔ یہ دوسری رائے ہے۔ جو معاملہ لفظ اللہ کے بارے میں اختلافی ہے بعینہٖ وہی اختلاف لفظ قرآن کے بارے میں ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسمِ جامد اور اسمِ علَم ہے' اس کا کوئی اور مادہ نہیں ہے' جبکہ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ اسم مشتق ہے۔ لیکن پھر اس کے مادے کی تعیین میں اختلاف ہے۔

ایک رائے کے مطابق اس کا مادہ ''قرن'' ہے' یعنی قرآن میں جو ''ن'' ہے وہ بھی حرفِ اصلی ہے۔ دوسری رائے کے مطابق اس کا مادہ ''ق ر ء'' ہے۔ یہ گویا مہموز ہے۔ میں یہ باتیں اہل علم کی دلچسپی کے لیے عرض کر رہا ہوں۔ جن لوگوں نے اس کا مادہ ''قرن'' مانا ہے' اُن کی بھی دو رائیں ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ جیسے عرب کہتے ہیں ''قَرَنَ الشَّیْءَ بِالشَّیْءِ'' (کوئی شے کسی دوسرے کے ساتھ شامل کر دی گئی) تو اس سے قرآن بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی آیات' اللہ تعالیٰ کا کلام جو وقتاً فوقتاً نازل ہوا' اس کو جب جمع کر دیا گیا تو وہ ''قرآن'' بن گیا۔ امام اشعری بھی اس رائے کے قائل ہیں۔ جبکہ ایک رائے امام فراء کی ہے' جو لغت کے بہت بڑے امام ہیں' کہ یہ قرینہ اور قرائن سے بنا ہے۔ قرائن کچھ چیزوں کے آثار ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کی آیات چونکہ ایک دوسرے سے مشابہ ہیں' جیسا کہ سورۃ الزمر میں قرآن مجید کی یہ صفت وارد ہوئی ہے ''کِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ''۔ اس اعتبار سے آپس میں یہ آیات قرناء ہیں۔ چنانچہ قرینہ سے قرآن بن گیا ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ اس کا مادہ ق ر ء ہے وہ قرآن کو مصدر مانتے ہیں۔ قَرَأَ' يَقْرَأُ' قَرْأً' وَقِرَاءَةً وَقُرْآنًا۔ یہ اگرچہ مصدر کا معروف وزن نہیں ہے لیکن اس کی مثالیں عربی میں موجود ہیں۔ جیسے رَجَحَ سے رُجحان اور غَفَرَ سے غُفران۔ ان کے مادہ میں ''ن'' شامل نہیں ہے۔ تو جیسے غفران اور رجحان مصدر ہیں' ایسے ہی قرأ سے مصدر قرآن ہے' یعنی پڑھنا۔ اور مصدر بسا اوقات مفعول کا مفہوم دیتا ہے۔ تو قرآن کا مفہوم ہو گا پڑھی جانے والی شے' پڑھی گئی شے۔ ''قَرَأَ'' میں جمع کرنے کا مفہوم بھی ہے۔ عرب کہتے ہیں:

قرأتُ المَاءَ فِي الْحَوْضِ ''میں نے حوض کے اندر پانی جمع کر لیا''۔ اسی سے قریہ بنا ہے' یعنی ایسی جگہ جہاں لوگ جمع ہو جائیں۔ گویا قرآن کا مطلب ہے اللہ کا کلام جہاں جمع کر دیا گیا۔ تمام آیات جب جمع کر لی گئیں تو یہ قرآن بن گیا۔ جیسے قریہ وہ جگہ ہے جہاں لوگ آباد ہو جائیں' مل جل کر رہ رہے ہوں۔ تو جمع کرنے کا مفہوم قَرَءَ میں بھی ہے اور قرن میں بھی ہے۔ یہ دونوں مادے ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ بہرحال یہ اس لفظ کی لغوی بحث ہے۔

قرآن کا اسلوبِ کلام

اب میں اگلی بحث پر آ رہا ہوں کہ اس کا اسلوب کلام کیا ہے! قرآن مجید نے شدّ و مد کے ساتھ جس بات کی نفی کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ شعر نہیں ہے۔ ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ﴾ (یٰسٓ :٦٩) ''ہم نے اپنے اس رسول کو شعر سکھایا ہی نہیں' نہ ان کے یہ شایانِ شان ہے''۔ شعراء کے بارے میں سورۃ الشعراء میں آیا ہے:

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ؕ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۙ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۙ

''اور شاعروں کی پیروی تو وہی لوگ کرتے ہیں جو گمراہ ہوں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں گھومتے رہتے ہیں (ہر میدان میں سرگرداں رہتے ہیں) اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے۔''

اگلی آیت میں ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ......﴾ کے الفاظ کے ساتھ استثناء بھی آیا ہے' اور استثناء قاعدہ کلیہ کی توثیق کرتا ہے (Exception proves the rule) — چنانچہ قرآن مجید کے اعتبار سے شعر گوئی کوئی اچھی شے نہیں' کوئی ایسی محمود صفت نہیں ہے کہ جو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو عطا فرماتا۔ بلکہ حضور اکرم ﷺ کا معاملہ تو یہ تھا کہ آپؐ کبھی کوئی شعر پڑھتے بھی تھے تو غلطی ہو جاتی تھی۔ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ پر سے اللہ تعالیٰ شاعری کی تہمت ہٹانا چاہتا تھا' لہٰذا آپ کے اندر شاعری کا وصف ہی پیدا

نہیں کیا گیا۔ سیرت کا ایک دلچسپ واقعہ آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ ایک شعر پڑھا اور اس میں غلطی ہوئی۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسکرائے اور عرض کی: ''اَشْھَدُ اَنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ'' ''میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں''۔ اس لیے کہ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ﴾۔ تو واقعتاً آپ کو شعر سے یعنی شعر کے وزن اور اس کی بحر وغیرہ سے مناسبت نہیں تھی۔ باقی جہاں تک شعر کے مفہوم کا اور اعلیٰ مضامین کا تعلق ہے تو خود حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ: ((اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا وَاِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَةً)) یعنی بہت سے بیان' بہت سے خطبے اور تقریریں جادو اثر ہوتے ہیں اور بہت سے اشعار کے اندر حکمت کے خزانے ہوتے ہیں۔ بعض شعراء کے اشعار حضور ﷺ نے خود پڑھے بھی ہیں اور ان کی تحسین فرمائی ہے' لیکن قرآن بہرحال شعر نہیں ہے۔

البتہ ایک بات کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ قدیم زمانے کی شاعری جس میں بحر' وزن اور ردیف و قافیہ کی پابندیاں سختی کے ساتھ ہوتی تھیں' اس کے اعتبار سے یقیناً قرآن شعر نہیں ہے' لیکن ایک شاعری جس کا رواج عصر حاضر میں ہوا ہے اور اس کے لیے غالباً قرآن ہی کے اسلوب کو چرایا گیا ہے' جسے آپ ''آزاد نظم'' (Blank Verse) کہتے ہیں' اس کے اندر جو صفات اور خصوصیات آج کل ہوتی ہیں اُن کا منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ اس لیے کہ اس میں ایک ردھم **(Rythm)** بھی ہوتا ہے' اس میں فواصل بھی ہیں' قوافی کی طرز پر صوتی آہنگ بھی ہے' لیکن وہ جو معروف شاعری تھی اس کے اعتبار سے قرآن بڑی تاکید کے ساتھ کہتا ہے کہ قرآن شعر نہیں ہے۔

قرآن کے اسلوب کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ عام معانی میں قرآن کتاب بھی نہیں ہے۔ میں یہاں اقبال کا مصرعہ quote کر رہا ہوں' اگرچہ اس کے وہ معانی نہیں ع این کتابے نیست چیزے دیگر است!

آج ہمارا کتاب کا تصور یہ ہے کہ اس کے مختلف ابواب ہوتے ہیں۔ آپ کسی

کتاب یا تصنیف میں ایک موضوع کو ایک باب (Chapter) کی شکل دیتے ہیں۔ ایک باب میں ایک بات مکمل ہو جانی چاہیے۔ اگلے باب میں بات آگے چلے گی' کوئی پچھلی بات نہیں دہرائی جائے گی۔ تیسرے باب میں بات اور آگے چلے گی۔ پھر ایک کتاب مضمون کے اعتبار سے ایک وحدت بنے گی اور اس کے اندر موضوعات اور عنوانات کے حوالے سے ابواب (Chapters) تقسیم ہو جائیں گے۔ گویا ہمارے ہاں معروف معنی میں کتاب کا اطلاق جس چیز پر کیا جاتا ہے' اس معنی میں قرآن کتاب نہیں ہے۔ البتہ یہ ''الکتاب'' ہے بمعنی لکھی ہوئی شے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے کتاب قرار دیا ہے اور اس کے لیے سب سے زیادہ کثرت سے یہی لفظ ''کتاب'' ہی قرآن میں آیا ہے۔ یہ لفظ ساڑھے تین سو (۳۵۰) جگہ آیا ہے۔ قرآن اور قرآناً تقریباً ۷۰ مقامات پر آیا ہے۔ لیکن ''قرآن'' exclusive آیا ہے' جبکہ کتاب کا لفظ تورات' انجیل' علم خداوندی اور تقدیر کے لیے بھی آیا ہے اور قرآن مجید کے حصّوں اور احکام کے لیے بھی آیا ہے۔ بہرحال کتاب اس معنی میں تو ہے۔ معاذ اللہ' کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآن کتاب نہیں ہے' لیکن جس معنی میں ہم لفظ کتاب بولتے ہیں اس معنی میں قرآن کتاب نہیں ہے۔

تیسری بات یہ کہ یہ مجموعۂ مقالات (Collection of Essays) بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہر مقالہ اپنی جگہ پر خود مکتفی اور ایک مکمل شے ہوتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کے بارے میں ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ تو پھر یہ ہے کیا؟ پہلی بات تو یہ نوٹ کیجیے کہ اس کا اسلوب خطبے کا ہے۔ عرب میں دو ہی چیزیں زیادہ معروف تھیں' خطابت یا شاعری۔ شعراء ان کے ہاں بڑے محبوب تھے۔ شاعری کا ان کو بڑا ذوق تھا اور وہ شعراء کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کے ہاں قصیدہ گوئی کے مقابلے ہوتے تھے۔ پھر ہر سال جو سب سے بڑا شاعر شمار ہوتا تھا اس کی عظمت کو تسلیم کرنے کی علامت کے طور پر سب شاعر اس کے سامنے باقاعدہ سجدہ کرتے تھے۔ پھر اس کا قصیدہ بیت اللہ پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ یہی قصائد ''سبعة معلّقة'' کے نام سے معروف ہیں۔ چنانچہ عرب یا تو شعروں سے واقف تھے یا خطبوں سے۔ تو قرآن مجید اُس دور کی دو سب سے زیادہ معروف اصناف

(شاعری اور خطبہ) میں خطبے کے اسلوب پر ہے۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن حکیم مجموعہ خطباتِ الٰہیہ (A Collection of Divine Orations) ہے' جس میں ہر سورت ایک خطبے کی مانند ہے۔

خطبے کے اعتبار سے چند باتیں نوٹ کر لیں۔ خطبے میں مخاطب اور خطیب کے درمیان ایک ذہنی رشتہ ہوتا ہے۔ مخاطب کو معلوم ہوتا ہے کہ میرے سامنے کون لوگ بیٹھے ہیں' ان کی فکر کیا ہے' ان کی سوچ کیا ہے' ان کے عقائد کیا ہیں' ان کے نظریات کیا ہیں۔ وہ ان کا حوالہ دیے بغیر اپنی گفتگو کے اندر اُن پر تنقید بھی کرے گا' ان کی تصحیح بھی کرے گا' لیکن کوئی تمہیدی کلمات نہیں ہوں گے کہ اب میں تمہاری فلاں غلطی کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں' میں اب تمہارے اس خیال کی نفی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ انداز نہیں ہوگا بلکہ وہ روانی کے ساتھ آگے چلے گا۔ مخاطِب اور مخاطَب کے مابین ایک ذہنی ہم آہنگی ہوتی ہے' وہ ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں' اور خاص طور پر مخاطبین کے فہم' اُن کی سمجھ' اُن کے عقائد' اُن کے نظریات سے خطیب واقف ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت خطبے کی شان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں تحویل خطاب ہوتی ہے اور بغیر وارننگ کے ہوتی ہے۔ بسا اوقات غائب کو حاضر فرض کر کے اس سے خطاب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک خطیب مسجد میں خطبہ دے رہا ہے اور وہ مخاطب کر رہا ہے صدر مملکت کو' حالانکہ وہ وہاں موجود نہیں ہوتے۔ اسی طرح جو لوگ بیٹھے ہوئے ہیں بسا اوقات ان سے صیغہ غائب میں گفتگو شروع ہو جائے گی' اور یہ بھی بلاغت کا انداز ہے۔ کبھی وہ ایک طرف بات کر رہا ہے' کبھی دوسری طرف کر رہا ہے' کبھی کسی غائب سے بات کر رہا ہے اور خطابت کا وہی انداز ہوگا اگرچہ وہ غائب وہاں موجود نہیں ہے۔ اس کو تحویل خطاب کہتے ہیں۔ قرآن مجید پر غور کرنے کے ضمن میں اس کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اگر خطاب کا رُخ معیّن ہو کہ یہ بات کس سے کہی جا رہی ہے' مخاطب کون ہے' تو اس بات کا اصل مفہوم اجاگر ہو کر سامنے آتا ہے' ورنہ اگر مخاطب کا تعین نہ ہو تو بہت سے بڑے بڑے مغالطے جنم لے سکتے ہیں۔

خطبے اور مقالے میں ایک واضح فرق یہ ہوتا ہے کہ مقالے میں عام طور پر صرف

عقل سے اپیل کی جاتی ہے۔ اس میں منطق اور عقلی دلائل ہوتے ہیں' جبکہ خطبے میں عقل کے ساتھ ساتھ جذبات سے بھی اپیل ہوتی ہے۔ گویا کہ انسان کے اندر جھانک کر بات کی جاتی ہے۔ لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ اپنے اندر جھانکو۔ ﴿وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ (الذّٰریٰت) ''اور خود تمہارے اندر بھی (نشانیاں ہیں) تو کیا تم کو سوجھتا نہیں ہے؟'' ﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (ابراھیم:۱۰) ''(ذرا غور کرو) کیا اللہ کے بارے میں شک کرتے ہو جو زمین و آسمان کا بنانے والا ہے؟'' یہ انداز بہرحال کسی تحریر یا مقالے میں نہیں ہوگا' یہ خطبے کا انداز ہے۔

ایک اور بات جو خطبے کے اعتبار سے اس کے خصائص میں سے ہے وہ یہ کہ ایک مؤثر خطبے کے شروع میں بہت جامع گفتگو ہوتی ہے۔ کامیاب خطبہ وہی ہوگا جس کا آغاز ایسا ہو کہ مقرّر اور خطیب اپنے مخاطبین اور سامعین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لے۔ اور پھر اگرچہ خطبے کے دوران مضمون دائیں بائیں پھیلے گا' اِدھر جائے گا' اُدھر جائے گا' لیکن آخر میں آ کر وہ پھر کسی مضمون کے اوپر مرتکز ہو جائے گا۔ یہ اگر نہیں ہے تو گویا کہ وقت ضائع ہو گیا۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے خطیب پیدا ہوئے ہیں۔ خاص طور پر مجلسِ احرار نے بڑے عوامی خطیب پیدا کیے' جن میں سے عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بہت بڑے خطیب تھے۔ ان کی تقریر کا یہ عالَم ہوتا تھا کہ گفتگو چار چار گھنٹے' پانچ پانچ گھنٹے چل رہی ہے۔ اس میں کبھی مشرق کی' کبھی مغرب کی' کبھی شمال کی اور کبھی جنوب کی بات آ جاتی۔ کبھی ہنسانے کا اور کبھی رلانے کا انداز ہوتا' کہیں لطیفہ گوئی بھی ہو جاتی۔ لیکن اوّل و آخر بات بالکل واضح ہوتی۔ خوب گھما پھرا کر بھی مخاطب کو کسی ایک بات پر لے آنا کہ اٹھے تو کوئی ایک بات' کوئی ایک پیغام لے کر اٹھے' کوئی ایک جذبہ اس کے اندر جاگ چکا ہو' ایک پیغام اس تک پہنچ چکا ہو' یہ خطبے کے اوصاف ہیں۔

آپ کو معلوم ہے خواہ غزل ہو یا قصیدہ' شاعری میں مطلع اور مقطع دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ مطلع جاندار ہے تو آپ پوری غزل پڑھیں گے اور اگر مطلع ہی پھسپھسا ہے تو

آگے آپ کیا پڑھیں گے! اسی طرح مقطع بھی جاندار ہونا چاہئے۔ اسی لیے مقطع اور مطلع کے الفاظ علیحدہ سے وضع کیے گئے ہیں۔ خطبات کے اندر بھی ابتدا اور اختتام پر نہایت جامع اور اہم مضمون ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی سورتوں کی ابتدا اور اختتام بھی نہایت جامع مضامین پر ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی سورتوں کی ابتدائی آیات اور اختتامی آیات کی فضیلت پر بہت سی احادیث ملتی ہیں۔ سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات اور اختتامی آیات' اسی طرح سورۃ آل عمران کی شروع کی آیات اور پھر اختتامی آیات نہایت جامع ہیں۔ یہ انداز اکثر و بیشتر سورتوں میں ملے گا۔ یہ ہے اصل میں بالعموم قرآن مجید کا اسلوب' جو ظاہر بات ہے شاعری کا نہیں ہے۔ عام معانی میں وہ کتاب نہیں' مجموعۂ مقالات نہیں۔ اس کا اسلوب اگر ہے تو وہ خطبے سے ملتا ہے۔ یہ گویا خطباتِ الٰہیہ ہیں جن کا مجموعہ ہے قرآن!

باب سوم

قرآن مجید کی ترکیب و تقسیم

آیات اور سورتوں کی تقسیم

بہت سی چیزوں سے مل کر کوئی شے مرکب بنتی ہے۔قرآن کلام مرکب ہے۔اس کی تقسیم سورتوں اور آیات میں ہے۔پھر اس میں احزاب اور گروپ ہیں۔عام تصورِ کتاب تو یہ ہے کہ اس کے ابواب ہوتے ہیں' لیکن قرآن حکیم پر ان اصطلاحات کا اطلاق نہیں ہوتا۔قرآن حکیم نے اپنی اصطلاحات خود وضع کی ہیں۔ان اصطلاحات کی دنیا میں موجود کسی بھی کتاب کی اصطلاحات سے کوئی مشابہت نہیں ہے۔چنانچہ علامہ جاحظ نے ایک بڑا خوبصورت عنوان قائم کیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ عرب اس سے تو واقف تھے کہ ان کے بڑے بڑے شعراء کے دیوان ہوتے تھے۔سارا کلام کتابی شکل میں جمع ہو گیا تو وہ دیوان کہلایا۔لہٰذا کسی بھی درجے میں اگر مثال اور تشبیہہ سے سمجھنا چاہیں تو دیوان کے مقابلے میں لفظ قرآن ہے۔پھر دیوان بہت سے قصائد کا مجموعہ ہوتا تھا۔ہمارے ہاں بھی کسی شاعر کا دیوان ہو گا تو اس میں قصائد ہوں گے' غزلیں ہوں گی' نظمیں ہوں گی۔قرآن حکیم میں اس سطح پر جو لفظ ہے وہ سورت ہے۔اللہ تعالیٰ کا یہ کلام سورتوں پر مشتمل ہے۔اگر کوئی نثر کی کتاب ہے تو وہ جملوں پر مشتمل ہو گی اور اگر نظم کی ہے تو وہ اشعار پر مشتمل ہو گی۔اس کی جگہ قرآن مجید کی اصطلاح آیت ہے۔شاعری میں اشعار کے خاتمے پر ردیف کے ساتھ ساتھ ایک لفظ قافیہ کہلاتا ہے اور غزل کے تمام اشعار ہم قافیہ ہوتے ہیں۔قرآن مجید پر بھی ہم عام طور پر اس لفظ کا اطلاق کر دیتے ہیں' اس لیے کہ قرآن مجید کی آیات میں بھی آخری الفاظ کے اندر صوتی آہنگ ہے۔یہاں انہیں فواصل کہا جاتا ہے' قافیہ کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا کہ کسی بھی درجے میں شعر کے ساتھ

کوئی مشابہت نہ پیدا ہو جائے۔

قرآن مجید کا سب سے چھوٹا یونٹ آیت ہے۔ یعنی قرآن مجید کی ابتدائی اکائی کے لیے لفظ آیت اخذ کیا گیا ہے۔ آیت کے معنی نشانی کے ہیں۔ قرآنی آیت گویا اللہ کے علم وحکمت کی نشانی ہے۔ آیت کا لفظ قرآن مجید میں بہت سے معانی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی۔ اس کائنات میں ہر طرف اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔ کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی قدرت' اس کے علم اور اس کی حکمت کی گواہی دے رہی ہے۔ گویا ہر شے اللہ کی نشانی ہے۔ پھر کچھ نشانیاں ہمارے اندر ہیں۔ چنانچہ فرمایا:
﴿وَفِي الْأَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝٢٠ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝٢١﴾ (الذّٰریٰت)
''اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لیے۔ اور خود تمہارے اپنے وجود میں بھی۔ کیا تم کو سوجھتا نہیں؟'' مزید فرمایا: ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ﴾ (حٰم السجدة:٥٣) ''عنقریب ہم اُن کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی' یہاں تک کہ اُن پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے''۔ انگریزی میں آیت کے لیے ہم لفظ verse بول دیتے ہیں' مگر verse تو شعر کو کہتے ہیں جبکہ قرآن کی آیات نہ تو شعر ہیں' نہ مصرعے ہیں' نہ جملے ہیں۔ پس بعینہٖ لفظ آیت ہی کو عام کرنا چاہیے۔ بہرحال کچھ آیاتِ آفاقی ہیں' یعنی اللہ کی نشانیاں' کچھ آیاتِ انفسی ہیں' وہ بھی اللہ کی نشانیاں ہیں اور آیاتِ قرآنیہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور علم کامل کی نشانیاں ہیں۔ یہ لفظ قرآن کی اکائی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

جان لینا چاہیے کہ آیات کا تعین کسی گرامر' بیان یا نحو کے اصول پر نہیں ہے' اس میں کوئی اجتہاد داخل نہیں ہے' بلکہ اس کے لیے ایک اصطلاح ''توقیفی'' استعمال ہوتی ہے' یعنی یہ رسول اللہ ﷺ کے بتانے پر موقوف ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آیات بہت طویل بھی ہیں۔ ایک آیت آیۃ الکرسی ہے جس میں مکمل دس جملے ہیں' لیکن بعض آیات حروفِ مقطعات پر بھی مشتمل ہیں۔ ﴿حٰمٓ ۝١﴾ ایک آیت ہے' حالانکہ اس کا کوئی مفہوم

معلوم نہیں ہے' عام زبان کے اعتبار سے اس کے معانی معین نہیں کیے جا سکتے۔ یہ تو حروف تہجی ہیں۔ اس کو مرکب کلام بھی نہیں کہہ سکتے' کیونکہ اس کو علیحدہ علیحدہ پڑھا جاتا ہے۔ اس لیے یہ حروفِ مقطعات کہلاتے ہیں۔ ﴿حٰمٓ ۞ عٓسٓقٓ ۞﴾ ان کو جمع نہیں کر سکتے' یہ توڑ توڑ کر علیحدہ علیحدہ پڑھے جائیں گے۔ اسی طرح ''الٓمٓ'' کو ''اَلَمْ'' نہیں پڑھا جا سکتا۔ لیکن یہ بھی آیت ہے۔ اس ضمن میں ایک بات یاد رکھئے کہ جہاں حروفِ مقطعات میں سے ایک ایک حرف آیا ہے جیسے ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ۞﴾ ' ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ۞﴾' ﴿قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ۞﴾ یہاں ایک حرف پر آیت نہیں بنی' لیکن دو دو حروف پر آیتیں بنی ہیں۔ ''حٰمٓ'' قرآن میں سات جگہ آیا ہے اور یہ مکمل آیت ہے۔ الٓمٓ آیت ہے۔ البتہ ''الٓرٰ'' تین حروف ہیں اور وہ آیت نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کی بنیاد کسی اصول' قاعدے یا اجتہاد پر نہیں ہے' بلکہ یہ امور کلیتہً توقیفی ہیں کہ حضورﷺ کے بتانے سے معلوم ہوئے ہیں۔ البتہ پھر حضورﷺ سے چونکہ مختلف روایات ہیں' اس لیے اس پہلو سے کہیں کہیں فرق واقع ہوا ہے۔ چنانچہ آیاتِ قرآنیہ کی تعداد متفق علیہ نہیں ہے۔ اس پر تو اتفاق ہے کہ آیات کی تعداد چھ ہزار سے زائد ہے' لیکن بعض کے نزدیک کم و بیش ۶۲۱۶' بعض کے نزدیک ۶۲۳۶ اور بعض کے نزدیک ۶۶۶۶ ہے۔ اس کے مختلف اسباب ہیں۔ بعض سورتوں کے اندر آیات کے تعین میں بھی فرق ہے۔ لیکن یہ سب کسی کا اپنا اجتہاد نہیں ہے' بلکہ سب کے سب اعداد و شمار حضورﷺ سے نقل ہونے کی بنیاد پر ہیں۔ ایک فرق یہ بھی ہے کہ آیت بسم اللہ قرآن حکیم میں ۱۱۳ مرتبہ سورتوں کے شروع میں آتی ہے (کیونکہ سورتوں کی کل تعداد ۱۱۴ ہے اور ان میں سے صرف ایک سورت سورۃ التوبہ کے شروع میں بسم اللہ نہیں آتی۔) اگر اس کو ہر مرتبہ شمار کیا جائے تو ۱۱۳ تعداد بڑھ جائے گی' ہر مرتبہ شمار نہ کیا جائے تو ۱۱۳ تعداد کم ہو جائے گی۔ اس اعتبار سے آیاتِ قرآنیہ کی تعداد متفق علیہ نہیں ہے' بلکہ اس میں اختلاف ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا کہ حروف مقطعات پر بھی آیت ہے' مرکباتِ ناقصہ پر بھی آیت ہے' جیسے ﴿وَالْعَصْرِ ۞﴾ کہیں آیت مکمل جملہ

بھی ہے' اور ایسی آیتیں بھی ہیں جن میں دس دس جملے ہیں۔

قرآن حکیم کی آیتیں جمع ہوتی ہیں تو سورتیں وجود میں آتی ہیں۔ سورت کا لفظ ''سُور'' سے ماخوذ ہے اور یہ لفظ سورۃ الحدید میں فصیل کے معنی میں آیا ہے۔ پچھلے زمانے میں ہر شہر کے باہر' گرداگرد ایک فصیل ہوتی تھی جو شہر کا احاطہ کر لیتی تھی' شہر کی حفاظت کا کام بھی دیتی تھی اور حد بندی بھی کرتی تھی۔ آیات کو جب جمع کیا گیا تو اس سے جو فصیلیں وجود میں آئیں وہ سورتیں ہیں۔ فصل علیحدہ کرنے والی شے کو کہتے ہیں۔ تو گویا ایک سورۃ دوسری سورۃ سے علیحدہ ہو رہی ہے۔ فصیل علیحدگی کی بنیاد ہے۔ فصیل کے لیے ''سُور'' کا لفظ مستعمل ہے' پھر اس سے سورت بنا ہے۔ البتہ یہ سورتیں ''ابواب'' نہیں ہیں' بلکہ جس طرح آیت کے لیے لفظ verse مناسب نہیں اسی طرح سورت کے لیے لفظ ''باب'' یا chapter درست نہیں۔

اب جان لیجیے کہ جیسے آیات کا معاملہ ہے ایسے ہی سورتوں کا بھی ہے۔ چنانچہ سورتیں بہت چھوٹی بھی ہیں۔ قرآن مجید کی تین سورتیں صرف تین تین آیات پر مشتمل ہیں: سورۃ العصر' سورۃ النصر اور سورۃ الکوثر۔ جبکہ تین سورتیں ۲۰۰ سے زائد آیات پر مشتمل ہیں۔ سورۃ البقرۃ کی ۲۸۵ یا ۲۸۶ آیات ہیں۔ (سورۃ البقرۃ کی آیات کی تعداد کے اعتبار سے رائے میں فرق ہے۔) سب سے زیادہ آیات سورۃ البقرۃ میں ہیں۔ پھر سورۃ الشعراء میں ۲۲۷ اور سورۃ الاعراف میں ۲۰۶ آیات ہیں۔ محققین وعلماء کا اس پر اجماع ہے کہ آیات کی طرح سورتوں کا تعین بھی حضور ﷺ نے خود فرمایا۔ اگرچہ ایک ضعیف سا قول ملتا ہے کہ شاید یہ کام صحابہ کرام ؓ نے کسی اجتہاد سے کیا ہو' مگر یہ مختار قول نہیں ہے' ضعیف ہے۔ اجماع اسی پر ہے کہ آیتوں کی تعیین بھی توقیفی اور سورتوں کی تعیین بھی توقیفی ہے۔

قرآن حکیم کی سات منازل

دَورِ صحابہؓ میں ہمیں ایک تقسیم اور ملتی ہے اور وہ ہے سات منزلوں کی شکل میں سورتوں کی گروپنگ۔ انہیں احزاب بھی کہتے ہیں۔ ''حزب'' کا لفظ احادیث میں ملتا

ہے' لیکن وہ ایک ہی معنی میں نہیں ہوتا۔ یہ لفظ اس معنی میں بھی استعمال ہوتا تھا کہ ہر شخص اپنے لیے تلاوت کی ایک مقدار معیّن کر لیتا تھا کہ میں اتنی مقدار روزانہ پڑھوں گا۔ یہ گویا کہ اس کا اپنا حزب ہے۔ چنانچہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ نَامَ عَنْ حِزْبِهٖ مِنَ اللَّيْلِ' اَوْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ' فَقَرَاَهٗ مَا بَيْنَ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَصَلَاةِ الظُّهْرِ' كُتِبَ لَهٗ كَاَنَّمَا قَرَاَهٗ مِنَ اللَّيْلِ))

(اخرجه الجماعة الا البخاری)

''جو شخص نیند (یا بیماری) کی وجہ سے رات کو (تہجد میں) اپنے حزب کو پورا نہ کر سکے' پھر وہ فجر اور ظہر کے درمیان اس کی تلاوت کر لے تو اس کے لیے اتنا ہی ثواب لکھا جائے گا گویا اس نے اسے رات کے دوران پڑھا ہے''۔ (یہ حدیث بخاری کے سوا دیگر ائمہ حدیث نے روایت کی ہے۔)

یعنی جو شخص کسی وجہ سے کسی رات اپنے حزب کو پورا نہ کر سکے' جتنا بھی نصاب اس نے معیّن کیا ہو' کسی بیماری کی وجہ سے' یا نیند کا غلبہ ہو جائے' تو اسے چاہیے کہ اپنی اس قراءت یا تلاوت کو وہ دن کے وقت ضرور پورا کر لے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے اکثر کا معمول تھا کہ ہر ہفتے قرآن مجید کی تلاوت ختم کر لیتے تھے۔ لہٰذا ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن کے سات حصے ایسے ہو جائیں کہ ایک حصہ روزانہ تلاوت کریں تو ہر ہفتے قرآن مجید کا دَور مکمل ہو جائے۔ اس لیے سورتوں کے سات مجموعے یا گروپ بنا دیے گئے۔ ان گروپوں کے لیے آج کل ہمارے ہاں جو لفظ مستعمل ہے وہ ''منزل'' ہے' لیکن احادیث و روایات میں حزب کا لفظ آتا ہے۔

احزاب یا منازل کی اس تقسیم میں بڑی خوبصورتی ہے۔ ایسا نہیں کیا گیا کہ یہ ساتوں حصے بالکل مساوی کیے جائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ظاہر بات ہے کہ سورتیں ٹوٹ جاتیں' ان کی فصیلیں ختم ہو جاتیں۔ چنانچہ ہر حزب میں پوری پوری سورتیں جمع کی گئیں۔ اس طرح احزاب یا منزلوں کی مقداریں مختلف ہو گئیں۔ چنانچہ کچھ حزب چھوٹے ہیں کچھ بڑے

ہیں' لیکن ان کے اندر سورتوں کی فصیلیں نہیں ٹوٹیں' یہ ان کا حسن ہے۔ غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ شے بھی شاید اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ اگر چہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ منزلوں کی تعیین بھی توقیفی ہے' لیکن منزلوں کی اس تقسیم میں گنتی کے اعتبار سے جو حسن پیدا ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہی کا ایک مظہر ہے۔ سورۃ الفاتحہ کو الگ رکھ دیا جائے کہ یہ تو قرآن حکیم کا مقدمہ یا دیباچہ ہے تو اس کے بعد پہلا حزب یا منزل تین سورتوں (البقرۃ' آل عمران' النساء) پر مشتمل ہے۔ دوسری منزل پانچ سورتوں پر' تیسری منزل سات سورتوں پر' چوتھی منزل نو سورتوں پر' پانچویں منزل گیارہ سورتوں پر اور چھٹی منزل تیرہ سورتوں پر مشتمل ہے' جبکہ ساتویں منزل (حزبِ مفصّل) جو کہ آخری منزل ہے' اس میں ۶۵ سورتیں ہیں۔ آخر میں سورتیں چھوٹی چھوٹی ہیں۔ یاد رہے کہ ۶۵ بھی ۱۳ کا multiple بنتا ہے (۶۵ = ۵×۱۳)۔ سورتوں کی تعداد جیسا کہ ذکر ہو چکا ۱۱۴ ہے۔ یہ تعداد متفق علیہ ہے' جس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

آج کل جو قرآن مجید حکومت سعودی عرب کے زیر اہتمام بہت بڑی تعداد میں بڑی خوبصورتی اور نفاست سے شائع ہوتا ہے' اس میں حزب کا لفظ بالکل ایک نئے معنی میں آیا ہے۔ انہوں نے ہر پارے کو دو حزب میں تقسیم کر لیا ہے' گویا نصف پارے کی بجائے لفظ حزب ہے۔ پھر وہ حزب بھی چار حصّوں میں منقسم ہے: **رُبع الحزب' نصفُ الحزب** اور پھر **ثلاثۃُ ارباعِ الحزب**۔ اس طرح انہوں نے ہر پارے کے آٹھ حصے بنا لیے ہیں۔ یہ لفظ حزب کا بالکل نیا استعمال ہے۔ اس کی کیا سند اور دلیل ہے اور یہ کہاں سے ماخوذ ہے' یہ میرے علم میں نہیں ہے۔

انسانی کلام حروف و اصوات سے مرتّب ہوتا ہے اور ہر زبان میں حروفِ ہجائیہ ہوتے ہیں۔ پھر حروف مل کر کلمات بناتے ہیں۔ کلمات سے کلام وجود میں آتا ہے' خواہ وہ کلام منظوم ہو یا نثر ہو۔ اسی طرح قرآن مجید کی ترکیب ہے۔ حروف سے مل کر کلمات بنے' کلمات نے آیات کی شکل اختیار کی' آیات جمع ہوئیں سورتوں کی شکل میں اور سورتیں جمع ہو گئیں منزلوں کی شکل میں۔

رکوعوں اور پاروں کی تقسیم

سورتوں کی پہلی تقسیم رکوعوں میں ہے۔ یہ تقسیم دورِ صحابہؓ اور دورِ نبویؐ میں موجود نہیں تھی۔ یہ تقسیمیں زمانۂ مابعد کی پیداوار ہیں۔ رکوعوں کی تقسیم بڑی سورتوں میں کی گئی۔ ۳۵ سورتیں ایسی ہیں جو ایک ہی رکوع پر مشتمل ہیں' یعنی وہ اتنی چھوٹی ہیں کہ انہیں ایک رکعت میں آسانی سے پڑھا جاسکتا ہے' لیکن بقیہ سورتیں طویل ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں ۲۸۵ یا ۲۸۶ آیات ہیں اور اس کے ۴۰ رکوع ہیں۔ حضورﷺ سے منقول ہے کہ آپؐ نے ایک رات ان تین سورتوں (البقرۃ' آل عمران' النساء) کی منزل ایک رکعت میں مکمل کی ہے۔ لیکن یہ تو استثناءات کی بات ہے۔ عام طور پر تلاوت کی وہ مقدار جو ایک رکعت میں بآسانی پڑھی جاسکتی ہو ایک رکوع پر مشتمل ہوتی ہے۔ رکوع رکعت سے ہی بنا ہے۔ یہ تقسیم حجاج بن یوسف کے زمانے میں یعنی تابعین کے دور میں ہوئی ہے۔ لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ یہ تقسیم بڑی محنت سے معانی پر غور کرتے ہوئے کی گئی ہے کہ کسی مقام پر ایک مضمون مکمل ہو گیا اور دوسرا مضمون شروع ہو رہا ہے تو وہاں اگر رکوع کر لیا جائے تو بات ٹوٹے گی نہیں۔ اگرچہ ہمارے ہاں عام طور پر ائمہ مساجد پڑھے لکھے لوگ نہیں ہوتے' عربی زبان سے واقف نہیں ہوتے' لہٰذا اکثر ایسی تکلیف دہ صورتِ حال پیدا ہوتی ہے کہ وہ ایسی جگہ پر رکوع کر دیتے ہیں جہاں کلام کا ربط منقطع ہو جاتا ہے۔ پھر اگلی رکعت میں وہاں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے بات معنوی اعتبار سے بہت ہی گراں گزرتی ہے۔ رکوعوں کی تقسیم بالعموم بہت عمدہ ہے' لیکن چند ایک مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ آیت یہاں سے ہٹا کر رکوع ماقبل میں شامل کی گئی ہوتی یا رکوع کا نشان اس آیت سے پہلے ہوتا تو معانی اور مفہوم کے اعتبار سے بہتر ہوتا۔ بہرحال اکثر و بیشتر رکوعوں کی تقسیم معنوی اعتبار سے صحیح ہے جو بڑی محنت سے گہرائی میں غور کر کے کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ ایک تقسیم پاروں کی شکل میں ہے۔ یہ تقسیم تو اور بھی بعد کے زمانے کی

ہے اور بڑی بھونڈی تقسیم ہے' اس لیے کہ اس میں سورتوں کی فصلیں توڑ دی گئی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کا جوشِ ایمان کم ہوا اور لوگوں نے معمول بنانا چاہا کہ ہر مہینے میں ایک مرتبہ قرآن ختم کر لیں تب اُن کو ضرورت پیش آئی کہ اس کو تیس حصّوں میں تقسیم کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے کسی نے غالبًا یہ حرکت کی کہ اُس کے پاس جو مصحف موجود تھا اُس نے اس کے صفحے گن کر تیس پر تقسیم کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح جہاں بھی صفحہ کٹ گیا وہیں نشان لگا دیا اور اگلا پارہ شروع ہو گیا۔ اس بھونڈی تقسیم کی مثال دیکھئے کہ سورۃ الحجر کی ایک آیت تیرہویں پارے میں ہے جبکہ باقی پوری سورت چودہویں پارے میں ہے۔ ہمارے ہاں جو مصحف ہیں ان میں آپ کو یہی شکل نظر آئے گی۔ سعودی عرب سے جو قرآن مجید بڑی تعداد میں شائع ہو کر پوری دنیا میں پھیلا ہے' یہ اب پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اسی انداز سے شائع کیا جاتا ہے جس سے کہ ہم مانوس ہیں۔ البتہ اہلِ عرب کے لیے جو قرآن مجید شائع کیا جاتا ہے اس میں رموزِ اوقاف اور علاماتِ ضبط بھی مختلف ہیں اور اس میں چودھواں جزء سورۃ الحجر سے شروع کیا جاتا ہے۔ گویا وہ تقسیم جو ہمارے ہاں ہے اس میں انہوں نے اجتہاد سے کام لیا ہے' اگرچہ پاروں کی تقسیم باقی رکھی ہے۔ بعض دوسرے عرب ممالک سے جو قرآن مجید شائع ہوتے ہیں۔ ان میں پاروں کا ذکر ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ کوئی متفق علیہ چیز نہیں ہے اور زمانۂ تابعین میں بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے' یہ اس سے بہت بعد کی بات ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی متفق علیہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((خَیْرُ النَّاسِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ)) اس حدیث کی رو سے بہترین ادوار تین ہی ہیں دورِ صحابہ' دورِ تابعین' پھر دورِ تبع تابعین۔ ان تین زمانوں کو ہم ''قرونٌ مشھودٌ لھا بالخیر'' کہتے ہیں۔ باقی اس کے بعد کا معاملہ حجت نہیں ہے' اس کی دین کے اندر کوئی مستقل اور دائمی اہمیت نہیں ہے۔

ترتیبِ نزولی اور ترتیبِ مصحف کا اختلاف

قرآن حکیم کی ترتیب کے ضمن میں پہلی بات جو بالکل متفق علیہ اور ہر شک و شبہ سے بالا ہے وہ یہ ہے کہ ترتیبِ نزولی بالکل مختلف ہے اور ترتیبِ مصحف بالکل مختلف ہے۔ اکثر و بیشتر جو سورتیں ابتدا میں نازل ہوئیں وہ آخر میں درج ہیں اور ہجرت کے بعد جو سورتیں نازل ہوئی ہیں (البقرۃ' آل عمران' النساء' المائدۃ) ان کو شروع میں رکھا گیا ہے۔ تو اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ترتیبِ نزولی اور ترتیبِ مصحف مختلف ہے۔

جہاں تک ترتیب نزولی کا تعلق ہے' اس سے ہر طالب علم کو دلچسپی ہوتی ہے جو قرآن مجید پر غور کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ ترتیبِ نزولی کے حوالے سے قرآن حکیم کے معانی اور مفاہیم کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ایک خاص پس منظر کے ساتھ سورتیں جڑتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ ابتدا میں کیا حالات تھے جن میں یہ سورتیں نازل ہوئیں' پھر حالات نے کیا پلٹا کھایا تو اگلی سورتیں نازل ہوئیں۔ چنانچہ ترتیبِ نزولی کے حوالے سے قرآن حکیم کو مرتب کیا جائے تو ایک اعتبار سے وہ سیرت النبیؐ کی کتاب بن جائے گی۔ اس لیے کہ آغازِ وحی کے بعد سے لے کر آپؐ کے انتقال تک وہ زمانہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔ دوسرے یہ کہ اس پورے زمانے کے ساتھ قرآن مجید کی آیات اور سورتوں کا جو مجموعی ربط ہے ترتیب نزولی کی مدد سے اسے سمجھنے اور غور و فکر کرنے میں مدد ملتی ہے۔ پس قرآن مجید کے ہر طالب علم کو اس سے دلچسپی ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ چنانچہ بعض صحابہ ﷡ کے بارے میں روایات ملتی ہیں کہ انہوں نے ترتیب نزولی کے اعتبار سے قرآن حکیم کو مرتب کیا تھا۔ حضرت علی ﷜ کے بارے میں یہ بات بہت شدّ و مدّ کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ انہوں نے بھی اس کو ترتیب نزولی کے اعتبار سے مرتب کیا تھا' اور عوام کی سطح پر یہ مشہور ہے کہ اہل تشیّع اسی کو اصل اور مستند قرآن مانتے ہیں اور حضرت علی ﷜ کا یہ مصحف ان کے بارہویں امام کے پاس ہے' جو ایک غار میں روپوش ہیں۔ قیامت کے قریب جب وہ ظاہر ہوں گے تب وہ اپنا یہ مصحف یعنی ''اصل قرآن''

لے کر آئیں گے۔ گویا اہلِ تشیّع یہ قرآن اُس وقت تک کے لیے ہی قبول کرتے ہیں۔ عام طور پر ان کی طرف یہی بات منسوب ہے' لیکن دورِ حاضر کے بعض شیعہ علماء اس تصور کے قائل نہیں ہیں۔ ایک شیعہ عالم دین سید ہادی علی نقوی نے بہت شدّ ومدّ کے ساتھ اس تصور کی نفی کی ہے اور کہا ہے کہ ''ہم اسی قرآن کو مانتے ہیں' یہی اصل قرآن ہے اور اسے من وعن محفوظ مانتے ہیں۔ ہمارے نزدیک کوئی آیت اس سے خارج نہیں ہوئی اور کوئی شے باہر سے بعد میں اس میں داخل نہیں ہوئی۔ یہی جو ''دُفّتین'' یعنی جلد کے دو گتّوں کے مابین ہے' یہی حقیقی اور اصلی قرآن ہے''۔

بہرحال اگر حضرت علی ﷛ کے پاس ایسا کوئی مصحف تھا جسے آپ نے ترتیب نزولی کے مطابق مرتب کیا تھا تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ علمی اور تحقیقی اعتبار سے قرآن حکیم پر غور وفکر کرنے کے لیے قرآن مجید کے بعض انگریزی تراجم میں بھی ترتیب نزولی کے اعتبار سے سورتوں کو مرتب کر کے ترجمہ کیا گیا ہے۔ (محمد عزۃ دروزۃ نے بھی اپنی تفسیر ''التفسیر الحدیث'' میں سورتوں کو نزولی اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔) علمی اعتبار سے اس میں کوئی حرج نہیں' لیکن اصل حجیت ترتیب مصحف کی ہے۔ یہ ترتیب توقیفی ہے۔ یہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی ترتیب ہے اور یہی ترتیب لوح محفوظ میں ہے۔ اصل قرآن تو وہی ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿٧٧﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿٧٨﴾﴾ (الواقعة) اور: ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿٢١﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿٢٢﴾﴾ (البروج) ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں جلال الدین سیوطی نے بہت ہی زور اور تاکید کے ساتھ کسی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر تمام انسان اور جن مل کر کوشش کر لیں تب بھی ترتیب نزولی پر قرآن کو مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس کے بارے میں ہمارے پاس مکمل معلومات نہیں ہیں۔ بہت سی سورتوں کے اندر بعد میں نازل ہونے والی آیات پہلے آ گئی ہیں اور شروع میں نازل ہونے والی بعد میں آئی ہیں۔ اس اعتبار سے ایک ایک آیت کے بارے میں معیّن کرنا اور اس کی ترتیب کے بارے میں اجماع ناممکن ہے۔ چنانچہ اصل مصحف وہی ہے جو ہمارے پاس ہے اور اس کی ترتیب بھی توقیفی ہے جو محمدؐ

رسول اللہ ﷺ نے بتائی ہے۔

اس ترتیب مصحف کے اعتبار سے اس دور میں سورتوں کی ایک نئی گروپنگ کی طرف راہنمائی ہوئی ہے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے خاص طور پر اپنی توجہ کو نظم قرآن پر مرکوز کیا' آیات کا باہمی ربط تلاش کیا۔ نیز یہ کہ آیتوں کی وہ کون سی قدر مشترک ہے جس کی بنا پر ان کو سورتوں میں جمع کیا گیا —— پھر یہ کہ ہر سورۃ کا ایک عمود اور مرکزی مضمون ہے' بظاہر آیات غیر مربوط نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت اُن کے مابین ایک منطقی ربط موجود ہے اور ہر آیت اس سورۃ کے عمود کے ساتھ مربوط ہے —— مزید یہ کہ سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں —— ان چیزوں پر مولانا فراہیؒ نے زیادہ توجہ کی۔ مولانا اصلاحی صاحب نے اس بات کو مزید آگے بڑھایا ہے۔

اس ضمن میں ایک اشتباہ پیدا ہوسکتا ہے' جسے رفع کر دینا ضروری ہے کہ قرآن مجید کا یہ پہلو اس زمانے میں کیوں سامنے آیا اور اس سے پہلے اس پر غور کیوں نہیں ہو سکا؟ کیا ہمارے اسلاف قرآن مجید پر تدبر کا حق ادا نہیں کرتے تھے؟ اس اشتباہ کو اپنے ذہن میں نہ آنے دیں' اس لیے کہ قرآن مجید کی شان یہ ہے کہ اس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ حضور ﷺ کا اپنا قول ہے کہ ''لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُهٗ''۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ کسی خاص دور کے محدثین' محققین' مفسرین قرآن مجید کے علم کا تمام و کمال احاطہ کر چکے تو وہ سخت غلطی پر ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ قرآن مجید پر بھی طعن ہوتا اور خود حضورؐ کے اس قول کی بھی نفی ہوتی۔ یہ تو جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھے گا قرآن مجید کے عجائب' اس کی حکمتیں' اس کے علوم و معارف کے نئے نئے خزانے برآمد ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ ہمارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ مطالعہ قرآن کے بعد ہم یہ محسوس کریں کہ ہم نے اپنی استطاعت کے مطابق اس کو سیکھا ہے اور بعد میں آنے والے اس میں سے کچھ اور بھی حاصل کریں گے' وہ ہمیشہ اس کے لیے کوشاں رہیں گے' اس میں غور و فکر اور تدبر کرتے رہیں گے اور نئے نئے علوم اور نئے نئے نکات اس میں سے برآمد ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت میں یہی زمانہ اس انکشاف کے لیے معین تھا' اور ظاہر بات ہے کہ

حکمتِ قرآنی کا جو بھی کوئی نیا پہلو دریافت ہوگا وہ کسی انسان ہی کے ذریعے سے ہوگا۔ لہٰذا اس کے لیے طبیعت کے اندر بُعد محسوس نہ کریں۔ بہرحال مولانا فراہیؒ نے نظمِ قرآن کو اپنا خصوصی موضوع بنایا۔ وہ تفسیرِ قرآن لکھنا چاہتے تھے مگر لکھ نہیں سکے' صرف چند سورتوں کی تفاسیر انہوں نے لکھی ہیں۔ ان میں سے بھی بعض نامکمل ہیں۔ وہ ایک مفکّر قسم کے انسان تھے' مصنف قسم کے انسان نہیں تھے۔ مفکّر انسان مسلسل غور کرتا رہتا ہے اور اس کے سامنے نئے نئے پہلو آتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کا تصنیف و تالیف کا انداز یہ تھا کہ انہوں نے مختلف موضوعات پر فائل کھول رکھے تھے۔ جب کوئی نیا خیال آتا تو کاغذ پر لکھ کر متعلقہ فائل میں شامل کر لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر تصانیف ان کی وفات کے بعد کتابی شکل میں شائع ہوئی ہیں' جبکہ ان کے زمانے میں وہ صرف فائلوں کی شکل میں تھیں اور کسی شے کے چھپنے کی نوبت آئی ہی نہیں۔ سوچ و بچار کا تسلسل ان کے آخری لمحے تک جاری رہا۔ ''مقدمہ نظام القرآن'' واقعتاً ان کے فکر اور سوچ کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے شاگردِ رشید امین احسن اصلاحی صاحب نے بات کو آگے بڑھایا ہے۔ نظمِ قرآن کے بارے میں ان حضرات کے نتیجۂ فکر کے چند نکات ملاحظہ ہوں:

(i) ہر سورت کا ایک عمود ہے' جیسے ایک ہار کی ڈوری ہے اور اس میں موتی پروئے ہوئے ہیں۔ یہ ڈوری دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتی' موتی نظر آتے ہیں' لیکن ان کو باندھنے والی شے تو ڈوری ہے جس میں وہ پروئے گئے ہیں۔ اسی طرح ہر سورت کا ایک مرکزی مضمون یا عمود ہے جس کے ساتھ اس کی تمام آیات مربوط ہیں۔

(ii) قرآن مجید کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں اور یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی مضمون کا ایک رخ ایک سورت میں آ جاتا ہے اور اسی کا دوسرا رخ اس جوڑے کے دوسرے حصّے میں آ کر مضمون کی تکمیل کر دیتا ہے۔ مولانا اصلاحی صاحب نے بھی ایسا ہی فرمایا ہے۔ البتہ جہاں تک اس اصول کے انطباق کا تعلق ہے اس میں اختلاف کی گنجائش ہے اور جو حضرات میرے دروس میں تسلسل سے شرکت کرتے رہے ہیں

انہیں معلوم ہے کہ مجھے بہت سے مواقع پر اصلاحی صاحب سے اختلاف بھی ہے' لیکن اصولاً یہ بات درست ہے کہ قرآن مجید کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ تاہم بعض سورتیں منفرد حیثیت کی مالک ہیں' ان کا جوڑا اس جگہ پر موجود نہیں ہے۔ اگرچہ میں نے تحقیق کی ہے کہ اکثر و بیشتر ایسی سورتوں کے جوڑے بھی معناً قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً سورۃ النور تنہا اور منفرد ہے' سورۃ الاحزاب بھی منفرد اور تنہا ہے' لیکن یہ دونوں آپس میں جوڑا ہیں اور ان میں جوڑا ہونے کی نسبت بتمام و کمال موجود ہے۔ اسی طرح سورۃ الفاتحہ منفرد ہے۔ وہ تو اس اعتبار سے بھی منفرد ہے کہ واقعتاً اس کا بتمام و کمال جوڑا بننا ممکن نہیں' وہ اپنی جگہ پر قرآن حکیم اور **سَبعًا مِنَ المثَانِی** ہے' لیکن سورۃ الناس میں غور کریں تو معناً یہ سورت سورۃ الفاتحہ کا جوڑا بنتی ہے۔ اس لیے کہ سورۃ الفاتحہ میں استعانت ہے اور سورۃ الناس میں استعاذہ۔ پھر سورۃ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی تین شانیں رَبّ' مَلِک' الٰہ ہیں اور یہی تین شانیں سورۃ الناس میں بھی ہیں۔

(iii) تلاوت کے لیے سات منزلوں کے علاوہ قرآن حکیم میں سورتوں کی ایک معنوی گروپنگ بھی ہے۔ اس اعتبار سے بھی سورتوں کے سات گروپ ہیں اور ہر گروپ میں مکی اور مدنی دونوں طرح کی سورتیں شامل ہیں۔ ہر گروپ میں ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتیں اور اس کے بعد ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتیں ہیں۔ ایک گروپ کی مکی اور مدنی سورتوں میں وہی نسبت ہے جو ایک جوڑے کی دو سورتوں میں ہوتی ہے۔ جیسے ایک مضمون کی تکمیل ایک جوڑے کی سورتوں میں ہوتی ہے' یعنی ایک رُخ ایک فرد میں اور دوسرا رُخ دوسرے فرد میں' اسی طرح ہر گروپ کا ایک مرکزی مضمون اور عمود ہے' جس کا ایک رُخ مکی سورتوں میں اور دوسرا رخ مدنی سورتوں میں آجاتا ہے۔ اس طرح غور و فکر اور تدبر کے نئے میدان سامنے آ رہے ہیں۔ جو انسان بھی ان کا عمود معین کرنے میں غور و فکر کرے گا وہ کسی نتیجے پر پہنچے گا' اگرچہ عمود معین کرنے میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ سب سے بڑا گروپ پہلا ہے جس میں مکی سورت صرف ایک

یعنی سورۃ الفاتحہ جبکہ مدنی سورتیں چار ہیں جو سوا چھ پاروں پر پھیلی ہوئی ہیں‘ یعنی سورۃ البقرۃ‘ آل عمران‘ النساء اور المائدۃ۔ دوسرا گروپ اس اعتبار سے متوازن ہے کہ اس میں دو سورتیں مکی اور دو مدنی ہیں۔ سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف مکّی ہیں‘ جبکہ سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ مدنی ہیں۔ تیسرے گروپ میں سورۂ یونس سے سورۃ المؤمنون تک چودہ مکی سورتیں ہیں۔ یہ تقریباً سات پارے بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک مدنی سورت ہے اور وہ سورۃ النور ہے۔ اس کے بعد چوتھے گروپ میں سورۃ الفرقان سے سورۃ السجدۃ تک مکیات ہیں‘ پھر ایک مدنی سورت سورۃ الاحزاب ہے۔ پانچویں گروپ میں سورۂ سبا سے سورۃ الاحقاف تک مکیات ہیں‘ پھر تین مدنی سورتیں‘ سورۂ محمد‘ سورۃ الفتح اور سورۃ الحجرات ہیں۔ اس کے بعد چھٹے گروپ میں پھر سورۂ ق سے سورۃ الواقعہ تک سات مکیات ہیں جن کے بعد پھر دس مدنیات ہیں سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم۔ اسی طرح ساتویں گروپ میں بھی پہلے مکی سورتیں ہیں اور آخر میں دو مدنی سورتیں۔ اس طرح یہ سات گروپ بنتے ہیں۔ یہ گروپ مولانا اصلاحی صاحب کے مرتب کردہ ہیں۔ ان میں پہلا اور آخری گروپ اس اعتبار سے عکسی نسبت رکھتے ہیں کہ پہلے گروپ میں صرف ایک سورت سورۃ الفاتحہ مکی ہے اور سوا چھ پاروں پر مشتمل چار طویل ترین سورتیں مدنی ہیں‘ جبکہ آخری گروپ میں سورۃ الملک سے لے کر پورے دو پارے تقریباً مکیات پر مشتمل ہیں‘ آخر میں صرف دو سورتیں ''معوّذتین'' مدنی ہیں۔ یعنی یہاں نسبت بالکل عکسی ہے۔ لیکن دوسرا گروپ بھی متوازن ہے‘ یعنی دو سورتیں مکی‘ دو مدنی اور چھٹا گروپ بھی متوازن ہے کہ اس میں سات سورتیں مکّی ہیں (سورۃ ق سے سورۃ الواقعہ تک) جبکہ دس سورتیں مدنی ہیں (سورۃ الحدید سے سورۃ التحریم تک) لیکن حجم کے اعتبار سے تقریباً برابر ہیں۔ یہ بھی غور وفکر اور سوچ بچار کا ایک موضوع ہے اور اس سے بھی قرآن مجید کی حکمت وہدایت اور اس کے علم کے نئے نئے گوشے سامنے آرہے ہیں۔

قرآن حکیم کی سورتوں کے جوڑے ہونے کا معاملہ قرآن مجید میں بعض جگہوں پر تو

بہت ہی نمایاں ہے۔ ''المعوّذتین'' آخری دو سورتیں ہیں جو تعوّذ پر مشتمل ہیں: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ①﴾ اور: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ①﴾۔ اسی طرح الزّہراوَین ''دونہایت تابناک سورتیں'' سورۃ البقرۃ اور آل عمران ہیں۔ حضورﷺ نے ان دونوں کو بھی ایک نام دیا جیسے آخری دو سورتوں کو ایک نام دیا۔ اسی طرح سورۃ المزمل اور سورۃ المدثر میں اور سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح میں معنوی ربط ہے۔ سورۃ التحریم اور سورۃ الطلاق میں تو یہ ربط بہت ہی نمایاں ہے۔ دونوں سورتوں کا آغاز بالکل ایک جیسا ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ اور ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ﴾۔ مضمون کے اندر بھی بڑی گہری مناسبت ہے۔ اس کے بعد سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ کا جوڑا ہے۔ سورۃ الصّف سَبَّحَ لِلّٰهِ سے اور سورۃ الجمعہ یُسَبِّحُ لِلّٰهِ کے الفاظ سے شروع ہو رہی ہے۔ سورۃ الصّف کی مرکزی آیت جو رسول اللہﷺ کے مقصدِ بعثت کو معیّن کر رہی ہے ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ ہے' جبکہ سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت جو حضورﷺ کے انقلاب کا اساسی منہاج معیّن کر رہی ہے ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ہے۔ بہرحال سورتوں کا جوڑا ہونا' سورتوں کا گروپ کی شکل میں ہونا' ان گروپس کا اپنا ایک عمود اور ایک مرکزی مضمون ہونا' پھر اس کے دو رخ بن جانا جو اُس کی مکیات اور مدنیات میں آتے ہیں' قرآن مجید کے علم وحکمت کے خزانے کے وہ دروازے ہیں جو اَب کھلے ہیں۔ اس طرح کے دروازے ہر دور میں کھلتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کھلتے رہیں گے۔ چنانچہ قرآن مجید پر تذکّر اور تدبّر تسلسل کے ساتھ جاری رہنا چاہیے۔

پیچھے سات منزلوں اور سات احزاب کا ذکر ہو چکا۔ اب مکّی اور مدنی سورتوں کے سات گروپس کا بیان ہوا۔ یہ دونوں قسم کے گروپ دو جگہ پر آ کر مل جاتے ہیں۔ پہلی منزل تو سورۃ النساء پر ختم ہو جاتی ہے اور پہلا گروپ سورۃ المائدۃ پر ختم ہوتا ہے۔ سورۃ التوبۃ پر دوسری منزل بھی ختم ہوتی ہے اور دوسرا گروپ بھی ختم ہوتا ہے۔ سورۂ یونس سے

تیسری منزل شروع ہوتی ہے اور تیسرا گروپ بھی شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مقام اور ہے۔ سورۂ ق سے آخری منزل بھی شروع ہو رہی ہے اور اسی سے چھٹا گروپ بھی شروع ہو رہا ہے۔ سورۂ ق چھٹے گروپ کی پہلی مکی سورۃ ہے۔ یہ چھٹا گروپ سورۃ التحریم پر ختم ہو جاتا ہے اور آخری گروپ سورۃ الملک سے شروع ہوتا ہے' لیکن جو منزل سورۂ ق سے شروع ہوتی ہے وہ سورۃ الناس تک ایک ہی ہے۔

یہ وہ چیزیں ہیں جو معلومات کے درجے میں سامنے رہیں اور ذہن میں موجود رہیں تو انسان جب غور کرتا ہے تو ان کے حوالے سے بعض اوقات حکمت کے بڑے قیمتی موتی ہاتھ لگتے ہیں۔

باب چهارم

تدوینِ قرآن

قرآن مجید کی تدوین کے ضمن میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں مکمل ہوگئی تھی۔ کسی شاعر کا دیوان اس کی غزلوں اور قصائد پر مشتمل ہوتا ہے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور اس کی بھی تدوین ہوئی ہے۔ یہ بھی ایک دیوان کی شکل میں ہے' اس کو بھی جمع کیا گیا ہے۔ جمع و تدوینِ قرآن اپنی جگہ پر بہت اہم موضوع ہے۔ اس کے بارے میں خاص معلومات ہمارے ذہنوں میں ہر وقت مستحضر رہنی چاہئیں' کیونکہ عام طور پر اہلِ تشیع کے حوالے سے ہمارے ہاں جو چیزیں مشہور ہیں (واللہ اعلم وہ حقیقت پر مبنی ہیں یا محض مخالفین کا پراپیگنڈا ہے) ان کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں شبہات پیدا ہوئے ہیں اور وہ کافی بڑے حلقے کے اندر پھیلے ہیں۔

ہمارے ہاں جمعے کے خطبے جو مرتب کیے گئے ہیں اور عام خطیب پڑھتے ہیں' ان میں بھی ایسے الفاظ آ گئے ہیں جو بہت بڑے بڑے مغالطوں کی بنیاد بن گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کسی دشمنِ اسلام نے' کسی باطنی نے' کسی غالی قسم کے رافضی نے یہ الفاظ شامل کر دیے ہوں۔ بظاہر تعریف ہو رہی ہے مگر حقیقت میں تنقیص ہو رہی ہے اور دین کی جڑ کاٹی جا رہی ہے۔ اس کی مثال بھی اسی تدوین کے ذیل میں آئے گی۔

قرآن حکیم کی تدوین تین مراحل میں مکمل ہوئی۔ پہلی تدوین رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہوگئی تھی' لیکن وہ تدوین اس شکل میں تھی کہ سورتیں معین ہوگئیں' سورتوں کی ترتیب معین ہوگئی۔ کتابی شکل میں قرآن مجید حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں موجود نہیں تھا۔ لوگوں کے پاس مختلف حصوں میں لکھا ہوا قرآن تھا۔ لوگ اونٹ کے شانے کی ہڈی (جو کافی چوڑی ہوتی ہے) پر لکھتے تھے یا کولہے کی ہڈی پر لکھا جاتا تھا۔ اونٹ کی

پسلیاں (ribs) بھی بڑی چوڑی ہوتی ہیں‘ یہ بھی اس مقصد کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ کاغذ اس زمانے میں کہاں تھا‘ کپڑا زیادہ دستیاب تھا‘ لہٰذا کپڑے پر بھی لکھا جاتا تھا۔ اسی طرح چھوٹے چھوٹے پتھروں پر بھی آیات لکھ لیتے تھے۔ یاد رہے کہ قرآن مجید کی اصل حیثیت ''قول'' کی ہے۔ ﴿اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ۝﴾ (الحاقۃ) نہ تو یہ حضورﷺ کو لکھی ہوئی شکل میں دیا گیا نہ حضورﷺ نے لکھی ہوئی شکل میں اُمت کو دیا۔ حضورﷺ کو بھی یہ پڑھایا گیا ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰٓى۝﴾ (الاعلیٰ) ''ہم آپ کو پڑھائیں گے‘ پھر آپ بھولیں گے نہیں''۔ یہ اوّلاً قولِ جبرائیلؑ‘ پھر قولِ محمدﷺ بن کر لوگوں کے سامنے آیا۔ جبرائیل علیہ السلام سے حضورﷺ نے سنا‘ حضورؐ سے صحابہؓ نے سنا۔ چنانچہ اصل میں تو قرآن پڑھی جانے والی شے ہے۔ لیکن جیسے جیسے قرآن نازل ہوتا آپ اسے لکھوا بھی لیتے۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کتابتِ وحی کی ذمہ داری پر مامور تھے۔ اور حضورﷺ نے اس بات کا حکم بھی دے دیا تھا کہ ((لَا تَكْتُبُوْا عَنِّيْ غَيْرَ الْقُرْآنِ)) ''میری طرف سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو''۔

احادیث کو لکھنے سے حضورﷺ نے منع فرما دیا تھا تاکہ کہیں اللہ اور رسولؐ کا کلام گڈمڈ نہ ہو جائے‘ صرف قرآن مجید کو ہی لکھنے کا حکم دیا۔ لیکن اصل قرآن اللہ تعالیٰ نے حضورﷺ کے سینے میں جمع کیا اور محمدٌ رسول اللہﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے سینوں میں جمع کر دیا۔ وہ قول سے قول کی شکل میں گیا ہے‘ لوگوں نے حضورﷺ کے دہن مبارک سے سیکھا ہے۔ بہرحال رسول اللہﷺ کے دور میں لکھا ہوا قرآن بھی تھا لیکن کتابی شکل میں جمع شدہ نہیں تھا۔ جمع شدہ شکل میں صرف سینوں میں تھا‘ حفاظ کو یاد تھا۔ انہیں یاد تھا کہ قرآن اس ترتیب کے ساتھ ہے۔ اس کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ صحیح روایات کے مطابق ہر رمضان المبارک میں جتنا قرآن اُس وقت تک نازل ہو چکا ہوتا تھا‘ حضورﷺ اور حضرت جبرائیل علیہ السلام اس کا دَور کرتے تھے‘ جیسا کہ ہمارے ہاں رمضان کے آنے سے پہلے حفاظ دَور کرتے ہیں‘ ایک حافظ سناتا ہے‘ دوسرا سنتا ہے تاکہ

کتاب کی شکل میں بھی قرآن مجید کی تدوین رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے دو سال کے اندر اندر مکمل ہوگئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت کل سوا دو برس ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مجلسِ شوریٰ میں یہ مسئلہ بھی زیر غور آیا کہ حضور ﷺ کے زمانے میں تو قرآن ایک جلد کے مابین جمع نہیں کیا گیا' لہٰذا اس کا نام کیا رکھا جائے! ایک تجویز یہ آئی کہ اسے بھی انجیل کا نام دیا جائے۔ ایک رائے یہ دی گئی کہ اس کا نام ''سِفر'' ہو' اس لیے کہ سفر کا لفظ تو راۃ کی کتابوں کے لیے معروف چلا آ رہا تھا' جیسے سفر ایوب ایک کتاب تھی۔ تو سفر کتاب کو کہتے ہیں جس کی جمع ''اَسفار'' ہے اور یہ لفظ قرآن میں بھی آیا ہے۔ سفر کا لفظی مطلب ہے روشنی دینے والی۔ پھر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے تجویز پیش کی کہ اس کا نام ''مصحف'' ہونا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ میرا آنا جانا حبشہ ہوتا ہے' وہاں کے لوگوں کے پاس ایک کتاب ہے اور وہ اسے مصحف کہتے ہیں۔ اب ''مصحف'' کے لفظ پر اتفاق و اجماع ہو گیا۔ چنانچہ قرآن کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی تجویز پر مصحف نام رکھا گیا اور اس پر لوگوں کا اجماع ہوا۔ تدوین قرآن کا یہ دوسرا مرحلہ ہے۔

قرآن حکیم کی تلاوت کے ضمن میں ایک معاملہ چلا آ رہا تھا' جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ قرآن مجید سات حروف پر نازل ہوا تھا۔ عربوں کی زبان تو ایک تھی لیکن بولیاں مختلف تھیں' الفاظ کے لہجے مختلف تھے۔ تو سب لوگوں کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ اپنے اپنے لہجے کے اندر قرآن پڑھ لیا کریں تاکہ سہولت رہے' ورنہ بڑی مشقت کی ضرورت تھی کہ سب لوگ اپنے لہجے بدلیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انقلابی جِدّوجُہد کا tempo اتنا تیز تھا کہ ان کاموں کے لیے زیادہ فرصت نہیں تھی کہ اس کے لیے باقاعدہ ادارے قائم ہوں' مختلف جگہوں سے لوگ آئیں اور اپنا لہجہ بدل کر قریش کے لہجے کے مطابق کریں' حجازی لہجہ اختیار کریں۔ چنانچہ اجازت دی گئی تھی کہ اپنے اپنے لہجوں میں پڑھ لیں۔ مختلف لہجوں میں پڑھنے کے ساتھ کچھ لفظی فرق بھی آنے لگے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے نوبت یہ آ گئی کہ مختلف لہجوں میں لفظی فرق کے ساتھ بھی

قرآن پڑھا جانے لگا۔ کوئی شخص قرآن پڑھ رہا ہوتا' دوسرا کہتا کہ یہ غلط پڑھ رہا ہے' یہ یوں نہیں ہے' جیسے میں پڑھ رہا ہوں وہ صحیح ہے۔ اس پر اس جذباتی قوم کے اندر تلواریں نکل آتی تھیں۔ اندیشہ ہوا کہ اگر اس طرح سے یہ بات پھیل گئی تو قرآن کا کوئی ایک ٹیکسٹ متفق علیہ نہیں رہے گا۔ امت کو جمع کرنے والی شے تو یہ قرآن ہی ہے' اس میں لفظی فرق کے نتیجے میں دائمی افتراق وانتشار پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت عثمان ﷺ نے صحابہؓ کے مشورے سے طے کیا کہ قرآن کا ایک ٹیکسٹ تیار کیا جائے۔ اس ٹیکسٹ کے لیے لفظ ''رسم'' ہے۔ رسم الخط کا لفظ ہم استعمال کرتے ہیں۔ ''اب ت'' حروف ہیں' لیکن عربی میں لکھے جائیں گے تو ان کا رسم الخط کچھ اور ہے' اردو میں لکھے جائیں گے تو ان کی شکل اور ہے۔ حضرت عثمانؓ نے ایک رسم الخط اور ایک ٹیکسٹ پر قرآن جمع کیا۔ انہوں نے بھی ایک کمیٹی بنائی اور اس کمیٹی کو یہ حکم دے دیا گیا کہ تمام لہجوں کو رد کر کے قریش کے لہجہ پر قرآن کا ٹیکسٹ تیار کیا جائے جو متفق علیہ ٹیکسٹ ہوگا۔ چنانچہ اس کمیٹی نے بڑی محنت شاقہ سے اس کام کی تکمیل کی۔ اس طرح قرآن کا رسم الخط معین ہو گیا اور ایک متفق علیہ ٹیکسٹ وجود میں آ گیا۔ رسم عثمانی کے مطابق سورۃ الفاتحہ میں ''ملك یوم الدین'' لکھا جائے گا' لکھنے کی شکل یہ نہیں ہوگی: "مالك یوم الدین"۔ ایک قراءت میں چونکہ مَلِكِ بھی ہے تو ''ملك'' کو ''مٰلِكِ'' بھی پڑھا جا سکتا ہے اور ''مَلِكِ'' بھی۔ تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہے جو حضرت عثمان ﷺ نے صحابہؓ کے مشورے سے سرانجام دیا کہ قرآن کا ایک رسم الخط معین ہو گیا اور مصاحف عثمانؓ تیار ہو گئے۔ بعض روایات کے مطابق اس کی چار نقول تیار کی گئیں' بعض روایات کے مطابق پانچ اور بعض میں سات کا عدد بھی ملتا ہے۔ ان میں سے ایک مصحف official version کے طور پر مدینے میں رکھا گیا اور باقی نقلیں مکہ مکرمہ' دمشق' کوفہ' یمن' بحرین اور بصرہ کو بھیج دی گئیں۔ ان میں سے کوئی کوئی نقل اب بھی موجود ہے۔ ترکی اور تاشقند میں وہ ''مصاحفِ عثمانی'' موجود ہیں جو حضرت عثمان ﷺ نے تیار کرائے تھے۔

یہاں ایک اہم بات توجہ طلب ہے کہ ہمارے ہاں خطباتِ جمعہ میں بعض خطیب یہ

جملہ پڑھ جاتے ہیں: ''جامعُ آیاتِ القرآن عثمان بن عفان ﷺ'' ۔ یہاں ہم قافیہ الفاظ جمع کر کے صوتی آہنگ کے ساتھ ایک خاص انداز پیدا کیا گیا ہے' لیکن یہ الفاظ اس قدر غلط اور اتنے گمراہ کن ہیں کہ اس سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ آیات قرآنیہ کو سب سے پہلے حضرت عثمان ﷺ نے جمع کیا۔ یہ بات قرآن پر سے اعتماد کو ہٹا دینے والی ہے۔ آیاتِ قرآنیہ تو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جمع ہو چکی تھیں' سورتیں حضورؐ کے زمانے میں وجود میں آ چکی تھیں' سورتوں کی تدوین ہی نہیں ترتیب بھی حضور ﷺ کے زمانے میں عمل میں آ چکی تھی۔ کتابی شکل میں قرآن ابوبکر ﷺ کے زمانے میں جمع ہوا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں دس پندرہ سال کا فصل ہے۔ اگر ''جامعُ آیاتِ القرآن'' حضرت عثمان ﷺ کو قرار دیا جائے تو کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ قرآن کی تدوین حضور ﷺ کے پندرہ یا بیس برس بعد ہوئی ہے۔ حضرت عثمانؓ کا عہد خلافت بارہ برس ہے اور حضور ﷺ کے انتقال کے ۲۴ برس بعد ان کا انتقال ہوا۔ تو اس طرح قرآن کے متن (text) کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کیے جا سکتے ہیں' جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمان ﷺ آیاتِ قرآنی کے جمع کرنے والے نہیں ہیں بلکہ اُمت کو قرآن کے ایک ٹیکسٹ اور رسم الخط پر جمع کرنے والے ہیں۔ اسی لیے آج دنیا میں جو مصحف موجود ہے یہ ''مصحفِ عثمان'' کہلاتا ہے۔ اس کا نام ''مصحف'' حضرت ابوبکر ﷺ نے رکھا تھا اور مصحفِ عثمان میں رسم الخط اور ٹیکسٹ معین ہو گیا کہ اب قرآن اسی طریقے سے لکھا جائے گا اور یہی پوری دنیا کے اندر official ٹیکسٹ ہے۔

ہمارے ہاں اکثر و بیشتر قرآن پاک کی اشاعت کے ادارے رسمِ عثمانی کا پورا اہتمام نہیں کرتے اور اس اعتبار سے ان میں رسم کی غلطیاں بھی آ جاتی ہیں' اس لیے کہ ان کے سامنے اپنے اپنے مفادات ہوتے ہیں یعنی کم خرچ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی کوشش لیکن اب سعودی حکومت نے اس کا اہتمام کر کے بڑی نیکی کمائی ہے۔ قرآن مجید کی حفاظت کے حوالے سے ایک نیکی مصر نے کمائی تھی۔ جب اسرائیل نے قراءتِ قرآن مجید کے اندر تحریف کر کے اس کو عام کرنے کی کوشش کی تو حکومت مصر

نے اپنے چوٹی کے قراء' قاری محمود خلیل حُصری اور عبدالباسط عبدالصمد سے پورا قرآن مجید مختلف قراءتوں میں تلاوت کرایا اور ان کے کیسٹس تیار کر کے دنیا میں پھیلا دیئے کہ اب گویا وہ ریفرنس کا کام دیں گے۔ ان کے ہوتے ہوئے اب کسی کے لیے ممکن نہیں ہے کہ اس طرح قراءت کے حوالے سے قرآن میں کوئی تحریف کر سکے۔ اسی طرح سعودی عرب کی حکومت نے کروڑوں روپے کے خرچ سے بہت بڑی فاؤنڈیشن بنائی ہے' جس کے زیر اہتمام بڑے عمدہ آرٹ پیپر پر عالمی معیار کی بڑی عمدہ جلد کے ساتھ لاکھوں کی تعداد میں یہ قرآن مجید چھاپے جا رہے ہیں' جو حضرت عثمان ؓ کے معین کردہ رسم الخط کے مطابق ہیں۔

بہرحال حضرت عثمان ؓ ''جامع آیات القرآن'' کی بجائے ''**جامع الاُمّةِ علٰی رسمٍ واحدٍ**'' یعنی اُمت کو قرآن حکیم کے ایک رسم الخط پر جمع کرنے والے ہیں۔ یہ تدوین بھی حضور ﷺ کے انتقال کے ۲۴ برس کے اندر مکمل ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا مانتی ہے اور تمام مستشرق مانتے ہیں کہ جتنا خالص متن (pure text) قرآن کا دنیا میں موجود ہے' کسی دوسری کتاب کا موجود نہیں ہے۔ یہ بات ''**الفضل ما شهدت به الاعداء**'' کا مصداق ہے' یعنی فضیلت تو وہ ہے جس کو دشمن بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اور یہ کسی شے کی حقانیت کے لیے آخری ثبوت ہوتا ہے۔ پس یہ بات پوری دنیا میں مسلّم ہے کہ قرآن حکیم کا ٹیکسٹ محفوظ ہے یا جتنا محفوظ ٹیکسٹ قرآن کا ہے اتنا اور کسی کتاب کا نہیں ہے۔ یعنی قراءت کے فرق بھی ریکارڈ پر ہیں' سبعہ قراءت اور عشرہ قراءت ریکارڈ پر ہیں' ان میں بھی ایک ایک حرف کا معاملہ مدوّن ہے کہ فلاں قراءت میں یہ لفظ زبر کے ساتھ پڑھا گیا ہے یا زیر کے ساتھ۔ اور یہ تمام official قراءات ہیں۔ باقی جہاں تک رسم الخط کا تعلق ہے اس کا ٹیکسٹ حضرت عثمان ؓ نے معین کر دیا۔ اُمتِ مسلمہ پر یہ ان کا بہت بڑا احسان ہے۔ قرآن حکیم کی compilation اور اس کی تدوین کے متعلق یہ چیزیں ذہن میں رہنی چاہئیں۔ یہ حقائق سامنے نہ ہوں تو کچھ لوگ ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا کر سکتے ہیں۔

باب پنجم

قرآن مجید کا موضوع

اب ہم اگلی بحث پر آتے ہیں کہ قرآن کا موضوع کیا ہے۔ کیا قرآن فلسفہ کی کتاب ہے؟ کیا یہ سائنس کی کتاب ہے؟ کیا یہ جیالوجی یا فزکس کی کتاب ہے؟ کس قسم کی کتاب ہے؟ تو پہلی بات یہ سمجھئے کہ قرآن کا موضوع ہے انسان — لیکن انسان کی اناٹومی' اس کی فزیالوجی یا anthropology نہیں' بلکہ انسان کی ہدایت۔ یہ ہدایت کا لفظ قرآن مجید کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے سورۃ البقرۃ کے شروع ہی میں فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲﴾ پھر اس کے وسط میں ارشاد ہوا: ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ یعنی پوری نوعِ انسانی کے لیے ہدایت۔ سورۂ یونس میں فرمایا: ﴿هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۷﴾۔ سورۂ لقمان میں فرمایا: ﴿هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۝۳﴾۔ سورۃ البقرۃ (آیت ۹۷) اور سورۃ النمل (آیت ۲) میں ﴿هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ جبکہ سورۂ آل عمران میں ﴿هُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۱۳۸﴾ اور سورۃ المائدۃ میں ﴿هُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۴۶﴾ کے الفاظ آئے۔ معلوم ہوا کہ ''هُدًى'' کا لفظ قرآن حکیم کے لیے کثرت کے ساتھ آیا ہے۔ پھر یہ صرف نکرہ نہیں' ''ال'' کے ساتھ معرفہ بن کر بھی کئی جگہ آیا ہے۔ تین مرتبہ تو اِس آیت مبارکہ میں آیا جو رسول اللہ ﷺ کے مقصدِ بعثت کو بیان کرتی ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبۃ: ۳۳' الفتح: ۲۸' الصف: ۹) هُدًى نکرہ تھا' اَلْهُدٰى معرفہ ہو گیا۔ یعنی ہدایتِ کاملہ' ہدایتِ تامّہ' ہدایتِ ابدی۔ اسی طرح سورۃ النجم میں فرمایا: ﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۝۲۳﴾۔ سورۃ الجن کا آغاز جنات کی ایک جماعت کے اس قول ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝۱﴾ سے ہوتا ہے۔ آگے چل کر الفاظ

آتے ہیں: ﴿وَاِنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰى اٰمَنَّا بِهٖ﴾ (آیت ۱۳) گویا سورۃ الجن نے معیّن کیا کہ "قُرْاٰنًا عَجَبًا" اور "اَلْهُدٰى" مترادف الفاظ ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف میں آیا ہے: ﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى﴾ (بنی اسراءیل: ۹۴، الکہف: ۵۵)۔ "کیا شے ہے جو لوگوں کو ایمان لانے سے روکتی ہے جبکہ اُن کے پاس الہدیٰ آیا ہے؟" تو گویا قرآن کا موضوع ہے انسان کی ہدایت۔

اب یہ بات ذہن میں رکھئے کہ انسان کے علم کے دو گوشے ہیں، علمِ انسانی دو حصوں میں منقسم ہے۔ (مشہور کہاوت ہے: اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ: عِلْمُ الْاَبْدَانِ وَعِلْمُ الْاَدْيَانِ) ایک حصہ ہے مادی دنیا (Physical World) کا علم، مادی حقائق کا علم، جو حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ دیکھنا، سننا، سونگھنا، چکھنا، چھونا ہمارے حواسِ خمسہ ہیں۔ یہ تمام صلاحیتیں ہیں جن سے کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور عقل کا کمپیوٹر اِن کو پراسیس کرتا ہے، ان سے نتائج نکالتا ہے اور انہیں سٹور کر لیتا ہے۔ پھر حواس کے ذریعہ سے مزید کوئی معلومات حاصل ہوتی ہیں تو اب ان کو بھی وہ پراسیس کر کے اپنے سابقہ "memory store" کے ساتھ ہم آہنگ کر کے کوئی اور نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ انسان کا یہ علم بڑھتا چلا جا رہا ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ ابھی اور کہاں تک جائے گا۔ آج سے سو سال پہلے بھی انسان تصور نہیں کر سکتا تھا کہ انسانی علم وہاں پہنچ جائے گا جہاں آج پہنچ چکا ہے۔ یہ علم بالحواس والعقل ہے اور اس علم کا وحی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا تعلق اس علمِ اَسماء سے ہے جو بالکل شروع میں حضرت آدم علیہ السلام میں ودیعت کر دیا گیا تھا اور یہی دنیا میں سربلندی کی بنیاد ہے۔

علمِ انسانی کے دو گوشوں کے ضمن میں سورۃ البقرۃ کا چوتھا رکوع بہت اہم ہے۔ علم الاَسماء کا ذکر اس کے شروع میں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں کی طرف سے یہ بات استفہاماً پیش کی گئی: ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ (آیت ۳۰) "کیا آپ اس کو زمین میں خلیفہ بنائیں گے جو اِس میں فساد پھیلائے گا اور خون ریزیاں کرے گا؟"

فرشتوں کا یہ اشکال اس طرح دُور کیا گیا کہ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (آیت ۳۱) ''اور اللہ نے آدم کو تمام نام سکھا دیے''۔ یہ علمِ اسماء جو آدم کو دیا گیا' یہی حکومتِ ارضی کی بنیاد ہے۔ جو قوم اِس علم کے اندر ترقی کرے گی وہی اقتدارِ ارضی کی حق دار ٹھہرے گی۔ البتہ اس رکوع کے آخر میں فرمایا گیا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے خطا ہوگئی اور شیطان کے اغوا سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہوگئی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرنے کا بایں طور اعلان کر دیا: ﴿فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ﴾ (آیت ۳۷) اس کے بعد ذکر ہے کہ جب آدم اور حوا علیہما السلام کو حکم دیا گیا کہ اب زمین میں جا کر رہو اور وہاں کا چارج سنبھالو تو فرمایا: ﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۳۸﴾ ''تو جب بھی میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہو گا''۔ وہ علمِ ہدایت ہے۔

یہ دو چیزیں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں۔ علمِ اسماء درحقیقت یوں سمجھئے کہ جیسے آم کی گٹھلی میں آم کا پورا درخت ہوتا ہے۔ وہی گٹھلی تو ہے جو آپ زمین میں دباتے ہیں۔ پھر اگر وہاں پانی پڑتا ہے اور زمین میں روئیدگی کی صلاحیت بھی ہے تو وہ گٹھلی پھٹے گی۔ اس میں سے جو دو پتے نکلیں گے وہ پھلیں پھولیں گے' پروان چڑھیں گے تو درخت بنے گا۔ وہ پورا درخت آم کی گٹھلی میں بالقوۃ (potentially) موجود تھا' البتہ اسے بالفعل (actually) پورا درخت بننے میں تین چار سال لگیں گے۔ تو جس طرح پورا درخت آم کی گٹھلی میں بالقوہ موجود تھا لیکن وہ آم کا درخت کئی سال کے اندر بالفعل وجود میں آیا' بعینہٖ یہ معاملہ کُل مادی حقائق کا ہے کہ اس ضمن میں کُل علم حضرت آدم علیہ السلام کے وجود میں بالقوۃ (potentially) ودیعت کر دیا گیا! اب اس کی exfoliation ہو رہی ہے' وہ بڑھتا جا رہا ہے' برگ و بار لا رہا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا' اس علم کا کوئی تعلق آسمانی ہدایت سے نہیں ہے۔ اب یہ خودرَو پودا ہے جو بڑھتا چلا جا رہا ہے' اور معلوم نہیں

کہاں تک پہنچے گا۔ علامہ اقبال نے اس کی صحیح تعبیر کی ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے!

علامہ کی زندگی میں تو انسان نے چاند پر قدم نہیں رکھا تھا' لیکن اب انسان چاند پر قدم رکھ کر آ گیا ہے۔ مزید یہ کہ اب تو جنیٹک انجینئرنگ اپنے کمالات دکھا رہی ہے۔ کلوننگ کے طریقے سے حیوانات پیدا کیے جا رہے ہیں۔ اس انسانی علم کے ساتھ اگر علم وحی یعنی علمِ ہدایت نہ ہو تو یہ علم بجائے خیر کے شر کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ آج یہ علم واقعتاً شیطانی قوت بن چکا ہے' ہلاکت کا سامان بن چکا ہے' تباہی کا ذریعہ بن چکا ہے۔

﴿فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی﴾ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ارتقائی مراحل طے کیے۔ جیسے جیسے نوعِ انسانی شعور کی منزلیں طے کرتی گئی' اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت میں بھی اضافہ ہوتا گیا' تا آنکہ یہ علمِ ہدایت قرآن حکیم میں آ کر ''اَلْھُدٰی'' (Final Guidance) کی صورت میں مکمل ہو گیا۔ اس ہدایت میں جو ارتقاء ہوا ہے اسے بھی آپ سمجھ لیجیے۔ پہلی کتابیں جو نازل ہوئیں ان میں بھی ھُدًی تو تھی۔ سورۃ المائدۃ میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِیْھَا ھُدًی وَّنُوْرٌ﴾ (آیت ۴۴) ''ہم نے تورات نازل کی تھی' اس میں ہدایت بھی تھی نور بھی تھا''۔ اسی رکوع میں (سورۃ المائدۃ کا ساتواں رکوع) انجیل کے بارے میں فرمایا: ﴿فِیْهِ ھُدًی وَّنُوْرٌ﴾ (آیت ۴۶) ''اس میں بھی ہدایت بھی تھی نور بھی تھا''۔ لیکن یہ ہدایت اور نور درجہ بدرجہ ترقی کرتا رہا ہے' یہاں تک کہ قرآن میں آ کر یہ کامل ہوا ہے اور اَلْھُدٰی بن گیا ہے۔ اب یہ ھُدًی نہیں' اَلْھُدٰی ہے' یعنی ہدایتِ تامہ۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ دیکھئے ایک بچے کو اگر آپ تعلیم دینا چاہتے ہیں تو اس کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھے بغیر نہیں دے سکتے۔ آپ پرائمری میں زیرِ تعلیم کسی بچے کے لیے چاہے پی ایچ ڈی استاد رکھ دیں' لیکن وہ استاد بچے کی ذہنی استعداد کی مناسبت سے ہی اسے تعلیم دے سکے گا۔ بچہ رفتہ رفتہ آگے بڑھے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی عقل اور شعور کی

پوری شدّت‘ قوت اور بلوغت کو پہنچ جائے گا تب اسے آخری علم پڑھایا جائے گا۔ پہلے وہ تاریخ پڑھ رہا تھا‘ اب فلسفۂ تاریخ پڑھے گا۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت تدریج کے ساتھ اتاری ہے۔ تورات میں صرف احکام ہیں‘ حکمت ہے ہی نہیں‘ جبکہ انجیل میں حکمت ہے‘ احکام ہیں ہی نہیں۔ دونوں چیزیں مل کر ایک بات کو مکمل کرتی ہیں۔ تورات میں صرف احکام ہیں۔ جیسے آپ بچے کو بتا دیتے ہیں کہ بھئی کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے‘ روزے کا مطلب یہ ہے کہ اب دن بھر کھانا پینا کچھ نہیں ہے۔ چاہے بچہ ابھی چھ سات سال کا ہے‘ وہ یہ بات سمجھ لیتا ہے۔ اس طرح اسے احکام تو دے دیے جائیں گے کہ یہ کرو‘ یہ نہ کرو‘ یہ Do's ہیں یہ Donts ہیں۔

چنانچہ تورات میں احکامِ عشرہ (The Ten Commandments) دے دیے گئے‘ لیکن ابھی ان کی حکمت نہیں بتائی گئی۔ اس لیے کہ ابھی حکمت کا تحمل انسان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ابھی نوعِ انسانی کا عہدِ طفولیت تھا۔ یوں سمجھئے کہ وہ آج سے ساڑھے تین ہزار سال قبل کا انسان تھا۔ تورات چودہ سو قبل مسیح میں حضرت موسٰی علیہ السلام کو دی گئی۔ اس کے چودہ سو سال بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل دی گئی‘ جس میں صرف حکمت ہے‘ احکام ہیں ہی نہیں۔ لیکن آج سے دو ہزار سال پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کے یہ الفاظ انجیل میں موجود ہیں (اب بھی موجود ہیں) کہ آپؑ نے اپنے حواریّین سے فرمایا تھا: ”مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی تھیں‘ مگر ابھی تم ان کا تحمل نہیں کر سکو گے‘ جب وہ فارقلیطؐ آئے گا تو تمہیں سب کچھ بتائے گا“۔ یہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی تھی۔ حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ ابھی تم تحمل نہیں کر سکتے۔ گویا تمہاری ذہنی بلوغت کے لیے چھ سو برس مزید درکار ہیں۔ چنانچہ الہدیٰ قرآن حکیم میں آ کر مکمل ہوا ہے۔

قرآن مجید جو ہدایت دیتا ہے اس کے بھی دو حصے ہیں۔ ایک فکر و نظر کی ہدایت ہے‘ جس کا عنوان ”ایمان“ ہے۔ اس کا موضوع وہی ہے جو فلسفے کا ہے۔ یعنی کائنات کی حقیقت کیا ہے‘ زندگی کی حقیقت کیا ہے‘ زندگی کا مآل کیا ہے‘ اس کا آغاز کیا ہے‘ انجام کیا ہے‘ صحیح کیا ہے‘ غلط کیا ہے‘ خیر کیا ہے‘ شر کیا ہے‘ علم کیا ہے؟ قرآن مجید کا دوسرا موضوع

ہدایتِ عملی ہے' انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی۔ یہ اوامر ونواہی اور حلال وحرام کے احکام پر مشتمل ہے۔ پھر اس میں معاشی ومعاشرتی احکام بھی ہیں۔ یہ ہدایتِ فکر ونظر اور ہدایتِ فعل وعمل (انفرادی واجتماعی) قرآن حکیم کا موضوع ہے۔

اس ضمن میں یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی قرآن حکیم کا موضوع نہیں ہے' قرآن مجید کتابِ ہدایت ہے' سائنس کی کتاب نہیں ہے' البتہ اس میں سائنسی علوم کی طرف اشارے موجود ہیں اور ان کے حوالے موجود ہیں۔ قرآن مجید کائناتی حقائق کو آیاتِ الٰہیہ قرار دیتا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۴ ملاحظہ کیجیے' جسے میں آیت الآیات قرار دیتا ہوں:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی ساخت میں' رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں' اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں' بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے' پھر اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اپنے اسی انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے' ہواؤں کی گردش میں' اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں' ان لوگوں کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں۔ ان میں اللہ کی قدرت' اللہ کی عظمت' اللہ کا علمِ کامل' اللہ کی حکمتِ بالغہ سب کچھ شامل ہے۔ تو یہ جو مظاہرِ طبیعی (Physical phenomena) ہیں' قرآن حکیم ان کا جابجا حوالہ دیتا ہے۔ بعض کائناتی حقائق وہ ہیں جن کا تعلق فلکیات (Astronomy) سے ہے۔ فرمایا: ﴿وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾﴾ یعنی یہ تمام

اجرامِ سماویہ اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔ معلوم ہوا ہر شے حرکت میں ہے۔ انسان پر ایک دور ایسا گزرا ہے جب وہ یہ سمجھتا تھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد حرکت کر رہا ہے۔ پھر ایک دَور آیا جس میں کہا گیا کہ نہیں، سورج ساکن ہے، زمین حرکت کرتی ہے، زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے، اور آج ہمیں معلوم ہوا کہ ہر شے حرکت میں ہے۔ سورج کا بھی اپنا ایک مدار ہے، اس میں وہ اپنے پورے کنبے سمیت حرکت کر رہا ہے۔ یہ نظامِ شمسی اس کا کنبہ ہے، اس پورے کنبے کو لے کر وہ بھی ایک مدار میں حرکت کر رہا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ الفاظِ قرآنی: ﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ میں ''كُلٌّ'' کا لفظ جس طرح منقح اور مبرہن ہو کر، جس شان کے ساتھ آج ہویدا ہوا ہے، آج سے پہلے انسان کو معلوم نہیں تھا۔ قرآن مجید میں کائناتی مظاہر کے بارے میں جو بات کہی گئی ہے وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ حقیقت ہے جو اِس دَور میں آ کر پوری طرح واضح ہوئی ہے۔

ڈاکٹر موریس بوکائی ایک فرانسیسی سرجن تھے۔ انہوں نے قرآن اور بائبل دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا۔ واضح رہے کہ بائبل سے مراد عہد نامہ قدیم (Old Testament) اور عہد نامہ جدید (New Testament) دونوں ہیں۔ تقابلی مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ پورے قرآن میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جسے ہمارے سائنسی انکشافات میں سے کسی نے غلط ثابت کیا ہو، جب کہ تورات میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں کہ سائنس انہیں غلط ثابت کر چکی ہے۔ اس پر انہوں نے ۲۵۰ صفحات کی کتاب تحریر کی: ''The Bible, The Quran and Science''۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تورات بھی تو اللہ کی کتاب ہے، پھر اس میں ایسی چیزیں کیوں آ گئیں جو سائنسی حقائق کے خلاف ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل تورات تو چھٹی صدی قبل مسیح ہی میں گم ہو گئی تھی جب بخت نصر کے ہاتھوں یروشلم کی تباہی ہوئی تھی۔ اس کے ڈیڑھ سو برس بعد کچھ لوگوں نے تورات کو یادداشتوں سے مرتب کیا۔ لہٰذا اُس وقت انسانی علم کی جو سطح تھی اس کے اعتبارات سے تاویلات تورات میں شامل ہو گئیں، کیونکہ انسان تو اپنی ذہنی سطح کے

مطابق ہی سوچ سکتا ہے۔ تورات میں تحریف ہونے کی وجہ سے اِس میں ایسی چیزیں در آئیں جو سائنس کی رو سے غلط ثابت ہوئیں۔ البتہ قرآن میں ایسی کوئی تاویل نہیں ہوئی اور اس کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے۔ یہ بات بڑی اہم ہے۔ اس کو بڑے خوبصورت انداز میں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے کہا ہے کہ یہ کائنات اللہ کا فعل ہے۔ اس کی تخلیق اور اس کی تدبیر ہے' جبکہ قرآن اللہ کا قول ہے' اور اللہ تعالیٰ کے قول وعمل میں تضاد ممکن نہیں ہے۔ کسی انسان کے قول وعمل میں بھی اگر کوئی تضاد ہو تو وہ انسانیت کی سطح سے نیچے اتر جاتا ہے' اللہ تعالیٰ کے قول اور عمل میں تضاد کیسے ہوسکتا ہے؟ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ایک دَور میں انسانوں نے بات سمجھی نہ ہو' اُن کا ذہن وہاں تک پہنچا نہ ہو' ان کی معلومات کا دائرہ ابھی اس حد تک ہو کہ ان حقائق تک نہ پہنچا جاسکے۔ لیکن جیسے جیسے وقت آئے گا مزید حقائق منکشف ہوں گے اور یہ بات زیادہ سے زیادہ واضح سے واضح تر ہوتی چلی جائے گی کہ جو کچھ قرآن نے فرمایا ہے وہی برحق ہے۔ ہاں آج سے پہلے انسانی ذہن اِس حد تک رسائی حاصل کرنے کا اہل نہیں تھا۔ سورۃ حم السجدۃ کی آخری سے پہلی آیت ذہن میں رکھیے:

سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ

''ہم انہیں دکھاتے چلے جائیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور خود اُن کی جانوں میں بھی' یہاں تک کہ یہ بات پوری طرح نکھر کر اُن کے سامنے واضح ہو جائے گی کہ یہ قرآن ہی حق ہے''۔

ڈاکٹر کیتھ این مُور کینیڈا کے بہت بڑے ایمبر یالوجسٹ ہیں۔ ان کی کتاب علمِ جنین (Embriology) میں سند مانی جاتی ہے اور یونیورسٹی کی سطح پر بطور ٹیکسٹ بک پڑھائی جاتی ہے۔ انہوں نے قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے کے بعد انتہائی حیرت کا اظہار کیا ہے کہ آج سے چودہ سو برس قبل جبکہ نہ مائیکروسکوپ موجود تھی اور نہ ہی dissection ہوتا تھا' قرآن نے علمِ جنین کے متعلق جو معلومات دی ہیں وہ صحیح ترین حقائق پر مشتمل ہیں۔ ڈاکٹر موصوف سورۃ المؤمنون کی آیات ۱۲ تا ۱۴ کا مطالعہ کرتے ہوئے انگشت

بدنداں ہیں:

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَةً فِىۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَةَ مُضۡغَةً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا' پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا' پھر اُس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی' پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا' پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں' پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا' پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔''

ان کا کہنا ہے کہ واقعہ یہ ہے کہ انسانی تخلیق کے مراحل کی اس سے زیادہ صحیح تعبیر ممکن نہیں ہے۔ تو یہ حقیقت ذہن میں رکھیے کہ اگرچہ قرآن مجید سائنس کی کتاب نہیں ہے' لیکن جن سائنسی حقائق یا سائنسی مظاہر (phenomena) کا قرآن نے حوالہ دیا ہے وہ یقیناً حق ہیں' چاہے تاحال ہم ان کی حقانیت کو نہ سمجھ پائے ہوں۔ مثلاً آج بھی مجھے نہیں معلوم کہ قرآن جو ''سات آسمان'' کہتا ہے تو اِن سے کیا مراد ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا جب انسان سمجھے گا کہ ''سات آسمان'' کے یہ الفاظ ٹھیک ٹھیک اس حقیقت پر منطبق ہوتے ہیں جو آج ہمارے علم میں آئی ہے' پہلے نہیں آئی تھی۔ البتہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' عملی اعتبار سے یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ قرآن سائنس یا ٹیکنالوجی کی کتاب نہیں ہے اور اس حوالے سے ایک بڑا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر ہمارے اسلاف نے اپنے دَور کی معلومات کی سطح پر قرآن کی ان آیات کا کوئی خاص مفہوم معین کیا تو ہمارے لیے لازم نہیں ہے کہ ہم اس کی پیروی کریں۔ ہم قرآن میں بیان کردہ سائنسی مظاہر کو اس سائنسی ترقی کے حوالے سے سمجھیں گے جو روز بروز ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ آخری بات عرض کر رہا ہوں کہ اس معاملے میں خود محمد رسول اللہ ﷺ سے بھی اگر کوئی بات منقول ہو تو وہ بھی قطعی نہیں سمجھی جائے گی' کیونکہ حضور ﷺ یہ چیزیں سکھانے کے لیے نہیں آئے تھے۔ یہ بات اگرچہ بہت سے لوگوں پر ثقیل اور گراں گزرے گی لیکن صحیح طرزِ عمل یہی ہوگا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ضمن میں اگر حضور ﷺ

کی کوئی حدیث بھی سامنے آ جائے تو اس کو بھی ہم دلیلِ قطعی نہیں سمجھیں گے۔

اس سلسلے میں تاَبیرِ نخل کا واقعہ بہت اہم ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضورﷺ کی پیدائش مکہ کی ہے' ہجرت تک ساری زندگی آپ نے وہاں گزاری' وہ وادیٔ غیر ذی زرع ہے' جہاں کوئی پیداوار' کوئی زراعت' کوئی کاشت ہوتی ہی نہیں تھی' لہٰذا آپؐ کو اس کا کوئی تجربہ سرے سے تھا ہی نہیں۔ ہاں تجارت کا بھرپور تجربہ تھا اور اس کے تمام اَسرار و رموز سے آپؐ واقف تھے۔ آپؐ مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے دیکھا کہ کھجوروں کے سلسلہ میں انصارِ مدینہ ''تاَبیرِ نخل'' کا معاملہ کرتے تھے۔ کھجور ایک ایسا پودا ہے جس کے نر اور مادہ پھول علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ اگر اس کے نر اور مادہ پھولوں کو قریب لے آئیں تو اس کے بار آور ہونے کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے۔ اہلِ مدینہ کو یہ بات تجربے سے معلوم ہوئی تھی اور وہ اس پر عمل پیرا تھے۔ مدینہ تشریف آوری پر رسول اللہﷺ نے جب اہل مدینہ کا یہ معمول دیکھا تو اُن سے فرمایا کہ اگر آپ لوگ ایسا نہ کریں تو کیا ہے؟ ایسا نہ کرنا شاید تمہارے حق میں بہتر ہو۔ یہ بات آپﷺ نے اپنے اجتہاد اور فہم کے مطابق اس بنیاد پر فرمائی کہ فطرت اپنی دیکھ بھال خود کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فطرت کا نظام انسانوں پر نہیں چھوڑا' بلکہ یہ تو خودکار نظام ہے۔ چنانچہ آپﷺ نے فرمایا کہ آپ لوگ اس قدرتی نظام میں دخل نہ دیں تو کیا ہے؟ البتہ آپؐ نے روکا نہیں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے لیے حضورﷺ کا اتنا کہنا بھی گویا حکم کے درجہ میں تھا۔ انہوں نے اس سال وہ کام نہیں کیا' لیکن فصل کم ہوگئی۔ اب وہ ڈرتے ڈرتے' جھجکتے جھجکتے حضورﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ حضور! ہم نے اس مرتبہ تاَبیرِ نخل نہیں کی تو فصل کم ہوئی ہے۔ اس پر آپﷺ نے فرمایا: ((**اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاکُمْ**)) اس حدیث کا ایک ایک لفظ یاد کر لیجیے۔ آپﷺ نے فرمایا کہ یہ جو تمہارے اپنے دُنیوی اور مادی معاملات ہیں جن کی بنیاد تجربہ پر ہے' یہ تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ تم زیادہ تجربہ کار ہو' تم ان حقائق سے زیادہ واقف ہو۔ ایک دوسری روایت میں رسول اللہﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ((**اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ ' اِذَا اَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ مِّنْ**

دِیْنِکُمْ فَخُذُوْا بِہٖ ' وَاِذَا اَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ مِنْ رَأْیِیْ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ)) ''میں تو ایک بشر ہوں۔ جب میں تمہیں تمہارے دین کے بارے میں کوئی حکم دوں تو اس سے سرتابی نہ کرنا' لیکن جب میں تمہیں اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو جان لو کہ میں ایک بشر ہی ہوں''۔ (یہ دونوں حدیثیں صحیح مسلم کی ہیں۔ کتاب الفضائل' باب وجوب امتثال ما قالہ ﷺ شرعاً دون ما ذکرہ من معایش الدنیا علی سبیل الرأی) گویا آپ ﷺ نے واضح فرما دیا کہ میں یہ چیزیں سکھانے نہیں آیا' میں جو کچھ سکھانے آیا ہوں وہ مجھ سے لو!

اس اعتبار سے یہ حدیث بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ ظاہر ہے آپؐ ٹیکنالوجی سکھانے نہیں آئے تھے۔ آپؐ طب و جراحت سکھانے نہیں آئے تھے' آپؐ کوئی اور سائنس پڑھانے نہیں آئے تھے۔ ورنہ تو ہم شکوہ کرتے کہ آپؐ نے ہمیں ایٹم بم بنانا کیوں نہیں سکھا دیا؟ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ فرما دیا کہ ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاکُمْ)) تو ہمارے لیے یہ بات آخری درجے میں سند ہے کہ جیسے جیسے سائنسی انکشافات ہو رہے ہیں' جیسے جیسے علم انسانی کی exploration ہو رہی ہے' ویسے ویسے حقائق فطرت ہماری نگاہوں کے سامنے منکشف ہو رہے ہیں۔ جیسے آم کی گٹھلی سے آم کا پورا درخت وجود میں آتا ہے ایسے ہی حضرت آدم علیہ السلام کے وجود میں علم بالحواس اور علم بالعقل کا جو mechanism رکھ دیا گیا تھا' یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ علم پھیل رہا ہے۔ اس سے جو بھی چیزیں ہمارے سامنے آئیں ان میں کہیں رکاوٹ نہیں ہے کہ ہم سلف کی بات کو لے کر بیٹھ جائیں کہ سائنس خواہ کچھ بھی کہے ہم تو اسلاف کی بات مانیں گے۔ یہاں پر اس طرزِ عمل کے لیے کوئی دلیل اور بنیاد نہیں۔

قرآن کا اصل موضوع ایمان ہے۔ ماوراء الطبیعیاتی حقائق عالمِ غیب سے متعلق ہیں' جو ہمارے عالمِ محسوسات سے ماوراء ہیں' جس کی خبریں ہمیں صرف وحی سے مل سکتی ہیں۔ علمِ حقیقت جسے ہم اجمالی طور پر ایمان کہتے ہیں یہ قرآن کا اصل موضوع ہے' یعنی ہدایتِ فکری و عملی۔ تمدّنی میدان میں' معاشی واقتصادی اور معاشرتی میدان میں یہ

کرو اور یہ نہ کرو۔ یہ چیزیں کھانے پینے کی ہیں' یہ چیزیں کھانے پینے کی نہیں ہیں۔ یہ حرام ہیں' یہ نجس ہیں۔ یہ علم حضورﷺ نے دیا ہے اور قرآن کا موضوع اصل میں یہی ہے۔ البتہ قرآن میں جو سائنسی ریفرنسز آئے ہیں' وہ غلط نہیں ہیں' وہ لازماً درست ہیں۔

انسانی علم کے تین دائرے ہیں۔ ایک علم بالحواس ہے' یہ انسانی علم کا پہلا دائرہ ہے۔ حواس کے ذریعے ہمیں معلومات حاصل ہوتی ہیں' جنہیں آج کل ہم sense data کہتے ہیں۔ آنکھ نے دیکھا' کان نے سنا' ہاتھ نے اس کی پیائش کی۔ اس کے بعد دوسرا دائرہ علم بالعقل ہے۔ عقل sense data کو پراسیس کرتی ہے۔ اس ضمن میں استدلال اور استنباط کے اصول معین کیے گئے ہیں۔ انسان اپنے حواسِ خمسہ کے ذریعے علم حاصل کرتا ہے' پھر عقل ان معلومات کو process کرتی ہے تو انسان کسی نتیجے پر پہنچتا ہے۔ یوں عقل حواس کی محتاج ہوئی' لیکن عقل وحواس کے ماورا بھی ایک علم ہے جسے شاہ اسماعیل شہیدؒ نے علم بالقلب کا نام دیا ہے۔ آج اسے extra sensory perceptions کہا جا رہا ہے۔ یہ علم کا تیسرا دائرہ ہے۔ اس سے پہلے ادب میں اس کے لیے وجدان(intuition) کا لفظ تھا۔ یہ علم بالقلب درحقیقت وہ خاص انسانی علم ہے جس سے آج کے مادہ پرست واقف نہیں ہیں۔ وحی کا تعلق اسی تیسرے دائرے سے ہے۔ اس لیے کہ وحی کا نزول قلب پر ہوتا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾﴾ (الشعراء)

عقل اور حواس سے حاصل ہونے والے علوم میں تمام فزیکل سائنسز' میڈیکل سائنسز اور ٹیکنالوجی کے مضامین شامل ہیں۔ انسان نے مختلف چیزوں کے خواص معلوم کیے' کچھ طبعی اور کیمیائی تبدیلیوں کے اصول دریافت کیے۔ پھر ان اصولوں سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان کو استعمال کیا۔ اس سے انسان کی ٹیکنالوجی ترقی کرتی جا رہی ہے اور ابھی نامعلوم کہاں تک پہنچے گی۔ یہ ایک علم ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں ﴿عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ کے الفاظ میں کر دیا گیا۔ البتہ انسان صرف اس علم پر قانع نہیں رہا'

اس لیے کہ اس سے تو صرف جزوی علم حاصل ہوتا ہے' انسان ایک ایک جزو' قدم بقدم سیکھتا ہے۔ انسان کی ایک طلب (urge) ہے کہ وہ ماہیت معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ میری حقیقت کیا ہے؟ علم کی حقیقت' خیر وشر کی حقیقت کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ آج سے ایک ہزار سال قبل کے انسان کی معلومات (علم بالحواس اور علم بالعقل کے اعتبار سے) بڑی محدود تھیں' لیکن اُس وقت کے انسان کو بھی اس چیز کی ضرورت تھی کہ وہ کوئی رائے قائم کرے کہ یہ کائنات جس کا میں ایک فرد ہوں' اس کی حقیقت کیا ہے' خود میری حقیقت کیا ہے؟ میری زندگی کا آغاز کیا ہے؟ میرا اس کے ساتھ ربط وتعلق کیا ہے؟ اس سفر کی منزل کیا ہے؟ میں اپنی زندگی میں کیا کروں' کیا نہ کروں؟ کیا کرنا صحیح ہے کیا کرنا غلط ہے؟ یہ انسان کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس ضرورت کے تحت جب انسان نے سوچنا شروع کیا تو فلسفہ کا آغاز ہوا جو گتھیوں کو سلجھانا چاہتا ہے۔ ان گتھیوں کو سلجھانے کے لیے پھر انسان نے عقل کے گھوڑے دوڑائے' اپنی منطق کو استعمال کیا۔ فلسفہ' مابعد الطبیعیات' الٰہیات' اخلاقیات اور نفسیات' یہ تمام علوم انسانی علوم میں سے ہیں۔ گویا کہ علم بالحواس اور علم بالعقل کے نتیجے میں یہ دو علم وجود میں آئے۔ ایک فزیکل سائنسز کا علم جس کا تعلق ٹیکنالوجی سے ہے' دوسرا سوشل سائنسز کا علم جس میں فلاسفی' سوشیالوجی' نفسیات' اخلاقیات' اقتصادیات اور سیاسیات وغیرہ شامل ہیں۔

جان لیجیے کہ ھُدًی جس کی تکمیلی شکل "الھُدٰی" قرآن مجید ہے' اس کا موضوع انسانی علم کا دائرۂ اوّل نہیں ہے۔ یہ سائنس کی کتاب نہیں ہے اور نہ ہی سائنس پڑھانے یا ٹیکنالوجی سکھانے آئی ہے۔ انبیاء اس لیے نہیں بھیجے گئے۔ اگرچہ قرآن حکیم میں سائنسی مظاہر کی طرف حوالے موجود ہیں اور وہ لازماً درست ہیں' لیکن وہ قرآن کا اصل موضوع نہیں ہے۔ جیسے جیسے انسان کے سائنسی علم میں تدریجاً ترقی ہو رہی ہے اسی طرح ان ریفرنسز کو سمجھنا بھی انسان کے لیے ممکن ہو رہا ہے۔ البتہ قرآن کا اصل موضوع مابعد الطبیعیات ہے۔ پھر فکر وعمل دونوں کے لیے راہنمائی درکار ہے' جیسے کہ کسی راستے پر

چلنے والے کو ''روڈ سائنز'' کی ضرورت ہوتی ہے کہ اِدھر نہ جانا' اِدھر خطرہ ہے' ہلاکت ہے۔ اسی طرح انسان کو سفرِ حیات میں ان cautions کی ضرورت ہے کہ ادھر خطرہ ہے یہ تمہارے لیے ممنوع ہے' یہ حرام ہے' یہ نقصان دہ ہے' اس میں ہلاکت ہے' چاہے تمہیں ہلاکت نظر نہیں آ رہی لیکن تم ادھر جاؤ گے تو تمہارے لیے ہلاکت ہے۔ درحقیقت یہ قرآن کا اصل موضوع ہے۔

باب ششم

فہمِ قرآن کے اصول

فہمِ قرآن کے سلسلہ میں درج ذیل عنوانات کی تفہیم ضروری ہے۔

۱) قرآن کریم کا اسلوبِ استدلال

قرآن کے طالب علم کو جاننا چاہیے کہ قرآن کا اسلوبِ استدلال منطقی نہیں' فطری ہے۔ انسان جس فلسفے سے واقف ہے اس کی بنیاد منطق ہے۔ چنانچہ ہمارے فلاسفہ اور متکلمین استخراجی منطق (Deductive Logic) سے اعتناء کرتے رہے ہیں' جبکہ قرآن مجید نے اسے سرے سے اختیار نہیں کیا۔ وقتی تقاضے کے تحت ہمارے متکلمین نے اسے اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن اس سے کوئی زیادہ فائدہ نہیں پہنچ پایا۔ ایمانی حقائق کو جب استخراجی منطق کے ذریعے سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تو یقین کم اور شک زیادہ پیدا ہوا۔ اس ضمن میں کانٹ کی بات حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے' لہٰذا علامہ اقبال نے بھی اپنے خطبات کا آغاز اسی حوالے سے کیا ہے۔ کانٹ نے حتمی طور پر ثابت کر دیا کہ کسی منطقی دلیل سے خدا کا وجود ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ منطق میں اللہ کی ہستی کے اثبات کے لیے ایک دلیل لائیں گے تو منطق کی دوسری دلیل اسے کاٹ دے گی۔ جیسے لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اسی طرح منطق، منطق کو کاٹ دے گی۔ قرآن نے اگرچہ کہیں کہیں منطق کو استعمال تو کیا ہے لیکن وہ بھی منطقی اصطلاحات میں نہیں۔ قرآن مجید کا اسلوبِ استدلال فطری ہے اور اس کا انداز خطابی ہے۔ جیسے ایک خطیب جب خطبہ دیتا ہے تو جہاں وہ عقلی دلائل دیتا ہے وہاں جذبات سے بھی اپیل کرتا ہے۔ اس سے اس کے خطبے میں گہرائی و گیرائی پیدا ہوتی ہے۔ ایک لیکچر میں زیادہ تر دارومدار منطق پر ہوتا ہے۔ یعنی ایسی دلیل جو عقل کو قائل کر سکے۔ لیکن شعلہ بیان خطیب انسان کے جذبات کو اپیل کرتا ہے۔ اس کو خطابی دلیل کہا

جاتا ہے۔ یہی خطابی انداز اور استدلال قرآن نے استعمال کیا ہے۔

انسان کی فطرت میں کچھ حقائق موجود ہیں۔ قرآن کے پیش نظر اِن حقائق کو ابھارنا مقصود ہے۔ یعنی انسان کو آمادہ کیا جائے کہ ع

''اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی!''

عقل اور منطق کا دائرہ تو بڑا محدود ہے۔ انسان اپنے اندر جھانکے تو اس کے اندر صرف عقل ہی نہیں ہے' کچھ اور بھی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

ہے نورِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

یہ جو اِس کے اندر ''کوئی اور'' شے بھی ہے' اسے اپیل کرنا ضروری ہے تاکہ انسان فطرت کی بنیاد پر اپنے اندر جھانکے اور محسوس کرے کہ ہاں یہ ہے! تاہم اس کے لیے کوئی منطقی دلیل بھی پیش کر دی جائے۔ تو یہ نورٌ علیٰ نورٍ ہوگا۔ یہ ہے درحقیقت قرآن کا فطری طرزِ استدلال۔ بعض مقامات پر ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے قرآن اپنے مخاطب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ کہہ رہا ہے اور اسے توجہ دلا رہا ہے کہ ذرا غور کرو' سوچو' اپنے اندر جھانکو۔ جیسے سورۃ ابراہیم کی آیت ۱۰ میں فرمایا گیا: ﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''کیا اللہ کی ہستی میں کوئی شک ہے جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے؟'' یہاں کوئی منطقی دلیل نہیں ہے' لیکن مخاطب کو دروں بینی پر آمادہ کیا جا رہا ہے کہ اپنے اندر جھانکو' تمہیں اپنے اندر ثبوت ملے گا' تمہیں اپنے اندر اللہ کی ہستی کی شہادت ملے گی۔ سورۃ الانعام کی آیت ۱۹ میں ارشاد ہوا: ﴿اَئِنَّکُمْ لَتَشْھَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اٰلِھَۃً اُخْرٰی ؕ﴾ ''کیا تم واقعی اس بات کی گواہی دے رہے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ بھی ہے؟'' یعنی تم یہ بات کہہ تو رہے ہو' لیکن ذرا سوچو تو سہی کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تمہاری فطرت اسے تسلیم کرتی ہے؟ اپنے باطن میں جھانکو' کیا تمہارا دل اس کی گواہی دیتا ہے؟ حالانکہ ظاہر ہے کہ وہ تو اِس کے مدعی تھے اور اپنے معبودانِ باطل کے لیے کٹ مرنے کو تیار تھے۔ اس خطابی دلیل کے پس منظر میں یہ حقیقت موجود ہے کہ تم جانتے ہو کہ یہ محض

ایک عقیدہ (dogma) ہے جو چلا آ رہا ہے' تمہارے باپ دادا کی روایت ہے' اس کی حیثیت تمہارے نسلی اعتقادات (racial creed) کی ہے۔ قرآن مجید درحقیقت انسان کی فطرت کے اندر جو شے مضمر ہے اسی کو ابھار کر باہر لانا چاہتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا اسلوبِ استدلال منطقی نہیں ہے' بلکہ فطری ہے۔ اس کو خطابی انداز کہا جائے گا۔

۲) قرآن حکیم میں محکم اور متشابہ کی تقسیم

سورۃ آل عمران کی آیت ۷ ملاحظہ کیجیے! ارشاد ہوا: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ﴾ ''وہی ہے (اللہ) جس نے (اے محمد ﷺ) آپ پر کتاب نازل کی' اس میں سے کچھ آیاتِ محکمات ہیں' وہی کتاب کی جڑ بنیاد ہیں اور دوسری متشابہ ہیں''۔ اس آیت میں لفظ کتاب دو دفعہ آیا ہے' دونوں کے مفہوم میں باریک سا فرق ہے۔ متشابہ ان معانی میں کہ ان کے اصل مفہوم کو سمجھنے میں اشتباہ ہو جاتا ہے' وہ آیاتِ متشابہات ہیں۔ آگے فرمایا: ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ﴾ ''تو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہ آیات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں (ان ہی پر غور وفکر اور ان ہی میں کھوج کرید میں لگے رہتے ہیں) اُن کی نیت ہی فتنہ اٹھانے کی ہے' اور وہ بھی ہیں جو اُس کا اصل مفہوم جاننا چاہتے ہیں''۔ ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ﴾ ''حالانکہ اس کے حقیقی معانی ومراد اللہ ہی جانتا ہے''۔ ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ﴾ ''البتہ جو لوگ علم میں پختگی کے حامل ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اس پوری کتاب پر (محکمات پر بھی اور متشابہات پر بھی)' یہ سب ہمارے ربّ کی طرف سے ہے''۔ ﴿وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝﴾ ''لیکن نصیحت نہیں حاصل کرتے مگر وہی جو ہوش مند ہیں''۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان عقلمندوں اور ہوش مندوں میں شامل کرے' رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ میں ہمارا شمار ہو!

محکم اور متشابہ سے مراد کیا ہے؟ جان لیجیے کہ ''محکم قطعی'' یعنی وہ محکم جن کے قطعی ہونے میں نہ پہلے کوئی شبہ ہو سکتا تھا نہ اَب ہے' نہ آئندہ ہو گا' وہ تو قرآن حکیم کے

اوامر و نواہی ہیں۔ یعنی یہ کرو‘ یہ نہ کرو‘ یہ حلال ہے‘ یہ حرام ہے‘ یہ جائز ہے‘ یہ ناجائز ہے‘ یہ پسندیدہ ہے‘ یہ ناپسندیدہ ہے‘ یہ اللہ کو پسند ہے اور یہ اللہ کو ناپسند ہے!

قرآن حکیم کا عملی حصہ درحقیقت محکمات ہی پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں کتاب کا لفظ دو مرتبہ آیا ہے۔ پہلے بحیثیت مجموعی پورے قرآن کے لیے فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ﴾ قرآن مجید کا جو حصہ عملی ہدایات پر مشتمل ہے اس کے لیے بھی لفظ ''کتاب'' مخصوص ہے۔ چنانچہ دوسری مرتبہ جو لفظ کتاب آیا ہے ﴿هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ وہ اسی مفہوم میں ہے۔ جہاں کوئی شے واجب کی جاتی ہے وہاں ''کُتِبَ'' کا لفظ آتا ہے۔ جیسے ﴿كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ﴾...... ﴿كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ﴾ ...... ﴿كُتِبَ عَلَیْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ نماز کے بارے میں فرمایا: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ یہاں کتاب سے مراد وہ حکم ہے جو دیا گیا ہے‘ تو ان معانی میں ﴿هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ سے مراد قانون‘ شریعت‘ عملی ہدایات‘ اوامر و نواہی ہیں اور اصل میں وہی محکمات ہیں۔

دائمی متشابہات عالمِ غیب اور اس کے ضمن میں عالمِ برزخ‘ عالمِ آخرت‘ عالمِ ارواح‘ ملائکہ کا عالم اور عالمِ امثال وغیرہ ہیں۔ یہ درحقیقت وہ دائرہ ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے اور اس کی حقیقتوں کو کما حقہٗ اس زندگی میں سمجھنا محال اور ناممکن ہے۔ لیکن ان کا ایک علم دیا جانا ضروری تھا۔ مابعد الطبیعیات ایمانیات کے لیے ضروری ہے کہ اس سب کا ایک اجمالی خاکہ سامنے ہو۔ ہر انسان نے مرنا ہے‘ مرنے کے فوراً بعد عالمِ برزخ میں یہ کچھ ہونا ہے‘ بعث بعد الموت ہے‘ حشر نشر ہے‘ حساب کتاب ہے‘ جنت و دوزخ ہے۔ ان حقیقتوں کا اجمالی علم موجود نہ ہو تو بنیادی ضرورت کے طور پر انسان کو جو فلسفہ درکار ہے وہ اس کو فراہم نہیں ہو گا۔ لیکن ان کی حقیقتوں تک رسائی اس زندگی میں رہتے ہوئے ہمارے لیے ممکن نہیں‘ لہٰذا ان کا جو علم دیا گیا ہے وہ آیاتِ متشابہات ہیں اور وہ دائماً متشابہات ہی رہیں گی۔ ہاں جب اُس عالم میں آنکھ کھلے گی تو اصل حقیقت معلوم ہو گی‘ یہاں معلوم نہیں ہو سکتی۔

البتہ متشابہات کا ایک دوسرا دائرہ ہے جو تدریجاً متشابہات سے محکمات کی طرف آ رہا ہے۔ وہ دائرہ مظاہر طبیعی (physical phenomena) سے متعلق ہے۔ آج سے ہزار سال پہلے اس کا دائرہ بہت وسیع تھا' آج یہ کچھ محدود ہوا ہے' لیکن اب بھی بہت سے حقائق ہم نہیں جانتے۔ سات آسمانوں کی حقیقت آج تک ہمیں معلوم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ آگے چل کر ہمارا میٹیریل سائنسز کا علم اس حد تک پہنچ جائے کہ معلوم ہو کہ یہ ہے وہ بات جو قرآن نے سات آسمانوں سے متعلق کہی تھی' لیکن اس وقت یہ ہمارے لیے متشابہات میں سے ہے۔ اسی طرح ایک آیت ﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝﴾ (یٰسٓ) (ہر شے اپنے مدار میں تیر رہی ہے) اس کو پہلے انسان نہیں سمجھ سکتا تھا' لیکن آج یہ حقیقت محکم ہو کر سامنے آ گئی ہے کہ ع

''لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں!''

اگر آپ نظامِ شمسی کو دیکھیں تو ہر چیز حرکت میں ہے۔ کہکشاں کو دیکھیں تو ہر شے حرکت میں ہے۔ کہکشائیں ایک دوسرے سے دُور بھاگ رہی ہیں' فاصلہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ایک ذرے (atom) کا مشاہدہ کریں تو اس میں الیکٹرون اور پروٹون حرکت میں ہیں۔ گویا ہر شے حرکت میں ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل یہ بات متشابہات میں تھی' آج وہ محکمات کے دائرے میں آ گئی ہے۔ چنانچہ بہت سے وہ سائنسی حقائق جو ابھی تک انسان کو معلوم نہیں ہیں اور ان کے حوالے قرآن میں ہیں' وہ آج کے اعتبار سے تو متشابہات میں شمار ہوں گے لیکن انسان کا فزیکل سائنسز کا علم آگے بڑھے گا تو وہ تدریجاً متشابہات کے دائرے سے نکل کر محکمات کے دائرے میں آ جائیں گے۔

۳) تفسیر اور تاویل کا فرق

تفسیر اور تاویل دونوں لفظ قرآن مجید میں آئے ہیں۔ سورۃ آل عمران کی متذکرہ بالا آیت میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ﴾ ''اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا مگر اللہ''۔ تفسیر کا لفظ قرآن مجید میں سورۃ الفرقان میں آیا ہے: ﴿وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ۝﴾ ''اور نہیں لاتے وہ آپ کے سامنے کوئی نرالی

بات مگر ہم پہنچا دیتے ہیں (اس کے جواب میں) آپ کو ٹھیک بات اور بہترین طریقے سے بات کھول دیتے ہیں''۔ یہ لفظ قرآن میں ایک ہی مرتبہ آیا ہے' جبکہ تاویل کا لفظ سترہ (۱۷) بار آیا ہے۔ اس کے کچھ اور مفاہیم بھی ہیں اور قرآن کے علاوہ کچھ اور چیزوں پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے۔ تفسیر اور تاویل میں فرق کیا ہے؟ تفسیر کا مادہ ''ف' س' ر'' ہے۔ یہ گویا ''سفر'' کی منقلب شکل ہے۔ سفر بمعنی Journey بھی ہے —— اور اس کا مطلب روشنی بھی ہے' کتاب بھی ہے۔ حروف ذرا آگے پیچھے ہو گئے ہیں' لفظ ایک ہی ہے۔ تفسیر کا معنی ہے کسی شے کا کھولنا' واضح کر دینا' کسی شے کو روشن کر دینا' لیکن یہ زیادہ تر مفردات اور الفاظ سے متعلق ہوتی ہے' جبکہ تاویل بحیثیت مجموعی کلام کا اصل مدلول ہوتی ہے کہ اس سے مراد کیا ہے' اس سے اصل مقصود کیا ہے' اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔ لہٰذا زیادہ تر یہی لفظ قرآن کے لیے مستعمل ہے۔ اگرچہ ہمارے ہاں اردو دان لوگ زیادہ تر لفظ تفسیر استعمال کرتے ہیں کہ فلاں آیت کی تفسیر' فلاں لفظ کی تفسیر' لیکن اس کے لیے قرآن کی اصل اصطلاح تاویل ہی ہے اور حدیث میں بھی یہی لفظ آیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا منقول ہے: ((اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِیْلَ)) یعنی اے اللہ! اس نوجوان کو دین کا فہم اور تفقہ عطا فرما اور تاویل کا علم عطا فرما! چنانچہ کلام کی اصل حقیقت' اصل مراد' اصل مطلوب' اصل مدلول کو پالینا تاکہ انسان اصل مقصود تک پہنچ جائے' اسے تاویل کہتے ہیں۔ ؎

''جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!''

ا' و' ل کا مادہ عربی زبان میں کسی شے کی طرف لوٹنے کے مفہوم میں آتا ہے۔ اسی لیے لوگ کہتے ہیں ہم فلاں کی آل ہیں' یعنی وہ کسی بڑی شخصیت کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں۔ ''آلِ فرعون'' کا مطلب فرعون کی اولاد نہیں ہے' بلکہ ''فرعون والے' فرعونی'' ہے۔ وہ فرعون ہی کی اطاعت کرتے تھے اور اسی کو اپنا معبود یعنی حاکم اور پیشوا سمجھتے تھے۔ اسی معنی میں کسی عبارت کو اُس کے اصل مفہوم کی طرف لوٹانا تاویل ہے۔ تفسیر اور تاویل کے مابین اس فرق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

۴) تاویلِ عام اور تاویلِ خاص

قرآن حکیم کی کسی ایک آیت یا چند آیات کے مجموعے یا کسی خاص مضمون جو چند آیات میں مکمل ہو رہا ہے' پر غور کرنے میں دو مرحلے ہمیشہ پیش نظر رہنے چاہئیں: ایک تاویل خاص' دوسرے تاویل عام۔ اس سلسلہ میں یاد رہے کہ قرآن حکیم زمان و مکان کے ایک خاص تناظر میں نازل ہوا ہے۔ اس کا زمانۂ نزول ۶۱۰ء سے ۶۳۲ء کے عرصے پر محیط ہے اور اس کے نزول کی جگہ سرزمین حجاز ہے۔ اس کا ایک خاص پس منظر ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر اُس وقت اور اُس علاقے کے لوگوں کے عقائد و نظریات اور ان کی ذہنی سطح کو ملحوظ نہ رکھا جاتا تو ان تک ابلاغ ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ تو اُمّی تھے' پڑھے لکھے نہ تھے۔ اگر انہیں فلسفہ پڑھانا شروع کر دیا جاتا' سائنسی علوم کے بارے میں بتایا جاتا تو یہ باتیں اُن کے سروں کے اوپر سے گزر جاتیں۔ قرآنی آیات تو ان کے دل و دماغ میں پیوست ہو گئیں' کیونکہ براہِ راست ابلاغ تھا' کوئی barrier موجود نہیں تھا۔ تو قرآن حکیم کا یہ شانِ نزول ذہن میں رکھیے۔ ویسے تو ''شانِ نزول'' کی اصطلاح کسی خاص آیت کے لیے استعمال ہوتی ہے' لیکن ایک خاص time and space complex میں قرآن حکیم کا ایک مجموعی شانِ نزول ہے جس میں یہ نازل ہوا۔ وہاں کے حالات' اس عرصے کے واقعات' ان حالات میں تدریجاً جو تبدیلی ہوئی' پھر کون لوگ اس کے مخاطب تھے' مکے والوں کے عقائد' ان کی رسمیں ریتیں' ان کے نظریات' ان کے مسلّمات' ان کی دلچسپیاں...... جب قرآن کو اس سیاق و سباق (context) میں رکھ کر غور کریں گے تو یہ تاویل خاص ہو گی۔ اسی میں آپ مزید تفصیل میں جائیں گے کہ فلاں آیت کا واقعاتی پس منظر کیا ہے۔ یعنی قرآن مجید کی کسی آیت یا چند آیات پر غور کرتے ہوئے اوّلاً اس کو اس کے context میں رکھ کر غور کرنا کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں اس وقت لوگوں نے ان کا مفہوم کیا سمجھا' یہ تاویل خاص ہو گی۔ البتہ قرآن مجید چونکہ نوعِ انسانی کی ابدی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے' صرف خاص علاقے اور خاص زمانے کے لوگوں کے لیے تو نازل نہیں ہوا' لہٰذا اس میں

ابدی ہدایت ہے' اس اعتبار سے تاویل عام کرنا ہوگی۔

تاویل عام کے اعتبار سے الفاظ پر غور کریں گے کہ الفاظ کیا استعمال ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ جب ترکیبوں کی شکل اختیار کرتے ہیں تو کیا ترکیبیں بنتی ہیں۔ پھر آیات کا باہمی ربط کیا ہے' سیاق و سباق کیا ہے؟ یہ آیات جس سورۃ میں آئیں اس کا عمود کیا ہے' اس سورۃ کا جوڑا کون سا ہے' یہ سورۃ کس سلسلۂ سُوَر کا حصہ ہے۔ پھر وہ سورتیں مکّی اور مدنی کون سے گروپ میں شامل ہیں' ان کا مرکزی مضمون کیا ہے؟ اس پس منظر میں ایک سیاق و سباق متن(text) کا ہوگا' جس سے ہمیں تاویلِ عام معلوم ہوگی اور ایک سیاق و سباق واقعات کا ہوگا' جس سے ہمیں ان آیات کی تاویلِ خاص معلوم ہوگی۔

اگر ہم قرآن مجید کی موجودہ ترتیب کے اعتبار سے آیات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جس ترتیب سے اِس وقت قرآن مجید موجود ہے اصل حجت یہی ہے' یہی اصل ترتیب ہے' یہی لوحِ محفوظ کی ترتیب ہے۔ تاویل عام کے اعتبار سے ایک اصولی بات یاد رکھیں: **الاعتبار لعموم اللفظ لا لخصوص السبب**۔ یعنی اصل اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوگا نہ کہ خاص شانِ نزول کا۔ دیکھا جائے گا کہ جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کا مفہوم و معنیٰ' نیز مدلول کیا ہے۔ کلامِ عرب سے دلائل لائے جائیں گے کہ وہ انہیں کن معانی میں استعمال کرتے تھے۔ اُس لفظ کے عموم کا اعتبار ہوگا نہ کہ اُس کے شانِ نزول کا۔ لیکن اس کا یہ معنیٰ بھی نہیں کہ اسے بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ سب سے مناسب بات یہی ہوگی کہ پہلے اس کی تاویل خاص پر غور کریں اور پھر اس کے ابدی سرچشمۂ ہدایت ہونے کے ناطے اس کے عموم پر غور کریں۔ اس اعتبار سے تاویلِ خاص اور تاویلِ عام کے فرق کو ذہن میں رکھیں۔

۵) تذکر و تدبر

تذکر اور تدبر دونوں الفاظ الگ الگ تو بہت جگہ آئے ہیں' سورۃ صٓ کی آیت ۲۹ میں یکجا آ گئے ہیں: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۹﴾﴾ ''یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے نبیؐ) ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق

لیں''۔ان دونوں کا مطلب کیا ہے؟ ایک ہے قرآن مجید سے ہدایت اخذ کر لینا' نصیحت حاصل کر لینا' اصل راہ نمائی حاصل کر لینا' جس کو کہ مولانا روم نے کہا ع ''ماز قرآں مغز ہا برداشتیم''۔یعنی قرآن کا جو اصل مغز ہے وہ تو ہم نے لے لیا۔اس کا اصل مغز''ہدایت'' ہے۔اس مرحلے پر قرآن جو لفظ استعمال کرتا ہے وہ ''تذکر'' ہے۔ یہ لفظ ذکر سے بنا ہے۔تذکر یاددہانی کو کہتے ہیں۔اب اس کا تعلق اسی بات سے جڑ جائے گا جو قرآن کے اسلوبِ استدلال کے ضمن میں پہلے بیان کی جاچکی ہے۔یعنی قرآن مجید جن اصل حقائق (مابعد الطبیعیاتی حقیقتوں) کی طرف راہنمائی کرتا ہے وہ فطرتِ انسانی میں مضمر ہیں' ان پر صرف ذہول اور نسیان کے پردے پڑ گئے ہیں۔ مثلاً آپ کو کوئی بات کچھ عرصہ قبل معلوم تھی' لیکن اب اس کی طرف دھیان نہیں رہا اور وہ آپ کی یادداشت کے ذخیرے میں گہری اتر گئی ہے اور اب یاد نہیں آتی' لیکن کسی روز اُس کی طرف کوئی ہلکا سا اشارہ ملتے ہی آپ کو وہ پوری بات یاد آجاتی ہے۔جیسے آپ کا کوئی دوست تھا' کسی زمانے میں بے تکلفی تھی' صبح شام ملاقاتیں تھیں' اب طویل عرصہ ہو گیا' کبھی اس کی یاد نہیں آئی۔ایسا نہیں کہ آپ کو یاد نہیں رہا' بلکہ ذہول ہے' نسیان ہے' توجہ اُدھر نہیں ہے' کبھی ذہن اُدھر منتقل ہی نہیں ہوتا۔لیکن اچانک کسی روز آپ نے اپنا ٹرنک کھولا اور اس میں سے کوئی قلم یا رومال جو اُس نے کبھی دیا ہو برآمد ہو گیا تو فوراً آپ کو اپنا وہ دوست یاد آجائے گا۔یہ phenomenon تذکر ہے۔تذکر کا مطلب تعلّم نہیں ہے۔تعلّم علم حاصل کرنا یعنی نئی بات جاننا ہے' جبکہ تذکر پہلے سے حاصل شدہ علم جس پر ذہول اور نسیان کے جو پردے پڑ گئے تھے' ان کو ہٹا کر اندر سے اسے برآمد کرنا ہے۔فطرتِ انسانی کے اندر اللہ کی محبت' اللہ کی معرفت کے حقائق مضمر ہیں۔یہ فطرت میں موجود ہیں' صرف اُن پر پردے پڑ گئے ہیں' دنیا کی محبت غالب آگئی ہے۔۔ے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے! (فیض)

یہاں کی دلچسپیوں' مسائل' مشکلات' مصروفیات' مشاغل کی وجہ سے ذہول ہو گیا ہے' پردہ

پڑ گیا ہے۔تذکر یہ ہے کہ اس پردے کو ہٹادیا جائے۔ع

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں' لوحِ جبیں تازہ کریں! (حفیظ)

یادداشت کو recall کرنا اور اپنی فطرت میں مضمر حقائق کو اجاگر کر لینا تذکر ہے۔قرآن کا اصل ہدف یہی ہے اور اس اعتبار سے قرآن کا دعویٰ سورۃ القمر میں چار مرتبہ آیا ہے:﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝﴾ ''ہم نے قرآن کو تذکر کے لیے بہت آسان بنادیا ہے' تو کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟'' اس کے لیے بہت گہرائی میں غوطہ زنی کرنے کی ضرورت نہیں ہے' بہت مشقت ومحنت مطلوب نہیں ہے۔ انسان کے اندر طلبِ حقیقت ہو اور قرآن سے براہِ راست رابطہ (Communication) ہو جائے تو تذکر حاصل ہو جائے گا۔اس کی شرط صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ انسان کو اتنی عربی ضرور آتی ہو کہ وہ قرآن سے ہم کلام ہو جائے۔اگر آپ ترجمہ دیکھیں گے تو کچھ معلومات تو حاصل ہوں گی' تذکر نہیں ہوگا۔اقبال نے کہا تھا: ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف!

تذکر کے عمل کا اثر تو یہ ہے کہ آپ کے اندر کے مضمر حقائق ابھر کر آپ کے شعور کی سطح پر دوبارہ آجائیں۔ یہ نہ ہو کہ پہلے آپ نے متن کو پڑھا' پھر ترجمہ دیکھا' حاشیہ دیکھا' اس کے بعد اگلی آیت کی طرف گئے تو تسلسل ٹوٹ گیا اور کلام کی تاثیر ختم ہوگئی۔ترجمہ سے کلام کی اصل تاثیر باقی نہیں رہتی۔شیکسپئر کی کوئی عبارت آپ انگریزی میں پڑھیں گے تو جھوم جائیں گے' اگر اس کا ترجمہ کریں گے تو اس کا وہ اثر نہیں ہوگا۔اسی طرح غالبؔ کا شعر ہو یا میرؔ کا' اس کا انگریزی میں ترجمہ کریں گے تو وہ اثر باقی نہیں رہے گا اور آپ وجد میں نہیں آئیں گے' جھوم جھوم نہیں جائیں گے۔عربی زبان کا اتنا علم کہ آپ عربی متن کو براہ راست سمجھ سکیں' تذکر کی بنیادی شرط ہے۔چنانچہ اوّلاً حسنِ نیت ہو' طلبِ ہدایت ہو' تعصب کی پٹی نہ بندھی ہو' اور ثانیاً عربی زبان کا اتنا علم ہو کہ آپ براہِ راست اس سے

ہم کلام ہو رہے ہوں' یہ دونوں شرطیں پوری ہو جائیں تو تذکر ہو جائے گا۔

دوبارہ ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ آیت کا مطلب نشانی ہے۔ نشانی اسے کہتے ہیں جس کو دیکھ کر ذہن کسی اور شے کی طرف منتقل ہو جائے۔ آپ نے قلم یا رومال دیکھا تو ذہن دوست کی طرف منتقل ہو گیا جس سے ملے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا تھا اور اس کا کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا۔ مولانا روم کہتے ہیں ۔

خشک تار و خشک مغز و خشک پوست

از کجا می آید ایں آوازِ دوست؟

ہمارا ایک ازلی دوست ہے ''اللہ'' وہی ہمارا خالق ہے' ہمارا باری ہے' ہمارا ربّ ہے۔ اس کی دوستی پر کچھ پردے پڑ گئے ہیں' اس پر کچھ ذہول طاری ہو گیا ہے۔ قرآن اس دوست کی یاد دلانے کے لیے آیا ہے۔

اس کے برعکس تدبر گہرائی میں غوطہ زن ہونے کو کہتے ہیں ۔ ؏ ''قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!'' تدبر کے اعتبار سے قرآن حکیم مشکل ترین کتاب ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ کہ اس کا منبع اور سرچشمہ علمِ الٰہی ہے اور علمِ الٰہی لامتناہی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کلام میں متکلم کی ساری صفات موجود ہوتی ہیں' لہٰذا یہ کلام لامتناہی ہے۔ اس کو کوئی شخص نہ عبور کر سکتا ہے نہ گہرائی میں اس کی تہہ تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے' چاہے پوری پوری زندگیاں کھپا لیں۔ وہ چاہے صاحبِ کشاف ہوں' صاحبِ تفسیر کبیر ہوں' کسے باشد۔ اس کا احاطہ کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ بعض لوگ غیر محتاط انداز میں یہ الفاظ استعمال کر دیتے ہیں کہ ''انہیں قرآن پر بڑا عبور حاصل ہے۔'' یہ قرآن کے لیے بڑا توہین آمیز کلمہ ہے۔ عبور ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ جانے کو کہتے ہیں۔ قرآن کا تو کنارہ ہی کوئی نہیں ہے۔ کسی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ قرآن پر عبور حاصل کرے۔ یہ ناممکنات میں سے ہے۔ اسی طرح اس کی گہرائی تک پہنچ جانا بھی ناممکن ہے۔

اس سلسلہ میں ایک تمثیل سے بات کسی قدر واضح ہو جائے گی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سمندر میں کوئی ٹینکر تیل لے کر جا رہا ہے اور کسی وجہ سے اچانک تیل لیک کرنے

لگ جاتا ہے۔ لیکن وہ تیل سطح سمندر کے اوپر ہی رہتا ہے‘ نیچے نہیں جاتا۔ سطح سمندر پر اوپر تیل کی تہہ اور نیچے پانی ہوتا ہے اور وہ تیل پانچ دس میل تک پھیل جاتا ہے۔ سمندر کی اتھاہ گہرائی کے باوجود تیل سطح آب پر ہی رہتا ہے۔ اسی طرح سمجھئے کہ قرآن مجید کی اصل ہدایت اور اصل تذکر اس کی سطح پر موجود ہے۔ اس تک رسائی کے لیے سائنس دان یا فلسفی ہونا‘ عربی ادب کا ماہر ہونا‘ کلامِ جاہلی کا عالم ہونا ضروری نہیں۔ صرف دو چیزیں موجود ہوں۔ پہلی خلوصِ نیت اور طلبِ ہدایت‘ دوسری قرآن سے براہِ راست ہم کلامی کا شرف اور اس کی صلاحیت۔ یہ دونوں ہیں تو تذکر کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔ البتہ تدبر کے لیے گہرائی میں اترنا ہوگا اور اس بحرِ زخار میں غوطہ زنی کرنا ہوگی۔ تدبّر کا حق ادا کرنے کے لیے شعرِ جاہلی کو بھی جاننا ضروری ہے۔ ہر لفظ کی پہچان ضروری ہے کہ جس دور میں قرآن نازل ہوا اُس زمانے اور اُس علاقے کے لوگوں میں اس لفظ کا مفہوم کیا تھا‘ یہ کن معانی میں استعمال ہو رہا تھا۔ قرآن نے بنیادی اصطلاحات وہیں سے اخذ کی ہیں۔ وہی الفاظ جن کو عرب اپنے اشعار اور خطبات کے اندر استعمال کرتے تھے انہی کو قرآن مجید نے لیا ہے۔ چنانچہ نزولِ قرآن کے دَور کی زبان کو پہچاننا اور اس کے لیے ضروری مہارت کا ہونا تدبر کے لیے ناگزیر ہے۔ پھر یہ کہ احادیث‘ علمِ بیان‘ منطق‘ ان سب کو انسان بطریقِ تدبر جانے گا تو پھر وہ اس کا حق ادا کر سکے گا۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اپنی تفسیر کا نام ہی ''تدبّرِ قرآن'' رکھا ہے اور وہ تدبرِ قرآن کے بہت بڑے داعی ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے اپنی زندگی میں بہت محنت کی ہے۔ ان کے بعض شاگرد حضرات نے بھی محنتیں کی ہیں اور وقت لگایا ہے۔ اس کے ان تقاضوں کو تو اُن حضرات نے بیان کیا ہے‘ لیکن تدبرِ قرآن کا ایک اور تقاضا بھی ہے جو بدقسمتی سے ان کے سامنے بھی نہیں آیا۔ اگر وہ تقاضا بھی پورا نہیں ہوگا تو عصرِ حاضر کے تدبر کا حق ادا نہیں ہوگا۔ وہ تقاضا یہ ہے کہ علمِ انسانی آج جس لیول تک پہنچ گیا ہے‘ میٹیریل سائنسز کے مختلف علوم کے ضمن میں جو کچھ معلومات انسان کو حاصل ہو چکی ہیں اور وہ خیالات و نظریات جن کو آج دنیا میں مانا جا رہا ہے ان

سے آ گاہی حاصل کی جائے۔ اگر ان کا اجمالی علم نہیں ہے تو اِس دَور کے تدبرِ قرآن کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن حکیم وہ کتاب ہے جو ہر دَور کے اُفق پر خورشیدِ تازہ کی مانند طلوع ہوگی۔ آج سے سو برس پہلے کے قرآن اور آج کے قرآن میں اس حوالے سے فرق ہوگا۔ متن اور الفاظ وہی ہیں، لیکن آج علمِ انسانی کی جو سطح ہے اس پر اس قرآن کے فہم اور اس کے علم کو جس طریقے سے جلوہ گر ہونا چاہیے اگر آپ اس کا حق ادا نہیں کر رہے تو آپ سو برس پہلے کا قرآن پڑھا رہے ہیں، آج کا قرآن نہیں پڑھا رہے۔ جیسے اللہ کی شان ہے ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ﴾ اسی طرح کا معاملہ قرآن حکیم کا بھی ہے۔

اسی طرح ہدایتِ عملی کے ضمن میں اقتصادیات، سماجیات اور نفسیاتِ انسانی کے سلسلہ میں راہنمائی اور حقائق قرآن میں موجود ہیں، انہیں کیسے سمجھیں گے؟ قرآن کی اصل تعلیمات کی قدر و قیمت اور اس کی اصل evaluation کیسے ممکن ہے اگر انسان آج کے اقتصادی مسائل کو نہ جانتا ہو؟ اس کے بغیر وہ تدبرِ قرآن کا حق نہیں ادا کر سکتا۔ مثلاً آج کے اقتصادی مسائل کیا ہیں؟ پیپر کرنسی کی حقیقت کیا ہے؟ اقتصادیات کے اصول و مبادی کیا ہیں؟ بینکنگ کی اصل بنیاد کیا ہے؟ کس طرح کچھ لوگوں نے اس پوری نوعِ انسانی کو معاشی اعتبار سے بے بس کیا ہوا ہے۔ اس حقیقت کو جب تک نہیں سمجھیں گے تو آج کے دَور میں قرآن حکیم کی اقتصادی تعلیمات واضح کرنے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ آج تدبرِ قرآن کسی ایک انسان کے بس کا روگ ہی نہیں رہا، اس کے لیے تو ایک جماعت درکار ہے۔ میرے کتابچے ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کے باب ''تذکر و تدبر'' میں یہ تصور پیش کیا گیا ہے کہ ایسی یونیورسٹیز قائم ہوں جن کا اصل مرکزی شعبہ ''تدبرِ قرآن'' کا ہو۔ جو شخص بھی اس یونیورسٹی کا طالب علم ہو، وہ عربی زبان سیکھے اور قرآن پڑھے۔ لیکن اس مرکزی شعبے کے گرد تمام علومِ عقلی، جیسے منطق، مابعد الطبیعیات، اخلاقیات، نفسیات اور الٰہیات، علومِ عمرانی جیسے معاشیات، سیاسیات اور قانون، اور علومِ طبعی، جیسے ریاضی، کیمیا، طبیعیات، ارضیات اور فلکیات وغیرہ کے شعبوں کا ایک حصار قائم ہو، اور ہر ایک طالب علم ''تدبرِ قرآن'' کی لازماً اور ایک یا اس سے

زائد دوسرے علوم کی اپنے ذوق کے مطابق تحصیل کرے اور اس طرح ان شعبہ ہائے علوم میں قرآن کے علم و ہدایت کو تحقیقی طور پر اخذ کر کے مؤثر انداز میں پیش کر سکے۔ طالب علم وہ بھی پڑھے تب معلوم ہو گا کہ اس شعبے میں انسان آج کہاں کھڑا ہے اور قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ فلاں شعبے میں نوعِ انسانی کے کیا مسائل ہیں اور اس ضمن میں قرآن حکیم کیا کہتا ہے۔ مختلف شعبے مل کر تدبر قرآن کی ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں جو وقت کا اہم تقاضا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا' تذکر کے اعتبار سے قرآن آسان ترین کتاب ہے جو ہماری فطرت کی پکار ہے۔ ع ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا!'' اگر انسان کی فطرت مسخ شدہ نہیں ہے' بلکہ سلیم ہے' صالح ہے' سلامتی پر قائم ہے تو وہ قرآن کو اپنے دل کی پکار محسوس کرے گا' اس کے اور قرآن کے درمیان کوئی حجاب نہ ہو گا' وہ اسے اپنے دل کی بات سمجھے گا' اس کے لیے عربی زبان کا صرف اتنا علم کافی ہے کہ براہِ راست ہم کلام ہو جائے۔ جبکہ تدبر کے تقاضے پورے کرنے کسی ایک انسان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ جو شخص بھی اس میدان میں قدم رکھنا چاہے اس کے ذہن میں ایک اجمالی خاکہ ضرور ہونا چاہیے کہ آج جدید سائنسز کے اعتبار سے انسان کہاں کھڑا ہے۔ جب انسان کو اپنے مقام کی معرفت حاصل ہو جائے تو وہ قرآن مجید سے بہتر طور پر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ سمندر میں تو بے تحاشا پانی ہے' آپ اگر پانی لینا چاہتے ہیں تو جتنا بڑا کٹورا' کوئی دیگ' دیگچی یا بالٹی آپ کے پاس ہے اسی کو آپ بھر لیں گے۔ یعنی جتنا آپ کا ظرف ہو گا اتنا ہی آپ سمندر سے پانی اخذ کر سکیں گے۔ اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہ ہو گا کہ سمندر میں پانی ہی اتنا ہے! انسانی ذہن کا ظرف علوم سے بنتا ہے۔ یہ ظرف آج سے پہلے بہت تنگ تھا۔ ایک ہزار سال پہلے کا ظرفِ ذہنی بہت محدود تھا۔ انسانی علوم کے اعتبار سے آج کا ظرف بہت وسیع ہے۔ اگر آج آپ کو قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنی ہے تو آپ کو اپنا ظرف اس کے مطابق وسیع کرنا ہو گا۔ اور اگر کچھ لوگ ابھی اُسی سابق دور میں رہ رہے ہیں تو قرآن حکیم کے مخفی حقائق اُن پر منکشف نہیں ہوں گے۔

٦) عملی ہدایات اور مظاہر طبیعی کے بارے میں متضاد طرزِ عمل

قرآن حکیم میں سائنسی علوم کے جو حوالہ جات آتے ہیں اور اس میں جو عملی ہدایات ملتی ہیں، ان کے ضمن میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ ایک اعتبار سے ہمیں آگے سے آگے بڑھنا ہے اور دوسرے اعتبار سے ہمیں پیچھے سے پیچھے جانا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم پر غور وفکر کرنے والے کا انداز (attitude) دو اعتبارات سے بالکل متضاد ہونا چاہیے۔ سائنسی حوالہ جات جو قرآن میں آئے ہیں ان کی تعبیر کرنے میں آگے سے آگے جایئے۔ آج انسان کو کیا معلومات حاصل ہو چکی ہیں، کون سے حقائق پایۂ ثبوت کو پہنچ چکے ہیں، ان کے حوالے پیش نظر رہیں گے۔ اس میں پیچھے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ امام رازی اور دیگر قدیم مفسّرین کو دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے بھی کچھ فرمایا ہے تو وہ بھی ہمارے لیے لازم نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ سائنس اور ٹیکنالوجی سکھانے نہیں آئے تھے۔ تأبیر نخل کا واقعہ پیچھے گزر چکا ہے، اس کے ضمن میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاکُمْ)) ''اپنے دنیاوی معاملات کے بارے میں تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو''۔ تجرباتی علوم کے مطابق جو تمہیں علم حاصل ہے اس پر عمل کرو۔ لیکن دین کا جو عملی پہلو ہے اس میں پیچھے سے پیچھے جایئے۔ یہاں یہ دلیل نہیں چلے گی کہ جدید دَور کے تقاضے کچھ اور ہیں، جبکہ یہ دیکھنا ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا کیا۔ اس حوالے سے قرآن کے طالب علم کا رُخ پیچھے کی طرف ہونا چاہیے کہ اسلاف نے کیا سمجھا۔ متأخرین کو چھوڑ کر متقدمین کی طرف جایئے۔ متقدمین سے تبع تابعین، پھر تابعین سے ہوتے ہوئے ''مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ'' یعنی حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل تک پہنچیے۔ اس اعتبار سے اقبال کا یہ شعر صحیح منطبق ہوتا ہے۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بأو نرسیدی تمام بولہبی ست!

دین کا عملی پہلو وہی ہے جو اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت ہے۔ اس میں اگرچہ

روایات کے اختلاف کی وجہ سے کچھ فرق ہو جائے گا مگر دلیل یہی رہے گی: ((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ)) ''نماز اِس طرح پڑھو جیسے تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو''۔ اب نماز کی جزئیات کے بارے میں روایات میں کچھ فرق ملتا ہے۔ کسی کے نزدیک ایک روایت قابل ترجیح ہے' کسی کے نزدیک دوسری۔ اس اعتبار سے جزئیات میں تھوڑا بہت فرق ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ البتہ دلیل یہی رہے گی کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل یہ تھا۔ حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان بھی نوٹ کر لیجیے: ((عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ)) ''تم پر میری سنت اختیار کرنا لازم ہے اور میرے خلفاءِ راشدین کی سنت جو ہدایت یافتہ ہیں''۔ چنانچہ حضور ﷺ کا عمل اور خلفاء راشدین کا عمل ہمارے لیے لائقِ تقلید ہے۔ پھر اسی سے متصل وہ چیزیں ہیں جن پر ہماری چودہ سو برس کی تاریخ میں اُمت کا اِجماع رہا ہے۔ اب دنیا اسلامی سزاؤں کو وحشیانہ قرار دے کر ہم پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہی ہے اور ہمیں بنیاد پرست (Fundamentalist) کی گالی دے کر چاہتی ہے کہ ہمارے اندر معذرت خواہانہ رویّہ پیدا کر دے' مگر ہمارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ ان باتوں سے قطعاً متاثر ہوئے بغیر دین کے عملی پہلو کے بارے میں پیچھے سے پیچھے جاتے ہوئے ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ﴾ تک پہنچ جائیں!

بدقسمتی سے ہمارے عام علماء کا حال یہ ہے کہ انہوں نے عربی علوم تو پڑھے ہیں' عربی مدارس سے فارغ التحصیل ہیں' مگر وہ آگے بڑھنے کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ انہوں نے سائنس نہیں پڑھی' وہ جدید علوم سے واقف نہیں' وہ نہیں جانتے آئن سٹائن کس بلا کا نام ہے اور اس شخص کے ذریعے طبیعیات کے اندر کتنی بڑی تبدیلی آ گئی ہے۔ نیوٹونین ایرا کیا تھا اور آئن سٹائن کا دَور کیا ہے' انہیں کیا پتہ! آج کائنات کا تصور کیا ہے' ایٹم کی ساخت کیا ہے' انہیں کیا معلوم! ایٹم تو پرانی بات ہو گئی' اب تو انسان نیوٹرون پروٹون سے بھی کہیں آگے کی باریکیوں تک پہنچ چکا ہے۔ اب ان چیزوں کو نہیں جانیں گے تو ان حقائق کو صحیح طور پر سمجھنا ممکن نہیں ہوگا۔ مظاہر طبیعی کا معاملہ تو آگے سے

آگے جا رہا ہے۔ اس کی تعبیر جدید سے جدید ہونی چاہیے۔ البتہ اس ضمن میں یہ فرق ضرور ملحوظ رہنا چاہیے کہ ایک تو سائنس کے میدان کے محض نظریات (theories) ہیں جنہیں مسلّمہ حقائق کا درجہ حاصل نہیں ہے' جبکہ ایک وہ چیزیں ہیں جن کی تجرباتی توثیق ہو چکی ہے اور انہیں اب مسلّمہ حقائق کا درجہ حاصل ہے۔ ان دونوں میں فرق کرنا ہوگا۔ خواہ مخواہ کوئی بھی نظریہ سامنے آ جائے یا کوئی مفروضہ (hypothesis) منظر عام پر آ جائے اس پر قرآن کو منطبق کرنے کی کوشش کرنا سعی لاحاصل بلکہ مضر شے ہے۔ لیکن اصولی طور پر ہمیں ان چیزوں کی تعبیر میں آگے سے آگے بڑھنا ہے۔ اور جہاں تک دین کے عملی حصے کا تعلق ہے جسے ہم شریعت کہتے ہیں' یعنی اوامر و نواہی' حلال و حرام' حدود و تعزیرات وغیرہ' ان تمام معاملات میں ہمیں پیچھے سے پیچھے جانا ہوگا' یہاں تک کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں اپنے آپ کو پہنچا دیجیے۔ اس لیے کہ دین اسی کا نام ہے۔

ع بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

۷) فہم قرآن کے لیے جذبۂ انقلاب کی ضرورت

فہم قرآن کے لیے بنیادی اصول اور بنیادی ہدایات یا اشارات کے ضمن میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ بات بڑی خوبصورتی سے تفہیم القرآن کے مقدمے میں کہی ہے کہ قرآن محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ کسی ڈرائنگ روم میں یا کتب خانے میں آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ کوئی محقق یا ریسرچ سکالر ڈکشنریوں اور تفسیروں کی مدد سے اسے سمجھنا چاہے تو نہیں سمجھ سکے گا۔ اس لیے کہ یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ مولانا مرحوم لکھتے ہیں:

> "......اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاعِ کفر و دین اور معرکۂ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کشمکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں! اسے تو پوری طرح آپ اُسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام

شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اُسی طرح قدم
اٹھاتے چلے جائیں......''

قرآن مجید کی بہت سی بڑی اہم حقیقتیں اس کے بغیر منکشف نہیں ہوں گی' اس لیے کہ قرآن ایک ''کتابِ انقلاب'' (Manual of Revolution) ہے۔ اس قرآن نے انسانی جدوجہد کے ذریعے عظیم انقلاب برپا کیا ہے۔ محمدؐ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھی رضی اللہ عنہم ایک حزب اللہ تھے' ایک جماعت اور ایک پارٹی تھے' انہوں نے دعوت اور انقلاب کے تمام مراحل کو طے کیا اور ہر مرحلے پر اس کی مناسبت سے ہدایات نازل ہوئیں۔ ایک مرحلہ وہ بھی تھا کہ حکم دیا جا رہا تھا کہ مار کھاؤ لیکن ہاتھ مت اٹھاؤ۔ ﴿كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ﴾۔ پھر ایک مرحلہ وہ بھی آیا کہ حکم دے دیا گیا کہ اب آگے بڑھو اور جواب دو' انہیں قتل کرو۔ سورۃ الانفال میں ارشاد ہوا: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (آیت ۳۹) ''اور ان سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے''۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا: ﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ﴾ (آیت ۱۹۱) ''اور اُن کو قتل کر دو جہاں کہیں تم ان کو پاؤ اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے''۔

دونوں مراحل میں یقیناً فرق ہے' بلکہ بظاہر تضاد ہے' لیکن جاننا چاہیے کہ یہ ایک ہی جدّوجہد کے دو مختلف مراحل ہیں۔ پھر ایک داعی جب دعوت دیتا ہے تو جو مسائل اسے درپیش ہوتے ہیں ان کو ایک ایسا شخص قطعاً نہیں جان سکتا جس نے اُس کوچے میں قدم ہی نہیں رکھا ہے۔ اسے کیا احساس ہو گا کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے یہ کیوں کہا جا رہا ہے: ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ① مَاۤ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ② وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ③﴾ ''قسم ہے قلم کی اور جو کچھ لکھتے ہیں! آپ اپنے ربّ کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔ اور آپ کے لیے تو بے انتہا اجر ہے''۔ یعنی اے نبیؐ آپ محزون اور غمگین نہ ہوں۔ آپ ان کے کہنے سے (معاذ اللہ) مجنون تو نہیں ہو جائیں گے۔ ایسے الفاظ جب کسی کو کہے جاتے ہیں تو اس کا ہی دل جانتا ہے کہ اس پر کیا گزرتی ہے۔ اندازہ

لگایئے کہ قریش مکہ سے اس قسم کے الفاظ سن کر قلبِ محمدیؐ پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہو گی۔ یہ قرآن ہم پر reveal نہیں ہوسکتا جب تک ان احساسات و کیفیات کے ساتھ ہم خود دوچار نہ ہوں۔ جب تک کہ ہماری کیفیات واحساسات اس کے ساتھ مماثلت نہ رکھیں ہم کیسے سمجھیں گے کہ کیا کہا جا رہا ہے اور کس کیفیت کے اندر کہا جا رہا ہے۔

میڈیکل کالج میں داخل ہونے والے طلبہ سب سے پہلے جس کتاب سے متعارف ہوتے ہیں وہ ''Manual of Dissection'' ہے۔ اس میں ہدایات ہوتی ہیں کہ لاش کے بدن پر یہاں شگاف لگاؤ اور کھال ہٹاؤ تو تمہیں یہ چیز نظر آئے گی' یہاں شگاف لگاؤ تو تمہیں فلاں شے نظر آئے گی' اسے یہاں سے ہٹاؤ گے تو تمہیں اس کے پیچھے فلاں چیز چھپی ہوئی نظر آئے گی۔ اس اعتبار سے قرآن حکیم ''Manual of Revolution'' ہے۔ جب تک کوئی شخص انقلابی جدوجہد میں شریک نہیں ہوگا قرآن حکیم کے معارف کا بہت بڑا خزانہ اُس کے لیے بند رہے گا۔ ایک شخص فقیہہ ہے' مفتی ہے تو وہ فقہی احکام کو ضرور اس کے اندر سے نکال لے گا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض تفاسیر ''احکام القرآن'' کے نام سے لکھی گئی ہیں جن میں صرف اُن ہی آیات کے بارے میں گفتگو اور بحث ہے جن سے کوئی نہ کوئی فقہی حکم مستنبط ہوتا ہے۔ مثلاً حلت وحرمت کا حکم' کسی شے کے فرض ہونے کا حکم جس سے عمل کا معاملہ متعلق ہے۔ باقی تو گویا قصص ہیں' تاریخی حقائق و واقعات ہیں۔ یہاں تک کہ قصۂ آدم و ابلیس جو سات مرتبہ قرآن میں آیا ہے' یا ایمانی حقائق کے لیے جو دلائل و براہین ہیں ان سے کوئی گفتگو نہیں کی گئی' بلکہ صرف احکام القرآن جو قرآن کا ایک حصہ ہے' اسی کو اہمیت دی گئی ہے۔

قرآن کے تدریجاً نزول کا سبب یہ ہے کہ صاحب قرآن ﷺ کی جدوجہد کے مختلف مراحل کو سمجھا جائے' ورنہ فقہی احکام تو مرتب کر کے دیے جا سکتے تھے' جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دیے گئے تھے۔ ''احکامِ عشرہ'' تختیوں پر کندہ تھے جو موسیٰ کے سپرد کر دیے گئے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد جس جس مرحلے سے گزرتی رہی قرآن میں اس مرحلے سے متعلق آیات نازل ہوتی رہیں۔ تنزیل کی ترتیب

کے اندر مضمر اصل حکمت یہی تو ہے کہ آنحضورﷺ کی جِدّوجُہد‘ حرکت‘اور دعوت کے مختلف مراحل سامنے آ جاتے ہیں۔ اب بھی قرآن کی بنیاد پر اور منہجِ انقلابِ نبویؐ پر جو جدوجہد ہو گی اسے ان تمام مراحل سے ہو کر گزرنا ہو گا۔ چنانچہ کم سے کم یہ تو ہو کہ اس جدوجہد کو علمی طور پر فہم کے لیے انسان سامنے رکھے۔ اگر علمی اعتبار سے سیرت النبیؐ کا خاکہ ذہن میں موجود نہ ہو تو فہم کسی درجے میں بھی حاصل نہیں ہو گا۔ فہمِ حقیقی تو اُسی وقت حاصل ہو گا جب آپ خود اس جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں اور وہی مسائل آپ کو پیش آ رہے ہیں تو اب معلوم ہو گا کہ یہ مقام اور مرحلہ یا مسئلہ وہ تھا جس کے لیے یہ ہدایتِ قرآنی آئی تھی۔

۸) قرآن کے منزّل من اللہ ہونے کا ثبوت

اس ضمن میں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت کیا ہے۔ یاد رکھیے کہ ثبوت دو قسم کے ہوتے ہیں‘ خارجی اور داخلی۔ خارجی ثبوت خود محمد رسول اللہﷺ کا یہ فرمانا ہے کہ یہ کلام مجھ پر نازل ہوا۔ پھر آپﷺ کی شہادت بھی دو حیثیتوں سے ہے۔ آپﷺ کی شخصاً شہادت زیادہ نمایاں اُس وقت تھی جب کہ قرآن نازل ہو رہا تھا اور حضورﷺ خود موجود تھے۔ وہ لوگ بھی وہاں موجود تھے جنہوں نے آپﷺ کی چالیس سالہ زندگی کا مشاہدہ کیا تھا‘ جنہیں کاروباری شخصیت کی حیثیت سے آپؐ کے معاملات کا تجربہ تھا۔ جن کے سامنے آپﷺ کی صداقت‘ دیانت‘ امانت اور ایفائے عہد کا پورا نقشہ موجود تھا۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر جن کے سامنے چہرۂ محمدیؐ موجود تھا۔ سلیم الفطرت انسان آپﷺ کا روئے انور دیکھ کر پکار اٹھتا تھا کہ سُبْحَانَ اللّٰہِ مَا ھٰذَا بِوَجْہِ کَذَّابٍ (اللہ پاک ہے‘ یہ چہرہ کسی جھوٹے کا ہو ہی نہیں سکتا)۔ تو حضورﷺ کی شخصیت‘ آپؐ کی ذات اور آپؐ کی شہادت کہ یہ قرآن مجھ پر نازل ہوا‘ سب سے بڑا ثبوت تھا۔

اس اعتبار سے یاد رکھیے کہ محمدٌ رسول اللہﷺ اور قرآن باہم ایک دوسرے کے شاہد ہیں۔ قرآن محمدﷺ کی رسالت پر گواہی دیتا ہے: ﴿یٰسٓ ۞ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ۞ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۞﴾ قرآن گواہی دے رہا ہے کہ آپﷺ اللہ کے رسول ہیں اور قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت ذاتِ محمدیؐ ہے۔ اس کا ایک پہلو تو وہ ہے کہ

نزولِ قرآن کے وقت رسول اللہ ﷺ کی ذات' آپؐ کی شخصیت' آپؐ کی سیرت وکردار' آپؐ کا اخلاق' آپؐ کا وجود' آپؐ کی شبیہہ اور چہرہ سامنے تھا۔ دوسرا پہلو جو دائمی ہے اور آج بھی ہے وہ حضور ﷺ کا وہ کارنامہ ہے جو تاریخ کی اَن مٹ شہادت ہے۔ آپ ایچ جی ویلز' ایم این رائے یا ڈاکٹر مائیکل ہارٹ سے پوچھیں کہ وہ کتنا عظیم کارنامہ ہے جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے سرانجام دیا۔ اور آپؐ خود کہہ رہے ہیں کہ میرا آلۂ انقلاب قرآن ہے' یہی میرا اسلحہ اور اصل طاقت ہے' یہی میری قوت کا سرچشمہ اور میری تاثیر کا منبع ہے۔ اس سے بڑی گواہی اور کیا ہوگی؟ یہ تو قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی خارجی شہادت ہے۔ یعنی ''حضورؐ کی شخصیت''۔ شہادت کا یہ پہلو حضور ﷺ کے اپنے زمانے میں اور آپ ﷺ کی حیاتِ دنیاوی کے دوران زیادہ نمایاں تھا۔ اور جہاں تک آپؐ کے کارنامے کا تعلق ہے اس پر تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ دیکھیے مائیکل ہارٹ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہوا ہے:

"He was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."

یعنی تاریخ انسانی میں صرف وہی واحد شخص ہیں جو سیکولر اور مذہبی دونوں میدانوں میں انتہائی کامیاب رہے —— اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ تو خارجی ثبوت گویا بتمام وکمال حاصل ہوگیا۔

قرآن کے منزّل من اللہ ہونے کا داخلی ثبوت یہ ہے کہ انسان کا دل گواہی دے۔ داخلی ثبوت انسان کا اپنا باطنی تجربہ ہوتا ہے۔ اگر ہزار آدمی کہیں چینی میٹھی ہے مگر آپ نے نہ چکھی ہو تو آپ کہیں گے کہ جب اتنے لوگ کہہ رہے ہیں میٹھی ہے تو ہوگی میٹھی۔ ظاہر ہے ایک ہزار آدمی مجھے کیوں دھوکہ دینا چاہیں گے' یقیناً میٹھی ہوگی۔ لیکن ''ہوگی'' سے آگے بات نہیں بڑھتی۔ البتہ جب انسان چینی کو چکھ لے اور اس کی اپنی حِسّ ذائقہ بتا رہی ہو کہ یہ میٹھی ہے تو اب ''ہوگی'' نہیں ''ہے''۔ ''ہوگی'' اور ''ہے'' میں درحقیقت انسان کے ذاتی تجربے کا فرق ہے۔ افسوس یہ ہے کہ آج کی دنیا صرف خارجی تجربات کو جانتی ہے۔ ایک تجربہ اس سے کہیں زیادہ معتبر ہے اور وہ باطنی تجربہ ہے' یعنی کسی شے پر

آپ کا دل گواہی دے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الٰہ الاّ
لغتِ غریب' جب تک تیرا دل نہ دے گواہی!

لا الٰہ الاّ اللہ کے لیے اگر دل نے گواہی نہ دی تو انسان خواہ عربی النسل ہو' عربی زبان جانتا ہو' لیکن اس کے لیے یہ کلمہ لغتِ غریب ہی ہے' نامانوس سی بات ہے' اس کے اندر پیوست نہیں ہے' اس کو متاثر نہیں کرتی۔ قرآن انسان کی اپنی فطرت کو اپیل کرتا ہے اور انسان کو اپنے من میں جھانکنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے اپنے من میں جھانکو' دیکھو تو سہی' غور تو کرو: اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ؟ کیا تمہیں اللہ کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی؟ کیا تم واقعتاً یہ گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ ہی میرے دل میں ہے!

علامہ ابن قیمؒ نے اس کی بڑی خوبصورت تعبیر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جب قرآن پڑھتے ہیں تو یوں محسوس کرتے ہیں کہ وہ مصحف سے نہیں پڑھ رہے بلکہ قرآن اُن کے لوحِ قلب پر لکھا ہوا ہے' وہاں سے پڑھ رہے ہیں۔ گویا فطرتِ انسانی کو قرآن مجید کے ساتھ اتنی ہم آہنگی ہو جاتی ہے۔

ہمارے دَور کے ایک صوفی بزرگ کہا کرتے ہیں کہ روحِ انسانی اور قرآن حکیم ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ جیسے ایک گاؤں کے رہنے والے ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور باہم انسیت محسوس کرتے ہیں ایسا ہی معاملہ روحِ انسانی اور قرآن حکیم کا ہے۔ قرآن کو پڑھ کر اور سن کر روحِ انسانی محسوس کرتی ہے کہ اس کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میرا ہے۔ جہاں سے میں آئی ہوں یہ کلام بھی وہیں سے آیا ہے۔ یقیناً اس کلام کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میرے وجود' میری ہستی اور میری روح کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ یہ ہم آہنگی ہے جو اصل باطنی تجربہ بن جائے تب ہی یقین ہوتا ہے کہ یہ کلام واقعتاً اللہ کا ہے۔

باب ھفتم

اعجازِ قرآن کے اہم اور بنیادی وجوہ

قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ کا باہمی تعلق

میں عرض کر چکا ہوں کہ قرآن مجید اور نبی اکرم ﷺ دونوں ایک دوسرے کے شاہد ہیں۔ قرآن کے منزّل من اللہ ہونے کی سب سے بڑی اور سب سے معتبر خارجی گواہی نبی اکرم ﷺ کی اپنی گواہی ہے۔ آپؐ کی شخصیت' آپؐ کا کردار' آپؐ کا چہرۂ انور اپنی اپنی جگہ پر گواہ ہیں۔ ہمارے لیے اگر چہ آپ ﷺ کی سیرت آج بھی زندہ و پائندہ ہے' کتابوں میں درج ہے' لیکن ایک مجسّم انسانی شخصیت کی صورت میں آپ ﷺ ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں' ہم آپ ﷺ کے روئے انور کی زیارت سے محروم ہیں۔ تاہم آپ ﷺ کا کارنامہ زندہ و تابندہ ہے اور اس کی گواہی ہر شخص دے رہا ہے۔ ہر مؤرّخ نے تسلیم کیا ہے' ہر مفکّر نے مانا ہے کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب وہ تھا جو حضور ﷺ نے برپا کیا۔ آپؐ کی یہ عظمت آج بھی مبرہن ہے' آشکارا ہے' اظہر من الشمس ہے۔ چنانچہ قرآن کے منزّل من اللہ اور کلامِ الٰہی ہونے پر سب سے بڑی خارجی گواہی خود نبی اکرم ﷺ ہیں' اور نبی اکرم ﷺ کے نبی اور رسول ہونے کا سب سے بڑا گواہ' سب سے بڑا شاہد اور سب سے بڑا ثبوت خود قرآن مجید ہے۔

اس اعتبار سے یہ دونوں جس طرح لازم و ملزوم ہیں اس کے لیے میں قرآن حکیم کے دو مقامات سے استشہاد کر رہا ہوں۔ سورۃ البینہ میں فرمایا:

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝

''اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کیا اور مشرک باز آنے والے نہ تھے

یہاں تک کہ اُن کے پاس 'بیّنہ' آ جاتی۔"

"بیّنۃ" کھلی اور روشن دلیل کو کہتے ہیں۔ ایسی بالکل روشن حقیقت جس کو کسی خارجی دلیل کی مزید حاجت نہ ہو وہ "بیّنہ" ہے۔ جیسے ہم اپنی گفتگو میں کہتے ہیں کہ یہ بات بالکل بیّن ہے' بالکل واضح ہے' اس پر کسی قیل وقال کی حاجت ہی نہیں ہے۔ بلکہ اگر بیّنہ پر کوئی دلیل لانے کی کوشش کی جائے تو کسی درجے میں شک وشبہ تو پیدا کیا جا سکتا ہے' اس پر یقین میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ بیّنہ کیا ہے؟ فرمایا:

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝

"ایک رسول اللہ کی جانب سے جو پاک صحیفے پڑھ کر سناتا ہے' جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔"

یہاں قرآن حکیم کی سورتوں کو اللہ کی کتابوں سے تعبیر کیا گیا ہے' جو قائم و دائم ہیں اور ہمیشہ ہمیش رہنے والی ہیں۔ تو گویا رسولؐ کی شخصیت اور اللہ کا یہ کلام جو اُن پر نازل ہوا' دونوں مل کر "بیّنہ" بنتے ہیں۔

میں نے قرآن فہمی کا یہ اصول بارہا عرض کیا ہے کہ قرآن مجید میں اہم مضامین کم سے کم دو جگہ ضرور آتے ہیں۔ چنانچہ اس کی نظیر سورۃ الطلاق میں موجود ہے۔ اس کی آیت ۱۰ اِن الفاظ پر ختم ہوتی ہے: ﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝﴾ "اللہ نے تمہاری طرف ایک ذکر نازل کر دیا ہے"۔ اور یہ ذکر کیا ہے؟ فرمایا: ﴿رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ﴾ "ایک ایسا رسول جو تمہیں پڑھ کر سنا رہا ہے اللہ کی آیات جو ہر شے کو روشن کر دینے والی (اور ہر حقیقت کو مبرہن کر دینے والی) ہیں' تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے"۔ یہاں "اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ" کے بجائے "اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ" آیا ہے۔ "بیِّن" وہ چیز ہے جو خود روشن ہے اور "مُبَيِّن" وہ چیز ہے جو دوسری چیزوں کو روشن کرتی ہے' حقائق کو اجاگر کرتی ہے۔ تو یہاں پر ذکر کی جو تاویل کی گئی کہ ﴿رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ﴾ اس سے

واضح ہوا کہ قرآن اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے اور ملے ہوئے ہیں کہ ایک حیاتیاتی وجود (Organic Whole) بن گئے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے لیے شاہد بھی ہیں اور ایک دوسرے کے لیے complimentary بھی ہیں۔ اس حوالے سے یہ دونوں حقیقتیں اس طرح جمع ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں کی جا سکتیں۔

محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا اصل معجزہ: قرآن حکیم

اگلی بات یہ سمجھئے کہ نبی اکرم ﷺ کی رسالت کا اصل ثبوت یا بالفاظِ دیگر آپؐ کا اصل معجزہ' بلکہ واحد معجزہ قرآن حکیم ہے۔ یہ بات ذرا اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ ''معجزہ'' کا لفظ ہمارے ہاں بہت عام ہو گیا ہے اور ہر خرقِ عادت شے کو معجزہ شمار کیا جاتا ہے۔ معجزہ کے لفظی معنی عاجز کر دینے والی شے کے ہیں۔ قرآن مجید میں ''عجز'' مادہ سے بہت سے الفاظ آتے ہیں' لیکن ہمارے ہاں اصطلاح کے طور پر اس لفظ کا جو اطلاق کیا جاتا ہے وہ قرآن حکیم میں مستعمل نہیں ہے' بلکہ اللہ کے رسولوں کو جو معجزات دیے گئے انہیں بھی آیات کہا گیا ہے۔ انبیاء و رُسل اللہ تعالیٰ کی آیات یعنی اللہ کی نشانیاں لے کر آئے۔

اس اعتبار سے معجزہ کا لفظ جس معنی میں ہم استعمال کرتے ہیں' اس معنی میں یہ قرآن مجید میں مستعمل نہیں ہے۔ البتہ وہ طبیعی قوانین (Physical Laws) جن کے مطابق یہ دنیا چل رہی ہے' اگر کسی موقع پر وہ ٹوٹ جائیں اور ان کے ٹوٹ جانے سے اللہ تعالیٰ کی کوئی مشیتِ خصوصی ظاہر ہو تو اسے خرقِ عادت کہتے ہیں۔ مثلاً قانون تو یہ ہے کہ پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے' لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا کی ضرب لگائی اور سمندر پھٹ گیا' یہ خرقِ عادت ہے' یعنی جو عادی قانون ہے وہ ٹوٹ گیا۔ ''خرق'' پھٹ جانے کو کہتے ہیں' جیسے سورۃ الکہف میں یہ لفظ آیا ہے ''خَرَقَهَا'' یعنی اس اللہ کے بندے نے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار تھے' کشتی میں شگاف ڈال دیا۔ پس جب بھی کوئی طبیعی قانون ٹوٹے گا تو وہ خرقِ عادت ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ان خرقِ عادت واقعات کے ذریعے سے بہت سے قوانینِ قدرت کو توڑ کر اپنی خصوصی مشیت اور خصوصی قدرت کا

اظہار فرماتا ہے۔ اور یہ بات ہمارے ہاں مسلّم ہے کہ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا معاملہ صرف انبیاء کے ساتھ مخصوص نہیں ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں میں سے بھی جن کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا چاہے کرتا ہے' لیکن اصطلاحاً ہم انہیں کرامات کہتے ہیں۔ خرقِ عادت یا کرامات اپنی جگہ پر ایک مستقل مضمون ہے۔

معجزہ بھی خرقِ عادت ہوتا ہے' لیکن رسول کا معجزہ وہ ہوتا ہے جو دعوے کے ساتھ پیش کیا جائے اور جس میں تحدّی (challenge) بھی موجود ہو۔ یعنی جسے رسول خود اپنی رسالت کے ثبوت کے طور پر پیش کرے اور پھر اُس میں مقابلے کا چیلنج دیا جائے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جو معجزات عطا کیے ان میں ''یدِ بیضا'' اور ''عصا'' کی حیثیت اصل معجزے کی تھی۔ ویسے آیات اور بھی دی گئی تھیں جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ﴾ ''اور بیشک ہم نے موسیٰ کو نو روشن نشانیاں دیں''۔ مگر یہ اُس وقت کی بات ہے جب آپؑ ابھی مصر کے اندر تھے۔ پھر جب آپؑ مصر سے باہر نکلے تو عصا کی کرامات ظاہر ہوئیں کہ اس کی ضرب سے سمندر پھٹ گیا' اس کی ضرب سے چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ یہ تمام چیزیں خرقِ عادت ہیں' لیکن اصل معجزے دو تھے جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعوے کے ساتھ پیش کیا کہ یہ میری رسالت کا ثبوت ہے۔

جب آپؑ فرعون کے دربار میں پہنچے اور آپ نے اپنی رسالت کی دعوت پیش کی تو دلیلِ رسالت کے طور پر فرمایا کہ میں اس کے لیے سند (سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ) بھی لے کر آیا ہوں۔ فرعون نے کہا کہ لاؤ پیش کرو تو آپؑ نے یہ دو معجزے پیش کیے۔ یہ دو معجزے جو اللہ کی طرف سے آپؑ کو عطا کیے گئے' آپؑ کی رسالت کی سند تھے۔ اس میں تحدّی بھی تھی۔ لہٰذا مقابلہ بھی ہوا اور جادوگروں نے پہچان بھی لیا کہ یہ جادو نہیں ہے' معجزہ ہے۔ معجزہ جس میدان کا ہوتا ہے اسے اُسی میدان کے افراد ہی پہچان سکتے ہیں۔ جب جادوگروں کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ ہوا تو عام دیکھنے والوں نے تو یہی سمجھا ہوگا کہ یہ بڑا جادوگر ہے اور یہ چھوٹے جادوگر ہیں' اس کا جادو زیادہ طاقتور نکلا' اس کے

عصا نے بھی سانپ اور اژدھا کی شکل اختیار کی تھی اور ان جادوگروں کی رسیوں اور چھڑیوں نے بھی سانپوں کی شکل اختیار کر لی تھی' البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کا بڑا سانپ باقی تمام سانپوں کو نگل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مجمع ایمان نہیں لایا' لیکن جادوگر تو جانتے تھے کہ اُن کے فن کی رسائی کہاں تک ہے' اس لیے اُن پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یہ جادو نہیں ہے' کچھ اور ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم کے معجزہ ہونے کا اصل احساس عرب کے شعراء' خطیبوں اور زبان دانوں کو ہوا تھا۔ عام آدمی نے بھی اگرچہ محسوس کیا کہ یہ خاص کلام ہے' بہت پُرتاثیر اور میٹھا کلام ہے' لیکن اس کا معجزہ ہونا یعنی عاجز کر دینے والا معاملہ تو اسی طرح ثابت ہوا کہ قرآن مجید میں بار بار چیلنج دیا گیا کہ اس جیسا کلام پیش کرو۔ اس اعتبار سے جان لیجیے کہ رسول اللہ ﷺ کا اصل معجزہ قرآن ہے۔

آپ ﷺ کے خرقِ عادت معجزات تو بے شمار ہیں۔ شقِ قمر قرآن حکیم سے ثابت ہے' لیکن یہ آپ ﷺ نے دعوے کے ساتھ نہیں دکھایا' نہ ہی اِس پر کسی کو چیلنج کیا' بلکہ آپؐ سے جو مطالبے کیے گئے تھے کہ آپؐ یہ یہ کر کے دکھایئے' اُن میں سے کوئی بات اللہ تعالیٰ کے ہاں منظور نہیں ہوئی۔ اللہ چاہتا تو اُن کا مطالبہ پورا کرا دیتا' لیکن اُن مطالبوں کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ البتہ خرقِ عادت واقعات بے شمار ہیں۔ جانوروں کا بھی آپؐ کی بات کو سمجھنا اور آپؐ سے عقیدت کا اظہار کرنا بہت مشہور ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر ۶۳ اونٹوں کو حضور ﷺ نے خود اپنے ہاتھ سے نحر کیا تھا۔ قطار میں سو اونٹ کھڑے کیے گئے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک اونٹ جب گرتا تھا تو اگلا خود آگے آ جاتا تھا۔ اسی طرح ''ستونِ حنانہ'' کا معاملہ ہوا۔ حضور ﷺ مسجد نبویؐ میں کھجور کے ایک تنے کا سہارا لے کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے' مگر جب اِس مقصد کے لیے منبر بنا دیا گیا اور آپؐ پہلی مرتبہ منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دینے لگے تو اُس سوکھے ہوئے تنے میں سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی بچہ بلک بلک کر رو رہا ہو' اسی لیے تو اسے ''حنّانہ'' کہتے ہیں۔ ایسے ہی کئی مواقع پر تھوڑا کھانا بہت سے لوگوں کو کفایت کر گیا۔

اِن خرقِ عادت واقعات کو بعض عقلیت پسند (Rationalists) اور سائنسی مزاج کے حامل لوگ تسلیم نہیں کرتے۔ پچھلے زمانے میں بھی لوگ ان کا انکار کرتے رہے ہیں۔ اس پر مولانا روم نے خوب فرمایا ہے کہ:؎

فلسفی کو منکرِ حنّانہ است
از حواسِ انبیا بیگانہ است!

بہرحال خرقِ عادت واقعات حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بہت ہیں۔ (**تفصیل دیکھنا ہو تو ''سیرت النبیؐ'' از مولانا شبلی کی ایک ضخیم جلد صرف حضور ﷺ کے خرقِ عادت واقعات پر مشتمل ہے**) لیکن جیسا کہ اوپر گزرا' معجزہ دعوے کے ساتھ اور رسالت کے ثبوت کے طور پر ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں اس کی دوسری مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آئی ہے کہ آپؑ لوگوں سے فرماتے ہیں کہ دیکھو میں مُردوں کو زندہ کر کے دکھا رہا ہوں۔ میں گارے سے پرندے کی صورت بناتا ہوں اور اُس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے اڑتا ہوا پرندہ بن جاتا ہے۔ خرقِ عادت کا معاملہ تو غیر نبی کے لیے بھی ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے لیے بھی اس طرح کے حالات پیدا کرسکتا ہے۔ اُن کا اللہ کے ہاں جو مقام و مرتبہ ہے اس کے اظہار کے لیے کرامات کا ظہور ہوسکتا ہے۔ یہ چیزیں بعید نہیں ہیں' لیکن انبیاء کی کرامات کو عرفِ عام میں ''معجزات'' کہا جاتا ہے اور غیر انبیاء اور اولیاء کے لیے ''کرامات'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن معجزہ وہ ہے جسے اللہ کا رسول دعوے کے ساتھ پیش کرے اور چیلنج کرے۔

یہ بات کہ قرآن مجید ہی حضور ﷺ کا اصل معجزہ ہے' دو اعتبارات سے قرآن میں بیان کی گئی ہے۔ ایک مثبت انداز ہے' جیسے سورۂ یٰسٓ کی ابتدائی آیات میں فرمایا: ﴿یٰسٓ ① وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ② اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ③﴾ ''یٰسٓ۔ قسم ہے قرآن حکیم کی (اور قسم کا اصل فائدہ شہادت ہوتا ہے' یعنی گواہ ہے یہ قرآن حکیم) کہ یقیناً (اے محمد ﷺ) آپ اللہ کے رسول ہیں''۔ خطاب بظاہر حضور ﷺ سے ہے' حالانکہ

حضورؐ کو یہ بتانا مقصود نہیں ہے' بلکہ مخاطبین یعنی اہلِ عرب اور اہلِ مکہ کو سنایا جارہا ہے کہ یہ قرآن شاہد ہے' یہ ثبوت ہے' یہ دلیلِ قطعی ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں' یہ قرآن پکار پکار کر محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن حکیم کے چار مقامات اور ہیں جن میں یہی آیت ﴿اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ مقدر ہے' اگرچہ بیان نہیں ہوئی۔ سورۂ صٓ کا آغاز ہوتا ہے: ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ① بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّۃٍ وَّشِقَاقٍ ②﴾ ''ص' قسم ہے اس قرآن کی جو نصیحت (یاددہانی) والا ہے۔ لیکن وہ لوگ کہ جو منکر ہیں' گھمنڈ اور ضد میں پڑے ہوئے ہیں''۔ یہاں ''صٓ'' ایک حرف ہے' لیکن اس سے آیت نہیں بنی' جبکہ ''یٰسٓ'' ایک آیت ہے۔ سورۂ صٓ کی پہلی آیت قسم پر مشتمل ہے۔ ''بَلْ'' سے جو دوسری آیت شروع ہو رہی ہے یہ ثابت کر رہی ہے کہ مُقسَم علیہ (جس چیز پر قسم کھائی جا رہی ہے) یہاں محذوف ہے اور وہ (اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ) ہے۔ گویا کہ معناً اسے یوں پڑھا جائے گا: ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ① (اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ) بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا......﴾۔ اسی طرح سورۂ قٓ میں ہے: ﴿قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ① (اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ) بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَھُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْھُمْ ......﴾۔

ایسے ہی دو سورتیں الزخرف اور الدخان ''حٰمٓ'' سے شروع ہوتی ہیں۔ ان کی پہلی دو آیات بالکل ایک جیسی ہیں: ﴿حٰمٓ ① وَالْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ②﴾۔ پہلی آیت حروفِ مقطعات پر اور دوسری آیت قسم پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد مُقسَم علیہ (اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ) محذوف ماننا پڑے گا۔ گویا: ﴿حٰمٓ ① وَالْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ② (اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ) اِنَّا جَعَلْنٰہُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ③﴾ اور: ﴿حٰمٓ ① وَالْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ② (اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ) اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ اِنَّا کُنَّا مُنْذِرِیْنَ ③﴾۔ یہ ایک اسلوب ہے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو ثابت کرنے کے لیے قرآن کی قسم کھائی گئی' یعنی قرآن کی گواہی اور شہادت پیش کی گئی۔ یہ اِس بات کو کہنے کا ایک اسلوب ہے کہ حضور ﷺ کی رسالت کا اصل ثبوت یا آپؐ کا اصل معجزہ

قرآن ہے۔

قرآن کا دعویٰ اور چیلنج

پہلے گزر چکا ہے کہ معجزے میں تحدّی (چیلنج) بھی ضروری ہے اور دعویٰ بھی۔ لہٰذا وہ مقامات گن لیجیے جن میں چیلنج ہے کہ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ محمد ﷺ کا کلام ہے' انسانی کلام ہے جسے محمد ﷺ نے خود گھڑ لیا ہے' یہ اُن کی اپنی اختراع ہے تو تم مقابلہ کرو اور ایسا ہی کلام پیش کرو۔ قرآن مجید میں ایسے پانچ مقامات ہیں۔ سورۃ الطور میں فرمایا:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۞

''کیا اُن کا یہ کہنا ہے کہ یہ محمدؐ نے خود گھڑ لیا ہے؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ماننے کو تیار نہیں۔ پھر چاہیے کہ وہ اسی طرح کا کوئی کلام پیش کریں اگر وہ سچے ہیں۔''

قَالَ' يَقُوْلُ کا معنی ہے کہنا۔ جبکہ تَقَوَّلَ' يَتَقَوَّلُ کا مفہوم ہے تکلف کر کے کہنا' یعنی محنت کر کے کلام موزوں کرنا (جس کے لیے انگریزی میں composition کا لفظ ہے۔) تو کیا اُن کا خیال ہے کہ یہ محمد ﷺ نے خود کہہ لیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ ماننے کو تیار نہیں' لہٰذا اس طرح کی کٹ حجتیاں کر رہے ہیں۔ اگر یہ سچے ہیں تو ایسا ہی کلام پیش کریں۔ آخر یہ بھی انسان ہیں' اِن میں بڑے بڑے شعراء اور بڑے قادر الکلام خطیب موجود ہیں۔ ان میں وہ شعراء بھی ہیں جن کو دوسرے شعراء سجدہ کرتے ہیں۔ یہ سب کے سب مل کر ایسا کلام پیش کریں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۞

''(اے نبیؐ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمام جن و اِنس جمع ہو جائیں (اور اپنی پوری قوت و صلاحیت اور اپنی تمام ذہانت و فطانت' قادر الکلامی کو جمع کر کے کوشش کریں) کہ اِس قرآن جیسی کتاب پیش کر دیں تو وہ ہرگز ایسی کتاب نہیں

لا سکیں گے چاہے وہ ایک دوسرے کی کتنی ہی مدد کریں۔''

یہ تو بحیثیت مجموعی پورے قرآن مجید کی نظیر پیش کرنے سے مخلوق کے عاجز ہونے کا دعویٰ ہے جو قرآن مجید نے دو مقامات پر کیا ہے۔ سورۂ یونس میں اس سے ذرا نیچے اتر کر' جسے بر سبیل تنزل کہا جاتا ہے' فرمایا کہ پورے قرآن کی نظیر نہیں لا سکتے تو ایسی دس سورتیں ہی گھڑ کر لے آؤ! ارشاد ہوا:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (ھود)

''کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن خود گھڑ کر لے آیا ہے؟ (اے نبیؐ! ان سے) کہیے پس تم بھی دس سورتیں بنا کر لے آؤ ایسی ہی گھڑی ہوئی اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔''

اس کے بعد دس سے نیچے اتر کر ایک سورۃ کا چیلنج بھی دیا گیا:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (یونس)

''کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن خود بنا کر لے آیا ہے؟ (اے نبیؐ! ان سے) کہیے پس تم بھی ایک سورت بنا کر لے آؤ ایسی ہی اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔''

یہ چاروں مقامات تو مکی سورتوں میں ہیں۔ پہلی مدنی سورۃ ''البقرۃ'' ہے۔ اس میں بڑے اہتمام کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝

''اگر تم لوگوں کو شک ہے اس کلام کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے (کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے) تو اس جیسی ایک سورۃ تم بھی (موزوں کر کے) لے آؤ اور اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو (ان سب کو جمع کر لو)

اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔ اور اگر تم ایسا نہ کر سکو' اور تم ہرگز ایسا نہ کر سکو گے' تو بچو اُس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے' یہ منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

یہاں یہ واضح کیا جارہا ہے کہ حقیقت میں تم سچے نہیں ہو' تمہارا دل گواہی دے رہا ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے' لیکن چونکہ تم زبان سے تنقید کر رہے ہو اور جھٹلا رہے ہو تو اگر واقعتاً تمہیں شک ہے تو اِس شک کو رفع کرنے کے لیے ہمارا یہ چیلنج موجود ہے۔

یہ ہیں قرآن مجید کے معجزہ ہونے کے دو اسلوب۔ ایک مثبت انداز ہے کہ قرآن گواہ ہے اس پر کہ اے محمد ﷺ! آپ اللہ کے رسول ہیں' اور دوسرا انداز چیلنج کا ہے کہ اگر تمہیں اس کے کلامِ الٰہی ہونے میں شک ہے تو اس جیسا کلام تم بھی بنا کر لے آؤ۔

قرآن کس کس اعتبار سے معجزہ ہے؟

اب اس ضمن میں تیسری ذیلی بحث یہ ہوگی کہ قرآن مجید کس کس اعتبار سے معجزہ ہے۔ یہ مضمون اتنا وسیع اور اتنا متنوّع الاطراف ہے کہ ''وجوہِ اعجاز القرآن'' پر پوری پوری کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ظاہر بات ہے اس وقت اِس کا احاطہ مقصود نہیں ہے' صرف موٹی موٹی باتیں ذکر کی جاتی ہیں۔

اصل شے تو اِس کی تأثیر قلب ہے کہ یہ دل کو لگنے والی بات ہے۔ اس کا اصل اعجاز یہی ہے کہ یہ دل کو جا کر لگتی ہے بشرطیکہ پڑھنے والے کے اندر تعصب' ضد اور ہٹ دھرمی نہ ہو اور اسے زبان سے اتنی واقفیت ہو جائے کہ براہِ راست قرآن اس کے دل پر اتر سکے۔ یہ قرآن کے اعجاز کا اصل پہلو ہے۔ لیکن اضافی طور پر جان لیجیے کہ جس وقت قرآن نازل ہوا اُس وقت کے اعتبار سے اس کے معجزہ ہونے کا نمایاں اور اہم تر پہلو اِس کی ادبیت' اِس کی فصاحت و بلاغت' اس میں الفاظ کا انتخاب' بندشیں اور ترکیبیں' اس کی مٹھاس اور اس کا صوتی آہنگ ہے۔ یہ درحقیقت نزول کے وقت قرآن کے معجزہ ہونے کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ ہر رسول کو اُسی طرز کا معجزہ دیا گیا جن چیزوں کا

اُس کے زمانے میں سب سے زیادہ چرچا اور شغف تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو عام تھا لہٰذا مقابلے کے لیے آپ کو وہ چیزیں دی گئیں جن سے آپ جادوگروں کو شکست دے سکیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قوم میں اپنی دعوت کا آغاز کیا اُس قوم کا اصل ذوق قدرتِ کلام تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اصل میں بولنے والے تو ہم ہی ہیں' باقی دنیا تو گونگی ہے۔ ان کی زبان دانی کا یہ عالَم تھا کہ وہ اپنی پسند کی اشیاء کے نام رکھنا شروع کرتے تو ہزاروں نام رکھ دیتے۔ چنانچہ عربی میں شیر اور تلوار کے لیے پانچ پانچ ہزار الفاظ ہیں۔ گھوڑے اور اونٹ کے لیے لاتعداد الفاظ ہیں۔ یہ اُن کی قادر الکلامی ہے کہ کسی شے کو اُس کی ہر ادا کے اعتبار سے نیا نام دے دیتے۔ گھوڑا اُن کی بڑی محبوب شے ہے' لہٰذا اُس کے نامعلوم کتنے نام ہیں۔ شعروشاعری میں ان کے ذوق وشوق کا یہ عالَم تھا کہ اُن کے ہاں سالانہ مقابلے ہوتے تھے تاکہ اس سال کے سب سے بڑے شاعر کا تعین کیا جائے۔ شعراء اپنے اپنے قصیدے لکھ کر لاتے تھے' مقابلہ ہوتا تھا۔ پھر جب فیصلہ ہوتا تھا کہ کس کا قصیدہ سب پر بازی لے گیا ہے تو باقی تمام شعراء اس کی عظمت کے اعتراف کے طور پر اس کو سجدہ کرتے تھے۔ پھر وہ قصیدہ خانۂ کعبہ کی دیوار پر لٹکا دیا جاتا تھا کہ یہ ہے اس سال کا قصیدہ۔ چنانچہ اس طرح کے سات قصیدے خانہ کعبہ میں آویزاں کیے گئے تھے جنہیں ''سَبْعَة مُعَلَّقَة'' کہا جاتا تھا۔ سبعة معلقة کے آخری شاعر حضرت لبید رضی اللہ عنہ تھے جو ایمان لے آئے۔ ایمان لانے کے بعد انہوں نے شعر کہنے چھوڑ دیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن سے کہا کہ اے لبید! اب آپ شعر کیوں نہیں کہتے؟ تو جواب میں انہوں نے بڑا پیارا جملہ کہا کہ ''اَبَعْدَ الْقُرْآنِ؟'' یعنی کیا قرآن کے نزول کے بعد بھی؟ اب کسی کے لیے کچھ کہنے کا موقع باقی ہے؟ قرآن کے آجانے کے بعد کوئی اپنی فصاحت وبلاغت کے اظہار کی کوشش کرسکتا ہے؟ گویا زبانیں بند ہوگئیں' اُن پر تالے پڑ گئے' ملک الشعراء نے شعر کہنے چھوڑ دیے۔

جن لوگوں کی مادری زبان عربی ہے وہ آج بھی قرآن کے اس اعجاز کو محسوس کر سکتے ہیں۔ غیر عرب لوگوں کے لیے اس کو محسوس کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر کوئی اپنی محنت

سے عربی ادب کے اندر مولانا علی میاں (۱) کی سی مہارت حاصل کر لے تو وہ واقعتاً اس کو محسوس کر سکے گا اور اس کی تحسین کر سکے گا کہ فصاحت و بلاغت میں قرآن کا کیا مقام ہے۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں ہے' البتہ اس کا صوتی آہنگ ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی قراءت کے اندر ایک معجزانہ تاثیر ہے جو قلب کے اندر عجیب کیفیات پیدا کر دیتی ہے۔ قرآن کا صوتی آہنگ ہماری فطرت کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ قرآن کی یہ معجزانہ تاثیر آج بھی ویسی ہے جیسی نزولِ قرآن کے وقت تھی۔ اس میں مرورِ ایام سے کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔

قرآن کی فصاحت و بلاغت' اس کی ادبیت' عذوبت اور اس کے صوتی آہنگ کی معجزانہ تاثیر پر مستزاد عہد حاضر میں قرآن کے اعجاز کے ضمن میں جو چیزیں بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں اُن میں سے ایک چیز تو وہ ہے جس کا قرآن مجید نے بڑے صریح الفاظ میں ذکر کیا ہے:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ

(حٰمٓ السجدۃ:۵۳)

''ہم عنقریب انہیں اپنی آیات دکھائیں گے آفاق میں بھی اور اُن کی اپنی جانوں میں بھی یہاں تک کہ یہ بات اُن پر واضح ہو جائے گی کہ یہ قرآن حق ہے۔''

اِس آیت مبارکہ میں علمِ انسانی کے دائرہ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور جدید اکتشافات وانکشافات کی طرف اشارہ ہے۔ یہ آیاتِ آفاقی ہیں۔ فرانسیسی سرجن ڈاکٹر مورس بکائی کا پہلے بھی حوالہ دیا جا چکا ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد اُس نے کہا کہ میرا دل اس پر مطمئن ہو گیا ہے کہ اس قرآن میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے سائنس نے غلط ثابت کیا ہو۔ البتہ اُس دَور میں جبکہ انسان کا اپنا ذہنی ظرف وسیع نہیں ہوا تھا' علومِ انسانی اور معلوماتِ انسانی کا دائرہ محدود تھا' اس وقت سائنسی اشارات کی حامل آیاتِ قرآنیہ کا کیا مفہوم سمجھا گیا' وہ بات اور ہے۔ کلام اللہ ہونے کے اعتبار سے اصل اہمیت تو

(۱) مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی جوارِ رحمت میں پہنچ چکے ہیں' يَغْفِرُ اللّٰهُ لَهٗ وَيَرْفَعُ دَرَجَاتِهٖ فِي الْجَنَّةِ۔ آمین!

قرآن کے الفاظ کو حاصل ہے۔ڈاکٹر مورس بکائی نے قرآن کا تورات کے ساتھ تقابل کیا ہے! تورات سے مراد Old Testament ہے۔ اناجیلِ اربعہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں' اُن میں تو کئی چیزیں ایسی ہیں جو غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ اناجیل میں زیادہ تر اخلاقی مواعظ ہیں یا پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوانح حیات ہیں۔تورات میں یہ مباحث موجود ہیں کہ کائنات کیسے پیدا ہوئی' اللہ نے کیسے اسے بنایا۔مختلف سائنسی phenomena اس میں موجود ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ فزکس میں آج سب سے زیادہ اہم موضوع جس پر تحقیق ہو رہی ہے' یہی ہے کہ کائنات کیسے وجود میں آئی' ابتدائی حالات کیا تھے اور بعدازاں ان میں کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ڈاکٹر مورس بکائی نے اس اعتبار سے محسوس کیا کہ تورات میں تو ایسی چیزیں ہیں جو غلط ثابت ہو چکی ہیں۔اس لیے کہ اصل تورات تو چھٹی صدی قبل مسیح ہی میں گم ہو گئی تھی۔ بخت نصر کے حملے میں یروشلم کو تہس نہس کر دیا گیا اور ہیکلِ سلیمانی کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی' اس کی بنیادیں تک کھود ڈالی گئیں اور یروشلم کے بسنے والے چھ لاکھ کی تعداد میں قتل کر دیے گئے جبکہ بخت نصر چھ لاکھ کو قیدی بنا کر بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے اپنے ہمراہ بابل لے گیا۔ چنانچہ یروشلم میں ایک متنفس بھی باقی نہیں رہا۔ آپ اندازہ کریں' اگر یہ اعداد و شمار صحیح ہیں تو حضرت مسیح علیہ السلام سے بھی چھ سو سال قبل یعنی آج سے ۲۶۰۰ برس قبل یروشلم بارہ لاکھ کی آبادی کا شہر تھا اور اس شہر پر کیا قیامت گزری ہو گی! اس کے بعد سے وہ اصل تورات دنیا میں نہیں ہے۔موسیٰ علیہ السلام کو جو احکامِ عشرہ (Ten Commandments) دیے گئے تھے وہ پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے تھے۔ یہ تختیاں بھی لاپتہ ہو گئیں اور باقی تورات کا وجود بھی باقی نہ رہا۔قرآن حکیم میں ''صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى '' کا ذکر ہے۔موسیٰ علیہ السلام کے صحیفے پانچ ہیں جو عہد نامۂ قدیم (Old Testament) کی پہلی پانچ کتابیں ہیں۔سانحۂ یروشلم کے قریباً ڈیڑھ سو برس بعد لوگوں نے تورات کو اپنی یادداشتوں سے مرتب کیا۔ چنانچہ اُس وقت کی نوعِ انسانی کی ذہنی اور علمی سطح جو تھی وہ اس پر لازمی طور پر اثر انداز ہوئی۔

ڈاکٹر موریس بکائی کے علاوہ میں ڈاکٹر کیتھ این مور کا حوالہ بھی دے چکا ہوں کہ وہ قرآن حکیم میں علمِ جنین سے متعلق اشارات پا کر کس قدر حیران ہوا کہ یہ معلومات چودہ سو برس پہلے کہاں سے آ گئیں! فزیکل سائنسز کے مختلف فیلڈ ہیں' ان میں جیسے جیسے علمِ انسانی ترقی کرتا جائے گا یہ بات مزید مبرہن ہوتی چلی جائے گی کہ یہ کلامِ حق ہے اور یہ کلام مظاہرِ طبیعی کے اعتبار سے بھی حق ثابت ہو رہا ہے۔ یہ ایک واضح ثبوت ہے کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

عہدِ حاضر کے اعتبار سے قرآن حکیم کے اعجاز کا دوسرا اہم تر پہلو اس کی ہدایتِ عملی ہے۔ اس میں انفرادی زندگی سے متعلق بھی مکمل ہدایات ہیں اور انسانی اخلاق و کردار اور انسان کے رویّہ کے بارے میں بھی پوری تفصیلات موجود ہیں۔ انفرادی زندگی سے متعلق یہ تمام چیزیں سابقہ انبیاء کی تعلیمات میں بھی موجود ہیں۔ یہ اخلاقی اقدار ویسے بھی فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہیں۔ قرآن کا اپنا کہنا ہے: ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۝٨﴾ (الشمس) یعنی نفسِ انسانی کو الہامی طور پر یہ معلوم ہے کہ فجور کیا ہیں اور تقویٰ کیا ہے۔ پرہیزگاری کسے کہتے ہیں اور بدکاری کسے کہتے ہیں۔ البتہ قرآن حکیم کا اعجاز یہ ہے کہ اس میں عدل و قسط پر مبنی اجتماعی نظام دیا گیا ہے جس میں انتہائی توازن رکھا گیا ہے۔

انسان غور کرے تو معلوم ہوگا کہ نوعِ انسانی کو تین بڑے بڑے عقدہ ہائے لاینحل (dilemmas) درپیش ہیں جو توازن کے متقاضی ہیں اور ان میں عدمِ توازن سے انسانی تمدن فساد اور بگاڑ کا شکار ہے۔ ان میں پہلا عقدۂ لاینحل یہ ہے کہ مرد اور عورت کے حقوق و فرائض میں کیا توازن ہے؟ دوسرا یہ کہ سرمایہ اور محنت کے مابین کیا توازن ہے؟ پھر تیسرا یہ کہ فرد اور ریاست یا فرد اور اجتماعیت کے مابین حقوق و فرائض کے اعتبار سے کیا توازن ہے؟ ان تینوں معاملات میں توازن قائم کرنا انتہائی مشکل ہے۔ اگر فرد کو ذرا زیادہ آزادی دے دی جاتی ہے تو انارکی (chaos) پھیلتی ہے۔ آزادی کے نام پر دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے! دوسری طرف اگر فرد کی آزادی پر قدغنیں اور بندشیں لگا دی

جائیں تو وہ ردِّعمل ہوتا ہے جو کمیونزم کے خلاف ہوا۔ فطرتِ انسانی اور طبیعتِ انسانی نے یہ قدغنیں قبول نہیں کیں اور اِن کے خلاف بغاوت کی۔

عورت اور مرد کے حقوق کے مابین توازن کا معاملہ بھی انتہائی حساس ہے۔ اس میزان کا پلڑا اگر ذرا سا مَرد کی جانب جھکا دیا جائے تو عورت کی کوئی حیثیت نہیں رہتی' وہ بالکل بھیڑ بکری کی طرح مرد کی مِلکیت بن کر رہ جاتی ہے' اس کا کوئی تشخص نہیں رہتا اور وہ مرد کی جوتی کی نوک قرار پاتی ہے۔ لیکن اگر دوسرا پلڑا ذرا جھکا دیا جائے تو عورت کو جو حیثیت مل جاتی ہے وہ قوموں کی قسمتوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ اس سے خاندانی ادارہ ختم ہو جاتا ہے اور گھر کے اندر کا چین اور سکون برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال سکینڈے نیوین ممالک ہیں۔ معاشی اور اقتصادی اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ روئے ارضی پر اگر جنت دیکھنی ہو تو اِن ممالک کو دیکھ لیا جائے۔ وہاں کے شہریوں کی بنیادی ضروریات کس عمدگی کے ساتھ پوری ہو رہی ہیں! وہاں علاج اور تعلیم کی سہولیات سب کے لیے یکساں ہیں اور اس ضمن میں خیرات (charity) پر پلنے والوں اور ٹیکس ادا کرنے والوں کے مابین کوئی فرق وتفاوت نہیں ہے۔ لیکن ان ممالک میں مرد اور عورت کے حقوق کے مابین توازن برقرار نہیں رکھا گیا جس کے نتیجے میں خاندان کا ادارہ مضمحل ہوا' بلکہ ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو گیا اور گھر کا سکون ناپید ہو گیا۔ چنانچہ آج خودکشی کی سب سے زیادہ شرح سویڈن میں ہے۔ اس لیے کہ گھر کا سکون ختم ہو جانے کے باعث اعصاب پر شدید تناؤ ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے ہاں خاندان کا ادارہ برقرار ہے۔ اگرچہ یہاں بھی نام نہاد طور پر بہت اونچی سطح کے لوگوں کے ہاں تو وہ صورتیں پیدا ہو گئی ہیں' تاہم مجموعی طور پر ہمارے ہاں خاندان کا ادارہ ابھی کافی حد تک محفوظ ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید میں لفظ ''سکون'' استعمال ہوا ہے۔ سورۃ الروم کی آیت ۲۱ ملاحظہ ہو:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ

''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی نوع سے جوڑے بنائے' تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔''

اگر انسان کو یہ سکون نہیں ملتا تو اگرچہ اس کی کھانے پینے کی ضروریات' جنسی تسکین اور دوسری ضروریاتِ زندگی خوب پوری ہو رہی ہوں لیکن زندگی انسان کے لیے جہنم بن جائے گی۔

مذکورہ بالا تین عقدہ ہائے لاینحل میں سے معاشیات کا مسئلہ سب سے مشکل ہے۔ سرمائے کو زیادہ کھل کھیلنے کا موقع دیں گے تو صورت حال ایک انتہا کو پہنچ جائے گی اور مزدور کا بدترین استحصال ہوگا' جبکہ مزدور کو زیادہ حقوق دے دیں گے تو سرمائے کو کوئی تحفظ حاصل نہیں رہے گا۔ اگر نیشنلائزیشن ہو جائے تو لوگوں میں کام کرنے کا جذبہ ہی نہیں رہتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں نیشنلائزیشن کے بعد کیا ہوا! روس کی اقتصادی موت کی اہم وجہ یہی نیشنلائزیشن تھی۔ تو اب سرمائے اور محنت میں توازن کے لیے کیا شکل اختیار کی جائے؟ یہ ہے درحقیقت عہد حاضر میں قرآن کی ہدایت کا اہم ترین حصہ! آج اس پر بھرپور توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ فزیکل سائنسز سے قرآن کی حقانیت کے ثبوت خود بخود ملتے چلے جائیں گے۔ جیسے جیسے سائنس ترقی کر رہی ہے نئے نئے گوشے سامنے آ رہے ہیں اور اِن سے ثابت ہو رہا ہے کہ یہ قرآن حق ہے۔ لیکن آج ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن حکیم نے عمرانیاتِ انسانیہ اور اجتماعیات مثلاً اقتصادیات' سیاسیات اور سماجیات کے ضمن میں جو عدلِ اجتماعی دیا ہے اس کو مبرہن کیا جائے۔ علامہ اقبال کے یہ دو شعر اسی حقیقت کی نشاندہی کر رہے ہیں:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو\
آں کہ از خاکش بروید آرزو\
یا ز نورِ مصطفیٰ اُو را بہاست\
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است!

یعنی دنیا میں جو سوشل انقلاب آیا ہے اس کی ساری چمک دمک اور روشنی یا تو نورِ مصطفیٰ ﷺ ہی سے مستعار اور ماخوذ ہے یا پھر انسان چار و ناچار حضور ﷺ کے لائے ہوئے نظام ہی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ دائیں بائیں کی ٹھوکریں اور افراط و تفریط کے دھکے کھا کر لڑکھڑاتا ہوا چار و ناچار اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جہاں محمدٌ رسول اللہ ﷺ اور قرآن حکیم نے اسے پہنچایا تھا۔

عہدِ حاضر میں اعجازِ قرآن کا مظہر: علامہ اقبال

وجوہِ اعجازِ قرآن کے ضمن میں ایک اہم بات عرض کر رہا ہوں کہ میرے نزدیک عہدِ حاضر میں قرآن کے اعجاز کا سب سے بڑا مظہر علامہ اقبال کی شخصیت ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن حکیم زمان و مکان کے ایک خاص تناظر میں آج سے چودہ سو برس قبل نازل ہوا تھا۔ اس کے اوّلین مخاطب عرب کے اجڈ' دیہاتی' بدو اور ناخواندہ لوگ تھے جنہیں قرآن نے ''اُمِّيّين'' اور ''قَوْمًا لُّدًّا'' قرار دیا ہے۔ لیکن اِس قرآن نے ان کے اندر بجلی دوڑا دی۔ اُن کے ذہن' قلب اور روح کو متاثر کیا' پھر اُن میں ولولہ پیدا کیا' ان کے باطن کو منور کیا۔ ان کی شخصیتوں میں انقلاب آیا اور افراد بدل گئے۔ پھر انہوں نے ایسی قوت کی حیثیت اختیار کی کہ جس نے دنیا کو ایک نیا تمدّن' نئی تہذیب اور نئے قوانین دے کر ایک نئے دَور کا آغاز کیا —— لیکن بیسویں صدی میں علامہ اقبال جیسا ایک شخص جس نے وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر علم حاصل کیا' جس نے مشرق و مغرب کے فلسفے پڑھ لیے' جو قدیم اور جدید دونوں کا جامع تھا' جو جرمنی اور انگلستان میں جا کر فلسفہ پڑھتا رہا' اُس کو اِس قرآن نے اس طرح possess کیا اور اس پر اس طرح اپنی چھاپ قائم کی کہ اس کے ذہن کو سکون ملا تو صرف قرآن حکیم سے اور اس کی تشنگیٔ علم کو آسودگی حاصل ہو سکی تو صرف کتاب اللہ سے۔ گویا بقول خود اُن کے ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو تیرے عفوِ بندہ نواز میں!

میرا ایک کتابچہ ''علامہ اقبال اور ہم'' ایک عرصے سے شائع ہوتا ہے۔ یہ میری ایک تقریر

ہے جو میں نے ایچی سن کالج میں ۱۹۷۳ء میں کی تھی۔ اس میں مَیں نے علامہ اقبال کے لیے چند اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ ''اقبال اور قرآن'' کے عنوان سے میں نے علامہ اقبال کو (۱) عظمتِ قرآن کا نشان' (۲) واقفِ مرتبہ و مقامِ قرآن' اور (۳) داعی الی القرآن کے خطابات دیے ہیں۔ میں علامہ اقبال کو اس دَور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن سمجھتا ہوں۔ قرآن مجید کے علوم و معارف کی جو تعبیر علامہ اقبال نے کی ہے اس دَور میں کوئی دوسری شخصیت اس کے آس پاس بھی نہیں پہنچی۔ ان سے لوگوں نے چیزیں مستعار لی ہیں اور پھر اُن کو بڑے پیمانے پر پھیلایا ہے۔ ان حضرات کی یہ خدمت اپنی جگہ قابل قدر ہے' لیکن فکری اعتبار سے وہ تمام چیزیں علامہ اقبال کے ذہن کی پیداوار ہیں۔

مذکورہ بالا کتابچے میں مَیں نے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی گواہی بھی شائع کی ہے۔ کئی سال پہلے کا واقعہ ہے کہ مولانا آنکھوں کے آپریشن کے لیے خانقاہ ڈوگراں سے لاہور آئے ہوئے تھے اور آپریشن میں کسی وجہ سے تاخیر ہو رہی تھی۔ گھر سے باہر ہونے کی وجہ سے اُن کا لکھنے پڑھنے کا سلسلہ معطل ہو گیا۔ تاہم فرصت کے اُن ایاّم میں مولانا نے علامہ اقبال کا پورا اردو اور فارسی کلام دوبارہ پڑھ لیا۔ اس کے بعد انہوں نے اس کے بارے میں مجھ سے دو تاثر بیان کیے۔ مولانا کا پہلا تاثر تو یہ تھا کہ ''قرآن حکیم کے بعض مقامات کے بارے میں مجھے کچھ مان سا تھا کہ میں نے ان کی تعبیر جس اسلوب سے کی ہے شاید کوئی اور نہ کر سکے۔ لیکن علامہ اقبال کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی تعبیر مجھ سے بہت پہلے اور مجھ سے بہت بہتر کر چکے ہیں!'' مولانا اصلاحی صاحب کا دوسرا تاثر یہ تھا کہ ''اقبال کا کلام پڑھنے کے بعد میرا دل بیٹھ سا گیا ہے کہ اگر ایسا حُدی خواں اِس اُمت میں پیدا ہوا' لیکن یہ اُمت ٹس سے مس نہ ہوئی تو ہما شما کے کرنے سے کیا ہو گا!'' جو قوم علامہ اقبال کے کلام سے حرکت میں نہیں آئی اسے کون حرکت میں لا سکے گا؟

واقعہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اس دَور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن اور سب

سے بڑا داعی الی القرآن علامہ اقبال ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید کی عظمت کا جس گیرائی اور گہرائی کے ساتھ احساس علامہ اقبال کو ہوا ہے میری معلومات کی حد تک (اگر چہ میری معلومات محدود ہیں) اس درجے قرآن کی عظمت کا انکشاف کسی اور انسان پر نہیں ہوا۔ جب وہ قرآن مجید کی عظمت بیان کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اُن کی دید اور اُن کا تجربہ ہے' کیونکہ جس انداز سے وہ بات بیان کرتے ہیں وہ تکلف اور آورد سے ماورا انداز ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے کہ علامہ اقبال قرآن مجید کے بارے میں کیا کہتے ہیں: ؎

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ اُو لا یزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ اُو را ریب نے' تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں
زندہ و پائندہ و گویا است ایں
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

''وہ زندہ کتاب' قرآن حکیم' جس کی حکمت لازوال بھی ہے اور قدیم بھی!
زندگی کے وجود میں آنے کا خزینہ' جس کی حیات افروز اور قوت بخش تاثیر سے بے ثبات بھی ثبات و دوام حاصل کر سکتے ہیں۔
اس کے الفاظ میں نہ کسی شک و شبہ کا شائبہ ہے نہ ردّ و بدل کی گنجائش۔ اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں۔

(اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے!
یہ ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ (کا کلام ہے لہٰذا اسی) کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی، اور جیتی جاگتی بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی!
(یہ کتابِ حکیم) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اُس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے' اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے۔"

قرآن حکیم کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:۔

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست!

"اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے میں بے شمار زمانے موجود ہیں"۔ (گویا ہر زمانے میں یہ قرآن ایک نئی شان اور نئی آن بان کے ساتھ دنیا میں آیا ہے اور آتا رہے گا۔)

اب آپ علامہ اقبال کے تین اشعار ملاحظہ کیجیے جو انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے مناجات کرتے ہوئے کہے۔ اِن سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ انہیں کتنا یقین تھا کہ میرے فکر کا منبع قرآن حکیم ہے۔ چنانچہ "مثنوی اسرار و رموز" کے آخر میں "عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمۃٌ للعالمینؐ" کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا کہ:۔

گر دِلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن!
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا!
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا!

"اگر میرے دل کی مثال اس آئینے کی سی ہے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو' اور اگر

میرے کلام میں قرآن کے سوا کسی اور شے کی ترجمانی ہے' تو
(اے نبی ﷺ!) آپ میرے ناموسِ فکر کا پردہ خود چاک فرما دیں اور اس چمن کو
مجھ ایسے خار سے پاک کر دیں۔ (مزید برآں) حشر کے دن مجھے خوار و
رسوا کر دیں اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) مجھے اپنی قدم بوسی کی سعادت سے
محروم فرما دیں!''

میں نے اپنی امکانی حد تک قرآن حکیم کا پوری باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور اس پر غور و فکر اور سوچ بچار کیا ہے۔ میں نے علامہ اقبال کا اردو اور فارسی کلام بھی پڑھا ہے۔اس کے بعد میں نے یہ بات ریکارڈ کرانی ضروری سمجھی ہے کہ علامہ اقبال کے بارے میں مَیں نے جو بات ۱۹۷۳ء میں کہی تھی آج بھی میں اسی بات پر قائم ہوں کہ ''اس دَور میں عظمتِ قرآن اور مرتبہ ومقامِ قرآن کا انکشاف جس شدت کے ساتھ اور جس درجہ میں علامہ اقبال پر ہوا شاید ہی کسی اور پر ہوا ہو''۔اور یہ کہ میرے نزدیک اس دَور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن اور داعی الی القرآن اقبال ہے۔ علامہ اقبال مسلمانوں کی قرآن سے دُوری پر مرثیہ کہتے ہیں:ؔ

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مؤمن کا دیں!

مسلمانوں کو قرآن کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:ؔ

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسینِ او آساں بمیری!

''اس قرآن کے ساتھ تمہارا اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ تم کسی شخص کو عالمِ نزع میں اِس کی سورۂ یٰسٓ سنا دو' تاکہ اس کی جان آسانی سے نکل جائے۔''

ہمارے ہاں صوفی اور واعظ حضرات نے قرآن کو چھوڑ کر اپنی مجالس اور اپنے وعظ کے لیے کچھ اور چیزوں کو منتخب کر لیا ہے' تو اس پر اقبال نے کس قدر دردناک مرثیے کہے ہیں اور کس قدر صحیح نقشہ کھینچا ہے:ؔ

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نغمۂ قوّال مست
آتش از شعرِ عراؔقی در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش

اور ؎

واعظِ دستاں زن و افسانہ بند
معنیٔ اُو پست و حرفِ اُو بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ او
با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو!

''ادنیٰ لباس میں ملبوس اور اپنے حال میں مست صوفی قوّال کے نغمے کی شراب ہی سے مدہوش ہے۔ اس کے دل میں عراؔقی کے کسی شعر سے تو آگ سی لگ جاتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں!

(دوسری طرف) واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ بھی خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھ دیتا ہے اور اس کے الفاظ بھی پُرشکوہ اور بلند و بالا ہیں' لیکن معنی کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے! اس کی ساری گفتگو (بجائے قرآن کے) یا تو خطیب بغدادی سے ماخوذ ہوتی ہے یا امام دیلمی سے' اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف' شاذ اور مرسل حدیثوں سے رہ گیا ہے!''

علامہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کے زوال و اضمحلال کا اور اُمتِ مسلمہ کے نکبت و افلاس اور ذلت و خواری کا اصل سبب قرآن سے دُوری اور کتابِ الٰہی سے بُعد ہی ہے۔ چنانچہ ''جوابِ شکوہ'' کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:؎

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

بعد میں اسی مضمون کا اعادہ علامہ مرحوم نے فارسی میں نہایت پُرشکوہ الفاظ اور حد درجہ درد انگیز اور حسرت آمیز پیرائے میں یوں کیا: ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ!

’’(اے مسلمان!) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دُور اور بے تعلق ہو گیا ہے‘ لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے! اے وہ قوم کہ جو شبنم کے مانند زمین پر بکھری ہوئی ہے (اور پاؤں تلے روندی جا رہی ہے)! اٹھ کہ تیری بغل میں ایک کتابِ زندہ موجود ہے (جس کے ذریعے تو دوبارہ بامِ عروج پر پہنچ سکتی ہے)۔‘‘

میں اپنا یہ تأثر ایک بار پھر دہرا رہا ہوں کہ عصرِ حاضر میں قرآن کی عظمت جس درجہ اُن پر منکشف ہوئی تھی‘ میں اپنی محدود معلومات کی حد تک کہنے کو تیار ہوں کہ وہ مجھے کہیں اور نظر نہیں آتی۔ میرے نزدیک علامہ اقبال دورِ حاضر میں اعجازِ قرآن کا ایک عظیم مظہر ہیں۔

باب ہشتم

قرآن مجید سے ہمارا تعلّق

قرآن ''حبلُ اللہ'' ہے!

جب ہم کہتے ہیں کہ قرآن ''حبلُ اللہ'' ہے تو اس کے کیا معنی ہیں؟ ''حَبل'' کے ایک معنی رسّی کے ہیں اور یہی اصل معنی ہیں۔ سورۃ اللّھب میں یہ لفظ آیا ہے: ﴿حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ۝۵﴾ یعنی مونج کی بٹی ہوئی رسّی۔ امام راغبؒ نے اس کی تعبیر کی ہے: ''استعیر للوصل ولکل ما یتوسل به الی شیء'' یعنی کسی شے سے جڑنے کے لیے اور جس شے سے جڑا جائے اس کے لیے استعارۃً یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ عہد' قول وقرار اور میثاق دو فریقوں کو باہم جوڑ دیتا ہے۔ چنانچہ یہ لفظ عہد کے معنی میں بھی آتا ہے' اور قرآن حکیم میں یہ ایسے عہد کے لیے آیا ہے جس سے کسی کو امن مل رہا ہو' حفاظت اور امان حاصل ہو رہی ہو۔ سورۂ آل عمران (آیت ۱۱۲) میں یہود کے بارے میں ارشاد ہوا:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوٓا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ط

''یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلّت کی مار ہی پڑی' سوائے اس کے کہ کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں' ان پر محتاجی اور کم ہمتی مسلط کر دی گئی ہے۔''

گویا خود اپنے بل پر' اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر' خود مختاری کی اساس پر اُن کے لیے عزت کا معاملہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ یہ قرآن مجید کی پیشین گوئی ہے اور موجودہ ریاست اسرائیل اس کا واضح ثبوت ہے۔ امریکہ اگر ایک دن کے لیے بھی اپنی حفاظت ہٹا لے تو اسرائیل کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

قرآن مجید میں اہلِ ایمان سے فرمایا گیا ہے:﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ (آل عمران:۱۰۳) ''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو سب مل کر''۔ البتہ ''حبلُ اللہ'' کیا ہے؟ قرآن میں اس کی صراحت نہیں ہے۔ اور قرآن مجید میں جو بات پوری طرح واضح نہ ہو' مجمل ہو' اس کی تشریح اور تبیین رسول اللہ ﷺ کا فرضِ منصبی ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل:۴۴) ''اور ہم نے (اے نبیؐ) آپ کی طرف 'الذکر' نازل کیا' تاکہ جو چیز اُن کے لیے اتاری گئی ہے آپ اسے ان پر واضح کریں''۔ چنانچہ احادیث نبویؐ میں یہ صراحت موجود ہے کہ ''حبلُ اللہ'' قرآن مجید ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلَا وَاِنِّيْ تَارِكٌ فِيْكُمْ ثَقَلَيْنِ ' اَحَدُهُمَا كِتَابُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ......))

''آگاہ رہو! میں تمہارے مابین دو خزانے چھوڑے جا رہا ہوں' اُن میں سے ایک اللہ کی کتاب ہے' وہی حبلُ اللہ ہے......''

قرآن حکیم کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے' جس میں الفاظ آئے ہیں:((هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ)) ''یہ (قرآن) ہی اللہ کی مضبوط رسّی ہے''۔ یہ روایت سنن ترمذی اور سنن دارمی میں موجود ہے۔ مزید برآں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جو روایت رزین میں آئی ہے اس میں بھی یہی الفاظ ہیں:((هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ)) ''یہ (قرآن) ہی اللہ کی مضبوط رسی ہے''۔ سنن دارمی میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:((اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ حَبْلُ اللّٰهِ وَالنُّوْرُ الْمُبِيْنُ)) ''یقیناً یہ قرآن حبلُ اللہ اور نورِ مبین ہے''۔

قرآن کو ''رسّی'' کس اعتبار سے کہا گیا ہے' اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو بندہ اس رسّی کے ذریعے اللہ سے جڑتا ہے۔ یہ رسّی ہمیں اللہ سے جوڑنے والی ہے۔ ''تعلق مع اللہ'' اور ''تقرّب الی اللہ'' دونوں تصوّف کی اصطلاحیں ہیں۔ تعلق کے معنی ہیں لٹک

جانا۔ ''علق'' لٹکی ہوئی شے کو کہتے ہیں۔ ''تعلّق مع اللہ'' کا مفہوم ہو گا اللہ سے لٹک جانا' یعنی اللہ سے چمٹ جانا' اللہ کے ساتھ جڑ جانا۔ اسی طرح ''تقرّب الی اللہ'' کا مطلب ہے اللہ سے قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش کرنا۔ سلوک اور طریقت کا مقصد یہی ہے۔ تعلق مع اللہ میں اضافے اور تقرب الی اللہ کا مؤثر ترین اور سہل ترین ذریعہ قرآن حکیم ہے۔

اس اعتبار سے دو حدیثیں ملاحظہ کیجیے۔ ایک کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ حدیث کے الفاظ ہیں: ((اَلْقُرْآنُ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَاءِ اِلَی الْاَرْضِ)) ''یہ قرآن اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے''۔ یہی الفاظ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بھی روایت کیے گئے ہیں۔ یعنی اگر اللہ سے جڑنا ہے' اللہ سے تعلق قائم کرنا ہے تو اس قرآن کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو' اس سے تم اللہ سے جڑ جاؤ گے' اللہ کا قرب حاصل کر لو گے۔

دوسری معجم کبیر طبرانی کی بڑی پیاری روایت ہے۔ اس میں ان الفاظ میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرے سے برآمد ہوئے تو آپؐ نے مسجد کے گوشے میں دیکھا کہ کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن کا مذاکرہ کر رہے تھے' قرآن کو سمجھ اور سمجھا رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور بڑا پیارا سوال کیا: ((اَلَسْتُمْ تَشْهَدُوْنَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ؟)) ''کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا: ''بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰهِ!'' یعنی ''کیوں نہیں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم' ہم اس کے گواہ ہیں! اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((فَاسْتَبْشِرُوْا فَاِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ طَرَفُهٗ بِاَیْدِیْکُمْ وَطَرَفُهٗ بِیَدِ اللّٰهِ)) ''پس تم خوشیاں مناؤ' اس لیے کہ یہ قرآن وہ شے ہے جس کا ایک سرا تمہارے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔ ان احادیث مبارکہ سے ''حبل اللہ'' کا یہ تصور واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ جوڑنے والی شے ہے۔

ابھی ہم نے جس حدیث کا مطالعہ کیا اس میں قرآن حکیم کے لیے ''جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ'' کے الفاظ آئے ہیں' کہ یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ مستدرک حاکم اور مراسیل ابی داوٗد میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نقل ہوئی ہے: ((اِنَّکُمْ لَا تَرْجِعُوْنَ اِلَی اللّٰہِ بِشَیْءٍ اَفْضَلَ مِمَّا خَرَجَ مِنْہُ یَعْنِی الْقُرْآنَ)) یعنی تم لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کے یہاں تقرّب اس چیز سے بڑھ کر کسی اور چیز سے حاصل نہیں کر سکتے جو خود اُسی (اللہ تعالیٰ) سے نکلی ہے' یعنی قرآن مجید۔ درحقیقت قرآن چونکہ اللہ کا کلام ہے اور کلام متکلّم کی صفت ہوتا ہے' تو اس سے بڑھ کر قریب ہونے کا کوئی اور ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ جب کوئی شخص قرآن پڑھتا ہے تو گویا وہ اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ تبع تابعین کے دَور کی شخصیت ہیں۔ انہوں نے اپنا معمول بنا لیا تھا کہ سال میں چھ مہینے سرحدوں پر جہاد میں شریک ہوتے۔ اُس دَور میں دارالاسلام کی سرحدیں بڑھ رہی تھیں اور اس کے لیے جہاد جاری تھا۔ جبکہ چھ مہینے آپؒ گھر پر گزارتے اور اِس عرصے میں لوگوں سے ملنے جلنے سے حتی الامکان گریز کرتے۔ صرف نماز باجماعت کے لیے مسجد میں آتے' باقی وقت گھر پر ہی رہتے۔ کسی نے کہا کہ عبداللہ! آپ تنہائی پسند ہو گئے ہیں' تنہائی سے آپ کی طبیعت اکتاتی نہیں؟ انہوں نے فرمایا: ''کیا تم اُس شخص کو تنہا سمجھتے ہو جو اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض یاب ہوتا ہے؟'' لوگ حیران ہوئے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ جب اس کی وضاحت طلب کی گئی تو فرمایا کہ دیکھو جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو قرآن پڑھتا ہوں یا حدیث پڑھتا ہوں۔ جب قرآن پڑھتا ہوں تو اللہ سے ہم کلام ہوتا ہوں اور جب حدیث پڑھتا ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض یاب ہوتا ہوں۔ تم مجھے تنہا نہ سمجھو ؎

دیوانۂ چمن کی سیریں نہیں ہیں تنہا
عالم ہے اِن گلوں میں' پھولوں میں بستیاں ہیں!

مسند احمد' ترمذی' ابوداوٗد' نسائی' ابن ماجہ اور صحیح ابن حبان میں حضرت عبداللہ بن

عمرو ﷺ سے یہ حدیث نبویؐ منقول ہے:

((يُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ اقْرَأْ وَارْتَقِ وَرَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنْيَا فَإِنَّ مَنْزِلَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرَأُهَا))

''(قیامت کے دن) صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور (جنت کے درجات پر) چڑھتا جا' اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھتا تھا۔ پس تیرا مقام وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے۔''

لیکن واضح رہے کہ صاحبِ قرآن سے مراد صرف حافظ قرآن یا ہمارے ہاں پائے جانے والے قاری نہیں ہیں' بلکہ وہ حافظ اور قاری مراد ہیں جو قرآن کے علم وحکمت سے بھی واقف ہیں' اس کو پڑھتے بھی ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہیں۔ جنت میں اس قرآن کے ذریعے ان کے درجات میں ترقی ہوتی چلی جائے گی اور ان کا آخری مقام وہاں معین ہوگا جہاں ان کا سرمایۂ قرآن ختم ہوگا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ تقرب الی اللہ اور وصل الی اللہ کا مؤثر ترین ذریعہ قرآن حکیم ہی ہے۔ میں نے اسی لیے امام راغبؒ کے الفاظ کا حوالہ دیا تھا کہ ''حبل'' کا لفظ وصل کے لیے استعارۃً استعمال ہوتا ہے اور یہ ہر اُس شے کے لیے استعمال ہوگا جس کے ذریعے کسی شے کے ساتھ جڑا جائے۔ اس معنی میں حبلُ اللہ قرآن مجید ہے۔

اگر پیراشوٹ کی مثال سامنے رکھیں تو جملہ ایمانیات اس قرآن کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں جس طرح پیراشوٹ کی چھتری کی رسیاں نیچے آ کر ایک جگہ جڑ جاتی ہیں۔ جب پیراشوٹ کھلتا ہے تو اس کی چھتری کس قدر وسیع ہوتی ہے' لیکن اس کی ساری رسیاں ایک جگہ آ کر جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر ایمانیات کے جتنے بھی شعبے ہیں وہ سب کے سب قرآن کے ساتھ منسلک ہیں۔ چنانچہ قرآن پر یہ یقین مطلوب ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے' بلکہ اس کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میری روح کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ یہ کلام بھی ذاتِ باری تعالیٰ ہی سے صادر ہوا ہے اور میری روح بھی اللہ ہی کے امرِ کُن کا ظہور ہے۔ اس انداز سے قرآن پر یقین' اللہ تعالیٰ پر یقین اور قرآن لانے

والے محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر یقین مطلوب ہے۔ (''حقیقت ایمان'' کے موضوع پر میری پانچ تقاریر میں یہ مضمون آ چکا ہے)۔

ایک ایمان تو تقلیدی ہے‘ یعنی غیر شعوری ایمان‘ کہ ایک یقین کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے‘ چاہے وہ علیٰ وجہ البصیرت نہ ہو‘ اور وہ بھی بہت بڑی دولت ہے‘ لیکن اس سے کہیں زیادہ قیمتی ایمان وہ ہے جو علیٰ وجہ البصیرت ہو۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ﴾ (یوسف: ۱۰۸) ''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کہ یہ میرا راستہ ہے‘ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر اور جو میرے ساتھ ہیں (وہ بھی)''۔ علیٰ وجہ البصیرت ایمان یعنی شعوری ایمان‘ اکتسابی ایمان اور حقیقی ایمان کا واحد منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ مولانا ظفر علی خان بہت ہی سادہ الفاظ میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کر گئے ہیں: ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں!

عاقل یعنی غور و فکر کرنے والے اور سوچ بچار کرنے والے کے لیے ایمان کا منبع و سرچشمہ صرف قرآنِ حکیم ہے۔

قرآن حکیم کے ''حبل اللہ'' ہونے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اہلِ ایمان کو جوڑنے والی رسّی‘ ان کو باہم ایک دوسرے سے باندھ دینے والی شے‘ ان کو بنیانِ مرصوص بنانے والی چیز یہ قرآن ہے۔ اس لیے کہ قرآن حکیم میں جہاں اللہ کی رسّی کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کا حکم آیا ہے وہاں اس کے ساتھ ہی باہم متفرق ہونے سے روکا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ ''اور مضبوطی سے تھام لو اللہ کی رسّی کو سب مل جل کر اور تفرقہ مت ڈالو!'' اہل ایمان کو جوڑنے والی اور بنیانِ مرصوص بنانے والی رسی یہی قرآن حکیم ہے۔ اس لیے کہ انسانی اتحاد وہی مستحکم اور پائیدار ہو گا جو فکر و نظر کی ہم آہنگی کے ساتھ ہو۔ بہت سے اتحاد وقتی طور پر وجود میں آ جاتے ہیں۔ جیسے کچھ سیاسی مصلحتیں ہیں تو اتحاد قائم کر لیا‘ کوئی دنیاوی مفادات ہیں تو

ان کی بنا پر اتحاد قائم کر لیا۔ یہ اتحاد حقیقی نہیں ہوتے اور نہ ہی پائیدار اور مستحکم ہوتے ہیں۔ انسان حیوانِ عاقل ہے۔ یہ سوچتا ہے' غور کرتا ہے' اس کے نظریات ہیں' اس کے کچھ اہداف و مقاصد ہیں' کوئی نصب العین ہے۔ نظریات' مقاصد اور نصب العین کا بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ تو جب تک ان میں ہم آہنگی نہ ہو کوئی اتحاد پائیدار اور مستحکم نہیں ہو گا۔ اس اعتبار سے اللہ کی اس رسّی کو مضبوطی سے تھامو گے تو گویا دو رشتے قائم ہو گئے۔ ایک رشتہ اہل ایمان کا اللہ کے ساتھ اور ایک رشتہ اہل ایمان کا ایک دوسرے کے ساتھ۔ جیسے کُل شریعت کو تعبیر کیا جاتا ہے کہ شریعت نام ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا۔ اللہ کے ساتھ جوڑنے والی سب سے بڑی عبادت نماز ہے اور بندوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے والی شے زکوٰۃ ہے۔ اسی طرح حبل اللہ ایک طرف اہل ایمان کو اللہ سے جوڑ رہی ہے اور دوسری طرف اہل ایمان کو آپس میں جوڑ رہی ہے۔ یہ انہیں بنیانِ مرصوص اور ''کَجَسَدٍ وَّاحِدٍ'' بنا دینے والی شے ہے۔ یہی وہ بات ہے جسے علامہ اقبال نے انتہائی خوبصورتی سے کہا ہے: ؎

از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کُن کہ حبل اللہ اوست!

''وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملتِ اسلامی کے جسدِ ظاہری میں روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔ ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں' ہمارا قلبِ زندہ اور ہماری روحِ تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے۔ لہٰذا اے مسلمان! تو قرآن کو مضبوطی سے تھام لے کہ 'حبل اللہ' یہی ہے۔''

حبل اللہ کے بارے میں مفسّرین کے ہاں بہت سے اقوال ملتے ہیں کہ حبل اللہ سے مراد قرآن ہے' کلمہ طیبہ ہے' اسلام ہے۔ یہ ساری چیزیں اپنی جگہ پر درست ہیں لیکن احادیث نبویؐ کی روشنی میں اس کا مصداقِ کامل قرآن ہی ہے۔ اور پھر اس کی جس قدر عمدہ تعبیر علامہ اقبال نے کی ہے' یہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی میرے

نزدیک بہت عمدہ مقام ہے:

ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست!

نوٹ کیجیے کہ قرآن مجید میں ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ کے الفاظ کے بعد فرمایا گیا ہے: ﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾ (آل عمران:۱۰۳) ''اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو کہ جب تم باہم دشمن تھے' پھر اس نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا تو تم اُس کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے''۔ یہ قرآن مجید ہی ہے جو اہلِ ایمان کے دلوں کو جوڑتا اور ان کو باہم پیوست کرتا ہے' اور یہ دلی تعلق اور دلی ہم آہنگی ہی ہے جو مسلمانوں کو بنیانِ مرصوص بنانے والی شے ہے۔

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

تعارفِ قرآن کے ضمن میں جو کچھ میں نے عرض کیا ان سب باتوں کا جو عملی نتیجہ نکلنا چاہیے وہ کیا ہے؟ یعنی قرآن حکیم کے بارے میں مجھ پر اور آپ پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ اس کے اعتبار سے میں خاص طور پر اپنی کتاب ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ہماری تحریک رجوع الی القرآن کے لیے دو بنیادوں میں سے ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہماری اس تحریک کا آغاز ۱۹۶۵ء سے ہوا تھا۔ ابتدائی چھ سات سال تو میں تنہا تھا۔ نہ کوئی انجمن تھی' نہ کوئی ادارہ' نہ جماعت۔ پھر انجمن خدام القرآن قائم ہوئی' پھر ۱۹۷۶ء میں قرآن اکیڈمی کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ قرآن اکیڈمی کی تعمیرات مکمل ہونے کے بعد پھر اسی کے بطن سے قرآن کالج کی ولادت ہوئی' جس کے سر پر قرآن آڈیٹوریم کا تاج سجا ہوا ہے۔ اس پوری جدوجہد کی بنیاد اور اساس دو کتابچے ہیں: (۱) ''اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کرنے کا اصل کام''۔ یہ مضمون میں نے ۱۹۶۷ء میں میثاق کے اداریے کے طور پر لکھا تھا۔ (۲) ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے

حقوق‘‘۔ یہ کتابچہ میری دو تقریروں پر مشتمل ہے جو میں نے ۱۹۶۸ء میں کی تھیں۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ اُس زمانے میں جشن خیبر اور جشن مہران وغیرہ جیسے مختلف عنوانات سے جشن منائے جا رہے تھے‘ جن میں راگ رنگ کی محفلیں بھی ہوتی تھیں۔ صدر ایوب خان کا زمانہ تھا۔ اگرچہ شکست و ریخت کے آثار ظاہر ہو رہے تھے‘ لیکن ’’سب اچھا ہے‘‘ کے اظہار کے لیے یہ شاندار تقریبات منعقد کی جارہی تھیں۔ یہ گویا اُن کے دورِ حکومت کی آخری بھڑک تھی‘ جیسے بجھنے سے پہلے چراغ بھڑکتا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی نظم ’’ابلیس کی مجلس شوریٰ‘‘ میں ابلیس کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے: ع ’’مست رکھو ذکر وفکرِ صبح گاہی میں اسے!‘‘ لیکن اُن دنوں ذکر وفکر کی بجائے لوگوں کو راگ رنگ کی محفلوں میں مست رکھنے کا اہتمام ہو رہا تھا۔ اسی زمانے میں مذہبی لوگوں کو رشوت کے طور پر ’’جشنِ نزولِ قرآن‘‘ عطا کیا گیا کہ تم بھی جشن مناؤ اور اپنا ذوق وشوق پورا کرلو۔ چنانچہ چودہ سوسالہ ’’جشنِ نزولِ قرآن‘‘ کا انعقاد ہوا۔ اس کے ضمن میں قراءت کی بڑی بڑی محفلیں منعقد ہوئیں‘ جن میں پوری دنیا سے قراء حضرات شریک ہوئے۔ اسی سلسلے میں سونے کے تار سے قرآن لکھنے کا پروجیکٹ شروع ہوا۔

اُس وقت میرا ذہن منتقل ہوا کہ کیا قرآن حکیم کا ہم پر یہی حق ہے؟ کیا اپنے ان کاموں سے ہم قرآن مجید کا حق ادا کر رہے ہیں؟ چنانچہ میں نے مسجد خضراء سمن آباد میں اپنے دو خطاباتِ جمعہ میں مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق بیان کیے کہ ہر مسلمان پر حسبِ استعداد قرآن مجید کے پانچ حق عائد ہوتے ہیں:

۱) اسے مانے جیسا کہ ماننے کا حق ہے۔ (ایمان وتعظیم)

۲) اسے پڑھے جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ (تلاوت وترتیل)

۳) اسے سمجھے جیسا کہ سمجھنے کا حق ہے۔ (تذکّر وتدبّر)

۴) اس پر عمل کرے جیسا کہ عمل کرنے کا حق ہے۔ (حکم واقامت)

انفرادی زندگی میں حکم بالقرآن یہ ہے کہ ہماری ہر رائے اور ہر فیصلہ قرآن پر مبنی ہو۔ اور اجتماعی زندگی میں قرآن پر عمل کی صورت اقامت ما انزل من اللہ یعنی قرآن

کے عطا کردہ نظامِ عدل اجتماعی کو قائم کرنا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ (المائدۃ:٦٨)

''اے کتاب والو! تمہارا کوئی مقام نہیں جب تک کہ تم قائم نہ کرو تورات اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری جانب نازل کیا گیا ہے تمہارے ربّ کی طرف سے۔''

۵) قرآن کو دوسروں تک پہنچانا' اسے پھیلانا اور عام کرنا۔ (تبلیغ و تبیین)

ان پانچ عنوانات کے تحت الحمد للہ ثم الحمد للہ یہ بہت جامع کتابچہ مرتب ہوا اور بلامبالغہ یہ لاکھوں کی تعداد میں چھپا ہے۔ پھر انگریزی' عربی' فارسی' پشتو' تامل' ملیشیا کی زبان اور سندھی میں اس کے تراجم ہوئے۔ جو حضرات بھی ہماری اس تحریک رجوع الی القرآن سے کچھ دلچسپی رکھتے ہیں' میرے دروس میں شریک ہوتے ہیں یا ہمارے لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں میرا ناصحانہ مشورہ ہے کہ اس کتابچے کا مطالعہ ضرور کریں۔ یہ درحقیقت ''تعارفِ قرآن'' پر میرے خطابات کا لازمی نتیجہ اور ان کا ضروری تکملہ ہے۔

یہ بھی جان لیجیے کہ اگر ہم یہ حقوق ادا نہیں کرتے تو از روئے قرآن ہماری حیثیت کیا ہے۔ قرآن مجید کے حقوق کو ادا نہ کرنا قرآن کو ترک کر دینے کے مترادف ہے۔ سورۃ الفرقان میں محمد رسول اللہ ﷺ کی فریاد نقل ہوئی ہے:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝

''اور پیغمبر کہے گا کہ اے میرے ربّ! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔''

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس آیت کے ذیل میں حاشیہ میں لکھا ہے:

''آیت میں اگرچہ مذکور صرف کافروں کا ہے تاہم قرآن کی تصدیق نہ کرنا' اس میں تدبر نہ کرنا' اس پر عمل نہ کرنا' اس کی تلاوت نہ کرنا' اس کی تصحیح قراءت کی طرف توجہ نہ کرنا' اس سے اعراض کر کے دوسری لغویات یا حقیر چیزوں کی طرف متوجہ ہونا' یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجرانِ قرآن کے تحت میں داخل ہو سکتی ہیں۔''

بحیثیت مسلمان ہم پر قرآن مجید کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں' اگر انہیں ہم ادا نہیں کر رہے تو حضور ﷺ کے اس قول اور فریاد کا اطلاق ہم پر بھی ہو گا۔ گویا کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہمارے خلاف مدعی کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے۔

علامہ اقبال اسی آیت قرآنی کی طرف اپنے اس شعر میں اشارہ کرتے ہیں: ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی!

''(اے مسلمان!) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دُور اور بے تعلق ہو گیا ہے' لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے!''

قرآن مجید میں دو مقامات پر قرآن کے حقوق ادا نہ کرنے کو قرآن کی تکذیب قرار دیا گیا ہے۔ آپ لاکھ سمجھیں کہ آپ قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں' لیکن اگر آپ اس کے حقوق کی ادائیگی اپنی استعداد کے مطابق' اپنی امکانی حد تک نہیں کر رہے تو درحقیقت قرآن کو جھٹلا رہے ہیں۔ سابقہ اُمت مسلمہ یعنی یہود کے بارے میں سورۃ الجمعہ میں یہ الفاظ آئے ہیں:

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

''مثال ان لوگوں کی جو حاملِ تورات بنائے گئے' پھر انہوں نے اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا اُس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ بُری مثال ہے اُس قوم کی جس نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا۔ اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

ہمیں کانپنا چاہیے' لرزنا چاہیے کہ کہیں ہمارا شمار بھی انہی لوگوں میں نہ ہو جائے۔

اس ضمن میں دوسرا مقام سورۃ الواقعہ کے تیسرے رکوع کی ابتدائی آیات ہیں:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴿۷۶﴾ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ
كَرِيْمٌ ﴿۷۷﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ
تُكَذِّبُوْنَ ﴿۸۲﴾

''پس نہیں' میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے مواقع کی' اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے' کہ یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے' ایک محفوظ کتاب میں ثبت' جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔ یہ ربّ العالمین کا نازل کردہ ہے۔ پھر کیا اس کلام کے ساتھ تم بے اعتنائی برتتے ہو' اور اس نعمت میں اپنا حصہ تم نے یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو؟''

اس قرآن' اس عظمت والی کتاب' جو کتاب کریم ہے' کتاب مکنون ہے' کے بارے میں تمہاری یہ سستی' تمہاری یہ کسل مندی' تمہاری یہ ناقدری اور تمہارا یہ عملی تعطل کہ تم اسے جھٹلا رہے ہو! تم نے اپنا حصہ اور نصیب یہ بنا لیا ہے کہ تم اس کی تکذیب کر رہے ہو؟ تکذیب اس معنی میں بھی کہ قرآن کا انکار کیا جائے' اسے اللہ کا کلام نہ مانا جائے اور تکذیب عملی کے ضمن میں وہ چیز بھی اس کے تابع اور شامل ہو گی جو میں بیان کر چکا ہوں۔ یعنی حاملِ کتابِ الٰہی ہونے کے باوجود اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجام سے محفوظ رکھے کہ ہم بھی ایسے لوگوں میں شامل ہوں۔ ہم میں سے ہر شخص کو ان حقوق کے ادا کرنے کی اپنی امکانی حد تک بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○

عظمتِ قرآن

قرآن وحدیث کے آئینے میں

۱۲ر نومبر ۲۰۰۴ء کا خطاب جمعہ

عنوانات

رمضان المبارک کا دوگونہ پروگرام اور اس کا حاصل 249

❁ عظمت قرآن بزبان قرآن **251**

عظمت قرآن کی ایک تمثیل 252

افادیت قرآن کے چار پہلو 253

سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی چار آیات 254

کَلَّآ اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ 255

سورۃ الواقعہ کی آٹھ آیات 256

❁ عظمت قرآن' احادیث نبویؐ کے آئینے میں **259**

فتنوں سے بچاؤ کا راستہ 260

قرآن: ماضی' حال اور مستقبل کا آئینہ 262

فیصلہ کن کتاب 263

ہدایت کا سرچشمہ 265

اللہ کی مضبوط رسّی 266

قرآن: پُرحکمت ذکر 268

قرآن: صراطِ مستقیم 269

بے مثل و بے مثال کتاب 270

جواہر علم و حکمت کا لامتناہی خزانہ 271

جنّات کا قبولِ اسلام 272

حدیث کا کلائمکس 272

دعوت الی القرآن کا مدّعا 273

قرآن مجید کی عظمت و فضیلت (حدیث کا متن اور ترجمہ) **275**

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ الکریم ...... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرَّجیم۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (ص)

رمضان المبارک کا دوگونہ پروگرام اور اس کا حاصل

رمضان المبارک کے بارے میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کا اصل تحفہ قرآن حکیم ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا''۔ اس میں جو دو عبادات رکھی گئیں' ان میں سے ایک کو فرض قرار دیا گیا اور ایک کو اپنی مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔ رمضان میں دن کا روزہ فرض قرار دیا گیا' جبکہ اللہ تعالیٰ نے رات کا قیام بندے کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کی راتوں میں قیام اللیل کی بہت زیادہ ترغیب دلائی۔ چنانچہ احادیث میں دن کے روزے اور رات کے قیام کا ذکر بالکل متوازی طور پر ہوا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی متفق علیہ حدیث ہے:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ' وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ))

''جس نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ

اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے گئے' اور جس نے رمضان (کی راتوں) میں قیام کیا (قرآن سننے اور سنانے کے لیے) ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کے بھی تمام سابقہ گناہ معاف کر دیے گئے۔"

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَلصِّیَامُ وَالْقُرْآنُ یَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ ' یَقُوْلُ الصِّیَامُ : اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُہُ الطَّعَامَ وَالشَّھَوَاتِ بِالنَّھَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ ' وَیَقُوْلُ الْقُرْآنُ : مَنَعْتُہُ النَّوْمَ بِاللَّیْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ ' فَیُشَفَّعَانِ)) (رواہ احمد والطبرانی والبیھقی)

"روزہ اور قرآن بندے کے حق میں شفاعت کریں گے۔ روزہ کہے گا: پروردگار! میں نے تیرے اِس بندے کو دن کے وقت کھانے پینے سے اور اپنی خواہشاتِ نفس پوری کرنے سے روکے رکھا' تو میری شفاعت اس کے حق میں قبول فرما! قرآن کہے گا: پروردگار! میں نے تیرے اِس بندے کو رات کے وقت سونے سے روکے رکھا' تو اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما! پس دونوں کی شفاعت قبول کی جائے گی۔"

رات کو جاگنا درحقیقت جو مطلوب ہے وہ کم سے کم تہائی رات ہے۔ ورنہ آدھی رات یا دو تہائی رات قیام کیا جائے' جیسا کہ سورۃ المزمل کی ابتدائی آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا۔ لیکن یہ کام ہر شخص کے لیے ممکن نہیں ہے۔ مزدور اور کاشت کار جو دن بھر محنت کرتے ہیں' ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رات کا قیام فرض نہیں کیا گیا۔ البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں تراویح کا وہ نظام جاری کر دیا جو آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے' تاکہ ہر مسلمان اس مہینے میں قرآن میں سے گزر جائے۔ ان لوگوں کا تو معاملہ یہ تھا کہ ان کی اپنی زبان عربی تھی اور ان کے لیے قرآن کو سمجھنے کے لیے اس کا سننا ہی کافی تھا۔ وہ براہِ راست ان کے ذہن و قلب میں سرایت کر جاتا تھا۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۵ میں رمضان المبارک کے پورے پروگرام کا حاصل بایں الفاظ بیان کر دیا گیا:

﴿وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰىکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۝۱۸۵﴾ "اور تاکہ تم اللہ کی

بڑائی کرو اس بات پر کہ اس نے تمہیں ہدایت بخشی اور تاکہ شکر کرو''۔ یعنی قرآن جیسی نعمت جو ہم نے تمہیں عطا کی ہے اس کا شکر اسی مناسبت سے ادا کر سکو۔ میں نے بارہا مثال دی ہے کہ کسی بچے کے ہاتھ پر اگر ہیرا رکھ دیجیے تو اس کے اندر کوئی جذبۂ تشکر پیدا نہیں ہوگا۔ وہ تو سمجھے گا کہ یہ کانچ کا کوئی ٹکڑا ہے جو میرے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے' لیکن یہی ہیرا کسی جوہری کے ہاتھ پر رکھیے جسے اس کی قدر و قیمت معلوم ہے تو اس کے اندر سے جو جذباتِ تشکر ابلیں گے ان کا آپ تصور نہیں کر سکتے۔ تو جب آپ پر قرآن کی عظمت منکشف ہوگی تبھی آپ اس نعمت کا اتنا شکر ادا کر سکیں گے جتنا کہ اس کا حق ہے۔ رمضان المبارک کا دوگونہ پروگرام عظمتِ قرآن کے انکشاف کے لیے رکھا گیا کہ دن میں روزہ رکھو' تاکہ تمہیں کچھ تقویٰ کی پونجی حاصل ہو جائے ﴿لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ﴾ اور رات کو قرآن کے ساتھ کھڑے رہو' تاکہ قرآن مجید کی عظمت تم پر منکشف ہو اور اس کی عظمت کے انکشاف کے ساتھ تم اللہ کا شکر ادا کر سکو۔

عظمتِ قرآن' بزبانِ قرآن

عظمتِ قرآن کا مضمون خود قرآن مجید میں بہت مرتبہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی خود تعریف کی ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ہم انسانوں کے لیے تو برائی کا درجہ رکھتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کو زیب دیتی ہیں۔ جیسے تکبر بہت بڑی برائی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے بڑائی کو اپنی چادر اور عظمت کو اپنی اِزار قرار دیا ہے: ((اَلۡکِبۡرِیَاءُ رِدَائِیۡ وَالۡعَظَمَۃُ اِزَارِیۡ)) (ابوداوٗد' ابن ماجہ' مسند احمد)۔ اُس کا نام اَلۡمُتَکَبِّرُ ہے۔ یہ جامہ اُسی کو راست آتا ہے۔ اسی طرح ہم اپنی کسی بات کی تعریف کریں تو یہ اچھی بات محسوس نہیں ہوگی۔ لیکن اللہ تعالیٰ خود اپنے کلام کی عظمت بیان کرتا ہے اور خود اِس کی تعریف کرتا ہے۔ قرآن مجید کے وہ بے شمار مقامات جن میں اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید کی عظمت بیان کی ہے' ان میں سے پانچ مقامات میرے سامنے ایک عجیب ترتیب سے آئے ہیں' جسے میں نے بارہا بیان بھی کیا ہے۔ اس وقت وہ میرا اصل موضوع نہیں ہے' صرف انہیں

گنوا دینا کافی ہے۔ پہلے ایک آیت' پھر دو آیتیں' پھر چار آیتیں' پھر چھ آیتیں اور پھر آٹھ آیتیں' اور ہر مقام کا اپنا ایک خاص مضمون ہے۔

عظمتِ قرآن کی ایک تمثیل

عظمتِ قرآن فی نفسہٖ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ یہ اللہ کا کلام ہے اور کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن اللہ کی صفت ہے اور ہم اس کی عظمت کما حقہٗ نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن سورۃ الحشر میں فرمایا کہ ایک مثال سے ہم تمہیں کچھ تھوڑا سا تصور دے سکتے ہیں:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اگر ہم نے اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اُتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کی خشیت سے۔ اور یہ مثالیں ہم بیان کرتے ہیں لوگوں کے لیے تاکہ وہ غور وفکر کریں۔''

اور پہاڑ کے پھٹ جانے کا واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔ حضرت موسیٰؑ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ مکالمہ پردے کی اوٹ سے ﴿مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾ ہو رہا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ مجھے دیدار بھی حاصل ہو جائے۔ عرض کیا: ﴿رَبِّ اَرِنِيْۤ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ﴾ ''پروردگار! مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں''۔ فرمایا: ﴿لَنْ تَرٰىنِيْ﴾ ''تم مجھے نہیں دیکھ سکتے'' ﴿وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ﴾ ''لیکن اس پہاڑ پر نظر جماؤ' (میں اس پر اپنی ایک تجلّی ڈالوں گا) پس اگر وہ (اسے برداشت کر جائے اور) اپنی جگہ پر قائم رہ جائے تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے''۔ ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ﴾ (الاعراف: ۱۴۳) ''چنانچہ جب اُس کے ربّ نے پہاڑ پر تجلّی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰؑ غش کھا کر گر پڑے''۔ یہ بالواسطہ مشاہدہ تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے پہاڑ پر اللہ کی تجلّی کا مشاہدہ کیا' لیکن اس کی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اس سے ذرا عظمتِ قرآن کا اندازہ کیجیے۔ قرآن اللہ تعالیٰ کی صفت ہے' اور جو اللہ کی ذات

کی تجلی کا اثر ہے وہی اللہ کی صفت کی تجلی کا اثر ہے۔

افادیتِ قرآن کے چار پہلو

سورۃ الحشر کی ایک آیت کے بعد اب سورۂ یونس کی دو آیتیں ملاحظہ کیجیے۔ دیکھئے ایک ہے کسی شے کا اپنی جگہ عظیم ہونا اور ایک ہے اُس کی افادیت۔ تاج محل اپنی جگہ بڑا عظیم ہے' لیکن مجھے اس سے کیا فائدہ ہوا؟ تو قرآن کی عظمت فی نفسہٖ کیا ہے' اس کا بیان تو سورۃ الحشر کی آیت میں آ گیا' جبکہ اس کی افادیت کیا ہے' اسے سورۂ یونس کی دو آیات میں بیان کر دیا گیا۔ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۝ (یونس)

''اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو نصیحت ہے اور دلوں میں جو روگ ہیں ان کے لیے شفا ہے اور رہنمائی کرنے والی ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔ (آپؐ) کہہ دیجیے کہ بس لوگوں کو اللہ کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہیے۔ وہ اس سے بدرجہا بہتر ہے جس کو وہ جمع کر رہے ہیں''۔

یہ قرآن تمہارے ربّ کی طرف سے مَوْعِظَة یعنی نصیحت ہے' جس سے دل نرم ہو جائیں گے۔ جب دل نرم ہو جائیں گے تو یہ قرآن ان میں جذب ہو جائے گا' اس طرح ساری باطنی بیماریوں کا علاج ہو جائے گا۔ تکبر' حسد' حبّ دنیا' حبِ مال' حبِ جاہ اور حبِ شہرت کا علاج ہو جائے گا۔ پھر یہ ہدایت ہے۔ یہ تمہیں رستہ بتائے گا کہ تمہیں کدھر جانا ہے' کدھر نہیں جانا۔ اور آخرت میں رحمت ہے۔ یہ قرآن کی چار افادیتیں ہیں۔ پھر فرمایا کہ یہ قرآن اللہ کی رحمت اور اس کے فضل کا مظہر ہے جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے۔ تو خوشیاں منانی ہوں تو اس کی مناؤ! اور جان لو کہ جو کچھ تم دنیا میں جمع کرتے ہو' ان سب چیزوں سے کہیں بڑھ کر قیمتی چیز یہ قرآن ہے۔

سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی چار آیات

آگے چلیے۔سورۃ الرحمٰن کی پہلی چار آیات ملاحظہ کیجیے۔ان چار آیتوں میں چار چوٹی کی چیزیں بیان کی گئی ہیں۔﴿اَلرَّحْمٰنُ ①﴾ یہ اللہ کے ناموں میں سب سے پیارا نام ہے۔عرب اس نام سے واقف نہیں تھے۔سورۃ الفرقان کی آیت ۶۰ میں فرمایا گیا: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ﴾ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ سجدہ کرو رحمٰن کو تو کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہوتا ہے؟'' اللہ کو تو وہ جانتے تھے' اسم ''اللہ'' ان کے ہاں ہمیشہ سے چلا آ رہا تھا' لیکن ''رحمٰن'' سے ناواقف تھے۔اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے جس کی ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ اللہ کی رحمت ہے اور ''رحمٰن'' میں وہ رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح ظاہر ہوتی ہے' جس میں جوش اور ہیجان ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سب سے پیارا نام رحمٰن ہے۔آگے فرمایا: ﴿عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ②﴾ ''سکھلایا قرآن''۔سارے علوم اللہ ہی نے سکھائے ہیں' چاہے مادّی علوم ہوں چاہے روحانی علوم ہوں' لیکن تمام علوم میں چوٹی کا علم قرآن کا علم ہے جو اللہ کی رحمانیت کا مظہر اتم ہے۔اگلی آیت میں فرمایا: ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ ③﴾ ''پیدا کیا انسان کو''۔اللہ تعالیٰ نے ہی تمام مخلوقات کو پیدا کیا۔جنوں کو بھی اسی نے پیدا کیا' فرشتوں کو بھی اسی نے پیدا کیا۔آسمان بنایا' زمین بنائی' پہاڑ بنائے' سورج' چاند' ستارے بنائے۔کیا نہیں بنایا؟ لیکن جو کچھ اس نے بنایا ہے اس میں چوٹی کی مخلوق انسان ہے جو مسجودِ ملائک ہے' خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔آگے فرمایا: ﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ④﴾ ''اسے بیان کی صلاحیت دی''۔تو کیا دیکھنے کی صلاحیت نہیں دی؟ سننے کی صلاحیت نہیں دی؟ ظاہر ہے انسان کو تمام صلاحیتیں اللہ تعالیٰ ہی نے عطا کی ہیں' لیکن انسان کی سب سے اونچی صلاحیت قوتِ بیان ہے۔اسی لیے انسان کو حیوانِ ناطق کہتے ہیں۔تو ان چار آیات میں چوٹی کی چار چیزیں بیان کر دی گئیں۔

اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ جو سب سے اونچی صلاحیت ہے یعنی بیان' اس کو سب سے اونچے علم ''قرآن'' پر صرف کرو۔قرآن کو بیان کرو' قرآن کو عام کرو' قرآن کو پھیلاؤ۔

یہ نتیجہ حضورﷺ نے ایک حدیث میں بیان کر دیا: عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ)) ''حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور اسے سکھائیں''۔ خود قرآن پڑھیں اور دوسروں کو پڑھائیں۔ یہ قرآن کی اس نعمت کو عام کرنے کے لیے تشویق وترغیب کا انتہائی خوبصورت انداز ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سب سے پیارا نام ''رحمٰن'' —— اس نے جو علم انسان کو دیے اس میں چوٹی کا علم ''قرآن'' —— اس نے جو کچھ بنایا ہے اس میں چوٹی کی تخلیق ''انسان'' —— انسان کو جو صلاحیتیں دی ہیں ان میں چوٹی کی صلاحیت ''بیان''۔ تو جیسے ہم کہتے ہیں توپ سے مکھی نہیں ماری جاتی' توپیں کسی اور کام کے لیے بنتی ہیں' اسی طرح تم اس قوتِ بیان کو دنیاوی چیزوں کے لیے صرف نہ کرو۔ دنیا کی چیزوں کی اللہ کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں۔ ساری دنیا میں جو کچھ ہے وہ اللہ کے نزدیک مچھر کے ایک پر کے برابر بھی نہیں۔ اسی قوتِ بیان کے زور پر ایک شخص عوامی مقرر اور لیڈر بن جاتا ہے' کوئی ڈکٹیٹر بن جاتا ہے' ہٹلر بن جاتا ہے' بھٹو بن جاتا ہے۔ اسی قوتِ بیان سے ایک وکیل ایک ایک پیشی کے پانچ پانچ لاکھ روپے لے لیتا ہے۔ حالانکہ وہی قانون ان وکیلوں نے بھی پڑھ رکھا ہوتا ہے جو بے چارے جوتیاں چٹخارتے پھر رہے ہوتے ہیں اور انہیں کوئی اپنا وکیل نہیں کرتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ سرٹیفکیٹ attest کر کے تھوڑے سے پیسے کما لیتے ہیں۔ وہی قانون اے کے بروہی اور ایس ایم ظفر نے پڑھا ہے اور اپنی قوتِ بیان کے بل بوتے پر ایک مقام حاصل کیا ہے۔ تو اِس قوتِ بیان کا اصل مصرف یہ ہے کہ اسے قرآن کے لیے استعمال کیا جائے۔

کَلَّآ اِنَّھَا تَذْکِرَۃ

سورۃ الرحمٰن کی چار آیات کے بعد اب ملاحظہ کیجیے سورۂ عبس کی چھ آیات۔ فرمایا:

کَلَّآ اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ ﴿۱۱﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَہٗ ﴿۱۲﴾ فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَۃٍ مُّطَھَّرَۃٍ ﴿۱۴﴾ بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ ﴿۱۵﴾ کِرَامٍ بَرَرَۃٍ ﴿۱۶﴾

''یوں نہیں! یہ قرآن تو ایک نصیحت اور یاددہانی ہے۔ جو چاہے اس سے یاددہانی حاصل کر لے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو بہت پُرعظمت ہیں۔ بہت بلند مقام کے حامل' نہایت پاکیزہ ہیں۔ ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں جو لائق تکریم اور پاک باز ہیں۔''

پہلی دو آیات میں فرمایا کہ آگاہ ہو جاؤ' یہ قرآن تذکرہ ہے' یاددہانی ہے۔ جو چاہے اس سے یاددہانی حاصل کرے۔ یہ بہت اہم مضمون ہے۔ قرآن جس چیز کی طرف تمہیں بلا رہا ہے وہ تمہارے دل کے اندر موجود ہے۔ تم دنیا میں گم ہو گئے ہو اس لیے تمہیں پتا ہی نہیں کہ تمہارے پاس کتنا قیمتی ہیرا ہے۔ ہندی کا ایک بڑا پیارا دوہا ہے ؎

بھیکؔا بھوکا کوئی نہیں' سب کی گدڑی لال
گرہ کھول جانے نہیں اس بدیے کنگال

یعنی ''اے بھیکؔ (شاعر کا نام) بھوکا اور محروم کوئی انسان بھی نہیں ہے' ہر انسان کی گدڑی کے اندر لعل موجود ہے' لیکن جو گرہ لگی ہوئی ہے وہ کھولی نہیں جا سکتی' اس لیے کنگال بن گئے ہیں۔'' پس تمہارے اندر تو سب کچھ ہے' لیکن ذہول ہے' توجہ نہیں ہے۔ یہ قرآن یاددہانی ہے۔ قرآن حکیم کے لیے خود قرآن میں الذّکر' ذکریٰ اور تذکرہ جیسے الفاظ آئے ہیں۔ فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ۝۴۵﴾ (قٓ) ''پس آپ قرآن کے ذریعے اسے یاددہانی کرائیں جو میری تنبیہہ سے ڈرے''۔ ایسے مقامات پر تعلیم کے بجائے تذکیر کا لفظ آتا ہے۔

اور یہ قرآن کتنی عظمت والا ہے؟ یہ لوحِ محفوظ میں ان صحیفوں میں درج ہے جو بہت محترم' باعزت اور پُرعظمت ہیں' بہت بلند مقام پر ہیں' نہایت پاک ہیں' ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں جو بہت ہی لائق تکریم اور پاک باز ہیں۔ یعنی یہ قرآن لوحِ محفوظ میں عالی مرتبت فرشتوں کے ہاتھوں میں ہے۔

سورۃ الواقعہ کی آٹھ آیات

اس کے بعد سورۃ الواقعہ کی آٹھ آیات کا مطالعہ کر لیجیے:

فَلَآ أُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝

''پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے ڈوبنے کے مقام کی' اور اگر تمہیں علم ہو تو یہ بہت بڑی قسم ہے' کہ یہ بڑی عزت والا قرآن ہے۔ ایک محفوظ کتاب میں ثبت ہے' جسے نہایت پاک مخلوق (فرشتوں) کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔ یہ ربّ العالمین کا نازل کردہ ہے۔ پھر کیا اس کلام کے ساتھ تم بے اعتنائی برتتے ہو' اور اس نعمت میں اپنا حصہ تم نے یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو؟''

ان آیات کا آغاز ایک بہت بڑی قسم سے ہوا۔ فرمایا: ''میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے ڈوبنے کے مقام کی۔ اور یہ قسم بہت بڑی ہے اگر تمہیں معلوم ہوتا''۔ تمہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ یہ کتنی بڑی قسم ہے۔ یہ تو وقت آئے گا تو پتا چلے گا۔ چنانچہ آج نزولِ قرآن کے چودہ سو سال بعد ہمارے علم میں آیا ہے کہ اس کائنات میں بلیک ہولز ہیں' جو ستاروں کے سکڑ کر ختم ہو جانے کے نشانات ہیں۔ گویا ستارے ڈوب رہے ہیں' ان کی موت واقع ہو رہی ہے۔ کائنات میں کہیں ایک خلا پیدا ہوتا ہے۔ اس خلا کے اندر جو ویکیوم ہے اس میں کھینچنے کی اتنی طاقت ہے کہ جو ستارہ اس کے قریب سے گزر جائے اسے کھینچ کر اس قبر میں دفن کر دیتا ہے۔ یہ ہے وہ جگہ جہاں ستارے ڈوبتے ہیں۔ فرمایا اگر تم جانتے تو یہ بہت بڑی قسم ہے جو ہم نے کھائی ہے۔ اور یہ عظیم قسم اس بات پر کھائی جا رہی ہے کہ یقیناً یہ بہت باعزت قرآن ایک چھپی ہوئی محفوظ کتاب میں درج ہے' جسے کوئی چھو ہی نہیں سکتا' مگر نہایت پاک مخلوق یعنی فرشتے۔ یہ ربّ العالمین کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ لوحِ محفوظ سے اس کی تنزیل ہو رہی ہے محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر۔ وہاں سے تھوڑا تھوڑا کر کے جو یہ نازل ہو رہا ہے' یہ اللہ ربّ العالمین کی طرف سے ہے۔

اس کے بعد ڈانٹ کا انداز ہے: ﴿اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝﴾ ''پھر کیا اس کلام سے تم لاپرواہی برت رہے ہو؟'' اور سہل انگاری کر رہے ہو؟ تم نے انگریزی

پڑھ لی' دنیا کی دوسری زبانیں سیکھ لیں' لیکن اتنی عربی نہیں پڑھی کہ ہمارے کلام کو سمجھ سکو۔ ڈاکٹری پڑھ لی اور اس میں بیس سال لگا دیے۔ انجینئرنگ میں اٹھارہ سال لگا دیے' لیکن اتنا وقت نہ نکال سکے کہ عربی پڑھتے اور قرآن کو براہِ راست اپنے قلب کے اندر اتارتے؟ ﴿وَتَجۡعَلُوۡنَ رِزۡقَكُمۡ اَنَّكُمۡ تُكَذِّبُوۡنَ﴿۸۲﴾﴾ ''اور اپنا حصہ تم نے بس یہی رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے پھرو؟'' قرآن کے ساتھ تمہاری بے اعتنائی کا یہ طرزِ عمل اس کی تکذیب کے مترادف ہے۔ اگر تم اسے اللہ کا کلام مانتے تو یہ بے اعتنائی اور یہ بے توجہی ہو سکتی تھی؟ قطعاً نہیں!

عظمتِ قرآن کے ضمن میں مَیں نے پانچ مقامات آپ کو گنوائے ہیں' جن کے درمیان بڑی حسین ترتیب بن گئی ہے ـــــ پہلے ایک آیت' پھر دو آیتیں' پھر چار آیتیں' پھر چھ آیتیں اور پھر آٹھ آیتیں۔ پہلی آیت میں اللہ کے کلام کی عظمت بیان ہوئی ہے جیسے کہ وہ ہے۔ دوسرے مقام پر قرآن کی عظمت اس کے افادے کے لحاظ سے بیان ہوئی ہے۔ تیسرے مقام میں اس کو عام کرنے کی ترغیب وتشویق ہے۔ چوتھے مقام میں کہا گیا ہے کہ یہ اصل میں تذکرہ اور یاددہانی ہے' کوئی نئی شے نہیں ہے' تمہاری فطرت میں ہدایت موجود ہے' جسے وہاں سے یہ قرآن نکال کر تمہارے سامنے لاتا ہے۔ اور پھر پانچویں مقام پر فرمایا گیا کہ یہ کتابِ مکنون میں ثبت ہے' جہاں اسے کوئی چھو ہی نہیں سکتا سوائے فرشتوں کے جو نہایت پاک باز اور مطہر ہیں۔ اس آیت سے ضمنی طور پر یہ فقہی مسئلہ بھی نکالا گیا ہے کہ آپ قرآن کو ہاتھ نہیں لگا سکتے اگر آپ باوضو نہ ہوں۔

﴿لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الۡمُطَهَّرُوۡنَ﴿۷۹﴾﴾ کا ایک تیسرا مطلب بھی ہے۔ دیکھئے' ایک ہے اِس قرآن کا گودا اور مغز' جبکہ ایک اس کا چھلکا ہے۔ متذکرہ بالا الفاظِ قرآنی سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ جن لوگوں کا اندر پاک نہیں ہو چکا' جن لوگوں کا تزکیۂ نفس نہیں ہو چکا' وہ اس کے چھلکے ہی کے ساتھ کھیلتے رہیں گے' اس کے مغز تک اُن کی رسائی نہیں ہو گی' چاہے وہ کہنے کو مفسّر بن جائیں' جلدیں کی جلدیں لکھ دیں۔ غلام احمد پرویز نے ''مفہوم

القرآن'' لکھ دی' غلام احمد قادیانی آنجہانی کے بیٹے نے تفسیر کبیر بھی لکھی تفسیر صغیر بھی' لیکن قرآن کے مغز تک اِن حضرات کی رسائی نہیں ہوئی۔ مولانا روم نے یہ بات اپنے ایک شعر میں بیان کی ہے' اگرچہ انداز خاصا قابلِ اعتراض ہے کہ ؎

ما ز قرآں مغزہا برداشتیم
اُستخواں پیشِ سگاں انداختیم

عظمتِ قرآن' احادیثِ نبویؐ کے آئینے میں

میری آج کی گفتگو کا موضوع ''عظمتِ قرآن بلسانِ نبوت'' ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے قرآن کی عظمت کو کس طرح بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں ایک حدیث تو میں بیان کر چکا ہوں:

((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ))

''تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور اسے سکھائے''۔

یہ حدیث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور صحیح بخاری کی ہے۔

دوسری حدیث جو میں آپ کو سنا رہا ہوں یہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور مسلم شریف کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ))

''اللہ تعالیٰ اسی کتاب کے ذریعے سے کچھ قوموں کو بامِ عروج تک پہنچائے گا اور اسی کو ترک کرنے کے باعث کچھ کو ذلیل وخوار کر دے گا''۔

اس حدیث کو جس قدر اہمیت علامہ اقبال نے دی ہے میرے علم کی حد تک کسی اور نے نہیں دی۔ اس حدیث کا مفہوم اقبال اپنے شعر میں یوں بیان کرتے ہیں ؎

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

کہ وہ ایک ہاتھ میں قرآن اور ایک ہاتھ میں تلوار لے کر نکلے تھے اور دنیا پر چھا گئے تھے' اور تم اسی قرآن کو چھوڑ کر ذلیل و رسوا ہو گئے ہو! اور اسی مضمون کو علامہ نے فارسی میں کس قدر خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔

خوار از مہجوری قرآں شدی
شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی!

کہ اے اُمتِ مسلمہ! تو قرآن کو ترک کرنے کے باعث ذلیل و خوار ہوئی ہے' لیکن تو گردشِ دوراں کا شکوہ کر رہی ہے اور اپنے زوال کا سبب ''فلک کج رفتار'' کو قرار دے رہی ہے' حالانکہ فلک تو کسی قوم کی قسمت نہیں بدلتا۔ اپنی ذلت و رسوائی کے ذمہ دار تم خود ہو۔

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

اے وہ اُمت جو شبنم کی طرح زمین پر پامال پڑی ہوئی ہے اور لوگ تجھے اپنے پاؤں تلے روند رہے ہیں' اگر اب بھی تم بلندی چاہتے ہو تو جان لو کہ تمہاری بغل میں ایک زندہ کتاب (قرآن مجید) موجود ہے۔

فتنوں سے بچاؤ کا راستہ

اب جو حدیث میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں یہ کلامِ نبوت کی فصاحت و بلاغت اور عذوبت کا ایک نادر نمونہ ہے۔ کلام کی فصاحت یہ ہوتی ہے کہ کلام واضح ہو' سمجھ میں آ جائے' اس میں کوئی اینچ پینچ نہ ہو' پہیلیاں بجھوانے کا انداز نہ ہو۔ کلام کی بلاغت یہ ہے کہ وہ قلب و ذہن تک پہنچ جائے' ذہن اور دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ اور عذوبت سے مراد کلام کی مٹھاس اور شیرینی ہے۔ تو فصاحت' بلاغت اور عذوبت' ان تینوں اعتبارات سے رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے مجموعے میں اس حدیث کا بہت اونچا مقام ہے۔

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ :اِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے

ہوئے سنا": ((اِنَّھَا سَتَکُوْنُ فِتْنَۃٌ)) "عنقریب ایک بہت بڑا فتنہ رونما ہو گا"۔ آنحضور ﷺ نے جس فتنے کی پیشین گوئی فرمائی تھی وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری عہد میں رونما ہوا۔ یہ فتنہ ایک بدمعاش یہودی عبداللہ بن سبا کا اٹھایا ہوا تھا' جس میں حضرت عثمانؓ شہید ہوئے۔ اس کے بعد مسلسل چار سال تک جنگ ہوتی رہی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پورا دورِ خلافت خانہ جنگی اور فتنے کی نذر ہو گیا۔ جنگ جمل' جنگ صفین اور جنگ نہروان میں تقریباً ایک لاکھ مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں' نیزوں اور تیروں سے قتل ہوئے۔ اس کے علاوہ اسلام جو پوری دنیا میں پھیلتا جا رہا تھا' اس کی نشأۃِ اولیٰ کا سیلاب کسی کے روکے نہ رکتا تھا —— ع "تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا" —— وہ سیلِ رواں اندر کے فتنے اور خانہ جنگی نے روک دیا اور یہ معاملہ رجعتِ قہقری کا شکار ہو گیا۔ اس پر ایک مصری مصنف نے "الفتنة الكبرى" کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ عظیم ترین فتنہ ہے جو تاریخِ اسلامی میں ہوا ہے۔ حضور ﷺ نے اس کی خبر ان الفاظ میں دی: ((اِنَّھَا سَتَکُوْنُ فِتْنَۃٌ))۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: قُلْتُ: مَا الْمَخْرَجُ مِنْھَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ؟ "میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! اس سے نکلنے کا راستہ کون سا ہو گا"؟ "مَخْرَج" نکلنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بڑے بڑے ہالز میں باہر نکلنے کے راستوں پر سرخ لائٹ کے ساتھ "EXIT" لکھا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اگر کوئی دھماکہ ہو جائے یا آگ لگ جائے یا کوئی اور ایمرجنسی کی صورت پیش آ جائے تو ہال میں موجود لوگ اپنی جانیں بچانے کے لیے ان راستوں کی طرف بھاگیں۔ عرب ممالک میں EXIT کی جگہ "مَخْرَج" لکھا ہوتا ہے۔ لسانِ نبوتؐ سے فتنے کی خبر سنتے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے بچاؤ کے لیے مَخْرَج کا پوچھا کہ اس فتنے سے نکلنے کا راستہ کون سا ہو گا؟ اس میں جو بات میرے اور آپ کے لیے قابلِ غور ہے وہ ہمارے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل کا بنیادی فرق ہے۔ اگر ہم وہاں ہوتے تو پوچھتے حضور ﷺ! یہ فتنہ کیا ہو گا؟ کیسے ہو گا؟ کب آئے گا؟ کدھر سے آئے گا؟ کیوں آئے گا؟ حالانکہ ان

سب سوالات کا عملی فائدہ کیا ہے؟ یہ تو سب معلومات ہیں۔ حضرت علیؓ نے بڑا عملی سوال پوچھا کہ اس سے بچ نکلنے کا راستہ کیا ہوگا؟ رسول اللہ ﷺ نے اس کا جو جواب ارشاد فرمایا اس پر توجہ کیجیے۔ قَالَ: ((كِتَابُ اللّٰهِ)) آپؐ نے فرمایا: ''اللہ کی کتاب!'' فتنوں سے نکالنے والی شے اللہ کی کتاب ہوگی!

جنگ صفین میں جب حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کی تجویز کے تحت قرآن نیزے پر اٹھا دیا گیا کہ لڑنے جھگڑنے کا فائدہ نہیں ہے' یہ قرآن ہمارے مابین فیصلہ کرے گا' تو حضرت علیؓ جنگ بندی پر تیار ہو گئے۔ حالانکہ آپؓ کے ساتھیوں میں سے بڑی تعداد نے کہا کہ علیؓ دھوکہ کھا گئے۔ بلکہ خوارج نے تو (معاذ اللہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر اور واجب القتل قرار دے دیا لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ قرآن کو حَکَم کیسے نہ مانتے؟ انہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ فتنے سے نکلنے کا راستہ قرآن ہے۔ میاں بیوی میں چپقلش اِس حد تک بڑھ جائے کہ تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو قرآن کی ہدایت یہ ہے کہ: ﴿فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا﴾ (النساء: ۳۵) یعنی ایک حَکَم مَرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک حَکَم عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کیا جائے۔ چنانچہ حضرت علی اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) دونوں نے اپنی اپنی جانب سے ایک ایک حَکَم مقرر کر دیا۔ حضرت علیؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاویہؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو حَکَم مقرر کیا۔ بعض لوگ اسے حضرت علیؓ کی سیاسی غلطی کہتے ہیں لیکن حضرت علیؓ کے پیشِ نظر یہ حدیث ہوگی کہ فتنے سے نکلنے کا راستہ قرآن ہے۔

قرآن: ماضی' حال اور مستقبل کا آئینہ

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے قرآن کی مدح جس انداز میں بیان فرمائی ہے یہ کلامِ نبویؐ کی فصاحت و بلاغت اور عذوبت کی بہترین مثال ہے۔ فرمایا: ((فِيْهِ نَبَاُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ)) ''اس قرآن میں خبریں ہیں ان کی جو تم سے پہلے گزر گئے (یعنی قومِ نوحؑ' قومِ عاد' قومِ ثمود' قومِ شعیبؑ' آلِ فرعون) اور اس میں

خبر ہے تم سے بعد والوں کی بھی' اور تمہارے مابین جو اختلافات ہو جائیں ان کا فیصلہ بھی اس کے اندر ہے''۔ ((وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ)) کے حوالے سے میں قرآن مجید کے تین مقامات سے دس آیتیں بارہا بیان کر چکا ہوں جو آج کے پاکستان کا نقشہ کھینچ رہی ہیں۔ قرآن میں پاکستان کا ذکر موجود ہے۔ پاکستان کیسے بنا' اس کا بھی ذکر ہے۔ پھر پاکستان حاصل کر کے ہم نے بحیثیت قوم کیا وطیرہ اختیار کیا' اس کا بھی ذکر ہے' اور اب اس کا کیسا انجام ہونے والا ہے' اس کا بھی ذکر ہے۔ سورۃ الانبیاء میں الفاظ آئے ہیں: ﴿لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ⑩﴾ ''(لوگو!) ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ذکر ہے' کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟''

فیصلہ کن کتاب

آگے فرمایا: ((هُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ)) ''یہ قرآن ایک فیصلہ کن کتاب ہے' یاوہ گوئی نہیں ہے''۔ یہ شاعروں کی شاعری نہیں ہے۔ یہ تو قوموں کے عروج و زوال کے فیصلے کرنے والی کتاب ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ والی روایت کے مطابق اب قوموں کی تقدیر کے فیصلے اس قرآن سے ہوں گے۔ اگر کوئی قوم ابھرے گی تو قرآن لے کر ابھرے گی اور گرے گی تو قرآن کو چھوڑنے کی وجہ سے گرے گی۔ یہاں آپ کسی مغالطے کا شکار نہ ہو جائیں' مغرب (West) ابھرا ہے تو وہ بھی قرآن کی وجہ سے ابھرا ہے۔ نوٹ کر لیجیے' اقبال نے یہ کہا ہے:

"The inner core of the Western Civilization is Quranic."

''مغربی تہذیب کا باطن قرآنی ہے۔''

قرآن نے انسان کو توہمات سے نجات دلائی ہے۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ آنکھوں سے کام لو' کانوں سے کام لو' دیکھو' مشاہدہ کرو۔

کھول آنکھ' زمیں دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ!
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

یہ بات مستشرقین بھی تسلیم کرتے ہیں اور مغربی مفکرین بھی کہ حقیقتاً دنیا میں توہمات کو ختم

کرنے والی اور انسان کے عمل کو علم کی بنیاد پر استوار کرنے والی کتاب قرآن مجید ہے۔ اسلام سے قبل علم کی بنیاد ارسطو کی استخراجی منطق (deductive logic) پر تھی۔ اسی سے گتھیوں پر گتھیاں بن بھی رہی تھیں اور سلجھ بھی رہی تھیں' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سلجھتی کم' الجھتی زیادہ تھیں۔ اسلام نے آ کر انسان کو منطق کی اس تنگ نائے سے نکالا اور اسے استقراء (induction) کی طرف متوجہ کیا کہ اللہ نے تمہیں سماعت دی ہے تاکہ سنو' بصارت دی ہے تاکہ دیکھو' تمہیں تفکر و تعقل کی استعداد دی ہے تاکہ غور و فکر اور سوچ بچار کرو۔ تمہیں استنباط' استدلال اور استنتاج کی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں۔ یہ روحِ عصر ہے اور اس روحِ عصر کا آغاز کرنے والا قرآن ہے۔ یورپ نے اسی کو اختیار کیا اور وہ بامِ عروج پر پہنچ گئے۔ اگرچہ اس میں انہوں نے بہت سی ٹھوکریں بھی کھائی ہیں' وہ ایک علیحدہ مضمون ہے' لیکن مغربی تہذیب کے باطن (inner core) کے بارے میں علامہ کہتے ہیں کہ یہ قرآنی ہے۔ البتہ اس کے ظاہر کے بارے میں اقبال نے ''The dazzling exterior'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں کہ یہ بڑی چکاچوند کا حامل ہے ۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

ہمارے نوجوان یورپ اور امریکہ میں جا کر اسی ظاہری چکاچوند سے مبہوت ہو جاتے ہیں' لیکن علامہ کہتے ہیں ۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ حجاز و حولِ قدس!

اس شعر کے دوسرے مصرع میں مَیں نے کچھ لفظی تصرف کیا ہے۔ بہرحال قرآن کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''یہ ایک فیصلہ کن کتاب ہے' یاوہ گوئی نہیں ہے''۔ سورۃ الطارق میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝١٣ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝١٤﴾ ''بے شک یہ قرآن دوٹوک فیصلہ کرنے والا کلام ہے' یہ ہنسی کی اور بے فائدہ بات نہیں ہے''۔ یہی

بات رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث مبارک میں ارشاد فرمائی۔

حدیث کے اگلے الفاظ ملاحظہ کیجیے۔ دیکھیے فصاحت' بلاغت اور عذوبت کے ساتھ ساتھ ان الفاظ میں کس قدر غنائیت ہے۔ فرمایا: ((مَنْ تَرَكَهُ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ)) ''جو شخص اپنے تکبر کی وجہ سے اس قرآن کو ترک کر دے گا اللہ اسے پیس کر رکھ دے گا''۔ اگرچہ قرآن کو ترک ہم نے بھی کیا ہے لیکن تکبر کی وجہ سے نہیں' بلکہ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے کیا ہے۔ قرآن ترک کرنے کے مجرم تو ہم بھی ہیں' لیکن ہم نے قرآن کے خلاف تکبر نہیں کیا ہے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ جو کوئی جابر و سرکش اپنی سرکشی کے قہر اور جوش میں آ کر اور طاقت کے نشے میں سرشار ہو کر قرآن کو ترک کرے گا اللہ اسے پیس کر رکھ دے گا۔

ہدایت کا سرچشمہ

((وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى فِيْ غَيْرِهٖ اَضَلَّهُ اللّٰهُ)) ''اور جو کوئی قرآن کے سوا کسی اور شے میں ہدایت تلاش کرے گا اللہ اسے لازماً گمراہ کر دے گا''۔ فلسفہ سے آپ ہدایت لینا چاہتے ہیں تو لازماً ناکام ہوں گے۔ مولانا ظفر علی خان کا شعر آپ کو یاد ہو گا ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دُکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

اور علامہ اقبال مشرق و مغرب کے فلسفے کھنگال چکنے کے بعد کس کرب سے کہتے ہیں ؎

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گزشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیلِ بے رطب

وہ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ فلسفہ تو کھجور کا ایسا بانجھ درخت ہے جس پر کھجور لگتی ہی نہیں' لہٰذا مجھے اس سے کچھ نہیں ملا ؎

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
میرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر!

تو ثابت ہوا کہ فلسفہ ہدایت کا ذریعہ نہیں ہے۔ اسی طرح سائنس بھی ذریعۂ ہدایت نہیں

ہے۔ سائنس تو آلات ایجاد کرنے کا ذریعہ ہے۔ سائنس تو توانائی کے سرچشمے تلاش کرنے اور قدرتی طاقتوں کو دریافت کرنے کا ذریعہ ہے۔ توانائی (energy) کا سب سے پہلا ذریعہ جو انسان نے دریافت کیا وہ آگ ہے' اور وہ اتفاقاً انسان کے علم میں آ گئی ہوگی۔ ہزاروں سال قبل کسی انسان نے دیکھا کہ ایک چٹان اوپر سے گری' نیچے بھی چٹان تھی' دونوں کے ٹکرانے سے شعلہ نکلا۔ اب اس نے اس مشاہدے کی بنیاد پر خود تجربہ کیا اور دو پتھر لے کر خوب زور سے ٹکرائے تو شعلہ نکل آیا۔ لیجیے آگ ایجاد ہوگئی۔ اس سے پہلے انسان کچا گوشت کھاتا تھا' اس کے علاوہ پھل کھاتا تھا' درختوں کی جڑیں کھاتا تھا۔ آگ کی دریافت کے بعد انسان نے گوشت کو بھون کر اور پکا کر کھانا شروع کر دیا۔ اسے اوّلین سورس آف انرجی مل گئی۔ پھر کسی سائنس دان نے دیکھا کہ ایک ہانڈی چولہے کے اوپر چڑھی ہوئی ہے اور اس کا ڈھکنا ہل رہا ہے۔ اس نے سوچا اس کو کون ہلا رہا ہے؟ کیا کوئی جن بھوت ہے؟ معلوم ہوا کہ اندر بھاپ (steam) پیدا ہو رہی ہے اور بھاپ میں اس قدر طاقت ہے کہ وہ اسے ہلا رہی ہے۔ اس طرح توانائی کا ایک ذریعہ بھاپ دریافت ہوگئی اور اس سے بڑا کام لیا گیا۔ کبھی سٹیم کے انجن چلتے تھے' جو بڑے ہیبت ناک اور دیوہیکل ہوا کرتے تھے۔ فرنٹیئر میل کا انجن دیکھ کر خوف آتا تھا۔ انسانی قد سے زیادہ تو اس کے پہیے کا گھیرا تھا۔ یہ سٹیم سے چلتے تھے۔ پھر بجلی ایجاد ہوگئی۔ تو سائنس سے ہدایت نہیں ملتی۔ اس سے تو آپ کو کچھ چیزوں کے استعمال کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ ہدایت صرف قرآن سے ملے گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا جو کوئی قرآن کے سوا کہیں اور سے ہدایت ڈھونڈے گا اللہ اسے لازماً گمراہ کر دے گا۔

اللہ کی مضبوط رسّی

آگے پھر حدیث کے تین ٹکڑے فصاحت و بلاغت اور عذوبت وغنائیت کی بہترین مثال ہیں۔ فرمایا: ((وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ ' وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ ' وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ)) شاعری نہیں ہے' لیکن آزاد شاعری سے ملتا جلتا انداز ہے۔ ((وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ)) ''یہی ہے اللہ کی مضبوط رسّی''۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۳ میں ارشاد

ہوا: ﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ص﴾ ''اللہ کی رسّی کو مل جل کر مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقے میں مت پڑو''۔ لیکن وہ اللہ کی رسّی کون سی ہے؟ اسے قرآن میں واضح نہیں کیا گیا' بلکہ اس کی صراحت حدیث سے ہوتی ہے۔ حدیث سے ناواقف لوگ ایسی آیات کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب ۱۹۷۴ء میں پاکستان میں عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس ہو رہی تھی تو جگہ جگہ اس آیت کے بینر لگے ہوئے تھے: ﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ص﴾۔ ہر رکشا اور ٹیکسی پر بھی یہی آیت لکھی ہوئی تھی۔ اُن دنوں میں اپنی ایک کتاب کی طباعت کے سلسلے میں مکتبہ جدید پریس گیا تو وہاں آزاد کشمیر حکومت کے محکمہ اطلاعات کے سربراہ آئے ہوئے تھے جو کمیونسٹ تھے۔ انہوں نے بڑی دریدہ دہنی سے کہا کہ یہ کیا مہمل کلام ہے؟ کہاں ہے اللہ کی رسّی جسے مل کر تھامنا ہے؟ کہاں لٹکی ہوئی ہے وہ رسّی؟ دکھاؤ مجھے! یہ اصل میں حدیث سے ناواقفیت ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید میں اگر کوئی شے تشریح طلب ہو تو اُس کو واضح کرنا حضور ﷺ کا فرضِ منصبی ہے۔ منکرینِ حدیث تو حضور ﷺ کا یہ حق بھی تسلیم نہیں کرتے' جبکہ ہم کہتے ہیں کہ یہ آپؐ کا فرضِ منصبی ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ﴾ (النحل:۴۴) ''اور (اے نبی!) ہم نے آپ پر یہ ذکر (قرآن حکیم) نازل کیا تا کہ آپ واضح کر دیں اس کو لوگوں کے لیے جو اُن کی طرف نازل کیا گیا ہے''۔ تو آپؐ نے واضح فرما دیا کہ: ((وَهُوَ حَبۡلُ اللّٰهِ الۡمَتِيۡنُ)) ''یہ (قرآن) اللہ کی مضبوط رسّی ہے''۔ اس کو پکڑ لو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

((وَقَدۡ تَرَكۡتُ فِيۡكُمۡ مَا لَنۡ تَضِلُّوۡا بَعۡدَهٗ اِنِ اعۡتَصَمۡتُمۡ بِهٖ كِتَابُ اللّٰهِ)) (مسلم)

''اور میں تمہارے درمیان ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم اسے مضبوطی سے پکڑ لو گے تو اس کے بعد کبھی گمراہ نہیں ہو گے' وہ کتاب اللہ ہے۔''

ایک اور حدیث میں ہے:

((كِتَابُ اللّٰهِ حَبۡلٌ مَمۡدُوۡدٌ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الۡاَرۡضِ)) (الترمذی)

''اللہ کی کتاب (کو تھامے رکھنا) جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ایک رسّی ہے۔''

اس ضمن میں ایک اور حدیث بڑی ہی پیاری ہے۔ حضورﷺ اپنے حجرے سے برآمد ہوئے' دیکھا کہ مسجد کے ایک کونے میں کچھ لوگ بیٹھے قرآن مجید کا مذاکرہ کر رہے ہیں' سمجھ رہے ہیں' سمجھا رہے ہیں' تو آپؐ کے چہرے پر خوشی اور مسرت کے آثار ظاہر ہوئے' آپؐ ان کے پاس تشریف لائے اور پوچھا: ((اَلَسْتُمْ تَشْهَدُوْنَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَهٰذَا الْقُرْآنَ جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ؟)) ''کیا آپ لوگ اس کے گواہ نہیں ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں' اور یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟'' سب صحابہؓ نے کہا: ((بَلٰی يَارَسُوْلَ اللّٰهِ)) ''کیوں نہیں اے اللہ کے رسول!'' ہم گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اور یہ کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ اب آپﷺ نے فرمایا: ((فَاسْتَبْشِرُوْا فَاِنَّ الْقُرْآنَ طَرَفُهٗ بِيَدِ اللّٰهِ وَطَرَفُهٗ بِاَيْدِيْكُمْ)) ''پس تم خوشیاں مناؤ' اس لیے کہ اس قرآن کا ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ایک سرا تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

قرآن: پُر حکمت ذکر

زیر مطالعہ حدیث میں آگے فرمایا: ((وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ)) ''اور یہی پُر حکمت ذکر ہے''۔ قرآن اپنے آپ کو ''الذکر'' کہتا ہے' لیکن تم نے ذکر کے نت نئے طریقے ایجاد کر لیے ہیں۔ سب سے مضبوط اور مستحکم ذکر یہ قرآن ہے' لیکن اس پر توجہ ہی نہیں' جبکہ ذکرواذکار اور اوراد و وظائف کے مجموعے توجہات کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔

دعا کے بارے میں رسول اللہﷺ کا ارشاد ہے: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) (ترمذی) یعنی ''دعا عبادت کا جوہر ہے''۔ بلکہ یہاں تک فرمایا: ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) (ترمذی) یعنی ''دعا ہی تو عبادت ہے''۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ((مَنْ شَغَلَهُ الْقُرْآنُ عَنْ ذِكْرِيْ وَمَسْاَلَتِيْ اَعْطَيْتُهٗ اَفْضَلَ مَا اُعْطِي السَّائِلِيْنَ)) ''جو شخص قرآن کی (تلاوت اور درس و تدریس کی) مصروفیت کی وجہ سے میرا ذکر نہ کر

سکے اور مجھ سے دعا نہ کر سکے میں اُسے اس شے سے افضل عطا کرتا ہوں جو میں دعا کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں''۔اس حدیث کے اگلے الفاظ ہیں: ((وَفَضْلُ کَلَامِ اللّٰہِ عَلٰی سَائِرِ الْکَلَامِ کَفَضْلِ اللّٰہِ عَلٰی خَلْقِہٖ)) (ترمذی) ''اوراللہ کے کلام کو جملہ کلاموں پر ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جیسی خود اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق پر۔''

قرآن: صراطِ مستقیم

زیر مطالعہ حدیث کے اگلے الفاظ ہیں:((وَھُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ)) ''اور یہی صراطِ مستقیم ہے''۔نماز کی ہر رکعت میں ہم ''اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ'' کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب کرتے ہیں۔اس حدیث میں صراحت آ گئی کہ صراطِ مستقیم یہی قرآن ہے۔

((ھُوَ الَّذِیْ لَا تَزِیْغُ بِہِ الْاَھْوَاءُ)) ''یہ وہ شے ہے جس کے ہوتے ہوئے خواہشاتِ نفس (تمہیں) گمراہ نہیں کر سکیں گی''۔اس قرآن سے رابطہ ہو گا تو خواہشاتِ نفسانی ٹیڑھے رُخ پر نہیں لے جاسکیں گی۔

((وَلَا تَلْتَبِسُ بِہِ الْاَلْسِنَۃُ)) ''اور زبانیں اس میں گڑبڑ نہیں کر سکیں گی''۔اس کے ساتھ سابقہ آسمانی کتابوں والا معاملہ کرنا ممکن نہیں ہو گا کہ ذرا سا زبان کو مروڑ کر پڑھا تو کچھ کا کچھ بن گیا۔اس طرح اُن کتابوں میں تحریف ہو گئی۔قرآن حکیم میں اس طرح کی تحریف کے سارے راستے بند کر دیے گئے ہیں۔یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کو متوجہ کرنے کے لیے جو لفظ ''رَاعِنَا'' استعمال ہو رہا تھا' مسلمانوں کو اس سے بھی روک دیا گیا۔رَاعِنَا کا مطلب ہے ذرا ہماری رعایت کیجیے' ہمارا لحاظ کیجیے' میں آپ کی بات سمجھا نہیں ہوں' آپ دوبارہ سمجھا دیجیے۔لیکن یہود نے اسے زبان مروڑ کر ''رَاعِیْنَا'' کہنا شروع کر دیا تو اس لفظ کے استعمال سے روک دیا گیا۔قرآن میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس کو توڑ مروڑ کر کہیں کا کہیں پہنچایا جا سکے۔قرآن اپنی حفاظت خود کرتا ہے۔قرآن میں ہے:﴿لَا یَاْتِیْہِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَلَا مِنْ خَلْفِہٖ﴾''اس پر باطل حملہ آور ہو ہی نہیں

سکتا' نہ سامنے سے نہ پیچھے سے۔''

بے مثل و بے مثال کتاب

((وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ)) ''اور علماء اس سے کبھی سیر نہیں ہو سکیں گے''۔ سیر ہونا کس کو کہتے ہیں؟ آپ نے کھانا اتنا کھالیا کہ پیٹ بھر گیا اور آپ سیر ہو گئے۔ اب آپ کے سامنے کوئی بہترین ڈش بھی لے آئے اور تھوڑا سا کھانے کی فرمائش کرے تو آپ کی طبیعت آمادہ نہیں ہوگی' اس لیے کہ آپ سیر ہو چکے ہیں۔ لیکن قرآن کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ علماء اس سے کبھی سیر نہیں ہوں گے۔ اس پر غور کرتے رہیں' تدبر کرتے رہیں' پڑھتے رہیں' لیکن قرآن سے سیر نہیں ہوں گے۔ یہ اس کا اعجاز ہے۔

((وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ)) ''اور تکرارِ تلاوت سے اس پر کوئی باسی پن طاری نہیں ہوگا''۔ دنیا کی کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں ہے۔ آپ نے کوئی کتاب ایک دفعہ پڑھی تو اب دوسری دفعہ پڑھنے کو جی نہیں چاہے گا۔ اور اگر دوسری دفعہ پڑھ لی تو اب اسے دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہے گا۔ لیکن یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اسے پڑھتے رہیے' پڑھتے رہیے' سینکڑوں دفعہ پڑھ جایئے' ہر دفعہ آپ کو نئی چیزیں ملیں گی' نئے نئے نکتے ملیں گے۔ امام شافعیؒ اصولِ فقہ کے امام تھے۔ ان کے بارے میں آتا ہے کہ وہ فقہ کے چار مآخذ قرآن' سنت' اجماع اور قیاس کے لیے قرآن سے دلائل جمع کر رہے تھے' لیکن اجماع کے لیے انہیں قرآن سے کوئی دلیل نہیں مل رہی تھی۔ اس کے لیے انہوں نے تین سو مرتبہ شروع سے آخر تک قرآن پڑھا' لیکن دلیل نہیں ملی۔ اس کے بعد جب تین سو ایک مرتبہ پڑھ رہے تھے تو سورۃ النساء کی آیت ۱۱۵ کے ان الفاظ پر توجہ مرتکز ہوگئی: ﴿......وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴿١١٥﴾﴾ ''......اور جو کوئی مسلمانوں کے راستے کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے گا تو ہم اس کو اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونک دیں گے' اور وہ بدترین جائے قرار ہے''۔ مسلمانوں کا راستہ وہ ہے جس پر مسلمانوں کا اجماع ہو جائے۔ کیونکہ ایک اور حدیث میں آیا ہے: ((اِنَّ اُمَّتِیْ لَا تَجْتَمِعُ عَلٰی ضَلَالَةٍ)) (ابن ماجہ)

''یقیناً میری اُمت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔''

جواہر علم وحکمت کا لامتناہی خزانہ

((وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ)) ''اور اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوں گے''۔ یہ وہ کان ہے جس میں سے علم وحکمت کے گوہر نایاب ہمیشہ نکلتے رہیں گے اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔حدیث مبارک کا یہ ٹکڑا بہت اہم ہے۔ہم نے عام طور پر یہ سمجھ رکھا ہے کہ قرآن کی تفسیر وتشریح میں جو کچھ اسلاف لکھ گئے' وہ حرفِ آخر ہے۔ یہ تصور غلط ہے' کیونکہ قرآن اتنا محدود نہیں ہے۔ ہیروں کی ایک کان سے آپ ہیرے نکالتے رہیں تو ایک وقت آئے گا کہ معلوم ہوگا کان خالی ہوگئی۔لیکن قرآن ایسی کان نہیں ہے جو کبھی خالی ہو جائے۔اس میں سے ہیرے نکلتے رہیں گے۔اس میں غور وفکر اور تدبر کے نتیجے میں علم وحکمت کے موتی ہمیشہ نکلتے رہیں گے۔بقول اقبال ؎

آں کتابِ زندہ قرآن حکیم
حکمتِ او لا یزال است و قدیم

خاص طور پر جدید سائنس جیسے جیسے ترقی کرے گی' قرآن میں سے نئے نئے ہیرے نکلتے چلے آئیں گے۔سورۃ حٰم السجدۃ کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ﴿سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ ؕ﴾ ''ہم عنقریب اپنی نشانیاں لوگوں کو دکھائیں گے آفاق میں بھی اور ان کے اپنے اندر بھی' یہاں تک کہ یہ بات بالکل مبرہن ہو جائے گی کہ یہ قرآن حق ہے''۔ چنانچہ آج کے سائنس دان انگشت بدنداں ہیں کہ چودہ سو برس پہلے یہ بات قرآن نے کہی ہے جو ہم پر آج کھلی ہے' جبکہ نہ مائیکروسکوپ کا وجود تھا' نہ dissection کا معاملہ تھا اور ماں کے پیٹ میں جنین کی نشوونما کے تمام مراحل قرآن نے کس قدر صراحت کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔البتہ جہاں تک فقہی و شرعی احکام کا تعلق ہے اس ضمن میں آپ پیچھے کی طرف چلیں۔اسلاف کی بات سنیں' پھر اُن کے بھی اسلاف کی بات سنیں۔فقہائے متاخرین کا نقطۂ نظر معلوم کر لیا ہے تو متقدمین کا نقطۂ نظر معلوم کریں۔ان سے بھی پیچھے جائیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس پہنچ جائیں۔

ان سے بھی پیچھے جائیں اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں سر رکھ دیں۔ جیسے اقبال نے کہا ہے۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

''اپنے آپ کو محمد مصطفیٰ ﷺ کے قدموں تک پہنچا دو' کیونکہ دین تو نام ہی ان کا ہے۔ اگر وہاں تک نہیں پہنچو گے تو یہ سراسر بولہبی ہی ہے۔''

جنّات کا قبول اسلام

((هُوَ الَّذِیْ لَمْ تَنْتَهِ الْجِنُّ اِذْ سَمِعَتْهُ حَتّٰی قَالُوْا : ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا○ یَّهْدِیْ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ﴾)) ''یہ وہ کتاب ہے کہ اسے جیسے ہی جِنوں نے سنا' فوراً پکار اٹھے: ہم نے ایک بہت خوبصورت قرآن سنا ہے جو سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے' تو ہم اس پر ایمان لے آئے''۔ ہمارا حال یہ ہے کہ سینکڑوں مرتبہ سنتے ہیں مگر ہم پر کوئی اثر نہیں ہوتا' جیسے چکنے گھڑے کے اوپر سے پانی بہہ جائے۔ اور جنوں کی جماعت نے اسے ایک مرتبہ سنا تو وہ اس پر ایمان لے آئی۔ اس واقعہ کا ذکر سورۃ الجن کے آغاز میں ہے۔ جبکہ سورۃ الاحقاف میں بتایا گیا ہے کہ یہ جنات ایمان لانے کے بعد اپنی قوم کے پاس گئے تو جاتے ہی دعوت وتبلیغ کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے اپنی قوم کو بتایا کہ ''ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰؑ کے بعد نازل کی گئی ہے' تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی' رہنمائی کرتی ہے حق اور رشد و ہدایت کی طرف''۔ پھر انہوں نے اپنی قوم کو رسول اللہ ﷺ کی پکار پر ایمان لانے کی دعوت دی: ﴿یٰقَوْمَنَا اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ......﴾ ''اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کرلو اور اس پر ایمان لے آؤ......''

حدیث کا کلائمکس

حدیث کے آخری ٹکڑے اس حدیث کا کلائمکس ہیں۔ فرمایا: ((مَنْ قَالَ بِهٖ صَدَقَ' وَمَنْ عَمِلَ بِهٖ اُجِرَ' وَمَنْ حَكَمَ بِهٖ عَدَلَ' وَمَنْ دَعَا اِلَیْهِ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ

مُّسْتَقِيْمٍ)) ''جس نے قرآن کی بنیاد پر بات کہی اُس نے سچ کہا' اور جس نے قرآن پر عمل کیا اس کا اجر محفوظ ہے' اور جس نے قرآن کی بنیاد پر کوئی فیصلہ دیا اس نے عدل کیا اور جس نے قرآن کی طرف بلایا اُسے تو سیدھے راستے کی طرف ہدایت دے دی گئی''۔ کسی اور کو ہدایت حاصل ہو یا نہ ہو' یہ داعی کے ذمے نہیں ہے' البتہ جو قرآن کی طرف بلا رہا ہے اس کی ہدایت یقینی (ensured) ہے۔

دعوت الی القرآن کا مدّعا

اب جان لیجیے کہ دعوت الی القرآن کا مطلب کیا ہے۔ لوگوں سے یہ کہنا کہ قرآن پڑھو اور پھر انہیں قرآن پڑھانا' لوگوں کو دعوت دینا کہ قرآن سمجھو اور پھر انہیں سمجھانا دعوت الی القرآن ہے۔ دعوت الی القرآن کا مقصد یہ بھی ہے کہ اپنی انفرادی زندگی میں بھی قرآن پر عمل کرو اور اجتماعی زندگی میں بھی اسے ایک نظام کی حیثیت سے قائم کرو۔ یہ بھی دعوت الی القرآن ہے کہ اس قرآن کو پہنچاؤ دنیا کے ایک ایک انسان تک۔ اس لیے کہ حضور ﷺ کو پوری نوعِ انسانی کے لیے بھیجا گیا تھا: ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾ (سبا:۲۸) اور خطبہ حجۃ الوداع میں آپؐ نے کہہ دیا تھا کہ دیکھو میں نے تمہیں پہنچا دیا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) (متفق علیہ) ''اب جو موجود ہیں وہ ان کو پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں''۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس عظیم مشن کو لے کر پوری دنیا میں پھیل گئے۔ ہم مدینے کی گلیوں کی بات کرتے ہیں' مدینے میں دفن ہونے کی آرزو کرتے ہیں' لیکن وہ مدینہ منورہ کو چھوڑ کر نکلے۔ ان میں سے کوئی فارس میں دفن ہے تو کوئی عراق میں۔ کوئی شام میں ہے تو کوئی مصر میں۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ کے میزبان حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے دفن ہیں۔ اس لیے کہ اُن حضرات کے پیشِ نظر دین کو پھیلانا تھا۔

یہ حدیث امام ترمذیؒ اور امام دارمیؒ نے اپنی اپنی سنن میں اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے ''شعب الایمان'' میں نقل کی ہے۔ مزید برآں مسند احمد اور معجم کبیر طبرانی میں یہ مختلف انداز میں آئی ہے۔ حدیث کا آغاز اس طور سے ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت

کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ((اَتَانِیْ جِبْرِیْلُ علیہ السلام فَقَالَ :یَا مُحَمَّدُ اِنَّ اُمَّتَكَ مُخْتَلِفَةٌ بَعْدَكَ)) ''میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور کہا: اے محمد ﷺ! آپ کی اُمت آپ کے بعد اختلاف کا شکار ہو جائے گی''۔ ((قَالَ فَقُلْتُ :فَاَیْنَ الْمَخْرَجُ یَا جِبْرِیْلُ؟)) ''آپؐ نے فرمایا کہ میں نے دریافت کیا: اے جبرائیل! تو (اس اختلاف سے) نکلنے کا راستہ کیا ہوگا؟''((قَالَ فَقَالَ: كِتَابُ اللّٰهِ تَعَالٰی......)) ''آپؐ نے فرمایا کہ جبرائیلؑ نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ کی کتاب......''اس روایت کی رو سے اس حدیث کے راویٔ اوّل حضرت جبرائیل علیہ السلام' راویٔ ثانی محمدؐ رسول اللہ ﷺ اور راویٔ ثالث حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

عظمتِ قرآن کے موضوع پر یہ عظیم حدیث میری طرف سے آپ کے لیے تحفہ ہے۔ آپ اس حدیث کا متن اور ترجمہ اپنے پاس محفوظ کر لیں' بلکہ لیمینیشن کرا کے نمایاں جگہ پر لٹکا لیں اور کوشش کریں کہ یہ آپ کو یاد ہو جائے۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولكم ولسائر المسلمین والمسلمات

(قرآن مجید کی عظمت وفضیلت پر مبنی متذکرہ بالا حدیث کا
مکمل متن اور اردو ترجمہ اگلے صفحات پر ملاحظہ کیجیے۔)

قرآن مجید کی عظمت وفضیلت بلسانِ نبوتؐ

عَنْ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ :اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ : ((اِنَّھَا سَتَکُوْنُ فِتْنَۃٌ)) قُلْتُ مَا الْمَخْرَجُ مِنْھَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ؟ قَالَ :((کِتَابُ اللّٰہِ، فِیْہِ نَبَاُ مَا قَبْلَکُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَکُمْ وَحُکْمُ مَا بَیْنَکُمْ، ھُوَ الْفَصْلُ لَیْسَ بِالْھَزْلِ، مَنْ تَرَکَہٗ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَہُ اللّٰہُ ، وَمَنِ ابْتَغَی الْھُدٰی فِیْ غَیْرِہٖ اَضَلَّہُ اللّٰہُ ، وَھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ ، وَھُوَ الذِّکْرُ الْحَکِیْمُ ، وَھُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ، ھُوَ الَّذِیْ لَا تَزِیْغُ بِہِ الْاَھْوَاءُ وَلَا تَلْتَبِسُ بِہِ الْاَلْسِنَۃُ وَلَا یَشْبَعُ مِنْہُ الْعُلَمَاءُ وَلَا یَخْلَقُ عَنْ کَثْرَۃِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ ، ھُوَ الَّذِیْ لَمْ تَنْتَہِ الْجِنُّ اِذْ سَمِعَتْہُ حَتّٰی قَالُوْا : ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّھْدِیْ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ﴾ مَنْ قَالَ بِہٖ صَدَقَ، وَمَنْ عَمِلَ بِہٖ اُجِرَ، وَمَنْ حَکَمَ بِہٖ عَدَلَ، وَمَنْ دَعَا اِلَیْہِ ھُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ)) (رواہ الترمذی والدارمی)

(ترجمہ) حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا' آپ نے ایک دن فرمایا: ''آگاہ ہو جاؤ' ایک بڑا فتنہ آنے والا ہے!'' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس فتنہ کے شر سے بچنے اور نجات پانے کا ذریعہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''کتاب اللہ! اس میں تم سے پہلی اُمتوں کے (سبق آموز) واقعات ہیں اور تمہارے بعد کی اس میں اطلاعات ہیں (یعنی اعمال واخلاق کے جو دُنیوی واُخروی نتائج و ثمرات مستقبل میں سامنے آنے والے ہیں' قرآن مجید میں ان سب سے بھی آگاہی دے دی گئی ہے!) اور تمہارے درمیان جو مسائل پیدا ہوں قرآن میں اُن کا حکم اور فیصلہ موجود ہے۔ (حق و باطل اور صحیح و غلط کے بارے میں) وہ قولِ فیصل ہے' وہ فضول بات اور یاوہ گوئی نہیں ہے۔ جو کوئی جابر و سرکش اس کو چھوڑے گا (یعنی غرور وسرکشی کی راہ سے قرآن سے مُنہ موڑے گا!) اللہ تعالیٰ اس کو توڑ کے رکھ دے گا' اور جو کوئی ہدایت کو قرآن کے بغیر تلاش کرے گا اس کے حصہ میں اللہ کی طرف سے صرف گمراہی آئے گی (یعنی وہ ہدایتِ حق سے محروم رہے گا!) قرآن ہی حبل اللہ المتین (یعنی اللہ سے تعلق کا مضبوط وسیلہ) ہے! اور محکم نصیحت نامہ ہے' اور وہی صراط مستقیم ہے' وہی وہ حق مبین ہے جس کے اتباع سے خیالات کجی سے محفوظ رہتے ہیں' اور زبانیں اس کو گڑ بڑ نہیں کر سکتیں (یعنی جس طرح اگلی کتابوں میں زبانوں کی راہ سے تحریف داخل ہو گئی اور محرفین نے کچھ کا کچھ پڑھ کے اس کو محرف کر دیا اس طرح قرآن میں کوئی تحریف نہیں ہو سکے گی۔ اللہ تعالیٰ نے تا قیامت اس کے محفوظ رہنے کا انتظام فرما دیا ہے!) اور علم والے کبھی اس کے علم سے سیر نہیں ہوں گے (یعنی قرآن میں تدبر کا عمل اور اس کے حقائق و معارف کی تلاش کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے گا اور کبھی ایسا وقت نہیں آئے گا کہ قرآن کا علم حاصل کرنے والے محسوس کریں کہ ہم نے علم قرآن پر پورا عبور حاصل کر لیا اور اب ہمارے حاصل کرنے کے لئے کچھ باقی نہیں رہا۔ بلکہ قرآن کے طالبین علم کا حال ہمیشہ یہ رہے گا کہ وہ علمِ قرآن میں جتنے آگے بڑھتے رہیں گے اتنی ہی ان کی طلب ترقی کرتی رہے گی اور ان کا احساس یہ ہوگا کہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے وہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے' جو ابھی ہم کو حاصل نہیں ہوا ہے) اور وہ (قرآن) کثرتِ مزاولت سے کبھی پرانا نہیں ہوگا (یعنی جس طرح دنیا کی دوسری کتابوں کا حال ہے کہ بار بار پڑھنے کے بعد اُن کے پڑھنے میں آدمی کو لطف نہیں آتا' قرآن مجید کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے' وہ جتنا پڑھا جائے گا اور جتنا اس میں تفکّر و تدبّر کیا جائے گا اتنا ہی اس کے لطف ولذت میں اضافہ ہوگا!) اور اس کے عجائب (یعنی اس کے دقیق ولطیف' حقائق و معارف) کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ قرآن کی یہ شان ہے کہ جب جنوں نے اس کو سنا تو بے اختیار بول اٹھے: ''ہم نے قرآن سنا جو عجیب ہے' رہنمائی کرتا ہے بھلائی کی' پس ہم اس پر ایمان لے آئے''۔ جس نے قرآن کے موافق بات کہی اس نے سچی بات کہی' اور جس نے قرآن پر عمل کیا وہ مستحق اجر و ثواب ہوا۔ اور جس نے قرآن کے موافق فیصلہ کیا اس نے عدل و انصاف کیا' اور جس نے قرآن کی طرف دعوت دی اس کو صراط مستقیم کی ہدایت کے سوا کچھ نہیں ملتا۔''

قرآن اور امنِ عالم

عنوانات

(۱) انفرادی امن وسکون	280
(۲) سیاسی ومعاشرتی سلامتی	285
(۳) امنِ عالم	288

ستمبر ۱۹٦۸ء میں مجلس طلبائے اسلام پاکستان نے بمقام بنات الاسلام اکیڈمی' گلبرگ' لائل پور (فیصل آباد) اپنا پہلا سالانہ تربیتی اجتماع منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا' جس میں بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کو ''اسلام اور امنِ عالم'' کے موضوع پر خطاب کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس اجتماع کی عمومی نشستیں تو بعد میں حکام کے امتناعی احکام کے پیش نظر منعقد نہ ہو سکیں' البتہ کچھ شہر کے مقامی طلبہ اور کچھ باہر سے آنے والے مندوبین اپنے خصوصی اجلاس منعقد کرتے رہے۔ ایسی ہی ایک نشست میں محترم ڈاکٹر صاحب نے نہایت فکر انگیز اظہارِ خیال فرمایا' جسے افادۂ عام کی غرض سے کتابچے کی صورت میں شائع کر دیا گیا۔ اس کتابچے کے اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ امن وامان کی موجودہ عالمی صورتِ حال اور اہلِ مغرب کے اسلام اور مسلمانوں پر دہشت گردی کے الزامات کے تناظر میں آج اس تحریر کی افادیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور اسے بہت بڑے پیمانے پر عام کرنے کی ضرورت ہے۔

حمد وثنا' درود وسلام اور دعا کے بعد:

عزیز طلبہ!

آج آپ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے میں ایک خصوصی مسرت محسوس کر رہا ہوں' جس کے دو اسباب ہیں: پہلا یہ کہ ابھی خود مجھے طالب علمی کے دور سے گزرے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں' میں ایم بی بی ایس کے فائنل امتحان سے فارغ ہوا تھا' اور ایک تو ویسے ہی گزرا ہوا وقت بہت مختصر معلوم ہوا کرتا ہے' چنانچہ قیامِ قیامت کے وقت لوگ نہ صرف اپنی پوری دنیوی زندگی بلکہ پورے دورِ عالم برزخ کو بھی بس ایک رات یا اس کی صبح جتنا مختصر محسوس کریں گے[۱]' پھر چودہ سال تو واقعتاً بہت قلیل

(۱) ﴿كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا ﴿۴۶﴾﴾ (النزعت)

مدت ہے —— علاوہ بریں میرا معاملہ تو خاص طور پر یہ ہے کہ میں نے اس پورے عرصے میں بھی اپنے آپ کو ایک طالب علم ہی محسوس کیا' اور واقعہ یہ ہے کہ اب بھی میں خود کو بس ایک طالب علم ہی سمجھتا ہوں۔ چنانچہ شاید آپ یہ جان کر حیران ہوں کہ میں نے آج سے تین سال قبل ایک باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لے کر ایم اے اسلامیات کا امتحان پاس کیا اور اس میں قطعاً کوئی حجاب محسوس نہ کیا' اور آج آپ کے مابین میں بالکل صحبتِ ہم جنس کی سی کیفیت محسوس کر رہا ہوں —— آج کے اس اجتماع سے خطاب کرنے میں جو مسرت مجھے حاصل ہوئی ہے اس کا ایک سبب اور بھی ہے جسے میں اپنی گزارشات کے آخر میں بیان کروں گا۔

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ مجھے 'اسلام اور امن عالم' کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا ہے۔ میں اس موضوع پر تین سطحوں (levels) پر گفتگو کروں گا: ایک انفرادی امن' دوسرے سیاسی و معاشرتی سلامتی اور تیسرے امنِ عالم۔

(۱) انفرادی امن وسکون

آپ شاید حیران ہوں کہ امنِ عالم پر گفتگو اور اس کی ابتدا انفرادی سکون واطمینان سے! لیکن آپ ذرا غور سے کام لیں گے تو خود محسوس فرمالیں گے کہ عالمی امن کے قیام میں اصل فیصلہ کن عامل افرادِ نسل انسانی کا انفرادی سکون واطمینان ہی ہے' اس لیے کہ:

(۱) پورے عالمِ انسانی کی اصل اکائی (unit) بہرحال فرد ہی ہے۔ جس طرح ایک فصیل چاہے وہ کتنی ہی لمبی' چوڑی اور اونچی کیوں نہ ہو' بنی تو بہرحال اینٹوں ہی سے ہوتی ہے اور اس کی مضبوطی کا سارا دار و مدار اینٹوں کی پختگی ہی پر ہوتا ہے' اسی طرح امن عالم کا تصور بھی افراد نسل انسانی کے داخلی سکون واطمینان کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) واقعہ یہ ہے کہ انسان 'عالم اصغر' ہے اور اس کے باطن میں نہ صرف یہ کہ عالم ارضی بلکہ پوری کائنات منعکس موجود ہے۔ اس حقیقتِ عظمیٰ کو نفسیاتِ انسانی کے سب سے بڑے عالموں یعنی صوفیائے اسلام نے خوب سمجھا ہے۔ چنانچہ انہی کی

اصطلاح کو میں نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے منتخب کیا ہے۔ اس بات کو تو عام طور پر سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ انسان کے باطن پر خارج کے اثرات مترتب ہوتے ہیں اور کائناتِ ارضی و سماوی کے تمام واقعات و حوادث انسان کی داخلی کیفیات پر اثر انداز ہوتے ہیں' لیکن اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں' تاہم یہ ہے ایک امر واقعہ' کہ اس عالمِ اصغر یعنی انسان کا باطن بھی عالمِ اکبر یعنی کائنات پر اثر انداز ہوتا ہے اور خارج کی وسعتوں اور پہنائیوں پر عکس ڈالتا ہے۔ لہٰذا نسلِ انسانی کے افراد کے باطن میں اگر سکون و اطمینان موجود ہوگا تو لامحالہ کائناتِ ارضی و سماوی پر بھی اس کا عکس پڑے گا اور امنِ عالم کا قیام ممکن ہو سکے گا۔

(۳) تاریخِ عالم پر ایک طائرانہ نظر ڈالیے تو صاف نظر آئے گا کہ بسا اوقات بعض افراد کے داخلی انتشار و فساد کی وجہ سے عظیم خوں ریزیاں ہوئیں اور امنِ عالم تہ و بالا ہوا۔ ہلاکو اور چنگیز خاں اور ہٹلر اور مسولینی ایسے لوگوں کی شخصیتوں کا ذرا دقتِ نظر کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ان کے جذبات و احساسات کے اختلال اور ذہنی و قلبی انتشار ہی کے نتیجے میں پورے عالمِ ارضی کا سکون و چین ختم ہوا اور بے اندازہ قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔

(۴) اِس وقت بھی ذرا آنکھیں بند کر کے سوچیے کہ کریملن اور وہائٹ ہاؤس میں جو معدودے چند لوگ اقتدار و اختیار کی گدیوں پر قابض ہیں' ان کے داخلی امن و سکون کا کتنا گہرا تعلق عالمی امن کے ساتھ ہے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کسی ایک یا چند ایک کے ذہنی اختلال ہی نہیں محض اعصابی تناؤ کی بدولت کتنی ہلاکت خیز جنگ چھڑ سکتی ہے اور کیسا کچھ خون خرابہ ہو سکتا ہے۔

ایمان

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اسلام کا معاملہ بالکل منفرد نظر آتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کی اساس جن بنیادی اعتقادات پر قائم ہے ان کا مجموعی نام ہی 'ایمان' ہے' جس کا مادہ 'امن' ہے اور جس کا اصل حاصل وہ سکون و اطمینان ہے جو اس کی بدولت نفس

انسانی میں پیدا ہوتا ہے۔

ایمان کا اصل الاصول 'ایمان باللہ' ہے' جو عبارت ہے اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے ساتھ توکل و اعتماد اور تسلیم و تفویض کے ایسے تعلق سے جو انسان کو حقیقی امن و سکون اور راحت و چین سے ہمکنار کرتا ہے اور انسان کے داخلی امن کے لیے ایک مثبت و محکم اساس فراہم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک فردِ نوعِ بشر کا مخلصانہ تعلق جس کا اصطلاحی نام 'توحید' ہے' بالآخر انسان کو "رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ" کے اُس مقامِ رضا پر فائز کرتا ہے جہاں پہنچنے کے بعد انسان کو نہ کوئی خطرہ و خدشہ رہتا ہے' نہ حزن و ملال[1]' اور اس کے سینے میں انشراح اور قلب میں انبساط کی وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو محسوس تو کی جا سکتی ہے' بیان میں نہیں آ سکتی۔

سورۃ الانعام کی آیات ۸۱۔۸۲ میں پہلے ایک سوال کیا گیا کہ:

فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٨١﴾

"اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ امن کا اصل حق دار کون سا فریق ہے؟"

اور پھر جواب دیا گیا ہے کہ:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ

"امن تو بس ان کے لیے ہے جو ایمان لائیں اور اس میں شرک کی کوئی آمیزش نہ کریں۔"

غرض ایمان باللہ انسان کے داخلی امن کا واحد مثبت ذریعہ ہے اور قلب انسانی کو حقیقی امن و سکون سوائے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ایسے مخلصانہ اور مضبوط و محکم تعلق کے کسی اور چیز سے حاصل نہیں ہو سکتا جس کا ذریعہ ذکرِ الٰہی ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿٢٨﴾ (الرعد)

"آگاہ ہو جاؤ کہ قلوبِ انسانی ذکرِ الٰہی ہی سے اطمینان پاتے ہیں۔"

نوعِ انسانی کا جو بدنصیب فرد اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم رہے گا اسے ذہنی سکون اور

---

(۱) اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾ (یونس)

"آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے دوستوں کے لیے نہ کوئی خوف ہے نہ حزن۔"

قلبی اطمینان کسی طرح حاصل نہیں ہوسکتا۔ پھر لازم ہے کہ اس کی دنیوی خواہشات (worldly ambitions) ہردم بڑھتی چلی جائیں اور وہ طولِ امل کے جال میں پھنستا چلا جائے۔ پھر اکثر و بیشتر تو آرزوؤں اور اُمیدوں کے سراب ہی پر دم توڑ دے' اور اگر نسبتاً ذہین تر ہو تو مزید پیچیدہ امراض کا شکار ہو۔ چنانچہ ایک طرف اس کا باطن مختلف اور متضاد خواہشات کے باہمی تصادم کی آماجگاہ بنے' جس کے نتیجے میں داخلی انتشار (internal conflicts) پیدا ہوں اور ناکامیاں و نارسائیاں مختلف النوع مایوسیوں (frustrations) کو جنم دیں اور ان سب کے نتیجے میں انسان کا باطن ایک سلگتی ہوئی بھٹی بنا رہے جس میں اس کے دل و جگر کباب ہوتے رہیں' اور دوسری جانب ابنائے نوع کے مفادات کے باہمی تصادم سے جُہدللبقاء (struggle for existence) ہی نہیں' بلکہ تکاثر و تنافس اور بغی و طغیان کی صورتیں پیدا ہوں اور خدا کی زمین فتنہ و فساد سے بھر جائے۔

اس مرحلے پر 'ایمان' ہی کی ایک دوسری شاخ 'ایمان بالآخرۃ' جو درحقیقت ایمان باللہ ہی کی ایک فرع ہے' انسان کا سہارا بنتی ہے اور انسانی بغی و طغیان کی راہ میں ایک مؤثر رکاوٹ بن کر سامنے آتی ہے اور بعث بعدالموت' حساب و کتاب اور جزاء و سزا کے حقائق کو اُجاگر کر کے انسان کو اپنے جائز حقوق پر قانع اور مناسب حدود کا پابند رہنے پر آمادہ کرتی ہے۔ سورۃ العلق کی آیات ۶ تا ۸ اگرچہ اوّلین وحی تو نہیں لیکن بالکل ابتدائی آیات میں سے ضرور ہیں اور ان کو اوّلین وحی سے بالکل متصل رکھ کر شارع نے ان کی اہمیت کو مزید اُجاگر کر دیا ہے۔ ان میں اسی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ انسان کو حد سے تجاوز اور ظلم و تعدی سے باز رکھنے والی قوت ایک ہی ہے اور وہ عقیدۂ آخرت ہے۔ فرمایا گیا:

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۙ﴿۶﴾ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۭ﴿۷﴾ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۭ﴿۸﴾

(العلق)

''کچھ نہیں' انسان سرکشی پر آمادہ ہو ہی جاتا ہے' اس لیے کہ پاتا ہے اپنے تئیں آزاد۔ (لیکن اسے) لازماً تیرے پروردگار کے پاس لوٹنا ہے۔''

میری ان گزارشات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ امن کی اساس ایمان ہی پر قائم

ہوسکتی ہے اور امن عالم کے قیام کی کوئی سکیم' جو ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ سے شروع نہ ہو' قطعاً کامیاب نہیں ہوسکتی۔

اسلام

میں عرض کر چکا ہوں کہ ایمان کا اصل تعلق انسان کی باطنی کیفیات سے ہے اور داخلی امن اس کا سب سے بڑا ثمرہ ہے۔ اس داخلی امن کے ظہورِ خارجی کو اصطلاح میں ''اسلام'' کہتے ہیں' جو خارجی سلامتی کا مظہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان جس ہیئتِ اجتماعی کو جنم دیتا ہے اور جو مسلم معاشرے اور اسلامی ریاست کی مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہوتی ہے اس کی اساس اسلام پر ہے نہ کہ ایمان پر' لیکن یہ ایک ضمنی بات ہے۔ موضوع زیر بحث کے اعتبار سے اصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ایمان و اسلام درحقیقت ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں' ایک انسان کے داخلی امن کا مظہر ہے اور دوسرا خارجی سلامتی کا۔ ان عظیم حقائق کو نبی اکرم ﷺ نے اس دعا میں جو آپ ﷺ ہر نئے ماہ کے چاند کو دیکھ کر پڑھا کرتے تھے' نہایت فصاحت اور حد درجہ بلاغت کے ساتھ سمو دیا ہے۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ اَهِلَّهٗ عَلَيْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِيْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ))

''پروردگار! اس ہلال کو ہم پر امن و ایمان اور سلامتی و اسلام کے ساتھ طلوع فرما'' (آمین)

انہی حقائق کو آپ ﷺ نے دوسرے مواقع پر پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا۔ چنانچہ ایک طرف آپ ﷺ نے اس شخص کے ایمان کی نفی پر تین بار اللہ تعالیٰ کی قسم کھائی جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا ہمسایہ امن میں نہ ہو(۱) دوسری طرف خلق حسن کو آپ ﷺ نے ایمان اور اسلام دونوں کی بلند ترین منزلیں قرار دیا(۲) تیسری

---

(۱) ((وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ)) قِيْلَ مَنْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((اَلَّذِىْ لَا يَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ)) (رواه البخاري' عن ابی شريح العدوی ﷺ)

(۲) ☆قِيْلَ اَىُّ الْاِيْمَانِ اَفْضَلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((خُلُقٌ حَسَنٌ)) (رواه احمد' عن عمرو بن عبسه ﷺ)

☆ ((اَكْمَلُ الْمُسْلِمِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا)) (رواه الترمذی و ابوداوٗد' عن ابی هريرة ﷺ)

طرف آپ ﷺ نے مسلمان کی تعریف (definition) ہی یہ بیان فرمائی کہ ''مسلم وہ ہے جس کے ہاتھوں اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں''۔[1] اور چوتھی طرف عام ہدایت دی کہ ''تم زمین والوں پر رحم کرو' آسمان والا تم پر رحم کرے گا''۔[2]

(۲) سیاسی و معاشرتی سلامتی

افرادِ نسلِ انسانی کے باہمی میل جول اور ربط و تعلق سے پہلے خاندان' پھر کنبہ اور قبیلہ اور اس سے آگے بڑھ کر معاشرہ اور ریاست وجود میں آتے ہیں اور چونکہ یہ عالمِ ارضی بہرحال گنتی کے چند معاشروں اور معدودے چند ریاستوں ہی پر مشتمل ہے اور امنِ عالم سے مراد ان معاشروں اور ریاستوں کے باہمی پرامن ربط و تعلق کے سوا اور کچھ نہیں' لہٰذا ان معاشروں اور ریاستوں کے داخلی امن و سکون کو امنِ عالم سے بالکل وہی نسبت ہے جو ایک فرد کے داخلی امن یعنی ایمان کو اس خارجی سلامت روی یعنی اسلام سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے معاشرتی امن و سکون اور سیاسی عدل و انصاف پر غیر معمولی زور دیا ہے۔ اسلامی معاشرے اور ریاست کی اکائی ایک فردِ مسلم ہے اور اس کی جو تعریف نبی اکرم ﷺ نے کی اور اس کے جو اوصاف آنحضور ﷺ نے بیان فرمائے ان کو ذہن میں مستحضر کر کے خود غور فرمایئے کہ جس معاشرے کی تعمیر ان اساسات پر ہو اور جس کے باشندے ایسے امن پسند' سلامت رو اور صلح جو واقع ہوئے ہوں اس میں امن و سلامتی کی کیسی فضا پائی جائے گی۔

اسلامی ہیئتِ اجتماعیہ کی مثبت اساس ''اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ'' پر قائم ہے اور اس کا امتیازی نشان یا علم سلامتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دو مسلمانوں کی خالصتاً لوجہ اللہ باہمی محبت کو نیکی کے چوٹی کے اعمال میں شمار فرمایا ہے اور مسلمان معاشرے میں سب سے

---

(۱) ((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ)) (متفق علیہ' عن عبداللّٰہ بن عمروؓ)

(۲) ((اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ)) (رواہ الترمذی وابوداؤد' عن عبد اللّٰہ بن عمرو رضی اللّٰہ عنہما)

زیادہ کہی اور سنی جانے والی بات باہم سلامتی کی بشارت اور دعا یعنی ''السلام علیکم'' اور ''وعلیکم السلام'' ہے۔ اسلامی معاشرے کے ان دونوں نمایاں اوصاف کو آنحضور ﷺ نے ایک حدیث مبارک میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

((لَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰى تَحَابُّوْا' اَوَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى شَيْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ' اَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ))

(رواہ مسلم والترمذی' عن ابی ہریرة ﷺ)

''اے مسلمانو! تم جنت میں داخل نہ ہو سکو گے جب تک صاحب ایمان نہ ہو' اور تم صاحب ایمان نہیں ہو سکو گے جب تک باہم ایک دوسرے سے محبت نہ کرو' تو کیا میں تمہیں ایسا کام نہ بتاؤں جس کے کرنے سے تمہارے مابین محبت پیدا ہو جائے (وہ یہ ہے کہ) اپنے مابین 'سلام' کا خوب چرچا کرو۔''

قربان جایئے اللہ کے رسول ﷺ کے کہ کیسے معجز نما ایجاز کے ساتھ اسلامی معاشرے کی پوری حقیقت از ابتدا تا انتہا کھول کر رکھ دی۔

قرآن حکیم میں سورۃ الحجرات خاص طور پر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے اصول و فروع سے بحث کرتی ہے اور اس میں اسلامی معاشرے اور مسلمان ریاست کے بہت سے اہم اور بنیادی امور بیان ہوئے ہیں۔ میرے لیے یہاں ان سب کا ذکر تو ممکن نہیں' البتہ اس امر کا تذکرہ موضوع زیر گفتگو کے اعتبار سے ضروری ہے کہ اس میں معاشرتی امن و سکون اور صلح و آشتی کی فضا کو برقرار رکھنے کے لیے نہایت باریک بینی کے ساتھ ہدایات دی گئی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف افواہوں کی روک تھام اور جھگڑوں اور مناقشوں کے فوری حل کی سخت تاکید کی گئی ہے اور دوسری طرف تمسخر و استہزاء' تفاخر و تنابز' تجسس و سوءِ ظن اور غیبت و بدگوئی سے احتراز و اجتناب کا بھی نہایت سختی کے ساتھ حکم دیا گیا ہے۔ میں آپ سب حضرات سے تاکیداً عرض کرتا ہوں کہ پوری سورۃ الحجرات کا بنظر غائر مطالعہ کر کے از خود اندازہ کریں کہ اسلام معاشرتی امن و سکون کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اور بغض و نفرت کے تمام اسباب کا کتنی باریک بینی کے ساتھ سد باب کرتا ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھیے تو نظر آتا ہے کہ اجتماعی زندگی کے لیے ایسے زریں اصول قرآن حکیم میں متعین کر دیے گئے ہیں کہ جن کی نظیر کسی دوسری آسمانی کتاب میں بھی شاید ہی مل سکے' کہیں اور تو اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً:

(۱) وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ (المائدة:۲)

''اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو' اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ہرگز تعاون نہ کرو۔''

(۲) كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ (النساء:۱۳۵)

''عدل وانصاف کے علمبردار اور اللہ کے گواہ بن کر کھڑے ہو' چاہے اس کی زد خود تمہارے اپنے اوپر پڑے' چاہے تمہارے والدین اور اعزہ واقرباء پر۔''

(۳) كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ (المائدة:۸)

''اللہ کے علمبردار اور عدل وانصاف کے گواہ بن کر کھڑے ہو' اور کسی گروہ کی عداوت تمہیں عدل وانصاف کی راہ سے ہٹانے نہ پائے۔ عدل سے کام لو' اسی کو پرہیزگاری سے زیادہ مناسبت ہے۔''

(۴) لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ (الحدید:۲۵)

''ہم نے اپنے رسولوں کو بینات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (شریعت) اتاری' تاکہ لوگ عدل وانصاف پر قائم رہیں۔ اور ہم نے لوہا اتارا جس میں شدید حرب وضرب کی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے دوسرے منافع بھی ہیں اور (خصوصاً) اس لیے کہ اللہ دیکھ لے کہ کون ہے وہ جو غیب میں رہتے ہوئے اللہ اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے (یعنی عدل وانصاف کے خدائی نظام کو قائم کرتا ہے)۔''

گویا کہ اسلامی ہیئت اجتماعی کے چار ستون بر وتقویٰ اور عدل وقسط ہیں' اور حیاتِ

اجتماعی کا اصل مقصود و مطلوب اور آلاتِ حرب وضرب کا اصل منشاء ومصرف اسلام کے نزدیک اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ لوگ عدل وانصاف پر قائم رہیں۔

(۳) امنِ عالم

عالمی امن کے قیام کے لیے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں' اسلام کے پاس دو سکیمیں ہیں' ایک دیرپا اور مستقل' اور دوسری عارضی وعبوری۔ چنانچہ اب میں مختصراً ان ہی کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔

عالم انسانی میں مضبوط ومحکم اور پائیدار ودیرپا امن کے قیام کی صورت تو ایک ہی ہے' اور وہ یہ کہ متذکرہ بالا اسلامی معاشرہ اور مسلم ریاست خود وسعت پذیر (expand) ہوں اور رفتہ رفتہ زیادہ سے زیادہ انسانوں حتیٰ کہ پوری انسانیت کو اپنے مضبوط حصارِ امن میں لے کر ہر قسم کے فتنہ وفساد سے مامون ومصئون کردیں' اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ امن وسلامتی کی اس صراطِ مستقیم کے سوا جو ایمان واسلام پر مبنی ہے' انسان کے لیے سکون اور اطمینان کی کوئی اور راہ ہے ہی نہیں' اور انسانی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ انسان نے اس شاہراہ سے ہٹ کر جب کبھی کوئی دوسری راہ اختیار کی' خدا کی زمین فتنہ وفساد سے بھر گئی۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ۝ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۝ (الفجر)

''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ کیا کیا تیرے پروردگار نے عاد کے ساتھ' یعنی ستونوں والی قومِ ارم کے ساتھ' اور قومِ ثمود کے ساتھ جو وادیوں میں چٹانوں کو تراشا کرتے تھے' اور میخوں والے فرعون کے ساتھ' جنہوں نے بلادِ ارضی میں سرکشی کی اور ان کو فساد سے بھر دیا!''

لہٰذا اسلام کا اصل زور (emphasis) تو اس دعوت پر ہے کہ پوری نوعِ انسانی اپنے خالق ومالک پر ایمان لے آئے اور اس کی مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کردے۔

(۱) فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ؕ (التغابن:۸)

''پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول (ﷺ) پر اور اس نور (قرآن مجید) پر جو ہم نے نازل فرمایا ہے۔''

(۲) ((اَسْلِمُوْا تَسْلَمُوْا)) (متفق علیه' عن ابی هریرةؓ)

''اسلام لے آؤ' سلامتی پاؤ گے۔''

(۳) ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (البقرة:۲۰۸)

''اسلام (اور سلامتی) میں پورے کے پورے اور سب کے سب داخل ہو جاؤ۔''

(۴) اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران:۱۹)

''اللہ کے ہاں تو بس ایک ہی دین مقبول ہے اور وہ ہے اسلام۔''

اور اس عالم ارضی کے امن وسکون اور سلامتی واطمینان کا گہوارہ بننے کی اصلی صورت یہی ہے کہ پہلے کسی ایک خطے میں صحیح اسلامی معاشرہ اور حقیقی اسلامی ریاست قائم ہو جو ایمان واسلام کی عالمگیر دعوت کی علمبردار بن کر کھڑی ہو' جس کے نتیجے میں ﴿وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲﴾[1] کی صورت ایک بڑے پیمانے پر دوبارہ پیدا ہو اور اس اسلامی معاشرے اور اسلامی ریاست کی حدود پھیلتی چلی جائیں' تا آنکہ پورے عالم ارضی میں ﴿قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ۝۲۶﴾[2] کا سماں بندھ جائے اور پورا عالم انسانیت اپنے رحیم وودود رب کے دامن رحمت کے سائے تلے آ جائے۔

تاہم بحالت موجودہ یہ ایک بہت دور کی بات معلوم ہوتی ہے[3] جب تک یہ آخری صورت نہ ہو' عبوری دور میں بھی اسلامی معاشرے اور مسلم ریاست کے پاس پورے عالم انسانی کے لیے دو مشترک اقدار کی بنیاد پر صلح وامن اور محبت ورأفت کا پیغام موجود ہے' اور اس سے قبل کہ میں آپ کے سامنے ان دو مشترک اساسات کو بیان کروں

---

(۱) سورۃ النصر: ''اور تم نے دیکھا لوگوں کو اللہ کے دین میں داخل ہوتے ہوئے فوج در فوج۔''

(۲) سورۃ الواقعہ: ''ہر جانب سلامتی ہی سلامتی کا غلغلہ!''

(۳) ''اگرچہ ایسا صرف ہماری تقویم کی رو سے ہے' اللہ تعالیٰ کی تقویم کے حساب سے تو معاملہ اس کے بالکل برعکس اور آیت قرآنی: ﴿اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝۶ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝۷﴾ (المعارج) کے عین مصداق ہے!

جن پر قیام امن کے لیے اسلام کی عبوری تجویز مبنی ہے' میں چاہتا ہوں کہ ایک نظر آپ عالمِ انسانی کی موجودہ صورت حال پر بھی ڈال لیں اور وقت کے اہم ترین تقاضے کو سمجھ لیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ سائنس کی حیرت انگیز ترقی اور ذرائع آمد و رفت اور نقل و حمل میں بے پناہ اضافے کی بنا پر پورا عالم انسانی ایک شہر کے مانند ہو کر رہ گیا ہے اور مختلف ممالک کی حیثیت اس کے محلوں سے زیادہ نہیں رہی' لیکن فاصلوں کی یہ ساری کمی انسان کے خارج ہی میں وقوع پذیر ہوئی ہے' دلوں کے بُعد میں قطعاً کوئی کمی واقع نہیں ہوئی' اور افرادِ نوعِ بشر اور اقوامِ و ملل عالم کے مابین دوری جوں کی توں قائم ہے۔ اور یہ عجیب مخمصہ ہے جس میں عالم انسانی اس وقت گرفتار ہے کہ حالات کا شدید تقاضا تو یہ ہے کہ انسان باہم ایک دوسرے سے قریب ہوں اور دنیا میں جلد از جلد ایک عالمگیر معاشرہ اور ایک عالمی ریاست (world state) قائم ہو جائے' لیکن انسان کی تہی دستی اور تنگ دامانی کا عالم یہ ہے کہ ایسی کوئی قدرِ مشترک اسے نہیں مل رہی جو مشرق و مغرب کے فاصلے' گورے اور کالے کے امتیاز' اور نسلوں اور عقائد و نظریات کے فرق و تفاوت کی خلیجوں کو پاٹ سکے' یا کم از کم ایسا پل بن جائے جس پر سے گزر کر ابنائے نوعِ بشر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو سکیں۔

اس بدلی ہوئی صورت حال ہی کا تقاضا تھا جس کے تحت مرحوم انجمن اقوامِ عالم (League of Nations) وجود میں آئی تھی' اور انسان کی یہی تہی دستی تھی جس کے باعث وہ ناکام ہوئی' لیکن چونکہ تقاضا نہ صرف یہ کہ اپنی جگہ موجود تھا بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ شدید صورت اختیار کر گیا تھا' لہٰذا پھر موجودہ تنظیم اقوام متحدہ (United Nations Organization) وجود میں آئی۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ انسان کی اسی تنگ دامانی کے باعث وہ بھی عملاً ناکام ہو چکی ہے' اور اگرچہ اس کا ظاہری ٹھاٹھ باٹھ موجود ہے' تاہم ہر شخص جانتا ہے کہ درحقیقت وہ ''united'' یعنی متحدہ کی بجائے ''untied'' یعنی منتشر اقوام کے زبانی جمع خرچ کا ایک ادارہ ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے اس اہم تقاضے کا جواب اسلام اور صرف اسلام کے پاس موجود ہے' جو دو ایسی مشترک قدروں کا علمبردار ہے جن کی لڑی میں پوری انسانیت کو پرویا جا سکتا ہے اور جن کی بنیاد پر مشرق بعید کے زرد رو' مغرب بعید کے سرخ و سپید اور افریقہ کے سیاہ فام انسانوں میں بھائی چارہ قائم ہو سکتا ہے اور باہمی اپنائیت اور یگانگت کے احساسات بیدار ہو سکتے ہیں۔ سورۃ الحجرات کی ایک ہی آیت میں یہ دونوں مشترک اقدار بھی بیان ہوئی ہیں اور انسانوں کے مابین فرق و امتیاز کی تمام غلط بنیادوں اور عزت و شرف کے باطل پیمانوں کی نفی کر کے فرق و تمیز اور عزت و شرف کی واحد بنیاد بھی واضح کر دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ (الحجرات:١٣)

''اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں شعوب و قبائل میں تقسیم کر دیا تاکہ باہم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ (باقی رہا عزت کا سوال تو) تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔''

گویا دنیا بھر کے تمام انسانوں کے مابین دو وحدتیں مشترک ہیں: ایک وحدتِ خالق اور دوسری وحدتِ آدم۔ روئے زمین پر جتنے انسان بھی بس رہے ہیں وہ سب خدا کی مخلوق' لہٰذا باہم مساوی' اور آدم وحوا کی اولاد' لہٰذا آپس میں بھائی بھائی ہیں: ((يَآ اَيُّهَا النَّاسُ كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا)) ان کے مابین رنگ و نسل اور شکل اور زبانوں کا اختلاف صرف باہمی تعارف کے لیے ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی عزت و شرف کی بنیاد نہیں۔ عزت و شرف کا معیار تو ایک ہی ہے اور وہ ہے خدا کا خوف! —— غور فرمایئے یہ باتیں آج کے اس نام نہاد ترقی یافتہ دور میں بھی کیسی بعید اور خالص نظری و کتابی محسوس ہوتی ہیں' لیکن محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ بات آپؐ کے بدترین دشمن بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے واقعتاً ان ہی اساسات پر ایک معاشرہ عملاً قائم فرما دیا اور ایک

باقاعدہ ریاست کی بنیاد رکھ دی۔(۱)

سورۃ الحجرات کی محولہ بالا آیت میں جو تین مضامین بیان ہوئے ہیں' وہی عکسی ترتیب کے ساتھ سورۃ النساء کی پہلی آیت میں بیان ہوئے ہیں:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا۝ (النسآء)

''اے لوگو! ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے پیدا کیا تمہیں ایک جان سے اور بنایا اسی سے اس کا جوڑا۔ اور پھیلا دیے انہی سے کثیر تعداد میں مرد اور عورتیں۔ اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کا واسطہ تم ایک دوسرے کو دیتے رہتے ہو اور رحمی رشتوں سے۔ بے شک اللہ تم پر نگران و نگہبان ہے۔''

یعنی وہی تقویٰ کی تعلیم اور وحدتِ الٰہ و رب اور وحدتِ آدم وحوا کو ملحوظ رکھنے کی تاکید' یہ دو بنیادیں ہر دو انسانوں کے مابین مشترک ہیں' چاہے وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے' کالے ہوں یا گورے' متمدّن ہوں یا غیر متمدّن' مرد ہوں یا عورت اور چاہے کسی نسل سے تعلق رکھتے ہوں' کوئی نظریہ وعقیدہ رکھتے ہوں' کسی شکل وصورت کے مالک ہوں اور کوئی سی زبان بولتے ہوں۔ آیت کے دوسرے حصے میں ان ہی دو اساسات کے تقاضوں کو کھول کر بیان کر دیا۔ پہلی اصل کی معرفت کا تقاضا تقویٰ ہے اور دوسری اصل کا تقاضا رحمی تعلق کا لحاظ ہے جس کے اعتبار سے آدم وحوا پر جا کر پوری نوعِ انسانی ایک ہو جاتی ہے۔(۲)

---

(۱) مثلاً ایچ جی ویلز جس نے آنحضور ﷺ کی سیرت طیبہ پر نہایت رکیک حملے بھی کیے' لیکن ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کیا کہ اگرچہ انسانی اخوت ومساوات کے مواعظ حسنہ کی تو' بقول اس کے' مسیح ناصری (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کے یہاں بھی کمی نہیں' لیکن ان اساسات پر ایک انسانی معاشرے کا واقعی قیام صرف محمد (ﷺ) کا کارنامہ ہے!

(۲) قرآن حکیم کا یہ اعجاز پیش نظر رہے کہ محولہ بالا دونوں آیتوں میں خطاب يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے نہیں بلکہ يَاَيُّهَا النَّاسُ سے ہے' اس لیے کہ ان میں وہ اساسات اجاگر کی جا رہی ہیں جو پوری نوعِ انسانی میں مشترک ہیں۔

برادرانِ عزیز! یہ ہے قرآن حکیم کی وہ تعلیم جس میں ایک فرد کے داخلی سکون و اطمینان سے لے کر پورے عالم انسانی میں پائیدار اور محکم امن کے قیام کے امکانات مضمر ہیں۔ اب ذرا ایک جانب اپنی خوش قسمتی کا تصور کیجیے کہ آپ اس عالم انسانی کا وہ واحد گروہ ہیں جس کے پاس ایسی عظیم الشان تعلیم موجود ہے اور دوسری جانب اس صورتِ حال کو دیکھئے اور سر دھنیے کہ عالم اسلام بھی آج فلسفوں اور نظریوں کے لیے دست سوال ان لوگوں کے سامنے دراز کر رہا ہے جو خود ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ حتیٰ کہ آج ''دنیا بھر کے مزدورو متحد ہو جاؤ!'' کا نعرہ بھی عالم اسلام میں اس لیے مقبول ہو رہا ہے کہ اس میں بین الاقوامیت کی ایک جھلک تو نظر آتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ آج اس دین کے نام لیوا' جس نے ہر قسم کی قوم پرستی (Nationalism) کا خاتمہ کیا اور جس کی تعلیم و تربیت کا منتہائے کمال یہ تھا کہ قریش کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والا اور پورے عالم اسلامی اور وقت کی عظیم ترین مملکت کا فرمانروا ایک حبشی النسل' سیاہ فام' آزاد شدہ غلام کو ''سیدنا'' کے خطاب سے یاد کیا کرتا تھا' اپنی مشکلات کا حل ایک نسلی قومیت میں تلاش کر رہے ہیں —— اللہ اکبر' خودفراموشی ہو تو ایسی! —— اور قلب ماہیت ہو تو اتنی!

حضرات! چاہے ہمیں اس کے تسلیم کرنے میں کتنی ہی ہچکچاہٹ محسوس ہو' واقعہ یہی ہے کہ قرآن کی تعلیمات سے سب سے زیادہ بعید خود ہم مسلمان ہیں' اور اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ قرآن کے فکر کو اُجاگر کرنے اور اس کے نورِ ہدایت کو پھیلانے کا کام بالکل ابتدا سے شروع کیا جائے' اور پہلے خود مسلمانوں کو قرآنی تعلیمات سے روشناس کیا جائے اور پھر پورے عالم انسانی میں قرآن کی رہنمائی کو واضح کیا جائے۔ اور چونکہ یہ بنیادی کام صرف ایسے نوجوان طلبہ کے ذریعے ہو سکتا ہے جو جدید علوم وفنون سے بھی آراستہ ہوں اور دینی جذبے اور مذہبی ذہن وفکر سے بھی مسلح ہوں اس لیے میں نے آپ کی اس مجلس میں شرکت کی دعوت کو غنیمت سمجھا اور یہی آج کی اس مجلس میں اظہارِ خیال پر خصوصی مسرت کا وہ دوسرا سبب ہے جس کا تذکرہ میں نے ابتدا میں کیا تھا

کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور میں دین کے احیاء اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے جس اساسی کام کی ضرورت ہے وہ درحقیقت کچھ ایسے نوجوان طلبہ ہی کے ذریعے انجام پا سکتا ہے جو جدید وقدیم علوم اور قرآن کے علم وحکمت کی تحصیل اور تعلیم وتعلّم کے لیے اپنی زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی ان گزارشات کی بنیاد قرآن مجید کے معروضی مطالعے پر رکھی ہے اور اپنی جانب سے کچھ عرض کرنے کی بجائے قرآن حکیم ہی کی چند آیات کے مضمرات کو کھول دیا ہے' تاکہ آپ لوگوں پر قرآن کی عظمت آشکارا ہو اور اس کے علم وحکمت کی تحصیل کا جذبہ پیدا ہو سکے' اور اگر میری آج کی ان گزارشات کے نتیجے میں آپ میں سے کسی ایک نوجوان طالب علم کے دل میں بھی قرآن کے تعلیم وتعلم کے لیے زندگی وقف کرنے کا ارادہ پیدا ہو جائے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت پھل ہوئی۔

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمینOO

مُسلمانوں پر
قرآن مجید کے حقُوق

ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت واستعداد
قرآن مجید کے مندرجہ ذیل پانچ حقوق عائد ہوتے ہیں

❁ پہلا حق

ایمان وتعظیم 300

❁ دوسرا حق

تلاوت وترتیل 306

❁ تیسرا حق

تذکّر وتدبّر 315

❁ چوتھا حق

حکم واقامت 326

❁ پانچواں حق

تبلیغ وتبیین 339

اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ان کی ادائیگی کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى
اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْلِيْ اَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ!

برادرانِ دین!

آپ کو معلوم ہے کہ آج کل ہمارے ملک میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں سطحوں پر ''نزولِ قرآن مجید کا چودہ سو سالہ جشن'' منایا جا رہا ہے۔(۱) اس سلسلے میں دو باتیں سمجھ لینے کی ہیں۔

ایک یہ کہ اس قسم کی نئی نئی تقریبات کی ایجاد و ترویج ہمارے دین کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتی۔ ہمیں اپنے تمام دینی جذبات کے اظہار کے لیے صرف ان تقریبات پر اکتفاء و قناعت کرنا چاہیے جو حضور نبی اکرم ﷺ سے ماثور چلی آ رہی ہیں۔ ان میں نت نئے اضافوں سے دین میں بدعت کا دروازہ کھلتا ہے' جس سے بے شمار خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ آنحضور ﷺ کا یہ فرمان مبارک ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے کہ:

((وَشَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ))(۲)

''سب سے برے کام وہ ہیں جو دین میں نئے ایجاد کر لیے جائیں۔ ایسا ہر کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی و ضلالت ہے۔''

موجودہ سلسلۂ تقریبات کے ساتھ لفظ ''جشن'' بھی خاص اہمیت کا حامل ہے' اس سے ذہن خواہی نخواہی جشنوں کے اس سلسلے کی جانب منتقل ہو جاتا ہے جو خیبر سے کراچی تک مختلف علاقائی ناموں سے منائے جا رہے ہیں اور جن میں اس نام نہاد ثقافت کا

(۱) واضح رہے کہ یہ تقریر اس دور کی ہے جب ۱۹۶۸ء میں صدر ایوب خان کے دورِ اقتدار کے دس برس مکمل ہونے کی خوشی میں پورے ملک میں سرکاری سطح پر مختلف عنوانات کے تحت ''جشن'' منائے جا رہے تھے' مثلاً جشن خیبر اور جشن مہران وغیرہ۔ اسی سلسلہ ہائے جشن میں ایک اضافہ ''جشن نزول قرآن'' کا بھی تھا۔

(۲) سنن النسائی' کتاب صلاۃ العیدین' باب کیف الخطبۃ۔

مظاہرہ کیا جاتا ہے جو قرآن مجید کی تعلیمات پر ایک کھلا طنز ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الحاد پسند اور اباحیت پرست لوگوں کے لیے اس قسم کے بے شمار جشنوں کے اہتمام کے ساتھ جشنِ نزولِ قرآن مجید کا انعقاد غالباً ایک رشوت ہے جو مذہبی ذوق رکھنے والے لوگوں کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ واللہ اعلم۔

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس قسم کی تقریبات سے اگر یہ فائدہ اٹھایا جائے کہ ان کے ذریعے عوام میں دین و مذہب سے لگاؤ پیدا ہو‘ قرآن حکیم کے ساتھ ان کا ربط و تعلق بڑھے اور اس بُعد میں کمی ہو جو آج ہمارے اور قرآن مجید کے مابین پیدا ہو گیا ہے‘ تو پھر بھی ان کے انعقاد کے جواز کا کوئی پہلو شاید پیدا کیا جا سکے‘ لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اس قسم کا کوئی فائدہ اس نوعیت کی تقاریب سے حاصل نہیں ہوتا۔ قرآن کی تزئین و آرائش یا حسنِ قراءت کے مظاہروں اور مقابلوں سے تو بہر حال اس قسم کے کسی فائدے کے حصول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو کانفرنسیں یا جلسے قرآن مجید کے نام پر منعقد ہوتے ہیں ان میں بھی اکثر سارا زور قرآن مجید کے مقام و مرتبہ کی وضاحت یا اس کی شان کے بیان پر صرف کر دیا جاتا ہے اور اس بات کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے کہ ہم پر بحیثیت مسلمان قرآن مجید کے کیا کیا حقوق عائد ہوتے ہیں اور ان کی ادائیگی کی کیا صورت ممکن ہے! حالانکہ جہاں تک قرآن مجید کے مقام یا مرتبے اور شان و عظمت کا تعلق ہے‘ واقعہ یہ ہے کہ اس کا بیان تو کجا کماحقہٗ ادراک بھی کسی انسان کے بس میں نہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ ؏ قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند گوہری!

قرآن حکیم کے اصل مقام و مرتبہ کا علم صرف اُس شاہِ ارض و سماوات کو ہے جس کا یہ کلام ہے اور اس کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ صرف وہ ذاتِ بابرکت ہے جس پر یہ نازل ہوا‘ صلی اللہ علیہ وسلم۔[1]

---

(۱) قرآن مجید کی حقیقی قدر و منزلت اور واقعی مقام و مرتبہ کا ادراک عام انسانی ادراکات کی سطح سے اس قدر ماوراء ہے کہ فکرِ انسانی کی رہنمائی کے لیے خود قرآن نے ایک تمثیل کے ذریعے اس کا بس ایک ہلکا سا تصور پیش کیا ہے کہ

ہمارا اصل کام یہ ہے کہ پوری دیانت داری کے ساتھ پہلے یہ سمجھیں کہ اس کتابِ مبارک کے کیا حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ پھر یہ دیکھیں کہ آیا ہم انہیں ادا کر رہے ہیں یا نہیں۔ اور اگر یہ معلوم ہو کہ ایسا نہیں ہے کہ تو پھر یہ سوچیں کہ ان کی ادائیگی کی کیا صورت ممکن ہوسکتی ہے اور پھر بلا تاخیر اِس کے لیے سرگرمِ عمل ہو جائیں۔ اس لیے کہ اس کا براہِ راست تعلق ہماری عاقبت اور نجات سے ہے اور اس معاملے میں کسی کوتاہی کی تلافی قرآن حکیم کی شان میں قصیدے پڑھنے سے بہر حال نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ میں آج کی صحبت میں انہی امور پر کسی قدر وضاحت سے گفتگو کروں گا۔

ہر مسلمان پر قرآن مجید کے پانچ حقوق

ثقیل الفاظ یا دینی اصطلاحات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے عام زبان میں بیان کیا جائے تو قرآن مجید کے یہ پانچ حقوق ہر مسلمان پر عائد ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ اسے مانے۔ (ایمان و تعظیم)

دوسرے یہ کہ اسے پڑھے۔ (تلاوت و ترتیل)

تیسرے یہ کہ اسے سمجھے۔ (تذکّر و تدبّر)

چوتھے یہ کہ اس پر عمل کرے۔ (حکم و اقامت)

اور پانچویں یہ کہ اسے دوسروں تک پہنچائے۔ (تبلیغ و تبیین)

اب میں چاہتا ہوں کہ ان پانچوں حقوق کی قدرے تفصیل ان اصطلاحات کی مختصر تشریح کے ساتھ آپ حضرات کے سامنے پیش کروں جو خود قرآن مجید میں ان کے لیے استعمال ہوئی ہیں، تاکہ ضمنی فائدے کے طور پر آپ حضرات قرآن مجید کی بعض بنیادی اصطلاحات سے بھی مانوس ہو جائیں۔

◄ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (الحشر)

''اگر ہم اُتار دیتے اس قرآن کو کسی پہاڑ پر تو تم دیکھتے کہ وہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ پڑتا۔ اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔''

پھلا حق

ایمان و تعظیم

ماننے کا اصطلاحی نام ایمان ہے اور اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک ''اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ'' اور دوسرے ''تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ''۔ اقرارِ لسانی دائرۂ اسلام میں داخلے کی شرطِ لازم ہے اور تصدیق قلبی حقیقی ایمان کا لازمہ ہے۔

قرآن پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ زبان سے اس کا اقرار کیا جائے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے' جو برگزیدہ فرشتے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا۔ اس اقرار سے انسان دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے' لیکن حقیقی ایمان اسے اُس وقت نصیب ہوتا ہے جب ان تمام امور پر ایک پختہ یقین اس کے قلب میں پیدا ہو جائے۔ پھر ظاہر ہے کہ جب یہ صورت پیدا ہو جائے گی تو خود بخود قرآن کی عظمت کا نقش قلب پر قائم ہو جائے گا اور جوں جوں قرآن پر ایمان بڑھتا جائے گا اس کی تعظیم و احترام میں بھی اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ گویا ایمان و تعظیم لازم وملزوم ہیں۔

قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پر ایمان سب سے پہلے خود نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھی رضوان اللہ علیہم اجمعین لائے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ (البقرة : ۲۸۵)

''ایمان لایا رسولؐ اس پر جو نازل کیا گیا اس کی جانب اور (اس کے ساتھی) اہلِ ایمان۔''

یہ ایمان پورے تصدیق قلب کے ساتھ تھا اور اس گہرے یقین پر مبنی تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو اس کی تعظیم و احترام کا گہرا نقش ان کے قلوب پر ثبت ہو گیا اور دوسری طرف گہری محبت اور والہانہ عشق کا ایک تعلق اس کے ساتھ قائم ہو گیا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کو نزولِ وحی کا شدت کے ساتھ انتظار رہتا تھا اور آپؐ اس کے لیے

بے چین رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وحی جلد جلد آیا کرے۔ پھر جب قرآن اترتا تھا تو آپؐ کمالِ شوق سے جلد از جلد اس کو یاد کر لینے کی کوشش کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو از راہِ محبت و شفقت ان امور میں مبالغے سے منع فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ ..... (طٰہٰ: ١١٤)

''قرآن کے لیے جلدی نہ کرو۔''

اور

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ (القیامہ)

''قرآن (کو یاد کرنے) کی جلدی میں اپنی زبان کو (تیزی سے) حرکت نہ دو۔''

نزولِ قرآن کے ابتدائی دَور میں جب ایک بار وحی کی آمد میں قدرے دیر ہو گئی تو یہ وقفہ آنحضور ﷺ پر اس قدر شاق گزرا کہ حضورؐ فرماتے ہیں کہ شدتِ غم سے میں سوچتا تھا کہ اپنے آپ کو پہاڑ پر سے گرا دوں۔ رات کا اکثر حصہ آپ ﷺ اپنے پروردگار کے حضور میں کھڑے ہو کر قرآن پڑھتے ہوئے گزار دیتے تھے' حتیٰ کہ آپ کے پائے مبارک متورم ہو جاتے تھے اور قرآن ہی کی شہادت ہے کہ ایک تہائی' آدھی اور دو تہائی رات اس طرح بسر کرنے میں بہت سے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی آپ کا اتباع کرتے تھے۔ جیسا کہ مَیں بعد میں تفصیل سے عرض کروں گا' اکثر صحابہ ؓ ہفتے میں ایک بار ضرور قرآن مجید ختم کرتے تھے اور خود حضور ﷺ جن پر قرآن نازل ہوا' ان کا حال یہ تھا کہ صحابہؓ سے باصرار فرمائش کر کے قرآن مجید سنا کرتے تھے اور بسا اوقات شدّتِ تاثّر سے آپؐ کے آنسو بہہ نکلتے تھے۔

آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کے قرآن سے اس گہرے شغف اور اس کی جانب اس قدر التفات کا سبب یہ تھا کہ انہیں یہ ''حق الیقین'' حاصل تھا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اس کے بالکل برعکس ہمارا حال ہے۔ قرآن کے مُنزَّل من اللہ ہونے کا اقرار تو ہم کرتے ہیں' اور اس پر بھی خدا کا جتنا شکر کیا جائے کم ہے کہ اس نے ہمیں ان لوگوں میں پیدا فرما دیا جو قرآن کو خدا کا کلام مانتے ہیں' لیکن' الا ماشاء اللہ' اس کے کلامِ الٰہی ہونے کا یقین ہمیں حاصل نہیں اور درحقیقت یہی ہمارے قرآن سے بُعد اور اس کی جانب عدمِ

التفات و توجہ کا اصل سبب ہے۔ آپ شاید میری اس بات سے ناراض ہوں، لیکن اگر ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور ان کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ واقعی ہمارے قلوب قرآن پر یقین سے خالی ہیں اور ریب اور شک نے ہمارے دلوں میں ڈیرا ڈالا ہوا ہے۔ ہماری اس کیفیت کا نقشہ قرآن مجید نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ۝ (الشوریٰ)

''اور جو لوگ وارث ہوئے کتابِ الٰہی کے ان کے بعد وہ اس کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ نہ ہمارے دلوں میں اس کی کوئی عظمت ہے، نہ اس کو پڑھنے پر ہماری طبیعت آمادہ ہوتی ہے، نہ اس پر غور و فکر کی کوئی رغبت ہم اپنے اندر پاتے ہیں اور نہ ہی اسے زندگی کا واقعی لائحہ عمل بنانے کا خیال کبھی ہمیں آتا ہے۔ اس پوری صورتِ حال کا اصل سبب ایمان اور یقین کی کمی ہے اور جب تک اسے دُور نہ کیا جائے کسی وعظ و نصیحت سے کوئی پائیدار نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا ہم میں سے ہر ایک کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے دل کو اچھی طرح ٹٹولے اور دیکھے کہ وہ قرآن مجید کو بس ایک متوارث مذہبی عقیدے (dogma) کی بنا پر ایک ایسی ''مقدس آسمانی کتاب'' سمجھتا ہے جس کا زندگی اور اس کے جملہ معاملات سے کوئی تعلق نہ ہو، یا اسے یقین ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے جو اس لیے نازل ہوا ہے کہ لوگ اس سے ہدایت پائیں اور اسے اپنی زندگیوں کا لائحہ عمل بنائیں۔

اگر دوسری بات ہے تو فھوالمطلوب، اور اگر پہلا معاملہ ہے، اور مجھے اندیشہ ہے کہ ہماری ایک عظیم اکثریت کے ساتھ یہی صورت ہے، تو پھر سب سے پہلے ایمان کی اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرنی ہو گی۔ اس لیے کہ قرآن مجید کے دوسرے تمام حقوق کی

ادائیگی کا مکمل انحصار اسی پر ہے۔

پوچھا جا سکتا ہے کہ اس کمی کو پورا کرنے کی عملی تدبیر کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان کی تحصیل کا سب سے زیادہ آسان اور سب سے بڑھ کر مؤثر ذریعہ تو اصحابِ ایمان و یقین کی صحبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قلوب میں ایمان و یقین کی جو کیفیت مجسمہ ایمان اور پیکر یقین ﷺ کی صحبت کی بدولت پیدا ہوئی تھی اس کا تصور بھی اب ناممکن ہے۔ آپؐ کی وفات کے بعد بھی عوام الناس تو نورِ ایمانی کے اکتساب کے لیے ایسے خواص کی صحبت ہی کے محتاج ہیں جن کے دلوں میں ایمان و یقین کی شمعیں روشن ہوں' لیکن خود اُن ''خواص'' کے لیے نورِ ایمان کا سب سے بڑا منبع قرآن مجید ہے۔ اور اس کے بعد اخبار و آثار اور سیرتِ رسول ﷺ اور سیر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ایسا مطالعہ جس سے طالب کو حضورؐ اور صحابہؓ کی معنوی صحبت میسّر آ جائے۔ رہا خود قرآن پر یقین اور اس میں اضافہ تو اس کا تو بس ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ خود قرآن مجید ہے۔[1]

جیسا کہ میں بعد میں کسی قدر تفصیل سے عرض کروں گا' ایمان درحقیقت کوئی خارج سے ٹھونسی جانے والی چیز ہے ہی نہیں' اس کی شمع تو انسان کے اپنے باطن میں روشن ہے اور اس کا قلب بذاتِ خود وہ جامِ جہاں نما ہے جس میں کائنات کے وہ تمام حقائق ازخود منعکس ہیں جن کا دوسرا نام ایمان ہے۔ ہوتا صرف یہ ہے کہ غلط ماحول اور غلط تعلیم و تربیت کے اثرات سے انسان کی شمعِ باطن کی روشنی دھندلا جاتی ہے[2] اور اس

---

(۱) ؎ وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی قاری کو یہ قرآں کے سیپاروں میں
(مولانا ظفر علی خان)

(۲) ((كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ...... الخ)) (حدیث نبویؐ) ''ہر انسان فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے' پھر اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔''

کے اعمال بد کے سبب سے اس کا آئینۂ قلب مکدر ہو جاتا ہے![1]

اور اس آئینے کو صیقل کرنے اور انسان کی اس شمع باطن کے نور کو اجاگر کرنے کے لیے ہی کلامِ الٰہی ﴿تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ﴾[2] بن کر نازل ہوا ہے۔ تلاشِ حق کی نیت سے اسے پڑھا اور اس پر غور وفکر کیا جائے تو سارے حجابات دُور ہوتے چلے جاتے ہیں اور انسان کا باطن نورِ ایمان سے جگمگا اٹھتا ہے۔

یہ تو ہوئی نورِ ایمانی کی اوّلین تحصیل' اس کے بعد بھی جب کبھی غفلت یا غلبۂ بہیمیت کے سبب سے آئینۂ قلب غبار آلود ہو جائے تو اس کے جلاء وصیقل کا مؤثر ترین ذریعہ قرآن مجید ہی ہے' جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ)) قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا جِلَاءُ هَا؟ قَالَ :((كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ)) (رواہ البیهقی)

''بنی آدم کے قلوب بھی اسی طرح زنگ آلود ہو جاتے ہیں جیسے لوہا پانی پڑنے سے!'' دریافت کیا گیا: یا رسول اللہ! اس زنگ کو دُور کس چیز سے کیا جائے؟ فرمایا:''موت کی بکثرت یاد اور قرآن مجید کی تلاوت!''

خلاصۂ کلام یہ کہ محض ایک متوارث عقیدے کے طور پر قرآن کو ایک مقدس آسمانی کتاب ماننے سے ہماری موجودہ صورتِ حال میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی اور قرآن مجید کے ساتھ عدم التفات کا جو رویہ ہمارا اس وقت ہے' وہ نہیں بدل سکتا۔ قرآن مجید کے جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کی ادائیگی کی اوّلین شرط یہ ہے کہ سب سے پہلے ہمارے دلوں میں یہ یقین پیدا ہو کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور ہماری ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے۔

---

(۱) ﴿كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (المطففین)
''نہیں' بلکہ ان کے اعمال کے نتیجے میں ان کے قلوب پر زنگ چڑھ گیا ہے۔''

(۲) سورۂ قٓ' آیت ۸ :''سجھانے والی اور یاددہانی ہر اُس بندے کے لیے جو (خدا کی طرف) رجوع کرے۔''

اس یقین کے پیدا ہوتے ہی قرآن کے ساتھ ہمارے تعلق میں ایک انقلاب آجائے گا۔ یہ احساس کہ یہ ہمارے اس خالق و مالک کا کلام ہے جس کی ذات تبارک و تعالیٰ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے' اور جس کا کسی ادنیٰ ترین درجے میں بھی کوئی تصور ہمارے بس میں نہیں اور جس کی ذات کے ادراک سے عجز کا احساس ہی بقول افضل البشر بعد الانبیاء کمالِ ادراک (۱) ہے' ہمارے فکر و نظر میں ایک انقلاب برپا کردے گا۔ پھر ہمیں محسوس ہوگا کہ اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے قرآن سے بڑی کوئی دولت اور اس سے عظیم تر کوئی نعمت موجود نہیں۔ (۲)

پھر اس کی تلاوت ہماری روح کی غذا اور اس پر غور و فکر ہمارے قلوب و اذہان کے لیے روشنی بن جائیں گے اور یقیناً یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی کہ اس کی تلاوت سے ہم کبھی سیر نہ ہوسکیں گے اور اپنی بہترین ذہنی و فکری صلاحیتوں اور اپنی پوری عمر کو اس پر تدبر و تفکر میں کھپا کر بھی ہم محسوس کریں گے کہ ع

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

---

(۱) حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا ایک قول "اَلْعِجْزُ عَنْ دركِ الذَّاتِ اِدْرَاكٌ" جس پر حضرت علی ؓ نے یہ گرہ لگائی کہ "وَالْبَحْثُ عَنْ كُنْهِ الذَّاتِ اِشْرَاكٌ"

(۲) جیسا کہ ایک حدیث میں آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو قرآن ایسی دولت عطا ہوئی اور پھر بھی اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کسی اور کو اس سے بڑھ کر نعمت ملی ہے' اس نے قرآن کی قدر و منزلت کو نہ پہچانا۔

دوسرا حق

تلاوت و ترتیل

قرآن کے پڑھنے کے لیے خود قرآن مجید میں اگرچہ قراءت اور تلاوت دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں' لیکن احترام و تعظیم کے ساتھ اسے ایک مقدس آسمانی کتاب سمجھتے ہوئے ذہنی اور نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر کے اتباع اور پیروی کے جذبے کے ساتھ قرآن کو پڑھنے کے لیے اصل قرآنی اصطلاح ''تلاوت'' ہی کی ہے۔ اس لیے بھی کہ یہ لفظ صرف آسمانی صحیفوں کے پڑھنے کے لیے خاص ہے' جبکہ قراءت ہر چیز کے پڑھنے کے لیے عام ہے اور اس لیے بھی کہ تلاوت کا لغوی مفہوم ساتھ لگے رہنے اور پیچھے پیچھے آنے کا ہے' جبکہ قراءت مجرد جمع و ضم کے لیے آتا ہے۔

عام گفتگو میں ابتداءً قراءت کا لفظ قرآن سیکھنے اور اس کے علم کی تحصیل کے لیے استعمال ہوتا تھا اور قاری عالم قرآن کو کہا جاتا تھا' لیکن بعد میں یہ اصطلاح قرآن کو اہتمام اور تکلّف کے ساتھ قواعد تجوید کی خصوصی رعایت اور حروف کے مخارج کی صحت کا پورا پورا لحاظ کرتے ہوئے پڑھنے کے لیے خاص ہوتی چلی گئی' جبکہ تلاوت کا اطلاق عام طریقے پر انابت اور خشوع و خضوع کے ساتھ حصولِ برکت و نصیحت کی غرض سے قرآن پڑھنے پر ہونے لگا۔

تلاوتِ کلامِ پاک ایک بہت بڑی عبادت ہونے کے ساتھ ساتھ ایمان کو تر و تازہ رکھنے کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔

> قرآن صرف ایک بار پڑھ لینے کی چیز نہیں ہے بلکہ بار بار پڑھنے اور ہمیشہ پڑھتے رہنے کی چیز ہے' اس لیے کہ یہ روح کے لیے بمنزلۂ غذا ہے اور جس طرح جسم انسانی اپنی بقاء و

تقویت کے لیے مسلسل غذا کا محتاج ہے جو انسان کے جسدِ حیوانی کی طرح سب زمین ہی سے حاصل ہوتی ہے اسی طرح روحِ انسانی جو خود آسمانی چیز ہے' کلامِ ربانی کے ذریعے مسلسل تغذیہ وتقویت کی محتاج ہے!

اگر قرآن بس ایک مرتبہ پڑھ لینے کی چیز ہوتی تو کم از کم نبی اکرم ﷺ کو تو اس کے بار بار پڑھنے کی قطعاً کوئی حاجت نہ تھی۔ لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کو مسلسل قرآن پڑھتے رہنے کی بار بار تاکید ہوئی۔ عہدِ رسالت کے بالکل ابتدائی ایام میں تو انتہائی تاکیدی حکم ہوا کہ رات کا اکثر حصہ اپنے ربّ کے حضور میں کھڑے ہو کر ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھتے ہوئے بسر کرو۔ بعد کے ادوار میں بھی' خصوصاً جب مشکلات ومصائب کا زور ہوتا تھا اور صبر واستقامت کی خصوصی ضرورت ہوتی تھی' آنحضور ﷺ کو تلاوتِ قرآن ہی کا حکم دیا جاتا تھا۔ چنانچہ سورۃ الکہف میں ارشاد ہوا ہے:

وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتٰبِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾ (الکہف)

''اور پڑھا کر جو وحی ہوئی تجھ کو تیرے پروردگار کی کتاب سے۔ کوئی اس کی باتوں کا بدلنے والا نہیں اور نہ ہی تو کہیں پا سکے گا اس کے سوا پناہ کی جگہ۔''

اور سورۃ العنکبوت میں ارشاد ہوا:

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ (العنکبوت:۴۵)

''پڑھا کر جو وحی ہوئی تیری طرف کتابِ الٰہی اور قائم رکھ نماز کو!''

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی تلاوت مسلسل کرتے رہنا ضروری ہے اور یہ مؤمن کی روح کی غذا' اس کے ایمان کو تر وتازہ اور سرسبز وشاداب رکھنے کا اہم ترین ذریعہ اور مشکلات وموانع کے مقابلے کے لیے اس کا سب سے مؤثر ہتھیار ہے۔

کتابِ الٰہی کے اصل قدردانوں کی یہ کیفیت قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے کہ:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ (البقرۃ : ۱۲۱)

''جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا فرمائی وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے۔''

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس آیتِ کریمہ کا مصداق بنائے اور ہم سب کو توفیق دے کہ ہم قرآن مجید کا حق تلاوت ادا کر سکیں۔ لیکن اس کے لیے سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ قرآن کی تلاوت کا حق ہے کیا؟ اور اس کی ادائیگی کی شرائط کیا ہیں؟

ا) تجوید

اس سلسلے میں سب سے پہلی ضروری چیز قرآن مجید کے حروف کی شناخت' ان کے مخارج کا صحیح علم اور رموزِ اوقافِ قرآنی کی ضروری معلومات کی تحصیل ہے' جسے اصطلاحاً تجوید کہتے ہیں اور جس کے بغیر قرآن مجید کی صحیح اور رواں تلاوت ممکن نہیں۔ آج سے تیس چالیس سال قبل تک ہر مسلمان بچے کی تعلیم کی ابتدا اسی سے ہوئی تھی اور وہ سب سے پہلے قرآن کے حروف کی پہچان اور ان کی صحیح ادائیگی کی صلاحیت حاصل کرتا تھا۔ افسوس کہ اِدھر ایک عرصے سے مساجد و مکاتب کی تعلیم کے زوال اور کنڈر گارٹن قسم کے مدارس کے رواج کی بدولت یہ صورتِ حال پیدا ہو چکی ہے کہ مسلمان قوم کی نوجوان نسل کی ایک عظیم اکثریت حتیٰ کہ بہت سے بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے لوگ بھی قرآن مجید کو ناظرہ پڑھنے پر بھی قادر نہیں۔ میں ایسے تمام حضرات سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنی اس کمی کا احساس کریں اور جلد از جلد اسے دُور کرنے کی کوشش کریں' اور خواہ وہ عمر کے کسی بھی مرحلے میں ہوں قرآن مجید کو صحیح پڑھنے کی صلاحیت لازماً پیدا کریں۔ ساتھ ہی ہمیں چاہیے کہ اپنی اولاد کے بارے میں یہ طے کر لیں کہ ان کی تعلیم کی ابتدا اسی سے ہوگی اور سب سے پہلے وہ قرآن کے حروف کی پہچان اور ان کو صحیح مخارج سے ادا کرنا سیکھیں گے۔ اس معاملے میں حد سے زیادہ غلو تو اگرچہ اچھا نہیں لیکن قرآن مجید کو روانی کے ساتھ صحیح اصوات و مخارج اور رموزِ اوقاف کی رعایت و لحاظ کے ساتھ پڑھنے پر قادر ہونا تو ہر معمولی پڑھے لکھے انسان کے لیے بھی لازم اور قرآن مجید کے حق تلاوت کی ادائیگی کی شرطِ اوّلین ہے۔

۲) روزانہ کا معمول

قرآن مجید کے حق تلاوت کی ادائیگی کے لیے دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ تلاوتِ قرآن کو زندگی کے معمولات میں مستقل طور پر شامل کیا جائے اور ہر مسلمان تلاوت کا ایک مقررہ نصاب پابندی کے ساتھ لازماً پورا کرتا رہے۔ مقدارِ تلاوت مختلف لوگوں کے لیے مختلف ہوسکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ مقدار جس کی آنحضورﷺ نے توثیق فرمائی ہے' یہ ہے کہ تین دن میں قرآن ختم کیا جائے' یعنی دس پارے روزانہ پڑھے جائیں۔ اور کم سے کم مقدار' جس سے کم کا تصور بھی ماضی قریب تک نہ کیا جاسکتا تھا' یہ ہے کہ ایک پارہ روزانہ پڑھ کر ہر مہینے قرآن ختم کرلیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ وہ کم از کم نصاب ہے جس سے کم پر تلاوتِ قرآن کے معمول کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ درمیانی درجہ جس پر اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم عامل تھے اور جس کا حکم بھی ایک روایت کے مطابق آنحضورﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو دیا تھا' یہ ہے کہ ہر ہفتے قرآن ختم کرلیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ صحابہؓ میں قرآن کی تقسیم سورتوں کے علاوہ صرف سات احزاب میں تھی[1] جن میں سے پہلے چھ احزاب علی الترتیب تین' پانچ' سات' نو' گیارہ اور تیرہ سورتوں پر مشتمل ہیں اور ساتواں جو حزبِ مفصّل کہلاتا ہے' بقیہ قرآن مجید پر مشتمل ہے۔ اس طرح ہر حزب کم وبیش چار پاروں کا بنتا ہے جن کی تلاوت انتہائی سکون واطمینان کے ساتھ دو گھنٹوں میں کی جاسکتی ہے جو دن رات کے عشر سے بھی کم ہے۔

تلاوتِ قرآن مجید کا یہ نصاب ہر اُس شخص کے لیے لازمی ہے جو دینی مزاج اور مذہبی ذوق رکھتا ہو اور قرآن مجید کا حقِ تلاوت ادا کرنے کا خواہش مند ہو' چاہے وہ عوام میں سے ہو یا اہلِ علم وفکر کے طبقے سے تعلق رکھتا ہو' اس لیے کہ جہاں تک روح کے تغذیہ و تقویت کا تعلق ہے اس کے اعتبار سے تو سب ہی اس کے محتاج ہیں۔ اس کے علاوہ عوام کو اس سے ذکر وموعظت حاصل ہوگی اور اہل علم وفکر حضرات اس سے اپنے علم کے

---

(۱) واضح رہے کہ تیس پاروں اور رکوعوں میں قرآن کی تقسیم بعد کی چیز ہے۔

لیے روشنی اور فکر کے لیے رہنمائی پائیں گے۔ (۱) حتیٰ کہ وہ حضرات بھی جو دن رات قرآن حکیم پر تفکّر وتدبر میں لگے رہتے ہوں اور قرآن کی ایک ایک سورت پر برسوں غور و فکر کرتے اور اس کے مشکل مقامات پر عرصۂ دراز تک توقف کرتے ہوں' وہ بھی قرآن کی اس تلاوتِ مسلسل سے مستغنی نہیں' بلکہ ان کو اس کی دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہی ضرورت ہے' اس لیے کہ قرآن کی تلاوتِ مسلسل سے اُن کی بہت سی مشکلیں از خود حل ہوتی چلی جاتی ہیں اور بے شمار نئے پہلو سامنے آتے رہتے ہیں۔

۳) خوش الحانی

قرآن کی تلاوت کے حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ ہر شخص اپنی حد تک بہتر سے بہتر اسلوب' اچھی سے اچھی آواز اور زیادہ سے زیادہ خوش الحانی سے قرآن مجید کی تلاوت کرے۔ اس لیے کہ حسنِ سماعت کا ذوق کم وبیش ہر انسان میں ودیعت کیا گیا ہے اور اچھی آواز ہر شخص کو بھاتی ہے۔ اسلام دین فطرت ہے اور انسان کے کسی فطری جذبے کو یکسر ختم نہیں کرتا' بلکہ تمام فطری داعیات کو صحیح راستوں پر ڈالتا ہے۔ حسنِ نظر اور حسنِ سماعت انسان کے فطری داعیات میں سے ہیں۔ قرآن مجید کی خوبصورت اور خوش نما کتابت سے ایک مؤمن کے حسن نظر کو حقیقی تسکین حاصل ہوتی ہے اور اس کی خوش الحانی کے ساتھ قراءت اس کے ذوقِ سماعت کو آسودگی عطا کرتی ہے ___ یہی وجہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے تاکیداً فرمایا ہے:

((زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِاَصْوَاتِكُمْ)) (۲)

''قرآن کو اپنی آوازوں سے مزین کرو۔''

---

(۱) واقعہ یہ ہے کہ اصحاب فکر جو خرد کی کسی گتھی کو سلجھانے میں مگن ہوں اور سخت اُلجھن میں ہوں' بسا اوقات قرآنِ حکیم کی تلاوتِ مسلسل کے دوران یہ محسوس کریں گے کہ جیسے دفعتہً ان کی گتھی سلجھ گئی اور الجھن حل ہو گئی اور قرآن مجید کے کسی ایسے مقام سے انہیں روشنی حاصل ہو گئی جس کو اس سے قبل بے شمار مرتبہ پڑھا تھا' لیکن چونکہ وہ مسئلہ ذہن میں موجود نہ تھا' لہٰذا اس پہلو کی جانب توجہ نہ ہوئی تھی۔

(۲) عن البراء بن عازب رضی اللّٰہ عنہ' رواہ ابو داوٗد والنسائی۔

ساتھ ہی اس معاملے میں کوتاہی پر ان الفاظ میں تنبیہہ فرمائی کہ:

((مَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ فَلَيْسَ مِنَّا)) (۱)

''جو قرآن کو خوش الحانی سے نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔''

اور اس کے لیے مزید تشویق کے لیے خبر دی ہے کہ:

((مَا اَذِنَ اللّٰهُ لِشَيْءٍ مَا اَذِنَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَتَغَنّٰى بِالْقُرْآنِ يَجْهَرُ بِهٖ)) (۲)

''اللہ تعالیٰ کسی چیز پر اس طرح کان نہیں لگاتا جس طرح نبیؐ کی آواز پر لگاتا ہے'
جبکہ وہ قرآن کو خوش الحانی کے ساتھ بآواز بلند پڑھ رہا ہوتا ہے۔''

بارہا ایسا ہوتا تھا کہ حضور ﷺ راہ چلتے کسی صحابیؓ کو اچھی آواز سے قرآن پڑھتے ہوئے سنتے تو دیر تک کھڑے ہو کر سنتے رہتے تھے اور بعد میں اس کی تحسین بھی فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ آپؐ فرمائش کر کے بھی صحابہؓ سے قرآن مجید سنا کرتے تھے۔ چنانچہ حدیث میں ایک واقعہ آتا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے قرآن سنانے کی فرمائش کی۔ انہوں نے عرض کیا: ''حضورؐ! کیا آپ کو قرآن سناؤں؟ حالانکہ آپ ہی پر تو وہ نازل ہوا ہے!'' آپؐ نے فرمایا: ''ہاں میں چاہتا ہوں کہ دوسرے سے سنوں!'' چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ نے آپؐ کو قرآن سنایا اور آپؐ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اسی طرح ایک بار آپؐ نے ایک صحابی (حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ) کو حسن صوت کے ساتھ قرآن پڑھتے سنا اور ان الفاظ میں تحسین فرمائی کہ تمہیں مزامیر آلِ داوٗد (علیہ السلام) میں سے حصہ ملا ہے۔

اس معاملے میں بھی غلو اگرچہ مضر ہے' خصوصاً جب اس میں تصنع یا ریا شامل ہو جائیں اور اس کی صورت ایک پیشے کی بن جائے تب تو یہ مہلکات میں سے شمار ہونے والی چیز بن جاتی ہے' لیکن ہر شخص کو اپنے ذوقِ حسن سماعت کی تسکین بہرحال قرآن کی تلاوت و سماعت ہی میں تلاش کرنی چاہیے' اور خود اپنے حدِ امکان تک اچھے سے اچھے طریقے پر تلاوت کی سعی کرنی چاہیے۔

---

(۱) عن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ' رواہ ابوداوٗد۔

(۲) عن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ' رواہ ابوداوٗد۔

۴) آدابِ ظاہری و باطنی

قرآن کے حق تلاوت کی ادائیگی کی شرائط میں سے تلاوت کے کچھ ظاہری اور باطنی آداب بھی ہیں۔ یعنی یہ کہ انسان باوضو ہو' قبلہ رُخ بیٹھ کر تلاوت کرے' اور اس کی ابتدا تعوّذ سے کرے پھر یہ کہ اس کا دل کلام اور صاحب کلام دونوں کی عظمت سے معمور ہو۔ حضورِ قلب' خشوع و خضوع اور انابت و رجوع الی اللہ کے ساتھ تلاوت کرے' اور خالص طلب ہدایت کی نیت اور قرآن حکیم کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو بدلنے کے عزمِ مصمّم کے ساتھ قرآن کو پڑھے' اور مسلسل تذکّر و تدبر اور تفہم و تفکّر کرتا رہے اور اپنے خود ساختہ خیالات و نظریات کی سند قرآن سے حاصل کرنے کے لیے نہیں' بلکہ حتی الامکان معروضی طور پر اس سے ہدایت اخذ کرنے کے لیے پڑھے۔ اس لیے کہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' تلاوت کا لغوی مفہوم ''پیچھے لگنے'' اور ''ساتھ رہنے'' کا ہے' اور نفس میں حوالگی و سپردگی کی کیفیت تلاوت کا اصل جوہر ہے۔

۵) ترتیل

تلاوتِ قرآن پاک کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ نماز (خصوصاً تہجد) میں اپنے ربّ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو کر انتہائی سکون اور اطمینان کے ساتھ متذکرہ بالا تمام شرائط کی پابندی کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر اور توقف کرتے ہوئے قرآن پڑھا جائے جس سے قلب پر اثرات مترتب ہوتے چلے جائیں۔ قرآن کی اصطلاح میں اس قسم کی تلاوت کا نام ترتیل ہے اور نبی اکرم ﷺ کو جو احکام بالکل ابتدائی عہد رسالت میں ملے ان میں سے غالباً اہم ترین حکم یہی تھا کہ:

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ (المزمل)

''اے مزمل! رات کو کھڑے رہا کرو سوائے اس کے تھوڑے سے حصے کے' (یعنی) آدھی رات' یا اس سے کچھ کم یا اس سے کچھ زائد۔ اور قرآن کو پڑھا کرو ٹھہر ٹھہر کر۔''

قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے میں ایک گونہ مماثلت اس کے طریق نزول سے بھی پیدا ہو جاتی ہے' اس لیے کہ قرآن خود آنحضورﷺ پر ''جُمْلَةً وَّاحِدَةً''، یعنی یک بارگی نہیں اترا' بلکہ تھوڑا تھوڑا اترا ہے۔ اور سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے کفار کا یہ اعتراض نقل کر کے کہ آخر پورا قرآن ایک ہی بار کیوں نازل نہیں ہو جاتا' جواباً آنحضورﷺ سے خطاب کر کے فرمایا ہے کہ:

كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝ (الفرقان)

''اسی طرح (اُتارا) تا کہ ہم اس کے ذریعے تمہارے دل کو ثبات عطا فرمائیں'
چنانچہ پڑھ سنایا ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر۔''

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ترتیل تثبیت قلبی کا مؤثر ذریعہ ہے اور اس طرح قرآن پڑھنے سے قلب انسانی کو زیادہ سے زیادہ فیض و افادہ حاصل ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ شدتِ تاثر سے قلب پر گریہ طاری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن عربی صاحب ''احکام القرآن'' نے ترتیل کی تفسیر میں حضرت حسنؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ آنحضورﷺ کا گزر ایک ایسے شخص پر ہوا جو قرآن مجید اس طرح پڑھ رہا تھا کہ ایک ایک آیت پڑھتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا۔ اس پر حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا: ''کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا قولِ مبارک ﴿وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا﴾ نہیں سنا؟ دیکھ لو یہ ہے ترتیل!'' قرآن مجید کو بطریق ترتیل تلاوت کرنے ہی کا حکم ہے آنحضورﷺ کے اس قولِ مبارک میں کہ:

((اُتْلُوا الْقُرْآنَ وَابْكُوْا)) (ابن ماجه) ''قرآن کو پڑھو اور روؤ!''

چنانچہ خود نبی اکرمﷺ کی صلوٰۃِ لیل کی یہ کیفیت روایات میں بیان ہوئی ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے جوشِ گریہ سے آپؐ کے سینۂ مبارک سے ایسی آواز نکلتی تھی جیسے کوئی ہانڈی چولہے پر پک رہی ہو۔

۶) حفظ

اس ترتیل کی شرط لازم یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ قرآن یاد کیا جائے۔ بدقسمتی سے اس کا ذوق بھی ہمارے یہاں کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا ہے۔ ایک تو حفظِ قرآن کی

صرف یہ صورت مروّج رہ گئی ہے کہ پورا کلامِ پاک حفظ کیا جائے اور اس کے لیے ظاہر ہے کہ بچپن ہی کا زمانہ موزوں ہوسکتا ہے' جبکہ کلام پاک کا مفہوم سمجھنے کا کوئی سوال ہی سرے سے پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ اس کا ذوق بھی اب کم ہورہا ہے اور الاّ ماشاءَ اللہ حفظِ قرآن صرف غرباء کے ایک طبقے کے لیے ایک پیشہ بن کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ بالکل ماضی قریب میں یہ حال تھا کہ شرفاء اور اچھے کھاتے پیتے گھرانوں میں حفظ قرآن کا چرچا تھا اور ہندوستان کے بعض شہر تو ایسے بھی تھے جن میں اکثر گھروں میں کئی کئی حافظ قرآن ہوتے تھے اور وہ گھرانا نہایت منحوس سمجھا جاتا تھا جس میں کوئی ایک شخص بھی حافظ نہ ہو۔ حفظ قرآن کا یہ سلسلہ نہایت مبارک ہے اور حفاظت قرآن کی خدائی تدابیر میں سے ہے اور اس کی جانب بھی ازسرِ نو توجہ وانہماک کی شدید ضرورت ہے' لیکن میں یہاں بالخصوص جس حفظ کا تذکرہ کر رہا ہوں وہ حفظ وہ ہے جو ترتیل قرآن کا حق ادا کرنے کے لیے ہر مسلمان پر واجب ہے' یعنی یہ کہ ہر مسلمان مسلسل زیادہ سے زیادہ قرآن یاد کرنے کے لیے کوشاں رہے تاکہ اس قابل ہو سکے کہ رات کو اپنے ربّ کے حضور میں کھڑے ہو کر اس کا کلام اسے سنا سکے! افسوس ہے کہ اس کا ذوق بالکل ہی ختم ہو گیا ہے حتیٰ کہ علماء تک اس سے مستغنی ہو گئے ہیں' اور ائمہ مساجد جنہیں قرآن مجید سے سب سے زیادہ شغف ہونا چاہیے ان کا حال بھی یہ ہو گیا ہے کہ بس جتنا قرآن کبھی یاد کرلیا تھا اسی پر قناعت کیے بیٹھے ہیں اور ادل بدل کر انہی حصوں کو نمازوں میں پڑھتے رہتے ہیں۔

اس کے برعکس ہونا یہ چاہیے کہ ہر شخص قرآن کے اس حصے کو جو اُسے یاد ہو' اپنا اصل اثاثہ اور سرمایہ سمجھے اور اس میں مسلسل اضافے کے لیے کوشاں رہے' تاکہ تلاوتِ قرآن کی سب سے اعلیٰ صورت یعنی ترتیل سے زیادہ سے زیادہ حظ حاصل کر سکے — اور اپنی روح کو زیادہ سے زیادہ غذا عمدہ سے عمدہ صورت میں فراہم کر سکے !

تیسرا حق

تذکّر و تدبّر

ماننے اور پڑھنے کے بعد تیسرا حق قرآن مجید کا یہ ہے کہ اسے ''سمجھا'' جائے اور ظاہر ہے کہ کلامِ الٰہی نازل ہی اس لیے ہوا ہے اور اس پر ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کا فہم حاصل کیا جائے۔ بغیر فہم کے مجرد تلاوت کا جواز ایسے لوگوں کے لیے تو ہے جو پڑھنے لکھنے سے بالکل محروم رہ گئے ہوں اور اب تعلیم کی عمر سے بھی گزر چکے ہوں۔ ایسے لوگ اگر ٹوٹے پھوٹے طریق پر تلاوت کر لیں تو بھی بہت غنیمت ہے اور اس کا ثواب انہیں ضرور ملے گا' بلکہ ایک ایسا اَن پڑھ شخص جو ناظرہ بھی نہ پڑھ سکتا ہو اور اب اس کے لیے اس کا سیکھنا بھی ممکن نہ ہو' اگر اس یقین کے ساتھ کہ قرآن اللہ کا کلام ہے' اسے کھول کر بیٹھتا ہے اور محبت و عقیدت اور احترام و تعظیم کے ساتھ اس کی سطور پر محض انگلی پھیرتا رہتا ہے تو اس کے لیے اس کا یہ عمل بھی یقیناً موجب ثواب و برکت ہوگا۔ لیکن (۱) پڑھے لکھے لوگ جنہوں نے تعلیم پر زندگیوں کا اچھا بھلا عرصہ صرف کر دیا ہو اور دنیا کے بہت سے علوم و فنون حاصل کیے ہوں' مادری ہی نہیں غیر ملکی زبانیں بھی سیکھی ہوں' اگر قرآن مجید کو بغیر سمجھے پڑھیں تو عین ممکن ہے کہ وہ قرآن کی تحقیر و توہین اور تمسخر و استہزاء کے مجرم

---

(۱) دراصل یہی وہ حقیقت ہے جو ایک حدیث میں بیان ہوئی' لیکن جس سے یہ بات بالکل غلط طور پر سمجھی گئی کہ اچھا بھلا پڑھا لکھا اور صاحب استعداد آدمی بھی قرآن کو بے سمجھے بوجھے اور غلط سلط پڑھنے پر بھی عنداللہ ثواب کا حقدار ہوگا:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ وَالَّذِیْ یَقْرَءُ الْقُرْآنَ وَیَتَتَعْتَعُ فِیْهِ وَهُوَ عَلَیْهِ شَاقٌّ لَّهٗ اَجْرَانِ)) (بخاری و مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قرآن کے ماہر کا درجہ تو معزز اور وفادار اور فرمانبردار فرشتوں کا ہے ہی' رہا وہ شخص جو قرآن کو پڑھتے ہوئے اٹکتا ہو اور اس کے لیے زحمت اور مشقت اٹھاتا ہو تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔''

گردانے جائیں اور اس اعراض عن القرآن کی سزا تلاوت کے ثواب سے بڑھ جائے۔ الاّ یہ کہ وہ قرآن کا علم حاصل کرنے کا عزم کرلیں اور اس کے لیے سعی و جدّوجُہد شروع کردیں تو درمیانی عرصے میں اگر مجرّد تلاوت بھی کرتے رہیں تو امید ہے کہ اس کا اجر انہیں ملتا رہے گا۔

پھر ''فہمِ قرآن'' کوئی سادہ اور بسیط شے نہیں' بلکہ اس کے بے شمار مدارج و مراتب ہیں اور ہر انسان علم کے اس اتھاہ و ناپیدا کنار سمندر سے اپنی فطری استعداد' ذہنی ساخت' طبیعت کی اُفتاد — پھر اپنی اپنی سعی و جُہد' محنت و مشقت' کدوکاوش اور تحقیق و جستجو کے مطابق حصہ پاسکتا ہے' حتیٰ کہ کوئی انسان خواہ کیسی ہی اعلیٰ استعداد کا مالک کیوں نہ ہو اور کتنی ہی محنت و کاوش کیوں نہ کرلے' پھر چاہے پوری کی پوری عمر قرآن پر تدبر و تفکر میں بسر کردے' یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی بھی مرحلے پر پہنچ کر وہ سیر ہو جائے اور یہ محسوس کرے کہ قرآن کا فہم کماحقہٗ اسے حاصل ہو گیا ہے' اس لیے کہ خود صادق و مصدوق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ ایک ایسا خزانہ ہے جس کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوں گے اور جس پر غور وفکر سے انسان کبھی فارغ نہ ہو سکے گا۔[1] وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ۔ پس چاہیے کہ اصحابِ عزم و ہمت اور اربابِ حوصلہ و امنگ اس میدان کو اپنے حوصلوں اور امنگوں کی آماجگاہ بنائیں اور اس میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کریں۔

''سمجھ'' کے لیے یوں تو قرآن مجید نے فہم و فکر اور عقل و فقہ کے قبیل کے تمام ہی

---

(۱) حضرت علی ؓ سے مروی ایک طویل حدیث میں قرآن کے بارے میں آنحضور ﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

((وَلَا یَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا یَخْلُقُ عَنْ کَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُهٗ))

(رواہ الترمذی والدارمی)

''علماء کبھی اس کتاب سے سیر نہ ہو سکیں گے' نہ کثرت و تکرارِ تلاوت سے اس کے لطف میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات (یعنی نئے نئے علوم و معارف) کا خزانہ کبھی ختم ہو سکے گا۔''

الفاظ استعمال کیے ہیں' لیکن عجیب بات یہ ہے کہ فہم قرآن کے لیے وسیع ترین اصطلاح جو قرآن میں سب سے زیادہ استعمال ہوئی ہے وہ ذکر و تذکر کی ہے۔ چنانچہ خود قرآن اپنے آپ کو جابجا ذکر' ذکریٰ اور تذکرہ کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ اصطلاح درحقیقت فہم قرآن کی اوّلین منزل کا پتہ بھی دیتی ہے اور اس کی اصل غایت اور حقیقی مقصود کا سراغ بھی اس سے ملتا ہے' اور ساتھ ہی اس سے اس حقیقت کی طرف بھی رہنمائی ہوتی ہے کہ تعلیماتِ قرآنی نفس انسانی کے لیے کوئی اجنبی چیز نہیں ہیں بلکہ یہ درحقیقت اس کی اپنی فطرت کی ترجمانی ہے اور اس کی اصل حیثیت ''یاددہانی'' کی ہے' نہ کہ کسی نئی بات کے ''سکھانے'' کی۔ قرآن تمام ذی شعور انسانوں کو جنہیں وہ ''اُولُوا الْاَلْبَابِ'' اور ''قَوْمٌ یَّعْقِلُوْنَ'' قرار دیتا ہے' تفکر اور تعقل کی دعوت دیتا ہے اور اس کا اوّلین میدان خود آفاق و انفس کو قرار دیتا ہے جو آیاتِ الٰہی سے بھرے پڑے ہیں۔

ساتھ ہی وہ انہیں آیاتِ قرآنی میں بھی تفکر و تعقل کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ:

كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۝ (یونس)

''اسی طرح ہم کھولتے ہیں اپنی آیات ان لوگوں کے لیے جو تفکر کریں۔''

اور فرمایا:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۝

(النحل)

''اور اتارا ہم نے تم پر ذکر کہ تم جو کچھ لوگوں کے لیے اتارا گیا ہے اس کی وضاحت کرو' تاکہ وہ تفکر کریں۔''

اسی طرح:

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝ (البقرۃ)

''اسی طرح اللہ اپنی آیات کی وضاحت فرماتا ہے تاکہ تم تعقل کرسکو۔''

اور:

اِنَّآ جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝ (الزخرف)

''ہم نے اسے قرآن عربی بنا کر اتارا تاکہ تم اسے سمجھ سکو۔''

آیاتِ قرآنی' آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی میں تفکر و تعقّل کے

> نتیجے میں انسان محسوس کرتا ہے کہ ایک تو ان تینوں میں گہری ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور دوسرے یہ سب کامل توافق کے ساتھ بعض ایسے حقائق کی جانب رہنمائی کرتی ہیں جن کی شہادت خود اس کی اپنی فطرت میں مضمر ہے۔ اس طرح اس کے اپنے باطن کی مخفی شہادت اجاگر ہو کر اس کے شعور کے پردوں پر جلوہ فگن ہوتی ہے اور حقیقت نفس الامری کا علم' جس کا دوسرا نام ایمان ہے' اس کے شعور میں بالکل اس طرح ابھرتا ہے جیسے کسی تحریک کی بنا پر کوئی پرانی بھولی بسری بات انسان کی یادداشت کے ذخیرے کی گہرائیوں سے ابھر کر افق شعور پر طلوع ہوتی ہے اسی عمل (phenomenon) کا نام قرآنی اصطلاح میں ''تذکّر'' ہے۔

اس ''تذکر'' کی احتیاج ہر انسان کو ہے' خواہ وہ عوام الناس میں سے ہو خواہ خواص کے طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ''تذکر'' کے لیے قرآن کو انتہائی آسان بنا دیا ہے اور قرآن کی ایک ہی سورت میں چار مرتبہ یہ فرما کر کہ:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۝﴾

(القمر: ١٧، ٢٢، ٣٢، ٤٠)

> ''ہم نے آسان بنا دیا ہے قرآن کو ذکر کے لیے' تو ہے کوئی یاددہانی سے فائدہ اٹھانے والا؟''

ہر انسان پر حجت قائم کر دی ہے کہ خواہ وہ کتنی ہی کم اور کیسی ہی معمولی استعداد کا حامل کیوں نہ ہو' فلسفہ و منطق اور علوم و فنون سے کتنا ہی نابلد اور زبان و ادب کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں سے کتنا ہی ناواقف کیوں نہ ہو' وہ قرآن سے تذکر کر سکتا ہے' بشرطیکہ اس کی طبع

سلیم اور فطرت صحیح ہو اور ان میں ٹیڑھ اور کجی راہ نہ پاچکی ہو — اور وہ قرآن کو پڑھتے ہوئے اس کا ایک سادہ مفہوم روانی کے ساتھ سمجھتا چلا جائے۔

''تیسیر قرآن للذکر'' کے متعدد پہلو ہیں۔ مثلاً ایک تو یہی کہ اس کا اصل موضوع اور اساسی مضامین فطرتِ انسانی کے جانے پہچانے ہیں اور قرآن کو پڑھتے ہوئے ایک سلیم الطبع انسان خود اپنے باطن کی آواز سن رہا ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا طریقِ استدلال نہایت فطری اور انتہائی سادہ ہے۔ مزید یہ کہ مشکل مضامین کو نہایت دل نشین مثالوں کے ذریعے آسان بنا دیا گیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس کے باوجود کہ یہ ادب کا شاہکار اور فصاحت و بلاغت کی معراج ہے' اس کی زبان عام طور پر نہایت آسان ہے اور عربی زبان کی تھوڑی سی سوجھ بوجھ اور معمولی سا ذوق رکھنے والا شخص بھی بہت جلد اس سے مانوس ہو جاتا ہے اور بہت ہی کم مقامات ایسے رہ جاتے ہیں جہاں ایسے شخص کو دقت پیش آئے۔

لیکن تذکر بالقرآن کے لیے بھی عربی زبان کا بنیادی علم بہر حال ناگزیر ہے اور متن کے ساتھ ساتھ قرآن کے کسی مترجم نسخے میں ترجمہ دیکھتے رہنا اس مقصد کے لیے قطعاً ناکافی ہے اور میں پوری دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ عربی کی اس قدر تحصیل کہ انسان قرآن مجید کا ایک رواں ترجمہ از خود سمجھ سکے اور تلاوت کرتے ہوئے بغیر متن سے نظر ہٹائے اس کے سرسری مفہوم سے آگاہ ہوتا چلا جائے' ہر پڑھے لکھے مسلمان کے لیے فرضِ عین کا درجہ رکھتا ہے۔

> اور میں نہیں سمجھتا کہ ایک ایسا مسلمان جس نے کچھ بھی پڑھا لکھا ہو' کجا یہ کہ غیر ملکی زبان تک سیکھی ہو' بی اے اور ایم اے پاس کیا ہو' ڈاکٹری اور انجینئرنگ جیسے مشکل علوم و فنون حاصل کیے ہوں' وہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اتنی سی عربی بھی نہ سیکھ سکنے پر کیا عذر پیش کر سکے گا جس سے وہ اس کے کلام پاک کا

فہم حاصل کر سکتا — حضرات! میں پورے خلوص اور خیر خواہی
کے ساتھ آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ ایسے لوگوں کا عربی سیکھ
کر قرآن کا فہم حاصل کرنے سے باز رہنا اللہ کے کلام کا تمسخر
اور استہزاء ہی نہیں بلکہ اس کی تحقیر و توہین ہے اور آپ خود سوچ
لیں کہ اپنے اس طرزِ عمل سے ہم اپنے آپ کو اللہ کی کیسی شدید
باز پُرس اور کتنی سخت عقوبت کا مستحق بنا رہے ہیں—!

میرے نزدیک عربی زبان کی کم از کم اتنی تحصیل کہ قرآن مجید کا سرسری مفہوم انسان کی سمجھ میں آ جائے' ہر پڑھے لکھے مسلمان پر قرآن کا وہ حق ہے جس کی عدم ادائیگی نہ صرف قرآن بلکہ خود اپنے آپ پر بہت بڑا ظلم ہے۔

فہم قرآن کا دوسرا مرتبہ ''تدبرِ قرآن'' کا ہے۔ یعنی یہ کہ قرآن کو گہرے غور و فکر کا موضوع بنایا جائے اور اس کے علم و حکمت کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کی کوشش کی جائے۔ اس لیے کہ قرآن ''هُدًى لِّلنَّاسِ'' ہے اور جس طرح عوام کو کائنات اور اپنی ذات کے بارے میں صحیح نقطہ نظر اور زندگی بسر کرنے کی واضح ہدایات عطا فرماتا ہے اسی طرح خواص اور اصحابِ علم و فکر کے لیے بھی کامل ہدایت اور مکمل رہنمائی ہے اور ان کے ذہنی و فکری سفر کے ہر مرحلے اور ہر موڑ پر ان کی دستگیری فرماتا ہے۔

قرآن نے اپنے محلِ تدبر ہونے کو بایں الفاظ خود واضح فرمایا ہے کہ:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۹﴾ (ص)

''(یہ قرآن) ایک کتابِ مبارک ہے جو ہم نے تمہاری طرف نازل کی تا کہ لوگ اس کی آیات پر تدبر کریں اور سمجھ دار لوگ نصیحت حاصل کریں۔''

اور عدم تدبر کا گلہ ان الفاظ میں کیا ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ط (النساء: ۸۲)

''کیا یہ لوگ قرآن پر تدبر نہیں کرتے؟''

اور

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۝ (محمد)

''کیا یہ تدبر نہیں کرتے قرآن پر؟ یا دلوں پر لگے ہوئے ہیں ان کے قفل؟''

''تذکر'' کے اعتبار سے قرآن مجید جس قدر آسان ہے واقعہ یہ ہے کہ ''تدبر'' کے نقطہ نظر سے یہ اسی قدر مشکل ہے اور اس سمندر میں اترنے والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ نہ اس کی گہرائیوں کا اندازہ ممکن ہے اور نہ اس کے کناروں ہی کا سراغ کسی کو مل سکتا ہے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں اس امر کی تصریح ملتی ہے کہ وہ ایک ایک سورت پر تدبر و تفکر میں طویل مدتیں صرف کرتے تھے' حتیٰ کہ ان ہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں جن کو آنحضور ﷺ نے ہفتے میں ایک بار ضرور قرآن مجید ختم کر لینے کی تاکید کی تھی' یہ تصریح ملتی ہے کہ انہوں نے صرف سورۃ البقرۃ پر تدبر میں آٹھ سال صرف کیے۔ ذرا غور فرمائیں کہ یہ ان لوگوں کا حال ہے جن کی اپنی زبان میں اور اپنی آنکھوں کے سامنے قرآن نازل ہوا تھا۔ چنانچہ نہ تو انہیں عربی زبان اور اس کے قواعد کی تحصیل کی کوئی ضرورت تھی نہ شانِ نزول اور سُور و آیات کے تاریخی پس منظر کو جاننے کے لیے کھود کرید کی کوئی حاجت۔ اس کے باوجود ایک ایک سورت پر ان کا سالہا سال غور و فکر کرنا یہ بتلاتا ہے کہ قرآن حکیم کے علم و حکمت کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کوئی آسان کام نہیں' بلکہ اس کے لیے سخت محنت اور شدید ریاضت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ بعد میں ابن جریر طبری' علامہ زمخشری اور امام فخر الدین رازی ایسے دسیوں بیسیوں نہیں سینکڑوں اور ہزاروں انسانوں نے اپنی پوری پوری زندگیاں کھپائیں تب بھی کسی ایک ہی پہلو سے قرآن حکیم پر غور و فکر کر سکے اور حق یہ ہے کہ حق پھر بھی ادا نہ ہوا — اور ان چودہ صدیوں میں کوئی ایک انسان بھی ایسا نہیں گزرا جس نے ضخیم سے ضخیم تفسیر لکھنے کے بعد بھی اس امر کا دعویٰ کیا ہو کہ اس نے قرآن حکیم پر تدبّر کا حق ادا کر دیا اور اس کا فہم کما حقہٗ حاصل کر لیا — تا بہ دیگراں چہ رسد؟

امام غزالی ؒ نے احیاء العلوم میں کسی عارف کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے قرآن کی عام تلاوت برائے تذکر اور اس پر گہرے غور و فکر کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ وہ

صاحب فرماتے ہیں کہ میں ایک ختم تو قرآن مجید کا ہر جمعہ کو کر لیتا ہوں' ایک ختم میں ماہانہ کرتا ہوں اور ایک سالانہ' اور ایک اور ختم بھی ہے جس میں میں تیس سال سے مشغول ہوں اور تا حال فارغ نہیں ہو سکا۔

قرآن کو بطریق تدبر پڑھنے کی شرائط بڑی کڑی ہیں اور ان کا پورا کرنا اس کے بغیر ہرگز ممکن نہیں کہ ایک انسان اپنے آپ کو بس اسی کے لیے وقف کر دے اور اپنی پوری زندگی کا مصرف صرف تعلیم و تعلّمِ قرآن ہی کو بنا لے۔ اس کے لیے اوّلاً عربی زبان کے قواعد کا گہرا اور پختہ علم ضروری ہے۔ پھر اس کے ادب کا ایک ستھرا ذوق اور فصاحت و بلاغت کا عمیق فہم لازمی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جس زبان میں قرآن نازل ہوا ہے اس کا صحیح فہم اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ادبِ جاہلی کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے اور دورِ جاہلی کے شعراء و خطباء کے کلام سے ممارست بہم پہنچائی جائے۔ پھر اسی پر بس نہیں' قرآن نے خود اپنی مخصوص اصطلاحات وضع کی ہیں اور اپنے خاص اسالیب ایجاد کیے ہیں جن سے انسان ایک طویل مدت تک قرآن کو پڑھتے رہنے اور اس پر غور کرتے رہنے کے بعد ہی مانوس ہوتا ہے ــــ اس کے علاوہ نظمِ قرآن کا فہم بجائے خود تدبرِ قرآن کی راہ کی ایک کٹھن منزل ہے اور مصحف کی موجودہ ترتیب کی حکمت کا علم جو ترتیبِ نزولی سے قطعاً مختلف ہے' اور اوّلاً مختلف سورتوں اور پھر ہر سورت کی آیتوں کے باہمی ربط و تعلق کو سمجھنا ایسا مشکل مرحلہ ہے جس پر بڑے بڑے اصحابِ عزم و ہمت تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس مرحلے کو سر کیے بغیر ''تدبرِ قرآن'' کے حق کی ادائیگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ــــ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسی معدن سے قرآن حکیم کے علم و حکمت کے اصل موتی حاصل ہوتے ہیں اور اسی سے اس بحرِ ناپیدا کنار کی وسعتوں کا اصل اندازہ ہوتا ہے ــــ!

ساتھ ہی قرآن کو سمجھنے کے لیے احادیث کے تمام ذخیرے پر انسان کی گہری نظر

بھی لازمی ہے اور قدیم صحف آسمانی کا گہرا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ ان ساری منزلوں سے گزر کر تو انسان اس قابل ہوتا ہے کہ قرآن کو بطریق تدبر[1] پڑھ سکے۔ اس کے بعد ایک دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انسانی تاریخ کے ہر دَور میں تجرباتی و عقلی دونوں قسم کے علوم ایک خاص سطح پر ہوتے ہیں اور قرآن پر تدبر کا حق اس کے بغیر ادا نہیں ہوسکتا کہ حکمت قرآنی کا طالب اپنی معلومات کے دائرے کو کم از کم اتنا وسیع ضرور کرے کہ ان تمام علوم طبعی و نظری کا ایک اجمالی خاکہ ان کے مقدمات و مبادی' طریق استدلال اور نہج استنتاج اور نتائج و عواقب کی اجمالی معرفت سمیت اس کے ذہن کی گرفت میں آ جائے

> اس لیے کہ قرآن مجید کے علم و حکمت کے بحر زخار سے ہر طالب بہر حال اپنے ''ظرفِ ذہنی'' کے عمق اور وسعت کے مطابق ہی حصہ پا سکتا ہے اور اس کتابِ منیر کا نورِ ہدایت ہر شخص پر اس کے ''افق فکر و نظر'' کی وسعت کی نسبت ہی سے روشن ہوسکتا ہے — اور انسان کا ظرفِ ذہنی اور افق فکری بہر حال متداول علوم طبعی و عقلی ہی سے تیار ہوتا ہے۔

خاص طور پر تبلیغ و تبیین للناس کے اعتبار سے تو اس کی اہمیت بہت ہی زیادہ ہے' بلکہ اس کے بغیر ان کا حق ادا ہونا تو کسی درجے میں بھی ممکن نہیں' اس لیے کہ ہر دَور کے تجرباتی علوم کی سطح کے مطابق اور اسی کی مناسبت سے منطق و فلسفہ' الٰہیات و مابعد الطبیعیات' اخلاقیات و نفسیات اور دیگر علومِ عمرانی کا ایک طومار ہوتا ہے جس سے ذہن بالعموم مرعوب ہوتے ہیں۔ ان کے پھیلائے ہوئے غلط افکار و نظریات کا توڑ اس کے بغیر قطعاً ممکن نہیں ہوتا کہ خود ان کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور ان کے اصل سرچشموں

---

(۱) اس موضوع پر مولانا امین احسن اصلاحی کی تالیف ''مبادئ تدبر قرآن'' کا بالاستیعاب مطالعہ ان شاء اللہ بہت مفید رہے گا۔

(Original Sources) تک رسائی بہم پہنچا کر علیٰ وجہ البصیرت ان کی جڑوں پر اسی طرح ضربِ کاری لگائی جائے جس طرح اپنے اپنے وقت میں امام ابن تیمیہ اور امام غزالی رحمہما اللہ لگا چکے ہیں۔ دورِ جدید اس معاملے میں غالبًا اپنی منطقی انتہا کو پہنچ چکا ہے اور علومِ متذکرہ بالا کے علاوہ علومِ طبعی (Physical Sciences) اور فنونِ صنعتی (Technology) نے انتہائی بلندیوں کو چھو کر عقلِ انسانی کو اس طرح مبہوت و ششدر کر دیا ہے کہ ایک عام انسان کے لیے ان کے جلو میں آنے والے غلط نظریات و افکار پر جرح و تنقید قطعاً ناممکن ہوگئی ہے — اندریں حالات' دورِ حاضر میں ''تدبرِ قرآن'' کا حق صرف اس طرح ادا ہوسکتا ہے کہ اصحابِ ہمت اور اربابِ عزیمت کی ایک بڑی جماعت اپنے آپ کو پوری طرح کھپا کر ایک طرف تدبر قرآن کی متذکرہ بالا جملہ شرائط کو پورا کرے اور دوسری طرف جدید علومِ عقلی و عمرانی کی گہری و براہِ راست ممارست بہم پہنچائے' اور پھر نہ صرف یہ کہ قرآن کی روشنی میں علومِ جدیدہ کے صحیح و غلط اجزاء کو بالکل علیحدہ کر دے' بلکہ جدید استدلال اور معروف اصطلاحات کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں کے قریب ہو کر کلام کرے اور قرآن کے نورِ ہدایت کو لوگوں کی نگاہوں کے عین سامنے روشن کر دے!— تاکہ ''لِتُبَيِّنَهٗ لِلنَّاسِ'' کا جو فریضہ آنحضور ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں ادا فرمایا تھا وہ اس دور میں آپؐ کی اُمت کے ذریعے پھر پورا ہو — اور یہ کام ظاہر ہے کہ اُس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک عالمِ اسلام میں جابجا ایسی یونیورسٹیاں قائم نہ ہوں جن میں سے ہر ایک کا اصل مرکزی شعبہ ''تدبرِ قرآن'' کا ہو اور اس کے گرد تمام علومِ عقلی' جیسے منطق' مابعد الطبیعیات' اخلاقیات' نفسیات اور الٰہیات' علومِ عمرانی جیسے معاشیات' سیاسیات اور قانون اور علومِ طبعی جیسے ریاضی' کیمیا' طبیعیات' ارضیات اور فلکیات وغیرہ کے شعبوں کا ایک حصار قائم ہو' اور ہر ایک طالب علم ''تدبرِ قرآن'' کی لازماً اور ایک یا اس سے زائد دوسرے علوم کی اپنے ذوق کے مطابق تحصیل کرے اور اس طرح ان شعبہ ہائے علوم میں قرآن کے علم و ہدایت کو تحقیقی طور پر اخذ کر کے مؤثر انداز میں پیش کر سکے۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں! اسی لیے اس پر ہر شخص مکلّف بھی نہیں۔ یہ کام اوّل تو ہے ہی صرف ان لوگوں کے کرنے کا جو علم کی ایک فطری پیاس لے کر ہی پیدا ہوتے ہیں اور جن کے ذہنوں میں ایسے سوالات ازخود پیدا ہو جاتے ہیں جن کا حل عقل کی جملہ وادیاں طے کیے بغیر ممکن ہی نہیں ہوتا۔ یہ لوگ طلب علم پر اسی طرح ''مجبور'' ہوتے ہیں جیسے ایک بھوکا تلاشِ غذا پر یا ایک پیاسا تحصیل ماء پر۔ ایسے ہی لوگ مسلسل ''رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا'' کی دعا کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں' اور اگر صحیح رہنمائی میسّر آ جائے تو علم وحکمت سے حصہ وافر پاتے ہیں۔ ''تدبر قرآن'' اصلاً تو ایسے ہی لوگوں کے کرنے کا کام ہے' ویسے ہر ''طالب علم'' اپنی اپنی استعداد اور اپنی اپنی محنت کے مطابق اس سے فیض یاب ہوسکتا ہے اور اس کے لیے ایک عام تشویق ہی کے لیے آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ))

(صحیح البخاری' عن عثمان بن عفان ؓ)

''تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔''

اور قرآن حکیم نے ایک عام ہدایت دی کہ:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ (التوبہ:۱۲۲)

''پس کیوں نہیں نکلتا ہر ہر فرقے میں سے ان کا ایک گروہ تاکہ سمجھ پیدا کرے دین میں۔''

یہ ''تفقّہ فی الدّین'' تدبرِ قرآن کا وہ ثمرہ ہے جس کے لیے آنحضور ﷺ نے چیدہ چیدہ صحابہ ؓ کے لیے دعا فرمائی ہے[۱] اور جس کا آپ ﷺ نے ((خِیَارُھُمْ فِی الْجَاھِلِیَّةِ خِیَارُھُمْ فِی الْاِسْلَامِ)) کے کلیہ کے ساتھ بطورِ شرط تذکرہ فرمایا ہے' یعنی یہ کہ ((اِذَا فَقُھُوْا))[۲]

(۱) جیسے مثلاً حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کے لیے حضور ﷺ نے ان الفاظ میں دعا فرمائی: ((اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِی الدِّیْنِ))

(۲) متفق علیه' عن ابی ھریرة ؓ۔ ترجمہ حدیث: ''ان میں سے جو لوگ دورِ جاہلیت میں سب سے اچھے تھے وہی اسلام میں بھی سب سے اچھے ہیں' بشرطیکہ دین کی سمجھ حاصل کرلیں۔''

چوتھا حق

حُکم واِقامت

''ایمان وتعظیم''، ''تلاوت وترتیل'' اور ''تذکّر وتدبّر'' کے بعد قرآن مجید کا چوتھا حق ہر مسلمان پر یہ ہے کہ وہ اس پر عمل کرے۔ اور ظاہر ہے کہ ماننا' پڑھنا اور سمجھنا' سب فی الاصل عمل ہی کے لیے مطلوب ہیں۔ اس لیے کہ قرآن مجید نہ تو کوئی جادو یا جنتر منتر کی کتاب ہے جس کا پڑھ لینا ہی دفعِ بلیات کے لیے کافی ہو' نہ یہ محض حصولِ برکت کے لیے نازل ہوا ہے کہ بس اس کی تلاوت سے ثواب حاصل کرلیا جائے یا اس کے ذریعے جان کنی کی تکلیف کو کم کرلیا جائے۔[1] اور نہ ہی یہ محض تحقیق وتدقیق کا موضوع ہے کہ اسے صرف ریاضتِ ذہنی کا تختۂ مشق اور نکتہ آفرینیوں اور خیال آرائیوں کی جولانگاہ بنالیا جائے بلکہ' جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جاچکا ہے' یہ ''هُدًى لِّلنَّاسِ'' یعنی انسانوں کے لیے رہنمائی ہے' اور اس کا مقصدِ نزول صرف اس طرح پورا ہوسکتا ہے کہ لوگ اسے واقعتاً اپنی زندگیوں کا لائحہ عمل بنالیں۔

یہی وجہ ہے کہ خود قرآن حکیم اور اُس ذاتِ اقدس نے جس پر یہ نازل ہوا (ﷺ) اس بات کو بالکل واضح فرمادیا ہے کہ قرآن پر عمل نہ کیا جائے تو اس کی تلاوت یا اس پر غور وفکر کے کچھ مفید ہونے کا کیا سوال' خود ایمان ہی معتبر نہیں رہتا۔ چنانچہ قرآن مجید نے دوٹوک فیصلہ سنادیا کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۝ (المائدۃ)

''اور جو فیصلہ نہ کرے اس کے مطابق کہ جو اللہ نے نازل فرمایا تو ایسے ہی لوگ تو کافر ہیں۔''

---

(۱) بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست (علامہ اقبال)
کہ از یٰسینِ اُو آساں بمیری!

اور آنحضرت ﷺ نے مزید وضاحت فرما دی کہ:

۱) ((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ)) (شرح السنۃ)

"تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہش نفس اس (ہدایت) کے تابع نہ ہو جائے جو میں لایا ہوں۔"

۲) ((مَا اٰمَنَ بِالْقُرْاٰنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَهٗ)) (رواہ الترمذی)

"جو شخص قرآن کی حرام کردہ چیزوں کو حلال ٹھہرائے وہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتا۔"

ایک ایسے شخص کا معاملہ تو مختلف ہے جو ابھی تلاشِ حق میں سرگرداں ہو اور قرآن کو پڑھ اور سمجھ کر ابھی اس کی حقانیت کے عدم یا اثبات کا فیصلہ کرنا چاہتا ہو' لیکن جو لوگ قرآن کو کتابِ الٰہی تسلیم کریں ان کے لیے اس سے استفادے کی شرطِ لازم یہ ہے کہ وہ اپنی زندگیوں کے رُخ کو قرآن کی سمت میں عملاً موڑ دینے اور اس کے ہر تقاضے کو پورا کرنے کی حتی الامکان سعی کے عزمِ مصمم کے بعد قرآن کو پڑھیں۔ چاہے اس میں انہیں کیسے ہی کسر وانکسار' ترک واختیار اور قربانی وایثار کے ساتھ سابقہ پیش آئے۔ بلکہ جیسا کہ اس سے قبل "تلاوت" کے لغوی مفہوم کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے' واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی ہدایت تامہ تو درحقیقت "منکشف" ہی صرف ان لوگوں پر ہوتی ہے جو اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر کے اس کا مطالعہ کریں اس عزمِ صادق کے بعد بھی ایک طویل مجاہدے اور کٹھن ریاضت کے بعد ہی نفس انسانی میں تسلیم وانقیاد کی وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جو آنحضور ﷺ کے اس قولِ مبارک میں بیان ہوئی جو ابھی میں نے آپ کو سنایا تھا۔ یعنی:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ))

"تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہش نفس اس (ہدایت) کے تابع نہ ہو جائے جو میں لایا ہوں۔"

نفس انسانی میں اس کیفیت کا پیدا ہو جانا قرآن کی "ہدایتِ تامّہ" کا نقطۂ آغاز ہے۔ پھر جوں جوں اس کتابِ ہدایت سے تمسک بڑھتا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مزید اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ ۝ (محمد)

''اور جو لوگ راہ یاب ہوئے تو ان کو مزید عطا ہوئی سوجھ' اور نصیب ہوئی پرہیزگاری۔''

یعنی انسان قرآن کی انگلی پکڑ کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش عملاً شروع کر دے تو صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائے گا اور درجہ بدرجہ رشد و ہدایت میں ترقی کرتا چلا جائے گا— ورنہ اس کی تلاوت صرف وقت کا ضیاع ہی نہ ہوگی بلکہ عین ممکن ہے کہ اس کے لیے موجبِ لعنت ہو۔ جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں بعض عارفین کا قول نقل فرمایا کہ قرآن کے بہت سے پڑھنے والے ایسے ہیں جنہیں سوائے لعنت کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ جب وہ پڑھتا ہے کہ: لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ یعنی اللہ کی لعنت ہو جھوٹوں پر' تو اگر وہ خود جھوٹا ہے تو یہ لعنت اسی پر ہوئی! اسی طرح جب ایک قاری تلاوت کرتا ہے کہ:

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ (البقرۃ : ۲۷۹)

''اور اگر ایسے نہیں کرتے تو تیار ہو جاؤ لڑنے کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ سے۔''

تو اگر وہ خود اس حکم الٰہی سے سرتابی کرتا ہے تو اللہ اور رسولؐ کے اس ''اذانِ حرب'' (ultimatum) کا مخاطب خود وہی ہوا۔ اسی طرح کم تولنے اور تھوڑا ناپنے والے' پیٹھ پیچھے برائی کرنے والے اور رو در رو طعنہ دینے والے قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ اور وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ کی دردناک ''بشارتوں'' کے مصداق خود ہی بنتے ہیں۔ اسی پر مزید قیاس کر لیجیے کہ عمل کے بغیر قرآن مجید کی تلاوت سے انسان کو درحقیقت کیا حاصل ہوتا ہے۔

رہا ان لوگوں کا معاملہ جو قرآن حکیم پر تحقیق و تدقیق' غور و فکر اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے ہوں' لیکن خود اس کے تقاضوں کی ادائیگی سے غفلت برتیں تو ان کا معاملہ تو سب سے بڑھ کر سنگین ہو جاتا ہے اور ان کی یہ ساری کدوکاوش اور تحقیق و جستجو صرف ذہنی عیاشی ہی نہیں ''تلعّب بالقرآن'' یعنی ع ''بازی بازی باریش بابا ہم بازی!'' کے مصداق قرآن کے ساتھ کھیل کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ نتیجتاً ان کے

اپنے حصے میں بھی قرآن سے ہدایت نہیں ضلالت آتی ہے۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ (البقرة : ٢٦)

''گمراہ کرتا ہے (اللہ تعالیٰ) اس سے بہت سوں کو اور ہدایت دیتا ہے اس کے ذریعے بہت سوں کو۔''

اور خلق خدا کے لیے بھی یہ طرح طرح کے فتنوں کا باعث اور نت نئی گمراہیوں اور ضلالتوں کا سبب بنتے ہیں' اس لیے کہ ان کا سارا ''قرآنی فکر'' اس آیت قرآنی کا مصداق بن جاتا ہے کہ:

فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ (آلِ عمران : ٧)

''تو وہ پیچھے پڑتے ہیں متشابہات کے تاکہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی حقیقت و ماہیت معلوم کریں۔''

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے جنہیں ''تدبرِ قرآن'' کا خاص ذوق عطا ہوا تھا اور جو کئی کئی برس ایک ایک سورت پر غور وفکر اور تدبر وتفہم میں صرف کر دیتے تھے ان کے بارے میں یہ تصریح ملتی ہے کہ ان کے اس توقف کا اصل سبب یہ ہوتا تھا کہ وہ قرآن کے علم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ اس پر پورے پورے عمل کا بھی حتی المقدور اہتمام کرتے تھے اور اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک انہیں یہ اطمینان نہیں ہو جاتا تھا کہ جتنا کچھ انہوں نے سیکھا اور پڑھا ہے اس پر عمل کی توفیق بھی انہیں حاصل ہو گئی ہے — آپ شاید یہ معلوم کر کے حیران ہوں کہ صحابہ کرام ؓ قرآن کی کسی سورت یا اس کے کسی حصے کے حفظ کا مطلب صرف یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اسے یاد کر لیا جائے' بلکہ یہ سمجھتے تھے کہ اس کا علم وفہم بھی حاصل ہو جائے اور اس پر عمل کی توفیق بھی بارگاہِ ربّ العزت سے ارزانی ہو جائے اور اس طرح قرآن ان کے فکر وعمل دونوں پر حاوی ہو جائے۔

گویا ''حفظ قرآن'' کا مطلب ان کے نزدیک یہ تھا کہ قرآن ان کی پوری شخصیت میں رچ بس جائے اور اس کا نورِ ہدایت

ان کے رگ و پے حتیٰ کہ ریشے ریشے میں سرایت کر جائے۔
نتیجتاً اس کے الفاظ ان کے حافظے میں' اس کا علم ان کے ذہن
میں' اور اس کی تعلیمات ان کے اخلاق و عادات اور سیرت و
کردار میں محفوظ ہو جائیں ۔۔!(۱)

اسی عمل (phenomenon) کی تکمیل اور اتمامی کیفیت کا ذکر ہے معلّمۂ اُمّت' اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کے اس غایت درجہ حکیمانہ قول میں جو انہوں نے اس سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کیسی تھی؟ ۔۔ کہ: ''کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْآنَ'' یعنی آپؐ کی سیرت تعلیماتِ قرآنی کا مکمل نمونہ تھی اور گویا کہ آپؐ مجسّمِ قرآن تھے۔ فداہ ابی و اُمی وصلی اللہ علیہ وسلم۔

غرضیکہ ۔۔ قرآن سے استفادے کی صحیح صورت صرف یہ ہے کہ اس کا جتنا جتنا علم وفہم انسان کو حاصل ہوا سے وہ ساتھ کے ساتھ اپنے اعمال و افعال' عادات و اطوار اور سیرت و کردار کا جزو بناتا چلا جائے اور اس طرح قرآن مجید مسلسل اس کے ''خُلق'' میں سرایت کرتا چلا جائے۔ بصورتِ دیگر اس کا خدشہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول

---

(۱) ملاحظہ ہو ''الاتقان فی علوم القرآن'' کی مندرجہ ذیل روایت (بحوالہ مبادیٔ تدبر قرآن۔ مؤلفہ مولانا امین احسن اصلاحی)

وقد قال ابوعبد الرحمٰن السلمی حدثنا الذین کانوا یقرء ون القرآن کعثمان بن عفان و عبداللہ بن مسعود وغیرھما انھم اذا کانوا تعلموا من النبی ﷺ عشر آیات لم یتجا وزوھا حتی یعلموا مافیھا من العلم والعمل' قالوا فتعلمنا القرآن والعمل جمیعًا ولھذا کانوا یبقون مدۃ فی حفظ السورۃ

''ابوعبدالرحمٰن سلمی کہتے ہیں کہ مجھ سے ان لوگوں نے بیان کیا جو قرآن پڑھتے پڑھاتے تھے' جیسے حضرت عثمانؓ بن عفان اور عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ' کہ ان لوگوں کا دستور یہ تھا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیتیں بھی پڑھ لیتے تھے تو جب تک ان آیات کے تمام علم وعمل کو اپنے اندر جذب نہ کر لیتے آگے قدم نہ بڑھاتے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے قرآن کے علم وعمل دونوں کو ایک ساتھ حاصل کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک ایک سورت کے حفظ میں وہ برسوں لگا دیا کرتے تھے۔''

مبارک کے مطابق کہ: ((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَّكَ اَوْ عَلَيْكَ)) (قرآن یا تو تمہارے حق میں حجت بنے گا یا تمہارے خلاف) قرآن کا علم وفہم الٹا انسان کے خلاف حجتِ قاطع اور اس کی بدعملی پر سزا وعقوبت کی شدت میں اضافے کا سبب بن جائے۔

یہاں یہ وضاحت البتہ ضروری ہے کہ ''عمل بالقرآن'' کے دو پہلو ہیں' ایک انفرادی اور دوسرا اجتماعی۔ قرآن مجید کے ایسے تمام احکام جو انسان کی انفرادی و نجی زندگی سے متعلق ہوں یا جن پر عمل کا اختیار اسے فی الفور حاصل ہو اُن کو بجالانے پر ہر انسان اسی دم مکلف ہو جاتا ہے جس دم وہ اس کے علم میں آئیں اور ان کے معاملے میں تاخیر وتعویق کا کوئی جواز سرے سے موجود نہیں ہے۔ ایسے احکام کی اطاعت وتعمیل میں کوتاہی وہ جرمِ عظیم ہے جس کی سب سے بڑی سزا اخذلان اور سلب توفیق کی شکل میں ملتی ہے' حتیٰ کہ قول و کردار اور علم و عمل کا یہ فرق و تفاوت اور ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ﴿۲﴾﴾ (۱) کی یہ کیفیت بالآخر نفاق پر منتج ہوتی ہے۔ یہی حقیقت ہے جو آنحضور ﷺ کے اس قولِ مبارک میں بیان ہوئی کہ:

((اَكْثَرُ مُنَافِقِيْ اُمَّتِيْ قُرَّاءُ هَا)) (مسند احمد)

''میری اُمت کے منافقین کی سب سے بڑی تعداد قُراء (۲) کی ہے۔''

لہٰذا سلامتی کی راہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ قرآن کا جس قدر علم بھی انسان کو حاصل ہو اس پر وہ حتی الامکان فوری طور پر عمل شروع کر دے۔

رہے دوسری قسم کے احکام' یعنی وہ جو ایسے اجتماعی معاملات سے متعلق ہوں جن پر ایک فرد کو کلی اختیار حاصل نہیں ہوتا تو ان کے بارے میں ظاہر ہے کہ ہر شخص بجائے خود مسئول و مکلّف نہیں ہوتا۔ اگرچہ وہ اس پر ضرور مکلّف ہے کہ اپنی امکانی حد تک حالات کو بدلنے اور ایسا اجتماعی ماحول برپا کرنے کی سعی و جُہد کرے جس میں پورے کا پورا

(۱) سورۃ الصّف' آیت ۲: ''اے اہلِ ایمان' کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟''

(۲) واضح رہے کہ یہاں قراء سے مراد معروف معنی میں محض قاری نہیں' بلکہ ان میں وہ عالم بھی شامل ہیں جو قرآن پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہوں لیکن اس پر عمل نہ کریں۔

قرآن سمو یا جا سکے اور اس کے تمام احکام کی مکمل تنفیذ کی جا سکے۔ ان حالات میں اس کی یہ کوشش اور جدوجہد ''مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ''[1] اور ان اجتماعی احکامات کی بالفعل تعمیل کی قائم مقام ہو جائے گی۔ لیکن اگر انسان ایسی جدّوجہد بھی نہ کرے اور مطمئن ہو کر بس اپنی زندگی کی بقاء اور اپنے بال بچوں کی پرورش میں لگا رہے تو اس صورت میں سخت خطرہ ہے کہ قرآن کے انفرادی و نجی نوعیت کے احکام پر عمل بھی ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ﴾[2] کے مصداق گردانا جائے!

جس طرح فہم قرآن کے لیے قرآن مجید کی وسیع تر اصطلاح ''تذکر'' ہے اسی

---

(۱) سورۃ الاعراف' آیت ۱۶۴: ''اور جب کہا ان میں سے ایک گروہ نے کہ کیوں نصیحت کرتے ہو ایسے لوگوں کو جنہیں اللہ تعالیٰ ہلاک یا شدید عذاب میں مبتلا کر کے رہے گا' تو انہوں نے جواب دیا: تاکہ پروردگار کے یہاں ہمارا عذر قبول ہو۔ اور (پھر) کیا عجب کہ وہ (خدا سے) ڈر ہی جائیں۔''

(۲) سورۃ البقرۃ' آیت ۸۵: ''تو کیا تم ایمان رکھتے ہو کتابِ الٰہی کے کچھ حصے پر اور کفر کرتے ہو دوسرے سے؟'' ان الفاظِ مبارکہ کے بعد جو تہدید قرآن میں وارد ہوئی ہے اس کو پڑھتے ہوئے ہر صاحبِ دل انسان لازماً کانپ اٹھتا ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم نے بعینہٖ یہی روش اختیار کی اور نتیجتاً اسی تہدید کا ایک عملی مظہر بن کر رہ گئے ہیں — یعنی یہ کہ:

''تو جو کوئی تم میں سے یہ روش اختیار کرے اس کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا میں اسے ذلیل و رسوا کیا جائے اور آخرت میں شدید ترین عذاب میں مبتلا کیا جائے'' — تو جہاں تک دنیا کی رسوائی کا تعلق ہے اس کا تو ایک عبرتناک نقشہ اُمت مسلمہ پیش کر رہی ہے۔ رہا عذابِ اُخروی' تو اس کے بھی حق دار بننے میں ہم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ویسے اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم دستگیری فرمالے تو دوسری بات ہے:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿﴾ (المائدۃ)

اللہ اکبر! کیسی صادق آتی ہے ہمارے حال پر آنحضور ﷺ کی یہ حدیث مبارک کہ:

((اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتٰبِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ)) (مسلم: عن عمر بن الخطاب ؓ)

''اللہ تعالیٰ اس کتابِ عزیز کی وجہ سے کچھ قوموں کو عزت و سربلندی عطا فرمائے گا اور دوسروں کو ذلت و نکبت سے ہمکنار کرے گا۔''

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور ''ہم'' خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

طرح قرآن پر ''عمل'' کے لیے قرآن کی سب سے جامع اور کثیر الاستعمال اصطلاح ''حُکم بِمَا اَنزَلَ اللّٰہُ'' ہے۔

''حکم'' کے ذیل میں قرآن مجید نے اصل الاصول تو یہ متعین کیا کہ:

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (الانعام: ٥٧' یوسف: ٤٠ و ٦٧)

''حکم (کا اختیار) سوائے اللہ کے اور کسی کو حاصل نہیں۔''

پھر خود قرآن مجید کو ''حکم'' قرار دیا:

وَکَذٰلِکَ اَنْزَلْنٰہُ حُکْمًا عَرَبِیًّا ط (الرعد: ٣٧)

''اور اسی طرح اتارا ہم نے اسے حکم بنا کر عربی زبان میں۔''

اور نبی اکرم ﷺ کا فرضِ منصبی یہ قرار دیا کہ:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰکَ اللّٰہُ ط

(النساء: ١٠٥)

''بے شک اتاری ہم نے تجھ پر کتاب حق کے ساتھ تاکہ تو فیصلہ کرے لوگوں کے مابین اس سوجھ کے ساتھ جو اللہ نے تجھ کو عطا فرمائی ہے۔''

اور سورۃ المائدۃ میں دوٹوک فیصلہ سنا دیا کہ جو لوگ اللہ کی کتاب کے مطابق ''حکم'' نہ کریں وہی کافر' ظالم اور فاسق ہیں۔ (آیات ۴۴' ۴۵' ۴۶ اور ۴۷)

''حکم'' کا مفہوم ایک لفظ میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ لفظ ''فیصلہ'' ہی ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ بات پیش نظر رہے کہ انسان میں اصل اہمیت کی چیزیں دو ہیں' ایک اس کا فکر اور دوسرے اس کا عمل۔ ''حکم'' ایک ایسی جامع اصطلاح ہے جو بیک وقت ان دونوں کا احاطہ بھی کرتی ہے اور خاص طور پر ان کے ربط و تعلق کو واضح اور ان کے مقامِ اتصال کو نمایاں کرتی ہے۔

کوئی خیال یا نظریہ جب انسانی فکر میں ایسا رچ بس جائے کہ اس کی ''رائے'' اور ''فیصلہ'' یعنی ''حکم'' بن جائے تو اس کا عمل خود بخود اس کے تابع ہو جاتا ہے—!

اسی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے قرآن حکیم نے عمل بالقرآن کے لیے حُکم بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ کی اصطلاح استعمال کی' تاکہ یہ بات بالکل واضح ہو جائے کہ قرآن مجید پر عمل درحقیقت اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان کا فکر قرآن کے تابع ہو جائے اور قرآن کا بیان کردہ علم حقیقت انسان کے دل اور دماغ دونوں میں جاگزیں ہو جائے۔

آسمانی کتابوں پر عمل کے لیے قرآن مجید کی دوسری اصطلاح ''اقامت'' کی ہے' جیسا کہ یہود ونصاریٰ کے بارے میں فرمایا گیا کہ:

وَلَوْ اَنَّھُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْھِمْ مِّنْ رَّبِّھِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِھِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِھِمْ ۭ (المائدۃ : ٦٦)

''اور اگر وہ قائم رکھتے تورات اور انجیل کو' اور اس کو جو نازل ہوا اُن کی جانب ان کے ربّ کی طرف سے' تو کھاتے اپنے اوپر سے بھی اور اپنے پاؤں کے نیچے سے بھی۔''

اور اس کے متصلاً بعد یہ فیصلہ سنا دیا گیا:

قُلْ يٰٓاَھْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰي شَيْءٍ حَتّٰي تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ (المائدۃ : ٦٨)

''کہہ دو (اے محمد ﷺ!) اے اہل کتاب! جب تک تم تورات' انجیل اور جو تمہارے ربّ کی طرف سے تمہاری جانب نازل کیا گیا ہے اسے قائم نہ کرو تم کسی بنیاد پر نہیں ہو۔''

''حُکم بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ'' کا تعلق زیادہ تر افراد کے فکر و عمل سے ہے' جبکہ ''اقامت مَا اُنْزِلَ مِنَ اللّٰہِ'' سے مراد خاص طور پر اس نظامِ عدلِ اجتماعی کا قیام ہے جو کسی اجتماعیت کے شریک افراد اور کسی معاشرے کے مختلف طبقات کے مابین قسط اور عدل و انصاف پر مبنی ''توازن'' کا ضامن ہوتا ہے اور جس میں بندھنے کے بعد کسی کے کسی پر ظلم و عدوان اور بغی و طغیان کا امکان باقی نہیں رہتا اور سیاسی جبر (Political repression) اور معاشی استحصال (Economic Exploitation) سب کے

دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۶ جو ابھی میں نے آپ کو سنائی تھی' اس میں ''اقامت مَا اُنْزِلَ مِنَ اللّٰهِ'' کے ثمرات کے طور پر عمومی خوش حالی وفارغ البالی کا تذکرہ خاص طور پر کیا گیا ہے۔

اس نظامِ عدل وقسط کے قیام کا تذکرہ کمالِ اجمال و غایتِ اختصار کے ساتھ تو سورۃ الحدید کی اس آیت میں ہوا ہے کہ:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ (آیت ۲۵)

''ہم نے بھیجے اپنے رسول کھلی نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان تا کہ لوگ سیدھی طرح انصاف پر قائم رہیں!''

لیکن سورۃ الشوریٰ میں اس کا بیان ایسی وضاحت کے ساتھ ہوا ہے کہ اس سے حکمِ الٰہی اور اقامتِ دین اور ایمان بالکتاب اور قیامِ نظامِ عدلِ اجتماعی کا باہمی ربط وتعلق بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اس سورت کے دوسرے رکوع میں ایک نہایت حکیمانہ تدریج وترتیب کے ساتھ اس مضمون کی تفاصیل بیان ہوئی ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے وہی اصل الاصول بیان ہوا جس کا تذکرہ میں پہلے کر چکا ہوں' یعنی یہ کہ حکم کا اصل اختیار اللہ تعالیٰ کو ہے۔ چنانچہ آیت نمبر۱۰ میں ارشاد ہوا:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ

''اور جس معاملے میں بھی تمہارے مابین اختلاف ہو اُس کے فیصلے کا حق اللہ ہی کو ہے۔''

پھر آیت نمبر۱۳ میں اس حکمِ الٰہی کے دین وشریعت کی شکل میں ڈھلنے کی تفصیل بیان ہوئی ہے کہ:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ

''راستہ مقرر کر دیا تمہارے لیے دین میں وہی جس کا حکم دیا تھا نوح کو اور جو وحی

کیا ہم نے (اے نبیؐ) تیری طرف اور جس کا حکم دیا ہم نے ابراہیمؑ موسیٰ اور عیسیٰ کو کہ قائم رکھو دین اور مت اختلاف میں پڑو اس کے بارے میں!''

پھر آیت نمبر ۱۵ میں آنحضور ﷺ سے خطاب کر کے فرمایا گیا:

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ

''پس تو اسی کی دعوت دے اور قائم رہ جیسا حکم ہوا تجھے اور مت پیچھے چل ان کی خواہشوں کے اور کہہ دے کہ میں ایمان لایا اس کتاب پر جو نازل فرمائی ہے اللہ نے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے مابین عدل کروں۔''

پھر آیت نمبر ۱۷ میں اس پوری بحث کا خاتمہ ان جامع الفاظ پر ہوا کہ:

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ۝

''اللہ ہی تو ہے جس نے اتاری کتابِ کامل حق کے ساتھ اور میزان بھی۔ اور تجھے کیا خبر، شاید قیامت قریب ہی ہے۔''

سورۃ الحدید کی متذکرہ بالا آیت کی طرح سورۃ الشوریٰ کی اس آیت میں بھی کتاب کے ساتھ ''میزان'' کا لفظ بھی وارد ہوا ہے۔ اس کی تشریح میں مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے بڑی جامع بات فرمائی ہے کہ:

''اللہ نے مادی ترازو بھی اتاری جس میں اجسام تلتے ہیں' اور علمی ترازو بھی جسے عقل سلیم کہتے ہیں اور اخلاقی ترازو بھی جسے صفتِ عدل وانصاف کہا جاتا ہے' اور سب سے بڑی ترازو دینِ حق ہے جو خالق اور مخلوق کے حقوق کا ٹھیک ٹھیک تصفیہ کرتا ہے اور جس میں بات پوری تُلتی ہے' نہ کم نہ زیادہ!''

قرآن مجید تشتت وانتشار اور افتراق واختلاف کا اصل سبب ''بَغْيًا بَيْنَهُمْ'' کو قرار دیتا ہے' چنانچہ سورۃ الشوریٰ کے اس دوسرے رکوع میں بھی ''وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ''

کے تاکیدی حکم کے بعد آیت نمبر ۱۴ میں تفرقہ و انتشار کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے:

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ

''اور نہیں تفرقے میں پڑے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس 'العلم' پہنچ چکا' ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کی غرض سے۔''

دینِ حق اور اللہ کی نازل کردہ کتاب اور میزان کی اقامت سے اس بغی وطغیان کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں' پھر نہ احبار اور رُہبان کے لیے موقع رہتا ہے کہ وہ ''اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' بن کر بیٹھ سکیں' نہ سرمایہ ''دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ''(۱) کی صورت اختیار کر سکتا ہے' نہ ہی کسی سیاسی جبر و استبداد کا موقع باقی رہتا ہے' بلکہ تمام انسان اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاتے ہیں اور ان کے اولوا الامر کا فرض یہ قرار پاتا ہے کہ وہ ہر ضعیف کو قوی سمجھیں جب تک اسے اس کا حق نہ دلوا دیں اور ہر قوی کو ضعیف سمجھیں جب تک اس سے حق وصول نہ کر لیں — ''اقامة مَا اُنْزِلَ مِنَ اللّٰهِ'' کے ذریعے ایسے عادلانہ و منصفانہ نظامِ اجتماعی کا قیام کتابِ الٰہی کے ماننے والوں کا وہ فرض ہے جس پر وہ بحیثیت مجموعی مکلف ہیں اور جس کے بارے میں جواب دہی کی فکر انہیں کرنی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الشوریٰ میں اس سلسلۂ مضمون کے آخر میں یہ فرما کر کہ کیا عجب کہ قیامت قریب ہی ہو' متنبہ کر دیا گیا ہے کہ کتاب اور میزان کے حقوق کی ادائیگی کی جلد فکر کرو' ایسا نہ ہو کہ تم لیت ولعل اور تاخیر و تعویق ہی میں پڑے رہو اور آخری حساب کتاب کی گھڑی اچانک آن کھڑی ہو۔ اور اللہ کی کتاب اور میزان کا حق صرف اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ بفحوائے ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ اور ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ اس نظامِ عدلِ اجتماعی کو عملاً قائم کر دیا جائے جو اللہ نے دین و شریعت کی صورت میں عطا فرمایا ہے۔

پوچھا جا سکتا ہے کہ کتابِ الٰہی کے اس حق کی ادائیگی کے لیے کیا عملی تدبیر اختیار کی جائے؟ تو اگرچہ یہ موضوع میری اس وقت کی گفتگو سے براہِ راست متعلق نہیں تاہم یہ

(۱) سورۃ الحشر' آیت ۷: ''تمہارے دولت مندوں ہی کے مابین الٹ پھیر میں۔''

اشارہ مناسب بلکہ ضروری ہے کہ اقامتِ دین اور قیامِ نظامِ عدلِ قرآنی کی جدّو جہد کو دنیا کی کسی دوسری سیاسی' معاشی یا معاشرتی تحریک پر قیاس کرنا نہایت غلط اور اس کا عملی نقشہ کسی دوسری تحریک سے اخذ کرنا سخت مضر ہی نہیں انتہائی مہلک ہے۔ جس طرح ایک فرد میں اسلام کی مطلوبہ تبدیلی کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ پہلے قرآن کو اس کے دل و دماغ میں اتارا جائے تاکہ اس کا ذہن وفکر اور جذبات واحساسات سب قرآن کے تابع ہو جائیں' نتیجتاً اس کا عمل ازخود قرآن کے تابع ہو جائے گا' اسی طرح کسی ہیئت اجتماعی میں بھی اسلامی انقلاب صرف اس طرح برپا کیا جاسکتا ہے کہ پہلے اس کے ذہین اور سوچنے اور سمجھنے والے طبقات کے قلوب واذہان نورِ قرآن سے منور ہوں اور ان کے ''فکر ونظر'' میں قرآنی انقلاب برپا ہو جائے۔ کسی ہیئتِ اجتماعیہ کے اصحابِ علم وفکر کے طبقے میں ایمان اور یقین کا ایک مضبوط مرکز (nucleus) قائم ہو جائے تو پھر اس سے نورِ ایمان اور بصیرتِ دینی ان دوسرے طبقات میں لازماً سرایت کریں گے جو جسد اجتماعی میں اعضاء وجوارح کی حیثیت رکھتے ہیں اور رفتہ رفتہ پوری اجتماعیت نورِ ایمان سے جگمگا اٹھے گی اور پورے کا پورا دین اپنے مکمل نظامِ عدلِ اجتماعی سمیت عملاً قائم ہو سکے گا — اس ایک راہ کے سوا اقامتِ دین کی کوئی اور راہ موجود نہیں اور یہ خیال تو بالکل ہی خام اور ''اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ''[1] کا کامل مصداق ہے کہ کسی مسلمان قوم کے اسلام کے ساتھ ایک موروثی مذہب کی حیثیت سے جذباتی لگاؤ اور تعلق کو مشتعل (exploit) کر کے ایک سیاسی تحریک برپا کر دینے سے قرآن کا نظام قائم کیا جاسکتا ہے — بہرحال یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اصل بات جو اس وقت عرض کرنی مقصود ہے' یہ ہے کہ قرآن مجید پر عمل یعنی ''حُکم بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ'' اور ''اقامت مَا اُنزِلَ مِنَ اللّٰه'' قرآن مجید کا وہ حق ہے جو ہر مسلمان پر اس کی انفرادی حیثیت میں اور پوری اُمت مسلمہ پر اجتماعی اعتبار سے عائد ہوتا ہے اور جس کی ادائیگی کی فکر ہم میں سے ہر شخص کو انفرادی طور پر اور پوری اُمت کو اجتماعی طور پر کرنی چاہیے۔

---

(۱) سورۃ العنکبوت' آیت ۴۱: ''اور سب گھروں میں سب سے بودا گھر مکڑی کا گھر ہے۔''

پانچواں حق

تبلیغ و تبیین

ماننے‘ پڑھنے‘ سمجھنے اور عمل کرنے کے علاوہ قرآن مجید کا ایک اور حق بھی ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت واستعداد عائد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ وہ اسے دوسروں تک پہنچائے۔

پہنچانے کے لیے قرآن حکیم کی اصل اور جامع اصطلاح ''تبلیغ'' ہے‘ لیکن تبلیغ کے پہلو بھی بہت سے ہیں اور مدارج و مراتب بھی۔ حتیٰ کہ تعلیم بھی تبلیغ ہی کا ایک شعبہ اور تبیین بھی اسی کا ایک بلند تر درجہ ہے۔

قرآن حکیم خود اپنے مقصدِ نزول کی تعبیر اِن الفاظ میں کرتا ہے:

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ (ابراھیم : ۵۲)

''یہ (قرآن) پہنچا دینا ہے لوگوں کے لیے اور تا کہ وہ اس کے ذریعے خبردار کر دیے جائیں۔''

اور نبی اکرم ﷺ پر اپنے نزول کا اوّلین مقصد یہ قرار دیتا ہے کہ:

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ (الانعام : ۱۹)

''اور وحی کیا گیا میری طرف یہ قرآن تا کہ میں تمہیں اور جنہیں بھی یہ پہنچ جائے انہیں اس کے ذریعے خبردار کر دوں۔''(۱)

ساتھ ہی اس بات کو غیر مبہم الفاظ میں واضح کر دیتا ہے کہ اس قرآن پاک کی بلاکم و کاست اور بعینہٖ تبلیغ آنحضور ﷺ کا وہ فرضِ منصبی ہے جس میں ادنیٰ کوتاہی بھی فرائضِ نبوت و رسالت میں تقصیر شمار ہوگی۔ چنانچہ سورۃ المائدۃ میں انتہائی تاکیدی حکم دیا گیا:

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ (المائدۃ : ۶۷)

(۱) واضح رہے کہ ایک بگڑے ہوئے معاشرہ میں ''تبلیغ'' کا پہلا قدم ''انذار'' ہی کا ہوتا ہے۔

''اے رسولؐ! جو کچھ تم پر تمہارے ربّ کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کی (بلا کم و کاست) تبلیغ کرو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے خدا کے فرضِ رسالت کو ادا نہیں کیا۔''

بعثت کی پہلی ساعت سے لے کر حیاتِ دُنیوی کی آخری گھڑی تک مسلسل تیئیس سال آنحضورﷺ اپنے اس فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لیے محنت و مشقت اٹھاتے اور شدائد و مصائب برداشت کرتے رہے اور اس عرصہ میں آپؐ کی دعوت اگرچہ بہت سے مراحل سے گزری جن میں آپؐ کی مصروفیات بہت متنوّع نظر آتی ہیں' لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے عرصے میں آپؐ کی جدّوجہد کا اصل محور قرآن مجید ہی رہا' اور اسی کی تلاوت و تبلیغ اور تعلیم و تبیین میں آپؐ مسلسل مصروف رہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں چار مقامات پر آپؐ کے طریق دعوت و تبلیغ اور نہجِ اصلاح و انقلاب کی وضاحت ان الفاظ میں ہوئی ہے کہ:

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

(آل عمران : ١٦٤' الجمعة : ٢)

''وہ (آنحضورﷺ) تلاوت کرتے ہیں ان پر اس (خدا) کی آیات' اور تزکیہ کرتے ہیں ان کا' اور تعلیم دیتے ہیں ان کو کتاب اور حکمت کی۔''

ظاہر ہے کہ ان الفاظِ کریمہ کا مطلب وہی ہے جو میں اس سے قبل آپ کے سامنے اسلامی انقلاب کے مخصوص طریق کی وضاحت کے ضمن میں بیان کر چکا ہوں۔ بہرحال اس طریق پر مسلسل تیئیس برس محنت کر کے آنحضورﷺ نے قرآن مجید کی تبلیغ کا حق ادا فرما دیا' اور اللہ کی امانت اس کے بندوں تک پہنچا دی۔ ادائے امانتِ الٰہی کی اس جدّوجہد کے دوران بھی آپ نے اپنے جاں نثاروں[1] سے اپنے اس فرضِ منصبی کی ادائیگی میں اس تاکیدی حکم کے ذریعے تعاون حاصل فرمایا کہ: ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰيَةً))

(۱) ان نفوسِ قدسیہ میں سے حضرت مصعب بن عمیرؓ کی مثال تو حد درجہ تابناک ہے' جن کی تعلیم و تربیت کے ذریعے ہی مدینہ منورہ میں انقلاب برپا ہوا اور یہ سرزمین ''دارالہجرت'' کا شرف و اعزاز پانے کے قابل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے!

''پہنچاؤ میری جانب سے چاہے ایک ہی آیت!'' اور اپنے مشن کی تکمیل پر — مستقبل کے لیے فریضہ تبلیغِ قرآن کی پوری ذمہ داری اپنی اُمت کے حوالے فرما دی۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے خطبے میں سوا لاکھ سے زائد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے متعدد بار یہ شہادت لے کر کہ میں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا ہے' آئندہ کے لیے یہ مستقل ہدایت جاری فرما دی کہ: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) یعنی اب جو لوگ یہاں موجود ہیں ان کا فرض ہے کہ ان تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں۔ اور اس طرح قیامت تک کے لیے فریضہ تبلیغِ قرآن کا بوجھ اُمتِ محمد ﷺ کے کاندھوں پر آ گیا جس کے لیے بحیثیت مجموعی وہ خدا کے ہاں مسئول ہو گی۔ اب ظاہر ہے کہ اُمت افراد ہی پر مشتمل ہے۔ لہٰذا اس اُمت کا ہر فرد اپنی اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق اس فرض کی ادائیگی کا ذمہ دار ہے۔ علماء اور فضلاء پر ذمہ داری ان کے علم و استعداد کی نسبت سے عائد ہوتی ہے اور عوام پر ان کی صلاحیت کی نسبت سے۔

بہرنوع آنحضور ﷺ کے ان مبارک الفاظ کے عموم سے کہ ''بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً'' ثابت ہوتا ہے کہ اس ذمہ داری سے بالکل بَری کوئی بھی نہیں۔ جسے ناظرہ پڑھنا آتا ہے وہ دوسروں کو ناظرہ پڑھنا سکھا دے' جسے حفظ ہے وہ دوسروں کو یاد کرائے' جسے ترجمہ آتا ہے وہ دوسروں کو ترجمہ پڑھائے اور جسے اس کا کچھ علم و فہم حاصل ہے وہ اسے دوسروں تک پہنچائے۔ حتیٰ کہ اگر کسی کو ایک آیت ہی یاد ہو اور وہ اسے ہی دوسروں کو یاد کرا دے یا قرآن کی کسی ایک آیت یا سورت کا مفہوم معلوم ہو اور وہ صرف اسی کا علم دوسروں تک منتقل کر دے تو یہ بھی ''تبلیغِ قرآن'' میں شامل ہے۔ اگرچہ اس مقدّس اور

عظیم الشان فرض کی ادائیگی کی جو ذمہ داری اُمتِ مسلمہ پر بحیثیتِ مجموعی عائد ہوتی ہے وہ صرف اس وقت پوری ہوسکتی ہے جب قرآن کا متن اور اس کا مفہوم اطراف واکنافِ عالم تک پہنچادیا جائے!

بحالاتِ موجودہ یہ ایک بہت دُور کی بات اور سہانا خواب معلوم ہوتا ہے' اس لیے کہ واقعی صورت حال یہ ہے کہ وہ اُمت کو قرآن کو اقوام واُمِم عالم تک پہنچانے کی ذمہ دار بنائی گئی تھی آج اس کی محتاج ہے کہ خود اسے قرآن ''پہنچایا'' جائے۔ لہٰذا اس وقت اصل ضرورت اس کی ہے کہ خود اُمت مسلمہ میں تعلیم وتعلّم قرآن کی ایک رَو چل نکلے اور مسلمان درجہ بدرجہ قرآن سیکھنے اور سکھانے میں لگ جائے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا' تبلیغ ہی کا ایک شعبہ تعلیم بھی ہے اور اسی کا ایک اعلیٰ درجہ وہ ہے جسے قرآن حکیم ''تبیین'' کا نام دیتا ہے۔ یعنی یہ کہ قرآن مجید کو صرف ''پہنچا'' ہی نہ دیا جائے بلکہ اس کی پوری وضاحت کی جائے۔ اور ایک تو جیسا کہ میں نے قرآن پر تدبر کے ضمن میں عرض کیا تھا' لوگوں کے ذہنوں کے قریب ہوکر کلام کیا جائے اور قرآن کا نورِ ہدایت لوگوں کی نگاہوں کے عین سامنے روشن کر دیا جائے اور دوسرے یہ کہ اس کی سور وآیات کے مدلولات ومتضمنات کو پوری طرح کھول دیا جائے۔ قرآن حکیم نے اپنے آپ کو ''بیان'' کے لفظ سے بھی تعبیر کیا ہے' جیسے:

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (آلِ عمران)

''یہ وضاحت ہے لوگوں کے واسطے اور ہدایت اور نصیحت ہے ڈرنے والوں کے لیے۔''

اور اپنے لیے ''مبین'' اور اپنی آیات کے لیے ''بیّنات'' اور ''مبیّنات'' کی صفات کا استعمال نہایت کثرت سے کیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ کتبِ الٰہی کی تبیین و

توضیح انبیاءِ کرام علیہم السلام کی ذمہ داری بھی ہے اور ان اُمتوں کی بھی جو اِن کی حامل بنائی جاتی ہیں‘ جیسا کہ آنحضور ﷺ سے خطاب کر کے فرمایا گیا کہ:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل : ٤٤)

''اور اتاری ہم نے تجھ پر یہ ''یاددہانی'' تاکہ تو واضح کر دے لوگوں کے سامنے جو کچھ اترا ہے ان کے لیے۔''

اور اہلِ کتاب کے بارے میں فرمایا گیا کہ ان سے تبیین کتاب کا عہد لیا گیا تھا:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ

(آلِ عمران : ١٨٧)

''اور جب عہد لیا اللہ نے ان سے جنہیں عطا فرمائی گئی کتاب‘ کہ اس کو واضح کرو گے لوگوں کے لیے۔''

لیکن جب انہوں نے اپنے اس فرض کو ادا نہ کیا اور اُلٹا کتمانِ حق کے مرتکب ہوئے تو لعنتِ خداوندی کے مستحق قرار دیے گئے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ (البقرة)

''بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں اس واضح تعلیم اور ہدایت کو جو ہم نے نازل فرمائی ہے اس کے بعد کہ واضح کر دیا ہم نے اس کو لوگوں کے لیے اپنی کتاب میں‘ تو لعنت کرتا ہے ان پر اللہ اور لعنت کرتے ہیں سب لعنت کرنے والے۔''

اس ''تبیین'' کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ہر قوم پر اس کی عام زبان اور آسان محاورے میں سہل انداز سے قرآن مجید کا سرسری مفہوم واضح کر دیا جائے۔ اس لیے کہ کسی قوم کے لیے تبیینِ قرآن اس کی اپنی زبان ہی میں ہو سکتی ہے‘ جیسا کہ فرمایا گیا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ (ابراهيم : ٤)

''اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر بولی بولنے والا اپنی قوم ہی کی تاکہ واضح کر دے ان پر (اللہ کا پیغام)۔''

اور اس کا آخری درجہ یہ ہے کہ کتابِ الٰہی کے علم و حکمت اور اس کے مضمرات و مقدرات

کو کھول کر بیان کیا جائے' اس کے نہجِ استدلال کو واضح کیا جائے' اس کے دلائل و براہین کی مدد سے تمام گمراہ کن خیالات ونظریات کی مدلّل تردید کی جائے' اور وقت کی بلند ترین علمی سطح پر اعلیٰ ترین علمی استدلال کے ساتھ قرآن حکیم اور اس کی تعلیمات کی حقانیت کو مبرہن کر دیا جائے۔ تبیینِ قرآن کے ادنیٰ درجے کے حق کی ادائیگی کی صورت فی الوقت یہ ہے کہ دنیا کی ہر قابلِ ذکر زبان میں قرآن مجید کے فصیح و بلیغ تراجم مع مختصر تشریح وتفسیر شائع کیے جائیں اور ان کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی جائے ـــ اور اعلیٰ درجہ میں اس کے حق کی ادائیگی صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ' جیسا کہ میں نے تدبر قرآن کے ضمن میں عرض کیا تھا' عالمِ اسلام میں جابجا اکیڈمیاں اور یونیورسٹیاں قائم ہوں جن کا مرکزی موضوع قرآن حکیم ہو اور ان کے ذریعے اعلیٰ ترین علمی سطح پر قرآن مجید کی ہدایت کی وضاحت کی جائے۔

حضرات! یہ ہیں قرآن مجید کے وہ حقوق جو میرے فہم کے مطابق ہم سب پر بحیثیت مسلمان عائد ہوتے ہیں اور جن کی ادائیگی کی فکر ہمیں کرنی چاہیے۔ ہم وہ خوش قسمت قوم ہیں جس کے پاس اللہ کا کلامِ پاک من وعن محفوظ اور موجود ہے۔ یہ بات جہاں بڑے اعزاز کا باعث ہے وہیں اس کی بنا پر ایک بہت بڑی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ ہم سے پہلے کتابِ الٰہی کے حامل بنی اسرائیل بنائے گئے تھے' لیکن جب انہوں نے اس منصبِ عظمیٰ کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا اور ثابت کر دیا کہ وہ اس اعزاز و اکرام کے لائق نہیں تو ایک دوسری اُمت برپا کر دی گئی اور اسے قرآن مجید کا حامل بنا کر کھڑا کر دیا گیا۔ سورۃ الجمعۃ کی آیت ۵ میں کتابِ الٰہی کے حامل ہو کر اس کے حقوق کو ادا نہ کرنے والوں کے لیے پہلے ایک مثال بیان کی گئی ہے کہ:

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ

''ان لوگوں کی مثال جو حامل تورات بنائے گئے' پھر نہ اٹھایا انہوں نے اس (کی ذمہ داری) کو' اس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ پیٹھ پر لادے پھر رہا ہو۔''

اور پھر اس کے فوراً بعد واضح کر دیا گیا کہ ان کا طرزِ عمل آیاتِ الٰہی کی تکذیب کے مترادف ہے۔

بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ

''بری ہے مثال ان لوگوں کی جو جھٹلاتے ہیں اللہ کی آیات کو۔''

اور ساتھ ہی یہ سُنّتُ اللہ بھی بیان کر دی گئی ہے کہ:

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○

''اور اللہ (ایسے) ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

مَیں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میرا یا آپ کا شمار اللہ کے نزدیک ان لوگوں میں ہو اور دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں صحیح معنی میں قرآن کا حامل بنائے۔

سورۃ الفرقان کی اس آیتِ کریمہ میں کہ:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِى اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۝

''اور کہا رسولؐ نے اے میرے ربّ! میری قوم نے اس قرآن کو نظرانداز کر دیا۔''

اگرچہ اصلاً تذکرہ ان کفار کا ہے جن کے نزدیک قرآن سرے سے کوئی قابلِ التفات چیز ہے ہی نہیں، لیکن قرآن کے وہ ماننے والے یقیناً اس کے ذیل میں آتے ہیں جو عملاً قرآن کے ساتھ عدم توجہ و التفات کی روش اختیار کریں۔ چنانچہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''آیت میں اگرچہ مذکور صرف کافروں کا ہے تاہم قرآن کی تصدیق نہ کرنا، اس میں تدبّر نہ کرنا، اس پر عمل نہ کرنا، اس کی تلاوت نہ کرنا، اس کی تصحیح قراءت کی طرف توجّہ نہ کرنا، اس سے اعراض کر کے دوسری لغویات یا حقیر چیزوں کی طرف متوجہ ہونا، یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجرانِ قرآن کے تحت میں داخل ہو سکتی ہیں۔'' (۱)

---

(۱) عجیب اتفاق ہے، بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ذاتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے قرب کی دلیل ہیں وہ الفاظ جو مولانا کے ان الفاظ کے بالکل مشابہ ایک حدیث میں وارد ہوئے جو حضرت عبیدہ ملیکی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور جس کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ◄

میں ایک بار پھر اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ ہمارا شمار ایسے لوگوں میں ہو۔ اور اس دعاءِ ماثورہ پر اپنی اس تقریر کو ختم کرتا ہوں جو بالعموم صرف ختمِ قرآن پر پڑھی جاتی ہے' لیکن جس کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ ہمیں کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے رہنا چاہیے تاکہ ہمیں قرآن مجید کے حقوق ادا کرنے کی توفیق بارگاہِ ربّ العزت سے حاصل ہو جائے:

اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنَا بِالْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ وَاجْعَلْهُ لَنَا اِمَامًا وَّنُوْرًا وَهُدًى وَّرَحْمَةً اَللّٰهُمَّ ذَكِّرْنَا مِنْهُ مَا نَسِيْنَا وَعَلِّمْنَا مِنْهُ مَا جَهِلْنَا وَارْزُقْنَا تِلَاوَتَهٗ آنَاءَ اللَّيْلِ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ وَاجْعَلْهُ لَنَا حُجَّةً يَّا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ (آمین)

''پروردگار! ہم پر قرآن عظیم کی بدولت رحم فرما اور اسے ہمارے لیے پیشوا' نور اور ہدایت و رحمت بنا دے۔ پروردگار! اس میں سے جو کچھ ہم بھولے ہوئے ہیں وہ ہمیں یاد کرا دے اور جو ہم نہیں جانتے ہمیں سکھا دے۔ اور ہمیں توفیق عطا فرما کہ اس کی تلاوت کریں راتوں کو بھی اور دن کے حصوں میں بھی اور بنا دے اسے دلیل ہمارے حق میں اے تمام جہانوں کے پروردگار!'' (آمین)

◄ ((يَا اَهْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَافْشُوْهُ وَتَغَنَّوْهُ وَتَدَبَّرُوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ)) (شعب الايمان للبيهقی' بحواله معارف الحديث' جلد پنجم)

''اے قرآن والو! قرآن کو بس اپنا تکیہ ہی نہ بنالو' بلکہ دن اور رات کے اوقات میں اس کی تلاوت کیا کرو جیسا اس کی تلاوت کا حق ہے' اور اس کو (چار دانگ عالم میں) پھیلاؤ' اور اس کو خوش الحانی سے حظ لیتے ہوئے پڑھا کرو' اور اس پر غور و فکر کرو' تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

سبحان اللہ کتنا پیارا ہے وہ خطاب جو اس اُمت کو ملا ---- اور کتنے جامع ہیں حدیث شریف کے الفاظ جنہوں نے مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق کا کمال اختصار کے ساتھ احاطہ کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری سینکڑوں تقریریں قربان آنحضور ﷺ کے ان چند الفاظ مبارکہ پر ---- بالکل سچ فرمایا آنحضور ﷺ نے کہ ((اُوْتِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ)) (مجھے نہایت جامع کلمات عطا ہوئے ہیں) فِدَاهُ اَبِيْ وَاُمِّيْ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

ایک عظیم ماثور دُعا

عبدیتِ کاملہ کا مظہرِ اَتم

اور

"شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ" کی کامل تفسیر

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ اَمَتِكَ ، فِیْ قَبْضَتِكَ، نَاصِيَتِیْ بِيَدِكَ ، مَاضٍ فِیَّ حُكْمُكَ، عَدْلٌ فِیَّ قَضَاءُ كَ، اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ، سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ، اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ، اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِی كِتَابِكَ، اَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهٖ فِیْ مَكْنُوْنِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ، اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِيْعَ قَلْبِیْ وَنُوْرَ صَدْرِیْ وَجِلَاءَ حُزْنِیْ وَذَهَابَ هَمِّیْ وَ غَمِّیْ ۔ آمِيْنَ يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ!

''اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں' تیرے ایک ناچیز غلام اور ادنیٰ کنیز کا بیٹا ہوں' مجھ پر تیرا ہی کامل اختیار ہے اور میری پیشانی تیرے ہی ہاتھ ہے' نافذ ہے میرے بارے میں تیرا ہر حکم اور عدل ہے میرے معاملے میں تیرا ہر فیصلہ۔ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں تیرے ہر اُس اسم پاک کے واسطے سے جس سے تو نے اپنی ذاتِ مقدس کو موسوم فرمایا' یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو تلقین فرمایا' یا اپنی کسی کتاب میں نازل فرمایا' یا اسے اپنے مخصوص خزانۂ غیب ہی میں محفوظ رکھا' کہ تو بنا دے قرآن مجید کو میرے دل کی بہار اور میرے سینے کا نور اور میرے رنج و حزن کی جلا اور میرے تفکرات اور غموں کے ازالے کا سبب۔ ایسا ہی ہو اے تمام جہانوں کے پروردگار!

(مسند احمد و رزین ۔ بروایت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ)

تقاریظ

(۱)

از مولانا امین احسن اصلاحی

یہ رسالہ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے' برادرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سلّمہٗ نے ان حقوق و فرائض کی تشریح کے مقصد سے لکھا ہے جو ایک مسلمان پر قرآن سے متعلق عائد ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں قرآن پر ایمان کے مدّعیوں کی کمی نہیں ہے' لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس ایمان کے تقاضے اور مطالبے کیا ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سلّمہٗ نے قرآن کے دلائل کی روشنی میں ان تقاضوں اور مطالبوں کی تشریح کی ہے اور بیک نظر محسوس ہوتا ہے کہ نہایت خوبی اور جامعیت کے ساتھ تشریح کی ہے۔ اندازِ بیان نہایت دل نشین' دلائل نہایت محکم اور اسلوبِ خطابت نہایت ہی مؤثر اور دردمندانہ ہے۔ ہر مسلمان جو قرآن کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح بنیاد پر قائم کرنا چاہتا ہے' اس رسالے میں بہترین رہنمائی پائے گا۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے قلم میں برکت دے کہ وہ ایسی بہت سی چیزیں لکھنے کی توفیق پائیں۔ ہماری بہت سی عزیز امیدیں ان سے وابستہ ہیں۔

(۲)

از پروفیسر یوسف سلیم چشتی

میری رائے میں برادرم اسرار احمد سلمہ' پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے کہ ایم بی بی ایس کرنے کے بعد اُن کی توجہ قوم کے روحانی امراض کے ازالے کی طرف منعطف ہوگئی ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ میری رائے میں انہوں نے بالکل ٹھیک تشخیص کی ہے۔قوم کے تمام روحانی امراض ایک بنیادی مرض سے پیدا ہوئے ہیں اور وہ مرض ہے قرآن حکیم سے بے اعتنائی و بے تعلقی' بلکہ ہجر قبیح۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے قبل از گرفت متنبہ فرما دیا ہے:

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۝﴾

ڈاکٹر صاحب نے اردو زبان میں غالبًا پہلی مرتبہ اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے کہ قرآن مجید کے ہم مسلمانوں پر کیا حقوق ہیں۔عام طور سے مسلمان اپنے اوپر قرآن مجید کا یہ حق سمجھتے ہیں کہ

ا) اسے ریشمی جز دان میں رکھا جائے۔

ب) لڑکی کو جہیز میں دیا جائے۔

ج) قریب الموت کے سرہانے اس کی ایک خاص سورت پڑھی جائے تاکہ دم نکلنے میں قدرے آسانی ہو جائے۔

د) عدالتوں میں قسم کھاتے وقت اسے سر پر رکھ لیا جائے۔

ہ) پریشانی کے وقت اس سے فال کھول لی جائے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان باتوں کی بجائے پانچ بالکل مختلف حقوق بیان کیے ہیں۔ان کو پڑھ کر راقم الحروف کے دل سے بے اختیار مصنف کے لیے دعا نکلی۔

مجھے یقین ہے کہ اگر مسلمان اس کتابچے کو جو "بقامت کہتر و لے بقیمت بہتر" کا مصداق ہے' غور سے پڑھیں گے تو انہیں قرآن مجید سے وہی رابطۂ قلبی پیدا ہو جائے گا جو عین منشاء ایزدی ہے' ان شاء اللہ —— یہ مضمون لکھ کر ڈاکٹر صاحب نے اپنے لیے سعادتِ اُخروی کا بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔

۞ ۞ ۞

اسلام، مسلمان اور قرآن حکیم

اشعارِ اقبال کی روشنی میں

☆

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست   کہ از یٰسینِ او آساں بمیری

(لیکن افسوس کہ اے مسلمان!) تجھے اس کی آیات سے اب اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ اس کی سورۂ یٰسین کے ذریعے موت کو آسان کر لے!

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی   شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ   در بغل داری کتابِ زندۂ

(اے مسلمان!) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تُو قرآن سے دُور اور بے تعلق ہو گیا ہے، لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے! اے وہ قوم کہ جو شبنم کے مانند زمین پر بکھری ہوئی ہے (اور پاؤں تلے روندی جا رہی ہے!) اٹھ کہ تیری بغل میں ایک کتابِ زندہ موجود ہے (جس کے ذریعے تو بامِ عروج پر پہنچ سکتی ہے!)

جز بہ قرآں ضیغمی روباہی است   فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است

فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر   فکر را کامل نہ دیدم جُز بذکر

قرآن کے بغیر شیر بھی گیدڑ بن جاتا ہے، اور اصل بادشاہی قرآن کے تعلیم کردہ فقر میں ہے۔ جانتے ہو قرآن کا فقر کیا ہے؟ یہ ذکر اور فکر دونوں کے جمع ہونے سے وجود میں آتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ بغیر ذکر کے فکر کامل نہیں ہو سکتا۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن   نیست ممکن جز بقرآں زیستن

(اے مسلمان!) اگر تو مسلمانوں والی زندگی گزارنا چاہتا ہے تو سن رکھ کہ یہ بغیر

قرآن کے ممکن نہیں ہے!

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود
مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں — زندہ و پایندہ و گویا ست ایں

(اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں! حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے۔ (یہ کتاب حکیم) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے! یہ ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ (کا کلام ہے' لٰہذا اسی) کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی' اور جیتی جاگتی بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی!

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است — گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مؤمن ز آیاتِ خداست — ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست!
چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش

اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہاں آباد ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے میں بے شمار زمانے موجود ہیں! عصرِ حاضر کو بھی بس ایک ایسا ہی جہانِ نو درکار ہے (جو قرآن سے ماخوذ اور مستنبط ہو!) اے مسلمان! اگر تیرے سینے میں ایک ایسا دل ہے جو معانی کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کر سکتا ہو تو (مجھ سے) یہ راز کی بات حاصل کر لے! بندۂ مؤمن آیاتِ خداوندی میں سے ہے اور اس عالَم کی حیثیت بس ایسی ہے جیسی اس کے لباس میں ایک قبا۔ جب اس کے لباس کی کوئی قبا یعنی کوئی عالَم پرانا ہو جاتا ہے تو قرآن اسے ایک جہانِ نو عطا فرما دیتا ہے۔

✿ ✿ ✿

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش نظر کتابچہ

”مُسلمانوں پر قُرآن مجید کے حُقوق“

اس کے حقیر اور ناچیز مؤلف نے

نومبر ۱۹۷۰ء میں ——— مدینہ منورہ میں

مولانا سیّد محمد یُوسف بنّوری رحمۃ اللہ علیہ

کی خدمت میں اس استدعا کے ساتھ پیش کیا کہ وہ اسے ایک نظر دیکھ لیں اور اگر کوئی غلطی محسوس ہو تو اصلاح فرمادیں' اس لیے کہ مؤلف اسے بڑی تعداد میں شائع کرنا چاہتا ہے

الحمد للہ کہ حضرت مولاناؒ نے

مسجدِ نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) میں بحالتِ اعتکاف

اسے بالاستیعاب پڑھا اور صرف ایک مقام پر اصلاح تجویز فرمائی'

جو دوسرے ایڈیشن میں کر دی گئی!

اس طرح اب اس کتابچے کو بحمد اللہ حضرت مولاناؒ کی کُلّی تصدیق و تصویب کی سعادت حاصل ہے!

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

زوالِ اُمّت کا اصل سبب اور اس کا علاج

مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر میں

''اگر ایک شخص مسلمانوں کی تمام موجودہ تباہ حالیوں اور بدبختیوں کی علّتِ حقیقی دریافت کرنا چاہے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دے کہ صرف ایک ہی علّتِ اصلی ایسی بیان کی جائے جو تمام علل و اسباب پر حاوی اور جامع ہو تو اس کو بتایا جا سکتا ہے کہ علماءِ حق و مرشدینِ صادقین کا فقدان اور علماءِ سُوء و مُفسدینِ دجّالین کی کثرت...... رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا...... اور پھر اگر وہ پوچھے کہ ایک ہی جملہ میں اس کا علاج کیا ہے' تو اس کو امام مالکؒ کے الفاظ میں جواب ملنا چاہیے کہ ''لَا يَصْلُحُ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا'' یعنی اُمتِ مرحومہ کے آخری عہد کی اصلاح کبھی نہ ہو سکے گی' تاوقتیکہ وہی طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے ابتدائی عہد نے اصلاح پائی تھی' اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قرآن حکیم کے اصلی و حقیقی معارف کی تبلیغ کرنے والے مرشدینِ صادقین پیدا کیے جائیں۔''

(ماخوذ از ''البلاغ'' جلد اوّل' شمارہ اوّل' مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء)

مسلمانوں کی زبوں حالی کا اصل سبب

اور اس کے تدارک کے لیے کرنے کا اصل کام

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ (اسیر مالٹا) کے تاثرات

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دُنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا' دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے' بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی میں قائم کئے جائیں' بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے' اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔"

(ماخوذ از وحدتِ اُمت' تالیف مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ)

انفرادی نجات اور اجتماعی فلاح کے لیے

قرآن کا لائحہ عمل

عنوانات

۞ قرآن حکیم کی اصل دعوت: ''عبادتِ رب'' 358
۞ ''عبادت'' اور ''عبادات'' میں فرق 363
۞ عبادت کا اصل مفہوم 366
۞ جزوی اطاعت کی حقیقت 370
۞ ہیں آج کیوں ذلیل......؟ 372
۞ انفرادی محاسبہ کی ضرورت 374
۞ فتنے سے نکلنے کا راستہ 376
۞ اُمتِ مسلمہ کا فرض منصبی 383
۞ فریضہ اقامتِ دین کی شرط لازم: التزامِ جماعت 386
۞ اقامتِ دین کے لیے مطلوبہ جماعت کے خصائص 391
۞ گر جیت گئے تو کیا کہنے' ہارے بھی تو بازی مات نہیں 398
۞ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دورِ ثانی 400

خطبہ مسنونہ کے بعد تلاوتِ آیات:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ (البقرة)

اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲﴾ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۳﴾ (نوح)

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (الاعراف:۵۹، ۶۵، ۷۳، ۸۵)

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ○ (الشعراء: ۱۰۸، ۱۲۶، ۱۴۴، ۱۵۰، ۱۶۳)

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ (الذّٰريٰت)

وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ﴿۵﴾ (البينة)

اس تحریر کے ذریعے راقم کے دینی فکر کو ایک جامع اور مانع شکل میں پیش کرنا مقصود ہے۔ جہاں تک میرے دینی فکر کے اجزاء کا تعلق ہے تو یہ کوئی ڈھکے چھپے نہیں ہیں اور میں انہیں اپنی تقاریر، گفتگوؤں، دروسِ قرآن، خطباتِ جمعہ اور خطباتِ عید میں بارہا بیان کر چکا ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یہ علیحدہ علیحدہ تو نہ صرف معلوم ہیں بلکہ معروف بھی ہیں اور بتکرار و اعادہ سامنے بھی آتے رہتے ہیں، لیکن یہاں انہیں میں جامع اور مانع صورت میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

جامع اور مانع، علمِ منطق کی دو اصطلاحات ہیں۔ کسی شے کی تعریف ''جامع'' اس اعتبار سے کہلائے گی کہ اس شے کی حقیقت کا کوئی جزو اس تعریف سے باہر نہ رہے، یعنی وہ اس کے تمام پہلوؤں کو جمع کر لے کہ وہ جامع ہو جائے، جبکہ ''مانع'' اس طرح سے

ہو کہ اس کے خلاف کوئی شے اس میں داخل نہ ہونے پائے۔ اس طرح جامع اور مانع تعریف وہ کہلاتی ہے کہ جو کسی شے کو یوں معین کر دے کہ ایک طرف تو اس کے تمام اجزاء اس میں شامل ہوں اور دوسری طرف اس کے منافی کوئی شے اس میں شامل نہ ہو سکے۔ اس تحریر کا مقصد بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد سے اپنی دینی سوچ اور فکر کا ایک جامع اور مانع خلاصہ آپ کے سامنے لاسکوں!

قرآن حکیم کی اصل دعوت: ''عبادتِ رب''

میرے نزدیک قرآن کی دعوت کا اوّلین اور جامع ترین عنوان ''عبادتِ رب'' ہے۔ باقی کی تمام چیزیں اسی کی شرح میں' اسی کے ذیل میں اور اسی کے مراحل کے طور پر آتی ہیں۔ یہ لفظ قرآن مجید میں کافی تکرار کے ساتھ آیا ہے۔

قرآن مجید کا آغاز سورۃ الفاتحہ سے ہوتا ہے۔ یہ گویا کہ پورے قرآن کے لیے ایک تمہید کی مانند ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو دعا کی تلقین فرمائی ہے۔ اس میں سات آیات ہیں جن کو ''سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَالۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ'' کہا گیا ہے۔ اس کی مرکزی آیت ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ﴾ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ضمن میں اسی سے استعانت طلب کی گئی ہے۔ ابتدائی آیات میں یہ اقرار کرنے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ ہی ساری تعریفوں کا سزاوار ہے' وہی تمام جہانوں کا پالن ہار اور پروردگار ہے' وہی رحمٰن اور رحیم ہے' جزا و سزا کے دن کا مختار مطلق ہے' اب اسی سے التجا کی جارہی ہے کہ عبادت کے تقاضے پورے کرنے میں ہماری مدد فرما۔ سورۃ الفاتحہ کو نہ صرف قرآن مجید کا دیباچہ اور خلاصہ کہا جاتا ہے بلکہ اسے اُمّ القرآن' اساس القرآن' الکافیہ اور الشافیہ جیسے القابات بھی دیے گئے ہیں۔ اسی سورۃ الفاتحہ کا مرکزی تصور یہ آیت ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ﴾ ہے۔

سورۃ الفاتحہ میں کی گئی دعا ﴿اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۙ﴾ کا جواب اس سورۃ کے بعد دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں سورۃ البقرۃ کے پہلے دو رکوعوں میں تین قسم کے اشخاص کی نشاندہی کر دی گئی ہے:

۱) وہ گروہ جس نے قرآن مجید کی ہدایت سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ ''یہی لوگ اپنے ربّ کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں۔''

۲) وہ افراد جنہوں نے اپنے دل اور ذہن کے دروازے ہدایت قرآنی سے بند کر کے ان پر تالے لگا دیے ﴿اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾ اور وہ اپنے تعصب' ہٹ دھرمی' تکبر اور حسد کی وجہ سے اللہ کی ہدایت سے محروم ہو گئے۔ ان کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۗ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ (آیت ۷) ''اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔''

۳) تیسرا طبقہ وہ ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ ''انسانوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کہتے تو ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور یومِ آخر پر' لیکن وہ حقیقتاً مومن نہیں ہیں۔''

یہاں سب سے زیادہ بحث تیسرے طبقے سے متعلق ہوئی ہے۔ دو طبقوں کا ذکر تو پہلے رکوع میں کر دیا گیا ہے جبکہ تیسرے طبقے کے لیے دوسرا رکوع پورے کا پورا مختص کیا گیا ہے۔ اس طبقے کا بہ تمام و کمال اطلاق یا تو منافقین پر تھا یا پھر اُس دور کے یہودی علماء پر' لیکن اس سے کم تر درجے میں وہ لوگ بھی اس زمرے میں آتے ہیں جو ضعفِ ایمان میں مبتلا ہیں۔ ان کے بارے میں سورۃ التوبۃ میں فرمایا گیا: ﴿خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ﴾ (آیت ۱۰۲) یعنی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اپنے اندر نیکیاں اور بدیاں جمع کر لیتے ہیں۔ یہ اصل میں اس بیماری کے مختلف shades ہیں۔ منافقین میں یہ بیماری درجہ بدرجہ بڑھتی جاتی ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ﴾ (البقرۃ: ۱۰)۔ بدقسمتی سے ہماری ایک عظیم اکثریت کسی نہ کسی طرح اس مرض میں مبتلا ہے' لہٰذا اس کا شمار اسی زمرے میں ہوتا ہے۔

اس کے بعد سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱ سے قرآن مجید کی دعوت کا آغاز ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اے بنی آدم! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور تم سے پہلوں کو بھی (پیدا کیا) تاکہ تم بچ سکو۔''

چونکہ ''عبادت'' کے لیے اردو میں ایسا کوئی لفظ موجود نہیں ہے جو مکمل طور پر اس کی ترجمانی کا حق ادا کر سکے' اس لیے فی الحال اسے اسی طرح رکھتے ہوئے آیت کے بقیہ حصے پر غور کیجیے۔

''مِنْ قَبْلِكُمْ'' خاص طور پر اس لیے کہا گیا کہ رسولوں کی دعوت کے جواب میں اُن سے اُن کی قوموں نے اکثر و بیشتر جو بات کہی وہ یہی ہوتی تھی کہ ہم نے تو اپنے آباء واجداد کو یہی کرتے ہوئے پایا تھا جو ہم کر رہے ہیں۔ گویا ان کی طرف سے دلیل یہ تھی کہ ہم اپنے آباء واجداد کی رسومات کو کیسے چھوڑ دیں؟ یہاں اس بات کی نفی کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جیسے تم مخلوق ہو ویسے ہی تمہارے آباء واجداد بھی مخلوق تھے' جیسے تم سے غلطی ہو سکتی ہے ویسے ان سے بھی ہو سکتی ہے' لہٰذا تمہیں ان کی پیروی نہیں کرنی' بلکہ پیروی تو اس کی کرنی ہے جو خود بھی سیدھے راستے پر ہو اور تمہیں بھی سیدھا راستہ دکھائے' یا جو حق تم پر منکشف ہو جائے اس کی پیروی کی جائے۔

''لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ'' کا ترجمہ عام طور پر کر دیا جاتا ہے: ''تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے''۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ دراصل ''وَقٰی' یَقِیْ'' کے عربی زبان میں معانی ہیں کسی کو بچانا۔ اس کو یاد رکھنے کے لیے آسان ترین حوالہ ''وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ'' ہے' یعنی ''اے اللہ! ہمیں آگ کے عذاب سے بچائیو!''۔ ''وَقٰی' یَقِی'' کا معنی بچانا اور ''اِتَّقٰی' یَتَّقِیْ'' کا معنی بچنا ہے۔ اسی طرح ''لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ'' کے معانی ہوں گے ''تاکہ تم بچ سکو''۔ کس چیز سے بچ سکو؟ اس دنیا کی زندگی میں افراط و تفریط کے دھکوں سے بچ جاؤ گے اور صراطِ مستقیم تمہیں میسر آ جائے گی اور آخرت میں اللہ کے غضب اور اس کی سزا

سے بچ جاؤ گے اور اس کی رحمت و مغفرت کے امیدوار بن سکو گے۔ قرآن کی دعوت کا نکتۂ اوّلین یہ ہے۔

''عبادتِ رب'' کے ضمن میں دوسرے حوالے کے لیے سورۂ نوح کی ابتدائی تین آیات نہایت اہم ہیں' کیونکہ رسولوں کی تاریخ حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔ ان سے پہلے آنے والے تمام پیغمبر نبی تھے' رسول نہیں تھے۔ پہلے رسول حضرت نوح علیہ السلام تھے اور آخری رسول حضرت محمد ﷺ ہیں۔ آخری رسول کی دعوت یہ ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴿۲۱﴾ (البقرۃ)

جبکہ پہلے رسول کی دعوت سورۂ نوح کی ابتدائی تین آیات میں بیان ہوئی:

اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴿۱﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴿۲﴾ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ﴿۳﴾ (نوح)

''یقیناً ہم نے نوح (علیہ السلام) کو بھیجا تھا اس کی قوم کی جانب (اس ہدایت کے ساتھ) کہ خبردار کر دو اپنی قوم کو اس سے پہلے کہ اُن پر دردناک عذاب ٹوٹ پڑے۔ اس نے کہا: اے میری قوم! میں یقیناً تمہارے لیے ایک واضح طور پر خبردار کرنے والا ہوں۔ (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو!''

چنانچہ یہی ''عبادتِ رب'' پہلے رسول کی دعوت تھی اور یہی آخری رسول کی دعوت ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ نبی آخر الزمان ﷺ سے پہلے کے تمام رسولوں کی دعوت صرف اپنی قوم کی طرف تھی جبکہ آپؐ کی دعوت پوری نوعِ انسانی کی طرف ہے۔ لہٰذا پہلے رسولوں کی دعوت کے ضمن میں الفاظ آتے ہیں: ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ﴾ اور ﴿وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا﴾ اور ﴿وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا﴾ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت چونکہ پوری نوعِ انسانی کے لیے ہوئی ہے لہٰذا یہاں لفظ ''يٰقَوْمِ'' نہیں آیا بلکہ ''يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ'' آیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴿۲۱﴾﴾

مکی سورتوں میں سورۃ الاعراف اور سورۃ الشعراء اس اعتبار سے بہت نمایاں ہیں کہ سورۃ الاعراف حجم کے اعتبار سے سب سے بڑی سورۃ ہے جس کے ۲۴ رکوع ہیں جبکہ سورۃ الشعراء تعدادِ آیات کے اعتبار سے سب سے بڑی سورۃ ہے جس کی ۲۲۷ آیات ہیں۔ ان دونوں سورتوں میں ایک ایک رسول کا تذکرہ ایک ایک رکوع پر محیط ہے۔ حضرات نوح' ہودٗ صالح اور شعیب ﷺ کے لیے ایک ایک رکوع ہے۔ سورۃ الاعراف میں چار مرتبہ یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَالَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ﴾ چنانچہ نوح علیہ السلام کی دعوت بھی یہی تھی اور ہودٗ صالح اور شعیب ﷺ کی دعوت بھی یہی تھی۔ سورۃ الشعراء میں پانچ مرتبہ یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ○﴾ ''اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو''۔

اس سے آگے چل کر تیسرا نکتہ یہ ہے کہ از روئے قرآن انسانوں اور جِنّوں کی تخلیق کی غایت یہی ''عبادت'' تھی۔ یہاں دو الفاظ کو علیحدہ علیحدہ سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ ایک ہے غایتِ تخلیق اور ایک ہے علّتِ تخلیق' اور ان دونوں میں فرق ہے۔ علّتِ تخلیق یہ کہ اللہ نے کیوں پیدا کیا؟ کس وجہ سے پیدا کیا؟ کس لیے پیدا کیا؟ یہ بہت بڑا فلسفیانہ سوال ہو جائے گا اور قرآن مجید فلسفیانہ سوالات سے کھل کر بحث نہیں کرتا۔ البتہ کس مقصد کے لیے پیدا کیا! یہ غایتِ تخلیق ہے۔ انسانوں اور جِنّوں کی غایتِ تخلیق سورۃ الذاریات میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴿۵۶﴾

''میں نے نہیں پیدا کیا جِنّوں اور انسانوں کو مگر صرف اس لیے کہ میری عبادت کریں۔''

اس ضمن میں آخری حوالہ سورۃ البیّنہ کی پانچویں آیت ہے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ۵ حُنَفَآءَ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ﴿۵﴾

''اور انہیں نہیں حکم دیا گیا تھا مگر اس کا کہ عبادت کریں صرف اللہ کی' اس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ' اور یہ

ہے ہمیشہ کا قائم ودائم دین۔“

یہ گویا دین کا خلاصہ ہے۔ یہی ”دینِ قیّم“ ہے جو آغاز سے اختتام تک ایک ہی رہے گا۔ یہ دین حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ایں دم تک بلکہ تا قیامِ قیامت ایک ہی ہے۔ جیسا کہ سورۃ الشوریٰ میں فرمایا:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى ...... (آیت ۱۳)

”اللہ نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا' اور جسے (اے محمدؐ) اب آپ کی طرف ہم نے وحی کے ذریعے بھیجا ہے' اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں......“

چنانچہ دین تو سب کا ایک ہی ہے۔ قرآن مجید کے یہ حوالے اس لیے دیے گئے ہیں تا کہ یہ نکتہ واضح ہو جائے کہ ایک اصطلاح جو قرآن مجید کی دعوت کے اعتبار سے اوّلین اہمیت کی حامل بھی ہے اور جامع ترین عنوان کی حیثیت بھی رکھتی ہے وہ ہے ”عبادتِ رب“ یا ”اللہ کی عبادت“۔

”عبادت“ اور ”عبادات“ میں فرق

اصل میں ہمارے ہاں تصورات کے اندر جو خرابی اور کجی پیدا ہوئی وہ یہ ہے کہ ہم نے ”عبادت“ اور ”عبادات“ کو گڈ مڈ کر دیا ہے۔ نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج عبادات ہیں لیکن عبادت فی الاصل کوئی اور شے ہے' جبکہ ہمارا تصورِ عبادت صرف انہی چند مراسم عبودیت تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ ہمارے دینی فکر کی سب سے بڑی اور سب سے بنیادی کجی ہے ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج   تا ثریّا می رود دیوار کج!

یعنی اگر کسی عمارت کی بنیاد ہی ٹیڑھی ہے تو ساری عمارت چاہے آسمان تک بلند ہو' جو بھی تعمیر ہو گی وہ ٹیڑھی ہی ہو گی۔

عبادت کا لفظ ”عبد“ سے بنا ہے۔ عبد کے معنی غلام کے ہیں اور غلام بھی پرانے

زمانے کا تصور کیجیے' آج کا نہیں' جب کہ ایک غلام ایک فرد کا مملوک ہوتا تھا' اس کی ملکیت ہوتا تھا۔ آقا اور غلام کی جو نسبت تھی وہ آج نہ ہمارے سامنے موجود ہے اور نہ ہی ہمارے تجربے میں ہے۔ ہمارے ہاں یہ تو ضرور ہے کہ فلاں قوم حاکم ہے' فلاں غلام ہے' لیکن اس صورت میں آقا اور غلام کا انفرادی رشتہ نہیں ہوتا۔ ہاں' بحیثیت مجموعی ایک قوم غلام ہوگئی ہے' لیکن انفرادی اعتبار سے جو آقا اور غلام میں رشتہ تھا وہ تو موجود نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس تصور کو سمجھ لیجیے کہ ''عبد'' ہوتا کیا تھا؟ یعنی غلام کسے کہتے تھے؟

اوّلاً آقا اپنے غلام کا مالک ہوتا تھا۔ آقا نے اسے اگر رات کو سونے کے لیے کوئی کوٹھڑی دے رکھی ہے یا کوئی چارپائی دے دی ہے تو وہ ان اشیاء کا مالک نہیں ہو جاتا تھا۔ وہ تو خود مملوک ہے' لہٰذا اس کی ہر شے اس کے مالک کی ہے۔ جیسے کہ ایک بزرگ صحابی نے حضور ﷺ سے اپنے بیٹے کی شکایت کی کہ یہ میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا حالانکہ یہ اچھا بھلا صاحبِ حیثیت ہے۔ حضور ﷺ نے اس نوجوان صحابی کو گریبان سے پکڑا اور اس کا گریبان اس کے والد کے ہاتھ میں دے کر فرمایا: ((اَنْتَ وَمَالُكَ لِاَبِيْكَ)) ''تُو خود اور تیرا مال تیرے باپ کی ملکیت ہے''۔ یہ انداز بتمام و کمال ایک غلام کا ہوتا تھا جو اپنے آقا کی ملکیت ہوتا تھا۔ چنانچہ غلام کا کام تھا کہ آقا جو حکم بھی دے اس پر سرِ تسلیم خم کرنا ہے' چاہے اس میں جان ہی چلی جائے۔

دوسرے یہ کہ آج کل ہمارا آجر و مستاجر کے باہمی تعلق (Employer-employee relationship) کا تصور بالکل مختلف ہے۔ اگر آپ نے کسی کو اپنے ہاں خانساماں کی حیثیت سے ملازم رکھا ہے اور آپ اسے کہیں کہ جاؤ میرا غسل خانہ صاف کر آؤ تو وہ صاف جواب دے سکتا ہے کہ جناب یہ میرا کام نہیں' آپ نے جس کام کے لیے مجھے رکھا ہے وہ کام لیجیے۔ لیکن غلام کا یہ کام نہیں تھا کہ وہ کسی وجہ سے انکار کرے۔

پھر ہمارے ہاں ملازمت کے قواعد و ضوابط میں وقت کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ آپ گورنمنٹ کے ملازم ہیں تو جو بھی آٹھ گھنٹے دفتر کا وقت ہے اس میں آپ کام کیجیے' اس کے بعد آپ فارغ ہیں۔ آپ کا آفیسر اور باس اس وقت تک آپ کا حاکم ہے جب

تک دفتر میں ہے۔ دفتر سے باہر آنے کے بعد اب وہ بھی عام شہری ہے اور آپ بھی عام شہری ہیں۔ اس کا بھی الیکشن میں آپ کی طرح ایک ہی ووٹ ہوگا۔ آپ کا باس اگر آپ سے دفتری اوقات کے بعد بھی کام لینا چاہے تو آپ اسے انکار بھی کر سکتے ہیں کہ میرا وقت ختم ہو گیا ہے' میں مزید کام کرنے کو تیار نہیں۔ لیکن غلام کا یہ کام نہیں' وہ تو ہمہ وقت' ہمہ تن خادم ہے۔ اسے جو حکم ملے اس پر اسے عمل کرنا ہے۔

عبدیت (غلامی) کے اس تصور کو ذہن میں رکھئے' لفظ عبادت اس سے بنا ہے۔ یعنی ''عبادت'' کے قریب ترین کوئی لفظ اگر آئے گا تو وہ غلامی کا لفظ آئے گا۔ تاہم یہ لفظ بھی قریب ترین ہے' عبادت کی پوری حقیقت اس میں بھی ادا نہیں ہو رہی۔ اس کی وضاحت بعد میں ہو جائے گی۔ چنانچہ قرآنی آیات میں جہاں بھی عبادت کا لفظ آیا ہے وہاں ان کے ترجمے میں غلامی کا لفظ استعمال کیا جانا چاہیے: ﴿اعْبُدُوا اللّٰهَ﴾ ''اللہ کی غلامی اختیار کرو''۔ تب ہی کسی حد تک اس کا مفہوم ادا ہوگا' ورنہ عبادت کا ترجمہ جب ہم عبادت ہی رکھ لیتے ہیں تو ذہن میں وہی نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ ہی آئے گا۔ ''عبادت'' اور ''عبادات'' کا فرق سورۃ البینہ کی اس آیت سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝

اس کے درمیان میں یہ جو حرف ''وَ'' ہے یہ حرفِ عطف کہلاتا ہے اور عربی نحو کی رو سے عطف دو مختلف اور مغائر چیزوں کو جوڑتا ہے' جیسے ''میں اور وہ''۔ ظاہر بات ہے ''میں'' اور ہوں ''وہ'' اور ہے۔ معطوف علیہ اور معطوف کے مابین مغائرت لازم ہے' لہٰذا معلوم ہوا کہ ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ﴾ اور شے ہے اور ﴿وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ﴾ اور شے ہے۔

اب یہ سمجھ لیجیے کہ ''عبادت'' اور ''عبادات'' کے مابین کیا رشتہ اور ربط و تعلق ہے۔ درحقیقت اس عظیم فریضہ ''عبادت'' کی ادائیگی کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ عبادات تسہیل اور آسانی کے لیے تجویز کی ہیں کہ ان کے ذریعے اس کی یاددہانی ہوتی رہے۔ مبادا تم بھول

جاؤ' لہٰذا دن میں پانچ مرتبہ یاد کرلیا کرو: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ○﴾ ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں''۔ حفیظ جالندھری کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں' لوحِ جبیں تازہ کریں!

نماز اس عہد کو تازہ کرنے کا نام ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾ ''نماز قائم کرو میری یاد کے لیے''۔ روزہ اس لیے دیا گیا تاکہ آپ اپنے حیوانی تقاضوں پر کچھ کنٹرول حاصل کریں اور یہ حیوانی تقاضے آپ سے اللہ کی شریعت کے خلاف کوئی کام نہ کروالیں۔ زکوٰۃ اس لیے دے دی گئی کہ قلب کے اوپر مال کی محبت کا تسلط نہ ہو جائے۔ حج میں ان ساری برکات کو جمع کر دیا گیا۔ تو یہ ''تسہیل العبادۃ'' ہے' جیسے آپ نے بچپن میں ایک قاعدہ ''تسہیل الاملا'' لکھا ہوگا۔ اس قاعدے میں حروفِ تہجی نقطوں (dots) کی صورت میں لکھتے ہوتے تھے' ان نقطوں پر قلم پھیرنے سے طالب علم کو لکھنا آ جاتا تھا۔ یہ تسہیل الاملا تھی۔ اسی طرح سے تسہیل العبادۃ ہے کہ ان عبادات کے ذریعے فریضہ عبادت کو آسان کر دینا جو کہ بہت مشکل اور بہت کٹھن ہے' اس کے تقاضے بڑے گھمبیر ہیں۔ ان کی آسانی کے لیے فرمایا تم نماز قائم کرو' زکوٰۃ ادا کرو' روزہ رکھا کرو' حج کیا کرو' اس سے تمہارے اندر عبادت کے لیے کچھ قوت' ہمت' طاقت اور استقامت پیدا ہوگی۔

''عبادت'' کا اصل مفہوم

''عبادت'' اصل میں کیا ہے؟ عبادت کی حقیقی تعریف میں دو لفظ خاص طور پر جمع ہوں گے: اطاعت + محبت۔ اس کے لیے بہترین اصطلاحات فارسی کی ہیں' یعنی بندگی + پرستش۔ پرستش انتہائی محبت کرنے کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے وطن کا پرستار' یعنی وطن سے انتہائی محبت رکھنے والا' وطن کی آن پر اپنی جان پیش کر دینے والا۔ غلامی کے لیے فارسی لفظ بندگی ہے۔ اس کی شیخ سعدی رحمہ اللہ نے بہترین تعبیر اس شعر میں کی ہے جو کبھی اکثر و بیشتر مساجد میں لکھا جاتا تھا ؎

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی!

ایک ہے بندگی' اطاعت' غلامی۔ لیکن ''عبادت' محض غلامی نہیں۔

یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ محض لفظ اطاعت پر بھی قرآن مجید میں عبادت کا اطلاق ہوا ہے۔ اس کی بڑی پیاری مثالیں ہیں۔ جب حضرات موسٰی و ہارون (علیہما السلام) پہلی مرتبہ فرعون کے دربار میں پیش ہوئے تو فرعون نے پُر جلال انداز میں کہا کہ ان کی یہ جرأت! ہماری محکوم قوم بنی اسرائیل کے دو افراد اس طرح کھڑے ہو کر ہمارے سامنے مطالبہ کر رہے ہیں ﴿وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ﴾ (المؤمنون) ''جبکہ ان دونوں کی قوم تو ہماری غلام ہے''۔ اب یہاں بنی اسرائیل کے لیے لفظ ''عَابِدُوْنَ'' آیا ہے تو ظاہر بات ہے کہ بنی اسرائیل آلِ فرعون کی عبادت نہیں کرتے تھے۔ غلامی تو تھی' یہ قوم ان کی محکوم تو تھی' ان پر اطاعت لازم تھی' لیکن (معاذ اللہ) عبادت نہیں۔ وہ موحد قوم تھی' حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھی' حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہما السلام کی نسل سے تھی۔ گویا یہاں اطاعت کے لیے عبادت کا لفظ آیا ہے۔ اس پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تو فرعون کا قول ہے' یہ دلیل نہیں بن سکتا۔ لیکن یاد رہے کہ فرعون کے دربار میں حضرت موسٰی علیہ السلام نے بھی یہی لفظ استعمال کیا۔ جب فرعون نے کہا: ﴿اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ﴾ (الشعراء) یعنی اے موسٰی! تم وہی نہیں ہو جو ہمارے ٹکڑوں پر پلے ہو اور ہمارے محل میں تمہاری پرورش ہوئی؟ ہم نے تمہیں پالا جب کہ تم چھوٹے سے تھے اور دریا میں بہتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے تھے۔ اس کے جواب میں حضرت موسٰی علیہ السلام کا جو قول تھا اسے قرآن نقل کر رہا ہے: ﴿وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ (الشعراء) یہ جو تم مجھ پر اتنا بڑا احسان جتا رہے ہو اس کی حقیقت یہی ہے ناکہ تم لوگوں نے ایک فرد کو پال لیا ہے جبکہ میری پوری قوم کو غلام بنا کے رکھا ہوا تھا۔

متذکرہ بالا آیات میں غلامی اور اطاعت پر بھی محض لفظ عبادت کا اطلاق قرآن مجید میں ہوا ہے' لیکن اللہ کی جو عبادت مطلوب ہے وہ محض غلامی اور اطاعت نہیں' بلکہ اللہ کی وہ بندگی' اطاعت اور غلامی ہے جو کہ اس کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر کی

جائے۔ جبری غلامی، جبری محکومی اور جبری اطاعت اس طرح کی عبادت قرار نہیں پائے گی جیسی عبادت اللہ کو ہم سے مطلوب ہے، جس کا تقاضا کیا جارہا ہے۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم (رحمۃ اللہ علیہما) جو ان کے اہم ترین شاگردوں میں سے ہیں، فلسفی ذہن اور صوفیانہ مزاج رکھنے والے ہیں، ان دونوں نے واقعتاً ''عبادت'' کی بہترین تعبیر ان الفاظ میں کی ہے: ''اَلْعِبادةُ تجمع اثنین: غایة الحُبِّ مع غایة الذُّلِّ والخُضوع'' یعنی ''عبادت دو چیزوں کو جمع کرنے سے وجود میں آتی ہے: اللہ کی حد درجے محبت اور حد درجے اللہ کے سامنے بچھ جانا'' اللہ کے سامنے ذلت، فروتنی اور تواضع اختیار کر لینا۔ یہ دو چیزیں جمع ہوں گی تو عبادت ہوگی۔

اس کے لیے ایک مثال نوٹ کر لیجیے کہ انسانی وجود روح اور جسد کا مرکب ہے۔ انسان کا ایک جسد ہے جس کا دو اڑھائی من وزن ہے اور یہی ہے جو سب کو نظر آتا ہے۔ لیکن اس کی اصل حقیقت وہ ہے جسے جان یا روح کہتے ہیں اور جس کا کوئی وزن ہی نہیں۔ اگر اس جسم سے روح نکل جائے تب بھی اس کا وزن وہی رہے گا، لیکن اس کے بعد بہترین کام یہ ہوگا کہ جلد از جلد اس کو قبر میں اتار دیا جائے، ورنہ یہ جسد خاکی متعفن ہو جائے گا، بدبو آئے گی، آپ اس کے قریب بیٹھ نہیں سکیں گے۔ جسد اور جان یا روح میں جو رشتہ ہے وہی رشتہ اطاعت اور محبت میں ہے۔ جسد جو کہ نظر آتا ہے، واضح ہے، وہ ہے اطاعت، لیکن اس کی اصل روح جو اسے ''عبادت'' بناتی ہے وہ ہے اللہ کی انتہائی محبت۔ یہ دو چیزیں جب جمع ہوتی ہیں تو پھر عبادتِ رب کا تقاضا پورا ہوتا ہے۔

چونکہ میں اپنے دینی فکر کا نچوڑ اور خلاصہ آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں تو ایک نکتہ اور نوٹ کرتے جائیے۔ اطاعت اور محبت میں اللہ اور رسول ایک وحدت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن حکیم میں متعدد بار فرمایا گیا: ﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ بلکہ اللہ کی اطاعت ہے ہی رسول کی اطاعت کے ذریعے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ۚ (النساء: ۸۰)

''جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

اور سورۃ النساء ہی میں فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ (آیت ۶۴)

''ہم نے جو رسول بھی بھیجا' اسی لیے (بھیجا ہے) کہ اذنِ باری تعالیٰ کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔''

سورۃ الشعراء میں رسولوں کا اپنی قوموں سے یہ مطالبہ بار بار نقل ہوا ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ (آیات ۱۰۸، ۱۲۶، ۱۴۴، ۱۵۰، ۱۶۳)

''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو!''

حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا:

﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ۝﴾

''(میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی عبادت (اس کی بندگی اور پرستش) کرو اور اس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو!''

جیسے اطاعت میں اللہ اور اس کا رسول دونوں جمع ہیں' اسی طرح محبت میں بھی اللہ اور اس کا رسول دونوں جمع ہیں۔ سورۃ التوبۃ کی آیت ۲۴ ملاحظہ کیجیے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

''(اے نبیؐ! ان سے) کہہ دیجیے: (دیکھو لوگو!) اگر تمہارے باپ' تمہارے بیٹے' تمہارے بھائی' تمہاری بیویاں (اور بیویوں کے لیے شوہر) اور تمہارے عزیز و اقارب' اور یہ مال جو تم نے بڑی محنت سے جمع کیے ہیں اور تمہارے کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تمہیں اندیشہ ہوتا ہے (کہ کساد بازاری نہ ہو جائے) اور یہ گھر اور کوٹھیاں جو تمہیں بڑی محبوب ہیں اگر (یہ آٹھ چیزیں) تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے محبوب تر ہیں تو انتظار کرو' یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ (تمہارے سامنے) لے آئے' اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔''

البتہ اللہ کی محبت اور اللہ کی اطاعت مل کر ''عبادت'' بنتی ہے' مگر رسول کی محبت اور اطاعت مل کر عبادت نہیں بنتی (معاذ اللہ)۔اس کا نام اتباع ہے۔فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ......﴾ (آل عمران:۳۱)

''(اے نبیؐ) ان سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو' اللہ تم سے محبت کرے گا......''

جزوی اطاعت کی حقیقت

اگلا نکتہ یہ ہے کہ یہ اطاعت جو جسد ہے' جو عبادت کا اصل ظاہر ہونے والا جزو ہے' اس کے بارے میں اہم ترین بات یہ ہے کہ اطاعت نام ہے صرف کُلی اطاعت کا' نہ کہ جزوی اطاعت کا۔ جزوی اطاعت اللہ کو قبول نہیں' وہ اسے مُنہ پر دے مارتا ہے۔ اللہ غنی ہے' محتاج نہیں۔ فقیر تو کہتا ہے روپیہ ڈال دو تب بھی ٹھیک ہے' چار آنے ڈال دو تب بھی ٹھیک ہے' لیکن غنی کا معاملہ یہ نہیں ہوتا۔ اللہ تو الغنی اور الحمید ہے۔ اس کی طرف سے تو بات سیدھی سی ہے کہ دین پر چلنا ہے تو پورے دین پر چلو' ورنہ دفع ہو جاؤ' ہمیں تمہاری جزوی اطاعت کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کو مثبت طور پر بھی کہا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (البقرۃ:۲۰۸)

''اے اہلِ ایمان! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ!''

یہاں ۳۳ فیصد نمبروں سے پاس شمار نہیں ہو گے۔ اپنی مکمل شخصیت اور مکمل نظامِ زندگی کے ساتھ اجتماعی اور انفرادی طور پر اللہ کی اطاعت میں داخل ہو جاؤ۔ اور یہ چیز منفی انداز میں بھی قرآن میں آتی ہے اور اس ضمن میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۵ بہت اہم ہے۔ اس مقام پر جو تذکرہ ہو رہا ہے وہ اگرچہ بنی اسرائیل کا ہے' لیکن یہ جان لیجیے کہ مختلف اقوام اور افراد کے معاملے میں اللہ کا قانون تبدیل نہیں ہوا کرتا۔ اللہ کا قانون اٹل ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی:

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۝ (فاطر)

''پس تم اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے' اور تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سنت کو اس کے مقررہ راستے سے کوئی طاقت پھیر سکتی ہے۔''

وہاں فرمایا گیا ہے:

اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ وَتَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾ (البقرۃ)

''تو کیا تم کتاب (اور شریعت) کے ایک حصے کو تو مانتے ہو اور ایک کو رد کرتے ہو؟ تو جو لوگ بھی تم میں سے یہ طرزِ عمل اختیار کریں گے ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں وہ ذلیل وخوار کر دیے جائیں اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں جھونک دیے جائیں' اور اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کرتے ہو۔''

جزوی اطاعت کی حقیقت کے اعتبار سے یہ قرآن حکیم کی اہم ترین آیت ہے۔ یہاں ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے والوں کے لیے ''اَشَدَّ الۡعَذَابِ'' (شدید ترین عذاب) کا تذکرہ ہے۔ اللہ کی جزوی اطاعت کرنے والوں کا حشر کفار سے بدتر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ منافقین کے بارے میں فرمایا گیا:

اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ فِی الدَّرۡکِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ (النساء: ۱۴۵)

''منافق آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔''

یہی وجہ ہے کہ اہلِ ایمان سے کہا گیا ہے:

لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۲﴾ کَبُرَ مَقۡتًا عِنۡدَ اللّٰہِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳﴾ (الصف)

''کیوں کہتے ہو وہ جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے غضب کو بھڑکانے اور اس میں بیزاری پیدا کرنے والی ہے یہ بات کہ تم وہ بات کہو جو کرتے نہیں۔''

اللہ تعالیٰ کو تو پوری اطاعت چاہیے' اسے جزوی اطاعت قبول نہیں۔ ایسی اطاعت مردود ہے' لوٹا دی جاتی ہے' منہ پر ماردی جاتی ہے۔ یہ نکتہ اگر پورے طور پر آپ کے ذہن نشین ہو جائے تو میری اگلی بات کا منطقی ربط آپ کی سمجھ میں آ جائے گا۔

ہیں آج کیوں ذلیل......؟

اسی میں درحقیقت ایک بہت بڑے سوال کا جواب ہمیں ملتا ہے اور وہ یہ کہ آج ہم

دنیا میں ذلیل وخوار ہیں' جبکہ کفار کا غلبہ ہے۔

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر!

تو کیا اللہ کو کفر پسند ہے اور اسلام اور ایمان ناپسند ہے؟ ہم دل میں سوچتے ہیں کہ ہم کم سے کم اللہ کو مانتے تو ہیں' نمازیں بھی پڑھ لیتے ہیں' ہمارے بیس بیس' تیس تیس لاکھ افراد جا کر حج بھی کرتے ہیں' پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے لیے عزت نام کی کوئی شے نہیں ہے' دنیا میں ہمارا کوئی وقار اور کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ع ''کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی!'' کسی بھی بین الاقوامی مسئلے میں ہماری تو رائے بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ وہ تو G-7' G-8' یا G-15 ہیں جن کے مشورے اور فیصلے چلتے ہیں۔ کوئی مسلمان ملک نہ G-7 میں ہے نہ G-15 میں۔ گویا نہ تین میں نہ تیرہ میں' کہیں بھی نہیں۔ یو این او کے مستقل ممبران' جن کے پاس ویٹو پاور ہے ان میں کسی مسلمان ملک کے آنے کا کوئی امکان نہیں۔ اب بھی اگر کوئی نیا ملک آئے گا تو بھارت آئے گا' پاکستان کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ کیوں ہے؟

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں!

یہ بہت اہم سوال ہے' اگر آپ نے نہیں سوچا تو یہ آپ کی غفلت ہے۔ یہ قابلِ غور بات ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں' دنیا میں ہماری کیا حیثیت ہے۔ اب اگر قیامت ٹوٹ رہی ہے تو کشمیر میں مسلمانوں پر ٹوٹ رہی ہے' اس سے پہلے چیچنیا کا تہس نہس کر کے رکھ دیا گیا' کوسووکا جو معاملہ ہوا ہے' بوسنیا میں جو کچھ ہوا ہے' ابھی فلپائن کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے' یہ سب کیوں ہے؟ نائیجیریا میں کیا کچھ نہیں ہوا؟ وہاں ایک صوبہ شریعت اسلامی نافذ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے اور عیسائیوں کے ہاتھوں ہزاروں مسلمان قتل ہو جاتے ہیں۔ یہی معاملہ انڈونیشیا کے اندر ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا اللہ کو کفر سے محبت اور اسلام سے دشمنی ہے؟ یا پھر اللہ عاجز اور لاچار ہے کہ وہ مسلمانوں کی مدد کرنا تو چاہتا ہے لیکن نہیں کر سکتا؟ دونوں میں سے کسی بات کا جواب آپ ''ہاں'' میں نہیں دے سکتے۔ انہی

دونوں چیزوں کو اقبال نے بڑی خوبصورتی سے جمع کیا ہے ؎

تُو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات!

اے اللہ تُو قادر ہے' عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے اور عادل بھی ہے۔ پھر دنیا میں بے انصافی کیوں ہو رہی ہے؟ سرمایہ دار مزدور کا خون نچوڑ کر اس سے شراب کشید کر رہا ہے' پھر اسے شام کو بیٹھ کر پیتا ہے۔ بندۂ مزدور کے اوقات واقعتاً بہت تلخ ہیں۔ اے اللہ! تُو قادر بھی ہے' عادل بھی ہے' اسلام کو پسند کرتا ہے' کفر کو ناپسند کرتا ہے' پھر بھی ایسا سلوک کیوں ہے کہ تیرے نام لیوا ذلیل وخوار ہیں؟ اس کا جواب سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۵ میں دے دیا گیا ہے جس کا ہم نے ابھی مطالعہ کیا:

فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ

جو کوئی بھی مسلمان قوم اور مسلمان اُمت میں یہ طرزِ عمل اختیار کرے (کہ وہ دین کو جزوی طور پر اختیار کرے' وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) اُس کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا کی زندگی میں ان پر ذلّت ورسوائی اور خواری مسلّط کر دی جائے۔ یہ تو بہرحال ہم بھگت رہے ہیں' لیکن آخرت کا معاملہ اس سے شدید تر ہے:

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ

''اور قیامت کے دن انہیں شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔''

اگر آپ کو یہ نکتہ سمجھ میں نہیں آیا تو میری بات اور میرے دینی فکر کی اساس ہی آپ کے پلے نہیں پڑی' چاہے آپ نے میرے بہت سے دروس اور بہت سی تقریریں سنی ہوں۔ یہ میرے فکر کا اساسی نکتہ ہے۔

اس پس منظر میں جائزہ لیجیے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ہماری اطاعت اس وقت کُلی ہے یا جزوی؟ اوّل تو یہ کہ پوری دنیا میں کوئی ایک ملک بھی ہم ایسا نہیں دکھا سکتے جہاں ہم نے اسلام کا عدل وقسط پر مبنی نظام قائم کیا ہو۔ سعودی عرب میں نماز' روزہ' حج' عمرے سب کچھ ہے' لیکن کیا اللہ کا دین قائم ہے؟ کیا بادشاہت کا نظام اور ملکی دولت کے اوپر

ایک خاندان کا قبضہ اور ارب ہا ارب ڈالر کا ایک ایک محل بنانا اسلام ہے؟ اگر یہ اسلام ہے تو پھر اس کی نوع انسانی کو کوئی ضرورت نہیں۔ اس اسلام کو تو نوعِ انسانی بہت عرصے پہلے ترک کر چکی ہے۔

انفرادی محاسبہ کی ضرورت

یہ تو پوری امت کا مسئلہ ہے' لیکن ابھی آپ انفرادی معاملے پر آیئے۔ ہمارے ہاں ۹۹ء۹۹ فیصد آبادی وہ ہے کہ شریعت کے اوپر جتنا عمل کیا جا سکتا ہے وہ بھی نہیں کرتی۔ ہر ایک نے کسی نہ کسی حرام شے کو اپنے لیے حلال ٹھہرا رکھا ہے اور اسے بامر مجبوری کا نام دے رکھا ہے کہ کیا کریں جی سود کے بغیر تو کاروبار نہیں ہوسکتا! سرکاری ملازم کا رشوت کے بغیر کیسے گزارہ ہوسکتا ہے! کاروباری آدمی کہے گا کہ حساب کتاب صحیح رکھ کر ہمیں تو اپنی دکان بند کرنا پڑے گی۔ ہر ایک نے کوئی نہ کوئی حرام شے اختیار کی ہوئی ہے۔ باقی یہ کہ نمازیں' روزے' عمرے اور حج بھی ہیں۔ پردے کا تو خیر رواج ہی نہیں رہا۔ اعشاریہ صفر ایک فیصد لوگ ایسے ہوں گے یا ہو سکتے ہیں کہ وہ جتنے اسلام پر عمل کر سکتے ہیں اس پر کر رہے ہیں۔ وہ نماز پڑھ رہے ہیں' روزہ رکھ رہے ہیں' شراب نہیں پی رہے' سودی لین دین میں براہِ راست ملوث نہیں ہیں' انہوں نے سود پر سرمایہ لے کر کوئی کاروبار نہیں کیا' سود پر قرض لے کر مکان نہیں بنایا' کہیں بینک میں پیسہ رکھ کر سود نہیں کھا رہے۔ الغرض جتنا عمل ہوسکتا ہے وہ کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ کتنے ہوں گے؟ لیکن ان کے حوالے سے بھی غور کیجیے کہ شریعت کے اجتماعی احکام پر وہ بھی عمل پیرا نہیں ہو سکتے۔ کیا یہ شریعت کا حکم نہیں ہے کہ زانی کو سو کوڑے مارو اور چور کے ہاتھ کاٹ دو؟ کیا یہ اس معاشرے کے رکن نہیں ہیں؟ اس ریاست کے شہری نہیں ہیں؟ کیا اس اجتماعی نظام کی کوئی ذمہ داری ان پر نہیں آتی؟ کیا یہ اس کے لیے ذمہ دار نہیں ہیں؟ کہاں ہے یہ قرآنی حکم کہ: ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا﴾؟ کہاں ہے شادی شدہ زانی کی سنگساری؟ کہاں ہیں وہ کوڑے جو زنا پر برسرِ عام لگائے جائیں تاکہ لوگ اپنی نگاہوں سے دیکھیں؟ معاشی نظام پورے کا پورا سود پر مبنی ہے۔ میں بھی اور آپ بھی سود کو inhale کر رہے

ہیں۔ حدیث کے اندر تو صاف آیا ہے کہ ایک وقت آ جائے گا کہ ایک شخص چاہے براہِ راست سود نہ کھائے' لیکن اس کا غبار اور دھواں اس کے اندر ضرور جائے گا۔ بڑی پیاری تشبیہہ ہے۔ اگر فضا میں دھواں ہے تو آپ کیا ناک بند کر لیں گے کہ دھواں اندر نہ جانے پائے؟ جینے کے لیے سانس تو لینا ہے' دھواں بہرحال اندر جائے گا۔ گرمیوں میں بعض اوقات dust suspension ہو جاتا ہے تو کیا ناک بند کر لیں گے کہ میں تو dust کو اندر نہیں لے جانا چاہتا؟ جینے کے لیے سانس لینا پڑے گا۔ سانس لیں گے تو dust اندر جائے گا۔ حدیث میں الفاظ آئے ہیں کہ سود کا ''دخان'' اور ''غبار'' تو لازماً اندر جائے گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ پوری انفرادی زندگی میں سود میں براہِ راست ملوث ہونے کا معاملہ نہیں ہے' لیکن یہ غبار تو جا رہا ہے۔ گندم کے ہر دانے کے ساتھ سود اندر جا رہا ہے۔

غور کیجیے' یہ میں کن کی بات بتا رہا ہوں؟ ان کی جو باقی شریعت پر سو فیصد عمل پیرا ہیں۔ فرض کیجیے کہ انہوں نے گھر میں شرعی پردہ بھی نافذ کر رکھا ہے تو اس کے کیا کہنے' یہ بہت بڑا جہاد ہے۔ ان کی پوری شرعی داڑھی ہے' لباس شرعی ہے' ہر اعتبار سے زندگی شریعت کے مطابق ہے' لیکن جو اس اجتماعی نظام کے تابع ہیں اس کے اعتبار سے تو وہ کفر ہی کا حصہ ہیں کہ وہ اس کفر کے نظام کے اندر سانس لے رہے ہیں' اس کے اندر جی رہے ہیں۔ یہ صورت حال آپ کے لیے اور میرے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ جان لیجیے ہماری اطاعت جزوی ہے۔ خاص طور پر جو لوگ بڑے شوق سے جا کر امریکہ میں آباد ہو گئے انہیں تو وہاں کے عائلی قوانین کو قبول کر کے آباد ہونا ہے۔ یہاں ہم اپنے شرعی عائلی قوانین پر تو چل رہے ہیں۔ یہاں ہمارے عائلی قوانین میں بھی گڑبڑ کی گئی تھی تاہم ان ترمیمات پر زیادہ عمل نہیں ہو رہا ہے۔ ہم سے کہیں بہتر بھارت کے مسلمان ہیں جنہوں نے اپنے عائلی قوانین میں ہندو اکثریت کو اب تک دخل نہیں دینے دیا۔ میں بھارتی مسلمانوں کو سلام کرتا ہوں۔ امریکہ میں رہنے والے مسلمان کا شرعی قوانین پر بھارتی مسلمان سے بھی کم عمل ہے۔ بھارتی مسلمان ابھی تک اپنے عائلی قوانین پر قائم ہے۔ امریکہ میں تو ظاہر بات ہے کہ شادی' طلاق اور وراثت کے قوانین میں آپ کا کوئی عمل

دخل نہیں۔ جب میں نے یہ بات امریکہ میں کہی تو ایک صاحب بڑے دھڑلے سے کہنے لگے کہ اب یہاں "will" (وصیت) ہوسکتی ہے۔ میں نے کہا یہ خود خلافِ شریعت ہے۔ وصیت تو ایک تہائی سے زیادہ میں ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا اگر آپ نے will کر دی ہے تو وہ بھی شریعت کے خلاف ہے' شریعت پر عمل پیرا ہونا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ بہرحال یہ ایک گمبھیر مسئلہ ہے۔ ایک طرف صورت وہ ہے کہ ﴿ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ﴾ اور دوسری طرف یہ بیڑیاں ہیں جو ہمارے پاؤں میں پڑی ہوئی ہیں۔

فتنے سے نکلنے کا راستہ

اس وقت میرے ذہن میں وہ حدیث آ رہی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ فتنے سے نکلنے کا راستہ (مَخرَج) کیا ہے! بڑی مشہور حدیث ہے جو ہم نے بڑی عام کی ہے۔ قرآن مجید کی مدح میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث آتی ہے' وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَلَا اِنَّھَا سَتَكُوْنُ فِتْنَةٌ))

"آگاہ رہو عنقریب ایک بہت بڑا فتنہ رونما ہوگا۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں' میں نے عرض کیا:

مَا الْمَخْرَجُ مِنْھَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس سے نکلنے کا راستہ کون سا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كِتَابُ اللّٰہِ' فِیْہِ نَبَاُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَیْنَكُمْ' وَھُوَ الْفَصْلُ لَیْسَ بِالْھَزْلِ' مَنْ تَرَكَہٗ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَہُ اللّٰہُ ' وَمَنِ ابْتَغَی الْھُدٰی فِیْ غَیْرِہٖ اَضَلَّہُ اللّٰہُ ' وَھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ ' وَھُوَ الذِّكْرُ الْحَكِیْمُ ' وَھُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ)) (رواہ الترمذی والدارمی)

"کتاب اللہ! اس میں تم سے پہلی اُمتوں کے واقعات ہیں اور تمہارے بعد کی اس میں اطلاعات ہیں' اور تمہارے درمیان جو مسائل پیدا ہوں قرآن میں اُن

کا حکم اور فیصلہ موجود ہے۔ وہ قولِ فیصل ہے' وہ فضول بات اور یاوہ گوئی نہیں ہے۔ جو کوئی جابر و سرکش اس کو چھوڑے گا' اللہ تعالیٰ اس کو توڑ کے رکھ دے گا' اور جو کوئی ہدایت کو قرآن کے بغیر تلاش کرے گا اس کے حصہ میں اللہ کی طرف سے صرف گمراہی آئے گی۔ قرآن ہی حبل اللہ المتین ہے! اور محکم نصیحت نامہ ہے' اور وہی صراط مستقیم ہے۔''

یہ بڑی طویل اور پیاری حدیث ہے۔ بہرحال میں نے یہ اس لیے بتایا کہ اس گھمبیر صورت حال سے نکلنے کا کیا مخرج (exit) ہے۔ بڑے بڑے ہالوں میں سرخ Exit لکھا ہوتا ہے کہ اگر کوئی آگ لگ جائے' بم دھماکہ ہو جائے تو اس Exit کی طرف بھاگو۔ تو ہمارے لیے مخرج (Exit) کیا ہے؟

(۱) اس وقت کے حالات میں جتنے اسلام پر عمل کرنا قانوناً ممکن ہے' لازماً کیا جائے' مشکل اگرچہ کتنا ہی ہو۔ مشکل اور ناممکن میں فرق ہے۔ چور کا ہاتھ کاٹنا میرے لیے ناممکن ہے' زانی کو سنگسار کرنا میرے لیے ناممکن ہے' لیکن گھر میں شرعی پردہ نافذ کر لینا میرے لیے ممکن ہے' مشکل ضرور ہے۔ یہاں بے پردگی کا کوئی قانون آج تک نہیں بنا' کوئی مصطفیٰ کمال پاشا یہاں نہیں آیا اور (ان شاء اللہ) ہرگز نہیں آ سکتا جو خواتین کا برقع زبردستی اتروا دے۔ جس کسی نے برقع اتارا ہے اس نے خود اتارا ہے اور خود بے پردگی اختیار کی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آدمی جتنے دین پر عمل کر سکتا ہو پہلے وہ اس پر تو عمل کرے۔ وہ ۱۰۰ فیصد پر تو آ جائے۔ چاہے مشکل ہو' چاہے اس میں بھوک آ جائے' چاہے تکلیف آ جائے' چاہے بائیکاٹ ہو جائے۔ آپ شرعی پردہ نافذ کریں گے' آپ کا سوشل بائیکاٹ ہو جائے گا۔ کچھ بھی ہو جائے' ہرچہ بادا باد' شریعت کے حکم پر جتنا عمل کر سکتے ہیں وہ تو پورا کریں۔

(۲) ایک اہم بات یہ ہے کہ اس اجتماعی نظام کو جس کی وجہ سے آپ مکمل شریعت پر عمل نہیں کر سکتے اسے ذہناً قبول کریں نہ قلباً۔

Don't accept it! don't reconcile with it!

(۳) اس کی چاکری اور غلامی نہ کریں' نہ اسے promote کریں' نہ اس کے

تحت پھلنے پھولنے اور پھیلنے کی کوشش کریں کہ جائیداد زیادہ ہو جائے' کاروبار میں اضافہ ہو جائے' بلڈنگز زیادہ ہو جائیں۔

یہ میں نے تین منفی پہلو بیان کیے ہیں۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ اسے ذہناً تسلیم نہ کریں۔ گویا کہ اس کے اندر under protest رہیں' کم از کم passive resistance تو ہو کہ اسے ذہناً اور قلباً تسلیم نہیں کیا اس کی چاکری کرنے کو تیار نہیں۔ میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جس وقت ہندوستان میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی دعوت اٹھی تو اپنے ابتدائی دور میں وہ دعوت صد فیصد اسلامی تھی' اور اس کی بنیاد پر ان پر بغاوت کا مقدمہ چل سکتا تھا۔ انگریز کا دور تھا' لیکن انہوں نے واضح طور پر کہا کہ فوج کی ملازمت حرام ہے' آپ انگریز کی فوج میں جاتے ہیں تو گویا آپ اسے تقویت دے رہے ہیں۔ ہمارے ہی مسلمان فوجیوں نے جا کر پہلی جنگ عظیم میں جنرل ایلن بی کو یروشلم کا قبضہ لے کر دیا تھا۔ ہمارے یہ فوجی جہلم اور راولپنڈی کے علاقے کے تھے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے خانہ کعبہ پر بھی گولیاں چلائی تھیں۔ مولانا مودودیؒ کا فتویٰ تھا کہ یہ ملازمت حرام ہے۔ اسی طرح سرکاری ملازمت بھی حرام ہے' خاص طور پر عدلیہ سے متعلق ملازمت کسی طور پر جائز نہیں۔ آپ عدالت کے اندر وکیل کی حیثیت سے پیش ہو رہے ہیں اور اس قانون کے تحت مقدمہ لڑ رہے ہیں جو اللہ کا قانون نہیں ہے' کسی اور کا ہے۔ اور غضب خدا کا کہ اس عدالت کی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں جہاں اللہ کے قانون کی بجائے انگریز کے قانون کے مطابق فیصلہ دینا ہے۔ جبکہ اللہ کا تو حکم ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (المائدۃ) ''اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ (احکام) کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں''۔ انگریز کے دور میں ایسی مثالیں موجود تھیں کہ نماز روزہ بھی ہے' تہجد بھی ہے' تسبیحات بھی ہیں اور حج بھی ہے' اور ان سب کے ساتھ ساتھ انگریز کی عدالت میں جج بھی ہیں۔ اس وقت مولانا مودودی کا یہ بات کہنا بڑی ہمت و جرأت کا کام تھا۔ وہ تو یہ کہ انگریز یہاں سے اپنا بوریا بستر لپیٹ رہا تھا' لہٰذا اس نے اسے نظر انداز کیا' ورنہ اس بات کو کون برداشت کر سکتا ہے؟ انہوں

نے زیادہ سے زیادہ یہ اجازت دی تھی کہ پبلک یوٹیلٹی کے محکمے مثلاً محکمہ ڈاک‘ ریلوے وغیرہ‘ یعنی جن سے عوام کے کام اور سہولتیں وابستہ ہیں ان کی ملازمت تو اختیار کی جاسکتی ہے لیکن وہ محکمے جو حکومت کی گاڑی کو چلانے کے لیے بنائے جاتے ہیں اور وہ محکمے جو حکومت کی اس گاڑی کے اندر جتے ہوئے ہیں‘ اس بگھی کو آگے لے کر دوڑ رہے ہیں‘ ان محکموں میں ملازمت اختیار کرنا نظامِ باطل کو support کرنا ہے‘ جو سراسر حرام ہے۔

اس بات کو میں نے منفی پہلو (negative aspect) قرار دیا ہے تو سمجھ لیجیے کہ یہ دراصل کفارہ ہے۔ اگر میں ایسے نظام کے تحت زندہ رہنے پر مجبور ہوں جہاں حق کا بول بالا نہیں ہے‘ پورا نظام حق کے تابع نہیں ہے‘ اجتماعی زندگی میں اللہ کی اطاعت نہیں ہے تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں کہاں جاؤں؟ امریکہ چلا جاؤں‘ لیکن وہاں تو یہاں سے زیادہ کفر ہے۔ سعودی عرب میں مجھے بسنے ہی نہیں دیں گے اور وہاں میں نے حکومتِ الٰہیہ کا نام لے لیا تو میرے وجود کا نام ونشان نہیں ملے گا۔ ہم مجبور ہیں‘ لہٰذا اس کا کوئی کفارہ ہونا چاہیے۔ کفارہ کسے کہتے ہیں؟ کفر (ک ف ر) کا اصل مفہوم کسی چیز کا چھپا دینا ہے۔ اس کا ایک معنی ناشکری کرنا بھی ہے۔ اس لیے کہ کسی نے آپ کے ساتھ احسان کیا ہے تو آپ کے دل سے اس کے لیے احسان مندی کے جذبات کا فوارہ ابلنا چاہیے۔ اگر آپ نے اس کو دبا لیا تو یہ کفر کہلائے گا‘ یعنی کفرانِ نعمت۔ شکر کے مقابلے میں کفر آتا ہے۔

''کفار'' کا لفظ قرآن مجید میں کاشت کار کے لیے بھی آتا ہے:

كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ (الحدید: ۲۰)

اس لیے کہ وہ بیج کو زمین میں دباتا ہے تو اس سے پودا نکلتا ہے۔ کفارہ یہ ہوتا ہے کہ آپ سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے تو اس کے اثرات کو زائل کرنے اور دھونے کے لیے کوئی عمل کیا جائے۔ اب یہ گناہ کہ میں نظام باطل میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوں‘ میری پوری اجتماعی زندگی اس نظام سے متعلق ہے اور وہ نظام کفر پر مبنی ہے‘ میں انفرادی زندگی کے اعتبار سے فرض کیجیے ۱۰۰ فیصد میں بھی آ گیا ہوں کہ میرے لیے جتنے بھی شرعی احکام پر

عمل ممکن تھا وہ میں کر رہا ہوں' تب بھی حال یہ ہے کہ میری پوری اجتماعی زندگی تو کفر کے تابع ہے' تو اس کا مخرج اور کفارہ کیا ہے؟ یہی کفارہ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ اس نظام کو ذہناً وقلباً تسلیم نہ کیا جائے' اس کے ساتھ reconcile نہ کیا جائے۔ یہی منفی انداز آیت الکرسی کے بعد آنے والی آیت میں اختیار کیا گیا ہے:

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ (البقرة:٢٥٦)

''جو کفر کرے طاغوت کا اور ایمان لائے اللہ پر وہ ہے کہ جس نے مضبوط کنڈے پر ہاتھ ڈال لیا ہے اور یہ کنڈا اپنی جگہ چھوڑنے والا نہیں ہے۔''

لہٰذا اسے مضبوطی سے تھامے رکھو!

اس نظام کو promote نہ کیا جائے۔ اس کی چاکری' اس کی خدمت نہ کی جائے' بلکہ اس سے انحراف کیا جائے۔ اس کے تحت پھلنے پھولنے اور پھیلنے کی کوشش نہ کی جائے' بلکہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی کم سے کم لازمی بنیادی ضروریات کے لیے جتنا وقت اور جتنی صلاحیت اور محنت کی ضرورت ہے اس کو ایک طرف کرتے ہوئے باقی پوری محنت و صلاحیت اور تمام اوقات اس نظام کے خلاف جِدّوجُہد میں لگا دیے جائیں۔ باطل نظام کے تحت مجبوراً زندگی گزارنے والا انسان اگر اس نظام کو بیخ وبُن سے اکھاڑنے اور نظامِ حق کو غالب کرنے کے لیے جدوجہد کرے گا تو یہ اس کے لیے کفارہ ہوتا چلا جائے گا۔ گویا اگرچہ گندگی اندر جا رہی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ دھل بھی رہی ہے۔ اس جدّوجہد میں مصروف انسان اللہ کا شکر ادا کرے کہ میں نے جو سانس لیا تھا اس کے ساتھ اگرچہ سود بھی اندر گیا تھا لیکن اس کے ساتھ جو آکسیجن آئی تھی اس نے مجھے توانائی بخشی تھی' اس توانائی کا اکثر حصہ میں نے اس نظام کو ختم کرنے کے لیے لگا دیا ہے' لہٰذا میں پاک ہوگیا ہوں' یہ اس کا کفارہ ہے۔

دیکھئے مثبت اور منفی دو چیزیں آگئیں کہ اس نظام کو ذہناً تسلیم نہ کرے' اس کی چاکری نہ کرے اور اسے درہم برہم کرنے کی جدّوجہد کرے۔ نظام باطل کی چاکری

کرنے والوں کو یہ حدیث پیش نظر رکھنی چاہیے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ مَشٰی اِلٰی صَاحِبِ بِدْعَةٍ لِیُوَقِّرَهٗ فَقَدْ اَعَانَ عَلٰی هَدْمِ الْاِسْلَامِ))

(مجمع الزوائد للهيثمى)

''جو شخص کسی بدعتی کی طرف اس کی تکریم کی خاطر چلا' اس نے اسلام کی جڑیں کھودنے میں مدد کی۔''

اگر حال یہ ہو کہ نظام باطل کی سروس ہو رہی ہے' اور اس کے حوالے سے طرے پر طرے چڑھائے جا رہے ہیں' خطابات لیے جا رہے ہیں' نظامِ باطل کی محافظ پولیس اور فوج میں سروس ہو رہی ہے تو اس کے ساتھ اسلام کا کیا سوال؟

مثبت بات یہ ہے کہ اپنے تَن مَن دَھن کا کم سے کم حصہ اپنے لیے اور اپنے اہل و عیال کے لیے رکھا جائے' باقی سارے کا سارا اس نظام کو uproot کر کے اس کی جگہ پر نظامِ دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے صرف کر دیا جائے۔ بصورتِ دیگر' ایک حدیث سن لیجیے۔ فرض کیجیے کوئی شخص ۱۰۰ فیصد میں آ گیا ہے' یعنی شریعت کے تمام احکام پر کاربند ہے' نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ پر عمل پیرا ہے' حرام خورد و نوش کے قریب نہیں جاتا' براہِ راست سود میں ملوث نہیں ہے اور اسی طرح اس کے گھر میں شرعی پردہ بھی رائج ہے' لیکن وہ inactive ہے' باطل کے خلاف فعال نہیں ہے' activist نہیں ہے تو اس کے لیے اس حدیث نبویؐ میں بہت سارا سامانِ عبرت موجود ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَوْحَی اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰی جِبْرِیْلَ علیہ السلام اَنِ اقْلِبْ مَدِیْنَةَ کَذَا وَکَذَا بِاَهْلِهَا ' قَالَ : یَا رَبِّ اِنَّ فِیْهِمْ عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ یَعْصِكَ طَرْفَةَ عَیْنٍ ' قَالَ: فَقَالَ: اِقْلِبْهَا عَلَیْهِ وَعَلَیْهِمْ' فَاِنَّ وَجْهَهٗ لَمْ یَتَمَعَّرْ فِیَّ سَاعَةً قَطُّ)) (رواه البيهقى فى شعب الايمان)

''اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو وحی کے ذریعے سے حکم دیا کہ فلاں فلاں شہروں کو اس کے رہنے والوں پر الٹ دو (تلپٹ کر دو' جیسے کہ سدوم اور

عامورہ کی بستیوں کے ساتھ کیا گیا' جہاں حضرت لوط ؑ کو بھیجا گیا تھا)۔
اس پر جبرائیلؑ نے عرض کیا: اے رب! ان لوگوں میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے
جس نے کبھی پلک جھپکنے جتنی دیر بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کی۔ حضور ﷺ
فرماتے ہیں اس پر اللہ نے فرمایا: الٹو اس بستی کو پہلے اس بد بخت پر' پھر دوسروں
پر' اس لیے کہ (وہ اتنا بے غیرت اور بے حمیت انسان ہے کہ) میری وجہ
سے کبھی اس کے چہرے کی رنگت تک نہیں بدلی۔''

اسے اس بات پر کبھی غصہ بھی نہیں آیا کہ اللہ کی شریعت کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے۔ اندازہ کیجیے اس حدیث میں جس بندے کا ذکر ہو رہا ہے یہ وہ شخص ہے جو ۱۰۰ فیصد میں سے ہے' جس کا پلک جھپکنے جتنا وقت بھی کبھی گناہ میں بسر نہیں ہوا۔ اس سے زیادہ پاک صاف' نیک' زاہد اور عابد کا آپ تصور کر سکتے ہیں؟ یہاں گواہی دینے والے حضرت جبرائیلؑ ہیں' کوئی کرائے کا وکیل نہیں ہے' اور یہ کہ گواہی بھی اللہ کے سامنے دی جا رہی ہے جہاں ابوجہل بھی جھوٹ نہیں بول سکے گا۔ یہ زاہد و عابد آدمی ایسا بے غیرت ہے کہ کیا مجال اس کو کبھی غصہ آیا ہو کہ اللہ کی شریعت کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے۔ آپ کو کوئی ماں کی گالی دے دے تو اوّل تو آپ اسے جانے نہیں دیں گے' لیکن اگر آپ میں طاقت نہیں ہے تو آپ اپنی جگہ کانپ کر رہ جائیں گے' آپ کے چہرے میں پورے جسم کا خون آ جائے گا۔ اس بد بخت کو تو یہ بھی نہیں ہوا ہے۔

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

یہ فقط ''اللہ ھُو'' میں لگا رہا۔

تو جان لیجیے کہ واحد مخرج یہ ہے کہ شریعت کے جن اجزاء پر عمل ممکن ہے' چاہے کتنا ہی مشکل ہو' اس پر تو عمل لازم ہے' بقیہ جس پر آپ عمل نہیں کر سکتے اس کا کفارہ یہ ہے کہ منفی طور پر ''یَکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ'' کیا جائے' اسے ذہناً اور قلباً تسلیم نہ کیا جائے' اس کی چاکری نہ ہو' اس کے ساتھ تعاون نہ ہو' اس کی ملازمت نہ ہو' اسے promote نہ کیا جائے اور اس کے تحت پھلنے پھولنے کی کوشش نہ کی جائے' بلکہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی

ضروریات کے لیے کم سے کم پر قناعت کرتے ہوئے اپنی صلاحیتوں‘ قوتوں‘ توانائیوں کا زیادہ سے زیادہ حصہ اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدّوجہد کے اندر وقف کر دیا جائے۔ یہ ہے وہ جدّوجہد جس کا شریعت کی رو سے جامع عنوان ’’جہاد فی سبیل اللہ‘‘ ہے اور جس کے بغیر ایمان کا تصور ہی نہیں۔ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ میں مومن کی جامع اور مانع تعریف آئی ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾

’’مومن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر‘ پھر شک میں نہیں پڑے‘ اور پھر انہوں نے جہاد کیا اپنی جان اور مال سے اللہ کی راہ میں۔ صرف یہ لوگ (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔‘‘

اس کے بغیر نجات نہیں ہے۔ سورۃ الصّف میں فرمایا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ؕ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾

’’اے اہلِ ایمان! کیا میں تمہیں وہ تجارت بتاؤں جو تم کو عذابِ الیم سے بچا دے؟ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر‘ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو اپنے مالوں سے بھی اور اپنی جانوں سے بھی۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔‘‘

اگر تم جہنم کی آگ سے بچنا چاہتے ہو تو اس کے لیے یہ ناگزیر ضرورت ہے۔

اُمّتِ مُسلمہ کا فرضِ منصبی

اب میں اپنی دعوتِ قرآنی اور فکرِ قرآنی کا دوسرا نکتہ بیان کر رہا ہوں جو اہم ترین ہے۔ ہم عبادت سے اب جہاد پر آتے ہیں‘ لیکن جہاد کی دو منزلیں ہیں۔ پہلی منزل یہ ہے کہ پہلے اس کی دعوت عام کرنی ہوگی۔ دعوتِ دین کو پھیلاؤ۔ جو لوگ آئیں انہیں جمع کرو‘ انہیں منظم کرو‘ ان کو تربیت دو‘ تیار کرو‘ پھر انہیں میدان میں لا کر طاقت کا استعمال کر

کے نظام کو بدلو۔ دعوتِ دین' اللہ کی کتاب کی دعوت اور نشر و اشاعت جہاد کا پہلا مرحلہ ہے۔ اس کے لیے اصطلاح ''شہادت علی الناس'' ہے جو اجتماعی فریضہ ہے' جس کے لیے اُمت وجود میں آئی ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (البقرۃ:۱۴۳)

''اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وسط بنایا ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔''

یہ دراصل فریضۂ رسالت ہے جو اُمت کو ادا کرنا ہے۔ یہ رسالتِ محمدیؐ کا تسلسل ہے جو قیامت تک جاری رہے گا۔ پہلے رسول اللہ ﷺ نے بنفسِ نفیس یہ فریضہ انجام دیا اور اس کے بعد حجۃ الوداع میں آپؐ اسے اُمت کے حوالے کر کے دنیا سے رخصت ہوئے:

((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) (متفق علیه)

''اب جو موجود ہیں وہ ان تک پہنچائیں جو غیر موجود ہیں۔''

اور اس کی آخری منزل اقامتِ دین یعنی دین کو قائم کر دینا ہے:

((لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا)) (متفق علیه)

''تا کہ اللہ کی بات سب سے اونچی ہو جائے۔''

تکبیرِ ربّ ہو جائے' اللہ کا کلمہ بلند ہو' اللہ کا حکم بالادست ہو۔ اسی اقامتِ دین پر جا کر عبادتِ رب بھی مکمل ہو گی۔ اب میں اگر اس نظام کے تحت زندگی گزار رہا ہوں تو میری عبادت مکمل ہو گئی' انفرادی زندگی میں بھی اور اجتماعی زندگی میں بھی۔ میری بندگی اس وقت مکمل ہوئی ہے' اس سے پہلے ناقص تھی۔ اس نقص کی تلافی مَیں اس جدّوجہد سے کر رہا تھا' اس جدوجہد کی صورت میں مَیں اس گناہ کا کفارہ ادا کر رہا تھا۔ اب اگر یہ ہو گیا تو میری عبادت بھی پوری ہو جائے گی اور شہادت علی الناس کا تقاضا بھی پورا ہو جائے گا' اور آپ پوری دنیا کو دعوت دے سکیں گے کہ آؤ اپنی آنکھوں سے دیکھو یہ ہے اسلام' یہ ہے محمد رسول اللہ ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کا مظہرِ اَتم' یہ ہے وہ نظامِ حق' نظامِ عدل وقسط' یہ ہے انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی رحمت کا مظہر۔ یہ نظام جو اللہ نے

محمد رسول اللہ ﷺ کو دیا اور جسے اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر کامل کیا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ (المائدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے' اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت دین قبول کر لیا ہے۔''

یہ ہے میرے دینی فکر کی بنیاد! اس دینی فکر سے کما حقہ آگاہی کے لیے اب میں لٹریچر تجویز کرتا ہوں۔ اس ضمن میں سب سے اہم تو میرا مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب ہے' جو ایک ایک گھنٹے کے چوالیس آڈیو کیسٹس پر مشتمل[1] ہے۔ اب یہ دروس کتابچوں کی صورت میں بھی شائع کر دیے گئے ہیں۔ یہ میں نے قرآن مجید کے اجزاء منتخب کر کے قرآن کے حوالے سے دعوت پیش کی ہے۔ ایک کتاب ''مطالباتِ دین'' کے نام سے موجود ہے' جس میں عبادتِ ربّ' شہادت علی الناس اور اقامتِ دین تین اصطلاحات کے حوالے سے دین کے مطالبات پیش کیے گئے ہیں۔ ''جہاد فی سبیل اللہ'' پر کتابچہ موجود ہے۔ انگریزی میں بھی دو گھنٹے کا ویڈیو اور آڈیو موجود ہے اور اردو میں بھی کہ جہاد کسے کہتے ہیں' جس کو کہ آج ہم نے دنیا کے اندر بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔ ''حقیقتِ ایمان'' پر میرے پانچ لیکچرز ویڈیوز کی صورت میں موجود ہیں[2]۔ ایمان یعنی ایمان حقیقی کو جتنا میں نے emphasize کیا ہے' وہ زور کسی اور تحریک میں نہیں ہے۔ تبلیغی جماعت میں ایمان کی محنت کی بات ضرور ہوتی ہے لیکن وہ علمی اور فکری بنیاد پر نہیں۔

اب ایک بات یہ سمجھ لیجیے کہ ایک ہے بنیادی طور پر کسی فرض کا ادا ہو جانا اور ایک ہے اس کا کما حقہ ادا ہو جانا۔ ایک وہ شخص ہے جو کسی فرضِ عین کی ادائیگی سرے سے نہیں کر رہا تھا' وہ تو فرض کا تارک ہو گیا' لیکن کوئی ہے جس نے اپنی زندگی کو اس رُخ پر تو ڈھال لیا ہے لیکن اس کے لیے وہ اتنی محنت نہیں کر رہا جتنی کہ وہ کر سکتا تھا' تو اس کا معاملہ بھی اللہ کے ہاں قابل گرفت ہو جائے گا۔ نماز آپ نے جیسے تیسے پڑھی' وہ ادا تو ہو گئی'

---

(۱) مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے یہ دروس اب ایک آڈیو سی ڈی میں بھی دستیاب ہیں۔

(۲) یہ پانچ لیکچرز اب ''حقیقتِ ایمان'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیے گئے ہیں۔

لیکن اگر اس میں خشوع وخضوع اور استحضار نہ ہوا' اللہ کی طرف انابت ہی نہ ہوئی' اس کی طرف توجہ ہی نہ ہوئی تو بات وہی ہوئی کہ نماز پڑھی تو ہے مگر نماز کی حقیقت حاصل نہ ہوئی۔ چنانچہ پہلی بات تو یہ کہ آدمی اس فریضے کی فرضیت کو پہچان لے جو آج اُمتِ مسلمہ کے ذہنوں سے بالکل خارج ہے۔ انہیں نماز' روزے' حج' زکوٰۃ کی فرضیت تو معلوم ہے لیکن ''اقامتِ دین'' کی فرضیت معلوم ہی نہیں۔ لیکن اس کے بعد خاص طور پر تنظیم اسلامی کے رفقاء میں سے ہر ایک کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ جتنا گُڑ ڈالیں گے اتنا ہی میٹھا ہوگا' تو آپ اپنی قوتوں' توانائیوں اور صلاحیتوں کا کتنا حصہ اس کام کے لیے صرف کر رہے ہیں؟ کیا محض قانونی تقاضا پورا ہو رہا ہے یا واقعتاً حتی المقدور اور حسبِ استطاعت جدّوجہد ہو رہی ہے؟ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ (البقرۃ:۲۸۶)

''اللہ تعالیٰ کسی کو مکلف نہیں ٹھہرائے گا مگر اس کی وسعت کے مطابق۔''

چنانچہ ہو سکتا ہے کم والا وہاں کامیاب ہو جائے اور زیادہ والا ناکام ہو جائے۔ کیوں؟ اس لیے کہ کم والے کی استعداد ہی اتنی تھی جتنا اس نے کیا ہے' اس سے زیادہ استعداد تھی ہی نہیں' جبکہ زیادہ والے کی استعداد اس سے کہیں زیادہ تھی' اس نے اپنی استعداد سے کم کیا تو وہ ناکام ہو جائے گا۔

فریضہ اقامت دین کی شرطِ لازم: التزامِ جماعت

اب میرا اگلا نکتہ سمجھ لیجیے! اور یہ بھی ہمارے مجموعی دینی فکر سے اوجھل اور بالکل غائب ہے۔ یوں سمجھئے آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا معاملہ ہے۔ اس فرضِ عین کے لیے شرطِ لازم ہے التزامِ جماعت۔ جیسے نماز فرضِ عین ہے' اس کے لیے وضو شرطِ لازم ہے اور اگر پانی نہ ہو تو تیمّم ضروری ہے (یہ دونوں الفاظ آپ نوٹ کر لیں)' اس کے بغیر تو نماز ہی نہیں ہوگی' اسی طرح اگر آپ باطل کے غلبے کے تحت رہ رہے ہیں تو طاغوت کا انکار' نظامِ باطل کو ذہناً اور قلباً تسلیم نہ کرنا' اس کی چاکری نہ کرنا' اس کے تحت پھلنے پھولنے کی کوشش نہ کرنا' بلکہ اپنے اہل وعیال کی ضروریات کے لیے کم سے کم پر قناعت

کرتے ہوئے اپنے باقی اوقات اور صلاحیتوں اور وسائل و ذرائع کو اللہ کے دین کے لیے کھپا دینا آپ کے لیے فرضِ عین ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ اس کا کفارہ ہے۔ لیکن اس کے لیے التزامِ جماعت ناگزیر ہے' جماعت کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے التزامِ جماعت پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور یہ جوامع الکلم قسم کی احادیث ہیں۔ فرمایا: ((عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ)) (ترمذی) ''تم پر جماعت سے وابستگی لازم ہے''۔ ((يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ)) (مجمع الزوائد) ''اللہ کا ہاتھ یعنی اس کی تائید و نصرت جماعت پر آتی ہے۔''

اس ضمن میں عظیم ترین حدیث وہ ہے جو حضرت حارث الاشعری ؓ سے مروی ہے۔ یہ مشکوٰۃ شریف (کتاب الامارۃ) میں بھی ہے اور یہ مسند احمد اور جامع ترمذی کی روایت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((اِنِّیْ آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ [اَللّٰهُ اَمَرَنِیْ بِهِنَّ] بِالْجَمَاعَةِ' وَالسَّمْعِ' وَالطَّاعَةِ' وَالْهِجْرَةِ' وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ))

''(دیکھو مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ (ایک روایت میں اضافی الفاظ ہیں: اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے) جماعت کا' سننے اور ماننے کا اور ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا۔''

خود حدیث میں وضاحت فرما دی گئی کہ جماعت محض لوگوں کا انبوہ نہ ہو' بلکہ سمع و طاعت والی جماعت ہو۔ وہ جماعت Listen and Obey والی ہو' اس کا ڈسپلن مضبوط ہو۔

Theirs not to reason why?
Theirs but to do and die!

یہ چیزیں عوام کے ذہنوں سے نکل گئی تھیں' خواص بھی ان احادیث کی عجیب و غریب تاویلیں کرتے ہیں کہ بس جی پوری امت جماعت ہے۔ **لَا حولَ ولا قوَّۃ اِلَّا باللّٰہ۔** جماعت کا تو ایک امیر یا امام ہوا کرتا ہے' بغیر امام کے جماعت نہیں ہوتی۔ اس جماعت کا امیر کون ہے؟ شاہ فہد صاحب ہیں یا پرویز مشرف صاحب ہیں؟ کسی نے کہا جو ہماری حکومتیں ہیں وہی ہماری جماعتیں ہیں۔ تو گویا آپ کی بیعت پرویز مشرف صاحب سے

ہے' یا کبھی بھٹو صاحب سے تھی۔ یہ چور دروازے ہیں' اِدھر سے اُدھر بھاگنا ہے' ذمہ داریوں سے کترانا ہے اور اس کے لیے اس طرح کے عذرات تراشنا ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جماعت کے بغیر اسلام ہی نہیں۔ نوٹ کیجیے یہ بھی حدیث شمار ہوتی ہے۔ حدیث اخبار اور آثار کا مجموعہ ہے۔ ''خبر'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول' فعل یا تقریر کا نام ہے (تقریر سے مراد ہے کہ کوئی کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوا اور آپؐ نے اسے نہیں روکا) جبکہ صحابیؓ کے قول و فعل اور تقریر کو ہم ''اثر'' کہتے ہیں۔ خبر کی جمع اخبار اور اثر کی جمع آثار ہے۔ چنانچہ یہ بھی حدیث ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((اِنَّهٗ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ وَلَا جَمَاعَةَ اِلَّا بِاِمَارَةٍ وَلَا اِمَارَةَ اِلَّا بِطَاعَةٍ)) (رواہ الدارمی)

''یہ ایک حقیقت ہے کہ جماعت کے بغیر اسلام نہیں ہے اور امارت کے بغیر جماعت نہیں ہے اور اطاعت کے بغیر امارت نہیں ہے۔''

اب آپ پر لازم ہے کہ فریضۂ اقامتِ دین کی جدّوجہد کے لیے جو بھی موجودہ (existing) جماعتیں ہیں ان میں سے جس پر آپ کا دل مطمئن ہو' اسے قبول کریں اور اس میں بلاتاخیر شامل ہو جائیں۔ اس کے لیے میں آپ کے سامنے چار معیارات (Cardinal Characteristics) رکھ رہا ہوں۔ ان کی راہنمائی میں آپ تلاش کریں' یہ آپ کا کام ہے۔ ہماری دسویں جماعت کی عربی کی کتاب میں آخری نظم یہ تھی: ''فَتِّشْ لِقَلْبِكَ عَنْ رَفِيْقٍ!'' یعنی ''اپنے دل کے لیے کوئی رفیق تلاش کرو!'' کوئی تو ہو جس سے تم دل کی بات کرسکو۔ میں آپ سے کہتا ہوں ع ''فَتِّشْ لِنَفْسِكَ عَنْ جَمَاعَةٍ! کہ اپنے لیے کوئی جماعت تلاش کرو!

اگر کوئی جماعت آپ کے معیار پر پوری نہیں اترتی تو آپ کو ارادہ کرنا ہوگا کہ کھڑے ہوں اور خود جماعت قائم کریں۔ اس میں جو وقت بھی گزرے گا وہ ''تیمّم'' کے درجے میں ہوگا۔ تیمّم کے لفظی معانی ارادہ کرنے کے ہیں۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ﴿فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ (المائدۃ:٦) یعنی ''(اگر پانی موجود نہیں ہے) تو قصد کرو

پاک مٹی کا‘‘۔امام اور تیمم‘ ان الفاظ کا مادہ تو ایک ہی ہے۔تیمم یہ ہوگا کہ جو انسان طے کر لے کہ کوئی جماعت اس کے معیار پر پوری نہیں اتر رہی وہ ارادہ کر لے کہ مجھے اس جدوجہد کے لیے خود جماعت قائم کرنی ہے۔جو شخص ہر جماعت کو کسی دلیل کی بنا پر رد کرتا ہے کہ اس میں یہ خرابی ہے‘ اس کا مطلب ہے اس کے ذہن میں جماعت کا ایک تصور موجود ہے‘ ایک معیار ہے‘ ایک ہیولا ہے‘ ایک فریم آف ریفرنس ہے۔اب اس کو چاہیے کہ اپنے اس ہیولے کو سامنے لائے اور لوگوں سے کہے کہ آؤ میرے دست و بازو بنو! میرے ساتھ جمع ہو جاؤ! ہم جماعت بنیں گے۔ایک اکیلا ہوتا ہے اور دو کی حیثیت جماعت کی ہوتی ہے۔ایک امام اور ایک مقتدی ہو تو جماعت بن جائے گی۔

میں اپنی زندگی کا ہلکا سا نقشہ آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔تقریباً ۱۸ برس کی عمر میں مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی جواب میں آپ کے سامنے ۶۸ برس کی عمر میں رکھ رہا ہوں۔پچاس سال سے میں خود بھی اس پر کار بند ہوں اور میں نے حتی الامکان اسے عام بھی کیا ہے۔میں زمانہ طالب علمی میں اسلامی جمعیت طلبہ کا رکن رہا اور جس دن میرا ایم بی بی ایس فائنل ایئر کا رزلٹ آیا تو میں اسی دن چاہتا تھا کہ جماعت اسلامی کی رکنیت کی درخواست لکھ دوں تا کہ کوئی ایک رات بھی مجھ پر بغیر جماعت کے نہ آئے۔پندرہ دن کی تاخیر صرف اس وجہ سے ہوئی کہ مولانا اصلاحی صاحبؒ اس وقت قائم مقام امیر جماعت تھے‘ وہ چاہتے تھے کہ میں لاہور ہی میں مقیم رہوں جب کہ میرا خیال تھا کہ میں منٹگمری (ساہیوال) چلا جاؤں۔پندرہ دن اسی معاملے میں گزر گئے‘ ساہیوال جاتے ہی پہلا کام میں نے یہ کیا کہ جماعت کی رکنیت کی درخواست دے دی۔اس میں لکھ دیا کہ چاہتا تو میں یہ تھا کہ ایک دن بھی مجھ پر جماعتی زندگی کے بغیر نہ گزرے‘ لیکن صرف اس وجہ سے کہ معلوم نہ تھا کہاں settle ہوں گا اور کہاں درخواست دینی چاہیے (حلقہ لاہور میں یا حلقہ اوکاڑہ میں) تقریباً پندرہ دن کی تاخیر ہوگئی ہے۔

پھر جب جماعت سے علیحدہ ہوا تو مسلسل چار سال تک مولانا امین احسن اصلاحی‘ مولانا عبدالغفار حسن اور مولانا عبدالرحیم اشرف جیسے بزرگوں کے پیچھے دن رات ایک

کیا۔ میری کوشش تھی کہ یہ اکابر ایک جماعت بنالیں۔ میری عمر تو اُس وقت صرف پچیس برس تھی۔ تاہم جب ان سے مایوس ہوا تو طے کرلیا تھا کہ میں اب خود کھڑا ہوں گا۔ اُس وقت سے میں ''تیمّم'' پر تھا۔ یہاں تک کہ جب میں نے ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن قائم کی تو اُس وقت بھی واضح کر دیا تھا کہ میرے پیشِ نظر صرف انجمن نہیں ہے' جماعت کا قیام ہے۔ اس کے بعد ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم کر لی۔ چنانچہ ''وضو'' والا درجہ تو یہ ہے کہ ایک شخص جماعت میں شامل ہے اور ایک درجہ یہ ہے کہ جماعت کا متلاشی ہے' یا یہ کہ طے کر چکا ہے کہ اس وقت مطلوبہ جماعت موجود نہیں ہے اور مجھے خود جماعت بنانی ہے۔ یہ گویا قائم مقام ہو گا' جیسے تیمّم وضو کے قائم مقام ہے۔ لیکن اگر یہ دونوں صورتیں نہیں ہیں تو پھر وہی بات ہے کہ آپ بغیر جماعت کے ہیں' بغیر جماعت کے ہیں تو آپ اس اقامت دین کی جدوجہد میں شریک نہیں ہیں۔ اور اگر آپ اس جدوجہد میں شریک نہیں ہیں تو کفارہ ادا نہیں کر رہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کی بندگی جزوی ہے اور آپ کے لیے سورۃ البقرۃ کی یہ آیت تلوار بن کر سر پر لٹکی ہے:

فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۞

جہاں تک ''خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' یعنی دنیا کی رسوائی کا معاملہ ہے اسے تو ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس آیت کے آخر میں فرمایا: ''اللہ اس سے غافل نہیں ہے جو کچھ تم کر رہے ہو''۔ تمہاری داڑھیوں سے' حج و عمرہ سے اور تمہارے اعتکافوں سے اللہ دھوکہ نہیں کھائے گا۔ وہ جانتا ہے تمہاری کمائی حلال کی ہے یا حرام کی' تمہارے گھر میں پردہ بھی نافذ ہے یا نہیں۔ تم تو شریعت کے اتنے حصے پر بھی عمل پیرا نہیں ہو جتنے پر عمل کر سکتے ہو' کجا یہ کہ جس پر عمل کر ہی نہیں سکتے اس کا کفارہ ادا کرو۔

اقامتِ دین کے لیے مطلوبہ جماعت کے خصائص

اب آئیے کہ اِس جماعت کی تلاش کیسے کی جائے! اس جماعت کے چار بنیادی خصائص (Cardinal Characteristics) یہ ہیں:

(۱) اس جماعت کا اعلانیہ ہدف (declared goal) اقامتِ دین ہونا چاہیے۔ کرنے کے اور بھی بہت سے اچھے کام ہیں' جیسے غالب نے کہا ہے ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور!

چنانچہ علمی، تعلیمی، تبلیغی، اصلاحی اور خدمتِ خلق جیسے بہت سے کام ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کام کرنا اچھا ہے' لیکن آپ یہ کہہ لیں کہ یہ سارے کام اس ایک کام میں بالقوۃ موجود ہیں' گویا implied ہیں۔ اس جماعت کا ہدف برملا اور اعلانیہ یہ ہو کہ یہ جماعت اقامتِ دین کی جدّوجہد کے لیے قائم کی گئی ہے' اس کا مقصد دین کو مکمل نظامِ زندگی کی حیثیت سے دنیا میں قائم کرنا ہے۔

(۲) یہ جماعت حد درجے منظم ہو اور سمع وطاعت (Listen and Obey) کے اصول پر پوری طرح عمل پیرا ہو' جس میں کہ صرف ایک استثناء ہو گا کہ شریعت کے خلاف کوئی حکم دیا جائے گا تو نہیں مانیں گے' باقی شریعت کے دائرے کے اندر اندر جو بھی نظمِ جماعت کے تحت فیصلہ ہو گا وہ ہمیں قبول کرنا ہو گا اور اس پر عمل کرنا ہو گا۔ اس سمع وطاعت (Listen and Obey) کا نام ہی بیعت ہے۔

واضح رہے کہ بیعت ''بیع'' سے ہے' یعنی اپنے آپ کو بیچ دینا' کسی کے حوالے کر دینا کہ جو حکم دیں گے وہ میں مانوں گا۔ اسی کا تذکرہ سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۱ میں ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۫ ...... فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

''یقیناً اللہ نے خرید لیے ہیں اہلِ ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے بدلے میں۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں' پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں...... پس تم خوشیاں مناؤ اس بیع پر جو تم نے اللہ کے ساتھ کی ہے۔ یہی ہے اصل کامیابی۔''

پھر جو بیع اللہ سے ہوئی تھی اس کی بیعت حضور ﷺ کے ہاتھ پر ہوئی:

إِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ

(الفتح: ۱۰)

''(اے نبیؐ!) جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ حقیقت میں اللہ سے بیعت کر رہے ہیں' ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے۔''

ایک ہاتھ حضور ﷺ کا ہوتا تھا' دوسرا ہاتھ بیعت کرنے والے صحابی کا' جبکہ تیسرا غیر مرئی (invisible) ہاتھ اللہ کا۔ یہ بیعت ہے۔

البتہ بیعت کے بارے میں دو وضاحتیں ہیں۔ یہ بیعت دستوری بھی ہو سکتی ہے یعنی اس جماعت کا یہ دستور ہے' یہ مقصد ہے' اقامتِ دین کے لیے یہ جماعت قائم ہوئی ہے' فلاں شخص اس کا رکن بن سکتا ہے۔ یہ ارکان اپنے میں سے ایک معیّن وقت کے لیے امیر چنیں گے' مثلاً پانچ سال کے لیے یا دو سال کے لیے۔ پھر یہ کہ اس کے لیے ایک شوریٰ ہو گی' جسے ارکانِ جماعت منتخب کریں گے' پھر ارکان اور شوریٰ کے اختیارات کا تعین ہوگا۔ طے کیا جائے گا کہ امیر کے کیا اختیارات ہوں گے۔ یہ دستور (constitution) ہے۔ ایک شخص جماعت میں شامل ہوتے وقت اس دستور کا حلف اٹھائے گا کہ میں اس کی اطاعت کروں گا تو یہی اس کی بیعت ہے۔ یہ دستوری (constitutional) بیعت ہے اور یہ مباح اور جائز ہے' حرام نہیں ہے' لیکن وہ بیعت جو منصوص' مسنون اور ماثور ہے' لہٰذا اس دستوری بیعت سے کم از کم تین درجے افضل ہے' وہ شخصی بیعت ہے یعنی کسی شخص (individual) سے بیعت کرنا کہ مَیں اپنے آپ کو آپ سے وابستہ کر رہا ہوں' جو حکم آپ دیں گے میں اسے مانوں گا بشرطیکہ شریعت کے خلاف نہ ہو' اپنا مشورہ ضرور پیش کروں گا لیکن فیصلہ آپ کے اختیار میں ہوگا۔ یہ شخصی بیعت ہے۔

میں نے اس کے لیے تین الفاظ (منصوص' مسنون اور ماثور) استعمال کیے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے کسی صحابی نے پوچھا: ''حضور ﷺ میرے حسنِ سلوک کا اوّلین مستحق کون ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: تمہاری والدہ۔ پوچھا: پھر کون؟ فرمایا: تمہاری والدہ۔ پھر پوچھا: اس کے بعد کون؟ فرمایا: تمہاری والدہ۔ چوتھی مرتبہ پوچھنے پر آپؐ نے فرمایا: تمہارا والد۔ چنانچہ ادب اور خدمت کے حوالے سے والدہ کا حق والد کے مقابلے میں

تین گنا زیادہ ہے۔ اسی طرح شخصی بیعت' دستوری بیعت سے تین گنا افضل ہے۔ چونکہ قرآن اور حدیث میں اس کا ذکر ہے' لہٰذا یہ منصوص ہے۔ پھر یہی مسنون ہے' کیونکہ پوری سیرت میں ہم اس کا تذکرہ دیکھتے ہیں۔ حضورﷺ کے بعد سے لے کر بیسویں صدی کے آغاز تک مسلمانوں کا ہر اجتماعی کام اسی بیعت کی بنیاد پر ہوا ہے' لہٰذا یہ ماثور بھی ہے۔ خلافت کا نظام قائم تھا تو بیعت کی بنیاد پر۔ حضرات ابوبکر' عمر' عثمان' علی ﷺ کی بیعت منعقد ہوئی تھی۔ پھر یہ کہ خلافت نے ملوکیت کی شکل اختیار کر لی تھی تو وہ نظام بھی بیعت پر قائم تھا۔ یزید کی امارت کے لیے بھی لوگوں سے بیعت لی گئی تھی۔ اس کے خلاف اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے تو وہ بھی بیعت لے کر۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بھی بیعت لے کر کھڑے ہوئے۔ حضرت نفس زکیہ اور امام زید رحمۃ اللہ علیہما بیعت لے کر سامنے آئے۔ پھر انیسویں صدی میں جب نوآبادیاتی نظام (colonial rule) آیا تو جس ملک میں بھی اس کے خلاف مزاحمت کی تحریک چلی اور یورپی استعمار کے خلاف جہاد کیا گیا تو وہ بھی بیعت کی بنیاد ہی پر ہوا۔ سوڈان میں مہدی سوڈانی' لیبیا میں سنوسی' الجزائر میں عبدالقادر الجزائری اور روس میں امام شامل نے بیعت کی بنیاد پر لوگوں کو جہاد کے لیے منظم کیا۔ اس ضمن میں سب سے بڑی جہادی تحریک ہندوستان میں سید احمد بریلویؒ اور ان کے سب سے بڑے لیفٹیننٹ شاہ اسماعیل شہیدؒ نے اٹھائی جو بیعت کی بنیاد پر ہی تھی۔ پھر بیسویں صدی کے آغاز میں کوشش ہوئی تھی کہ ابوالکلام آزاد کو ''امام الہند'' مان کر ان کے ہاتھ پر بیعت ہو جائے' لیکن وہ کوشش ناکام ہو گئی۔ اس کے بعد مذہبی دنیا میں انتشار ہے' chaos ہے' تفریق در تفریق ہے۔ بہرحال ہم نے تنظیم اسلامی قائم کی ہے' جس کا نظم شخصی بیعت کی بنیاد پر قائم ہے۔

رسول اللہﷺ نے صحابہ کرام ﷺ سے جو بیعت لی اس کے الفاظ احادیث میں نقل ہوئے ہیں۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے' یعنی بخاری اور مسلم دونوں میں آئی ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ

وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَعَلٰى اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ وَعَلٰى اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَ مَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ))

''ہم نے بیعت کی تھی اللہ کے رسول ﷺ سے اس پر کہ آپ کا ہر حکم سنیں گے اور اس کی اطاعت کریں گے' مشکل میں بھی اور آسانی میں بھی' چاہے طبیعت آمادہ ہو چاہے طبیعت پر جبر کرنا پڑے' چاہے ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے' اور جن کو بھی آپ امیر بنائیں گے ہم ان سے جھگڑیں گے نہیں' اور یہ کہ جہاں کہیں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے' اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کے خوف سے زبان پر تالا نہیں ڈالیں گے۔''

یہ اس بیعت کے نکات ہیں جو حدیث میں بیان ہوئے۔ اور اس امت کی اس قدر ناشکری ہے کہ اس وقت بیعت کی بنیاد پر کوئی جماعت قائم نہیں ہے' سوائے تنظیم اسلامی کے۔ ہم نے تنظیم کے رفقاء کے لیے بیعت کے جو الفاظ رکھے ہیں وہ اسی حدیث سے ماخوذ ہیں۔ ہم نے اس بیعت میں ''فِي الْمَعْرُوْفِ'' کا اضافہ کیا ہے: ''اِنِّيْ اُبَايِعُكَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْمَعْرُوْفِ'' اور یہ اضافہ بھی حدیث کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ اسی حدیث کی جو مسلم شریف کی روایت میں ہے اس میں یہ اضافی الفاظ موجود ہیں۔ رسول اللہ ﷺ تو ظاہر بات ہے کوئی غلط حکم نہیں دے سکتے تھے' لیکن فرض کریں آپ نے کوئی لشکر بھیجا ہے تو اس کا ایک امیر ہے' اس کی اطاعت بھی تو کرنی ہے' وہ امیر کوئی غلط کام کر سکتا ہے' غلط حکم دے سکتا ہے' لہٰذا فرمایا:

((اِلَّا اَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ فِيْهِ مِنَ اللّٰهِ بُرْهَانٌ))

''اِلّا یہ کہ تم (اپنے امیر کی طرف سے) کوئی ایسا کفر دیکھو جس کے لیے تمہارے پاس (کتاب وسنت سے) کھلی دلیل موجود ہو (کہ یہ کفر ہے)۔''

تب تم کہہ سکتے ہو کہ ''لَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ''۔ ہم نے اپنی بیعت میں اسی اصول کو اختیار کیا ہے۔ بیعت کے باقی الفاظ وہی ہیں جو متذکرہ بالا حدیث میں آئے ہیں۔

مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک طویل حدیث مروی ہے' جس میں یہ الفاظ آئے ہیں:

((مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً))

''جو مسلمان مرا اس حال میں کہ اس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہیں ہے وہ جاہلیت کی موت مرا۔''

دیکھئے کس قدر دوٹوک الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ بیعت کا مطلب ہی یہ ہے کہ اپنے آپ کو بیچ دینا۔ جیسے آپ قربانی کے لیے جانور خرید کر لے جا رہے ہوتے ہیں تو اس کی گردن میں آپ نے ایک رسّی ڈالی ہوئی ہوتی ہے جو آپ نے خود تھام رکھی ہوتی ہے۔ بالکل یہی کیفیت نظم جماعت کی ہے۔ جس شخص کی آپ نے بیعت کی ہے گویا کہ اپنی گردن میں قلادہ ڈال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا ہے کہ جدھر حکم دو گے ادھر مڑ جائیں گے۔ لیکن اگر کسی شخص کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہیں ہے تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ جاہلیت سے مراد حضور ﷺ سے پہلے کا معاشرہ ہے۔

اس بیعت کی دو ہی شکلیں ہوتی ہیں۔ اوّلاً: اسلامی نظامِ خلافت موجود ہے تو خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت ہوگی۔ اور ثانیاً: اگر اسلامی نظامِ خلافت موجود نہیں ہے تو وہ خود بخود آسمان سے تو ٹپکے گا نہیں' اسے قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑے گی اور اس جدوجہد کے لیے جماعت اسی طرح لازم وملزوم ہے جیسے نماز کے لیے وضو۔ چنانچہ جماعت کے امیر کے ہاتھ پر بیعت ہو جائے گی۔ تیسری کوئی شکل سرے سے ہی نہیں۔ لیکن تاویلیں کرنے والے نہ معلوم کیا کیا تاویلیں کرتے ہیں!

اقامتِ دین کی جدّوجہد کے لیے مطلوبہ جماعت کے خصائص اربعہ میں سے دو میں نے آپ کے سامنے رکھے ہیں۔ ان کا اعادہ کرتے ہوئے آگے چلیے:

(۱) اس جماعت کے پیش نظر اقامتِ دین کا اعلانیہ ہدف ہو۔

(۲) اس کا نظم سمع وطاعت والا ہو' چاہے وہ دستوری بیعت ہو جو کہ مباح اور جائز ہے' چاہے وہ شخصی بیعت ہو جو کہ تین درجے بہتر ہے۔

(۳) آپ یہ معلوم کیجیے کہ اقامت دین کی جدوجہد کے لیے اس جماعت کے پیش نظر طریق کار کیا ہے۔ ان سے معلوم کیجیے کہ آپ کیا کام کرنا چاہتے ہیں اور کیسے کرنا

چاہتے ہیں! آپ ہمیں بتایئے کہ سیرت النبیؐ کے ساتھ اس کا کیا ربط و تعلق ہے؟ حضورﷺ کے منہاج کے ساتھ اس کا کیا correlation ہے؟ ان موضوعات پر میرے کتابچے موجود ہیں۔ بیعتِ سمع و طاعت کے موضوع پر میرا اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی کتابچہ موجود ہے۔ ''منہج انقلابِ نبویؐ'' کے عنوان سے چار سو صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب موجود ہے۔ ان موضوعات پر میرے بے شمار خطابات ہوئے ہیں، مختصر بھی ہیں، مطوّل بھی ہیں اور ان کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹ موجود ہیں۔ اقامتِ دین یا انقلاب اسلامی کی جدوجہد کے لیے جو طریق کار اختیار کیا جائے وہ سیرت النبیؐ سے ماخوذ ہونا چاہیے اور اگر اس میں کہیں حالات کی مناسبت سے تبدیلی کی ضرورت محسوس ہو، اجتہاد کرنا لازم ہو تو معیّن کرنا چاہیے کہ موجودہ حالات میں کیا بنیادی تبدیلی واقع ہوئی ہے اور اس کی وجہ سے ہمیں یہاں اجتہاد کرنا پڑا، اور وہ معین اجتہاد ہوگا، یہ نہیں کہ ہم سارے مسنون راستے کو چھوڑ دیں۔

(۴) چوتھی اور آخری بات یہ کہ اس جماعت کی قیادت کے قریب ہو کر انہیں دیکھیں اور پرکھیں۔ اس لیے کہ پیچھے چلنے والوں میں تو ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ حضورﷺ کے پیچھے صفِ اوّل میں عبداللہ بن اُبَی منافقِ اعظم بھی کھڑا ہوتا تھا اور جب حضورﷺ خطبہ دینے کھڑے ہوتے تو وہ اپنی چوہدراہٹ ظاہر کرنے کے لیے کہا کرتا کہ لوگو غور سے سنو! یہ اللہ کے رسول ہیں، ان کی بات توجہ سے سنو! پیچھے چلنے والوں کا معاملہ مختلف بھی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا آپ قیادت کے قریب ہو کر سونگھیں کہ خلوص واخلاص اور للٰہیت کی خوشبو آ رہی ہے یا نفسانیت کی بدبو آ رہی ہے۔ کہیں اپنی شخصیت کی promotion یا جائیداد بنانے یا اپنے مفادات اور کاروبار چمکانے کے لیے تو یہ سارا ڈھونگ نہیں رچایا ہوا ہے۔ میں نے ''سونگھنے'' کا لفظ استعمال کیا ہے، اس لیے کہ یہ تو بڑا مشکل ہوتا ہے کہ بہت تفصیل میں جا کر آپ دیکھ سکیں، البتہ ع ''دل را بدل رہیست'' کے مصداق آپ کو خوشبو آ جائے گی یا بدبو بھی آ جائے گی۔

ان چار معیارات پر جو جماعت پاس مارکس بھی لے جائے، آپ پر فرضِ عین ہے کہ

اس میں شامل ہوں۔ آپ کا ایک دن بھی اس میں شمولیت کے بغیر نہیں گزرنا چاہیے' ورنہ آپ کا یہ دن کفر میں گزرے گا۔ سائیں عبدالرزاق صاحب یہ کہا کرتے تھے کہ ''جو دم غافل سو دم کافر!'' یعنی صوفیاء کے نزدیک کفر اور اسلام کی ایک definition یہ بھی ہے کہ انسان کا جو سانس اللہ کی یاد کے بغیر گزر رہا ہے وہ کفر کا سانس ہے۔ اقبال بھی کہتا ہے ۔

بُتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

میرے نزدیک آپ پر جو دن اور رات جماعتی زندگی کے بغیر گزرے' وہ دن کفر کا دن اور وہ رات کفر کی رات ہے۔

البتہ کسی جماعت میں شامل ہو کر بھی آنکھوں پر تعصب کی پٹی مت باندھ لیجیے۔ مزید غور کیجیے' سوچتے رہیے' آنکھیں دیکھتی رہیں' کان سنتے رہیں' دماغ سوچتا رہے' اگر اس سے بہتر کوئی جماعت نظر آئے تو اسے چھوڑ کر اس میں شامل ہو جائیں۔ اس لیے کہ اب نبی کی جماعت کوئی نہیں۔ نبی کی جماعت میں ایک دفعہ شامل ہو کر' ایک مرتبہ ہاتھ میں ہاتھ دے کر اگر آپ اسے چھوڑ دیں گے تو ''مَنْ شَذَّ شَذَّ فِی النَّارِ'' (ترمذی) کے مصداق ٹھہریں گے۔ اب تو کوئی جماعت نبی کی جماعت نہیں ہے' سب ہمارے جیسے انسان ہیں۔ ہاں اللہ نے کسی کو درد زیادہ دے دیا' کسی کو سوچ اور فکر زیادہ دے دی' کسی میں قوتِ کار زیادہ رکھ دی' کسی کے اندر ذہانت زیادہ ہے' کسی کے لیے حالات ایسے سازگار کر دیے کہ اس پر حق واضح ہو گیا اور اس کو قبول کرنے کی ہمت بھی ہو گئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے' لیکن اس سے بڑھ کر کسی کو کوئی ترجیح حاصل نہیں ہے۔ جیسے کہ ہم سورۂ حٰم السجدۃ کے درس میں پڑھتے ہیں:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۝

''اور اُس شخص سے اچھی بات کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف دعوت دے اور عمل صالح پر کاربند ہو اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔''

یعنی میں تم پر کوئی دھونس نہیں جمانا چاہتا کہ میں کوئی بہت بڑا متقی' بڑی روحانی شخصیت کا مالک اور کوئی بڑا عارف باللہ ہوں' بلکہ میں عام مسلمان ہوں۔

یہ ہیں جماعت کے ضمن میں وہ چار خصائص جو دیکھنے ضروری ہیں۔ اگر ان خصائص پر پورا اترنے والی کوئی جماعت نہ ملے تو کھڑے ہو جائیں' کمرِ ہمت کس لیں اور اپنی جماعت بنانے کی تیاری کریں۔

گر جیت گئے تو کیا کہنے' ہارے بھی تو بازی مات نہیں!

اب آخری نکتہ یہ ہے کہ اگر ہم یہ جدوجہد کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ جیسے میں نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کی توفیق سے پوری زندگی یہ جدوجہد کی ہے' اس کے لیے اللہ ہی نے میرے لیے حالات ساز گار بنائے۔ اب دو ہی امکانات ہیں کہ یا تو میں اسی دنیا میں اپنی زندگی ہی میں کامیابی دیکھ لوں یا مجھے اس زندگی میں اس کوشش کا کوئی ثمر نظر نہ آئے۔ تو جان لیجیے کہ اگر ہم دنیا میں ناکام رہتے ہیں تب بھی یہ ناکامی نہیں ہے' اس لیے کہ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔ اگر میں نے یہ ساری جُہد و کوشش خلوص و للّٰہیت کے ساتھ کی ہے تو کم سے کم انفرادی سطح پر میری نجات لازم ہے۔ اگر کسی میں یہ کہنے کی ہمت ہے کہ اے اللہ! تو نے مجھے جو توانائی' قوت' ذہانت' صلاحیت' وسائل و ذرائع اور جو اولاد دی میں نے اسی کام کے اندر لگا دی تو اللہ تعالیٰ کے ہاں نجات کی امید کی جا سکتی ہے۔ اگر یہ ہو جائے تو ﴿ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ یہی سب سے بڑی کامیابی ہو جائے گی۔ دوسری چیز (دنیا میں نصرت و کامیابی) کو تو قرآن ایک طرح سے تنقید کے انداز میں بیان کرتا ہے ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا﴾ "ایک اور شے جو تمہیں بہت پسند ہے" اللہ کو تو اس سے غرض ہی نہیں۔ اللہ کو اگر اس سے غرض ہو کہ دین قائم ہو جائے تو اسے ایک آن میں قائم کر دے ﴿وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ﴾ یہ سارا سلسلہ تو تمہارے امتحان کے لیے ہے۔ اس جدوجہد میں اپنی جانیں قربان کرنے والے کامیاب ہیں' چاہے وہ حضرت سمیہ اور یاسر رضی اللہ عنہما کی طرح مکہ میں ہی شہید کر دیے گئے۔ اس سے بڑی کامیابی کس کی ہو گی جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی کہ ((اصْبِرُوْا آلَ يَاسِرَ فَاِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْجَنَّةَ))

(مجمع الزوائد للهیثمی) ''اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو' تمہارے استقبال کی تیاریاں تو جنت میں ہو رہی ہیں''۔ حضرت حمزہ سمیت ستر صحابہ ؓ غزوۂ احد میں شہید ہو گئے۔ ابھی تو سمجھئے پانچ سال کے بعد وہ منظر سامنے آنا تھا کہ جب حضور ﷺ دس ہزار کے لشکر کے ہمراہ مکہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ ستر صحابہ کرام بئر معونہ پر لے جا کر ذبح کر دیے گئے۔ اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے۔ ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۭ﴾ (التغابن:۹) ''وہی ہے اصل ہار جیت کے فیصلے کا دن''۔ اصل کامیابی وہاں کی کامیابی ہے۔

میری آج کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ اگر یہ جدوجہد نہیں ہے تو انفرادی نجات قطعاً نہیں ہے۔ اگر قرآن سچا ہے اور حضرت محمد ﷺ سچے ہیں تو میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ اس کے بغیر ہماری انفرادی نجات ممکن نہیں ہے۔ یہ میرے پچاس برس کے مطالعہ قرآن کا حاصل' لُبِّ لُباب اور خلاصہ ہے۔

ہماری اس جدوجہد اور کوشش کا نتیجہ ہمارے سامنے بھی نکل سکتا ہے کہ ہم دُنیوی اعتبار سے بھی کامیاب ہو جائیں' اور ان شاء اللہ ضرور ہوں گے۔ آج نہیں تو کل ہوں گے' ہم نہیں ہوں گے تو ہماری اگلی نسل ہو گی۔ اس لیے کہ اس کی خبر تو محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے دی ہے۔ اور اگر ہم کسی ایک ملک میں بھی اس نظام کو قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ پوری اُمتِ مسلمہ کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا ہو جائے گا۔ یہ اصل میں میرے فکر کی ایک اور dimension ہے۔ اس پر میری کتاب ''سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی' حال اور مستقبل'' کے عنوان سے موجود ہے۔

اس وقت اُمتِ مسلمہ عذابِ الٰہی کی گرفت میں ہے۔ اس کی ایک وجہ میں آپ کے سامنے پہلے بیان کر چکا ہوں کہ دین پر ہمارا عمل جزوی ہے' لٰہذا ہم ﴿خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ اور ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ﴾ کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ اس کی عملی مثال کبھی یہودی تھے' آج ہم ہیں۔ دوسری بات یہ سمجھ لیجیے کہ جو امت حاملِ کتاب ہوتی ہے' شریعتِ الٰہی کی حامل ہوتی ہے اور اللہ کے رسول کی امت ہونے کی مدعی ہوتی ہے وہ زمین پر اللہ کی نمائندہ ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنے عمل سے غلط نمائندگی

کرے تو وہ کافروں سے بڑھ کر مجرم ہے۔ اس وجہ سے آج ہم عذابِ الٰہی کی گرفت میں ہیں اور عذاب الٰہی کی یہ گرفت ڈھیلی نہیں پڑے گی، ہلکی بھی نہیں ہوگی، سخت سے سخت تر ہوتی چلی جائے گی جب تک کسی ایک قابلِ ذکر ملک میں اللہ کے نظام کو قائم کر کے پوری دنیا کے لیے فرض کفایہ ادا نہ ہو جائے کہ بھئی دیکھو، یہ ہے اسلام۔ آؤ اپنی آنکھوں سے دیکھو، یہ ہے اسلام کا نظامِ حکومت، یہ ہے اسلام کا معاشی، عمرانی اور سوشل نظام۔ آؤ اور اس کی برکات کو دیکھو۔ افغانستان میں نظام اسلام کی تھوڑی سی برکات ہمارے ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب دیکھ کر آئے ہیں۔ وہاں اگرچہ ابھی نظام کی بات نہیں ہے، لیکن شریعت کے احکام کچھ نافذ ہوئے ہیں، ان کی برکتیں وہ دیکھ کر آئے تو انہوں نے کہا کہ اگر دوسرے ملکوں میں بھی وہی نظام نافذ ہو جائے جو وہاں ہے تو پوری دنیا مسلمان ہو جائے گی۔(۱) یہ تأثر ڈاکٹر جاوید اقبال کا ہے، حالانکہ وہ آزاد خیال آدمی ہیں۔ میں نے ان کا یہ بیان پڑھا تو وقت لے کر ان کے پاس گیا اور انہیں مبارک باد پیش کی۔ نوٹ کیجیے کہ اگر ہم یہ کرتے ہیں تو پوری اُمت کی جانب سے فرض کفایہ ادا ہو جائے گا۔

خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کا دورِ ثانی

اب اس کے ضمن میں چند سال سے میرا ایک فکر سامنے آیا ہے جس سے کہ ہم نے خلافت کی تحریک کا آغاز کیا۔ اس کے نکات نوٹ کر لیجیے:

(۱) اس دنیا کے خاتمے سے قبل کُل روئے ارضی پر اللہ کا دین قائم ہو کر رہے گا۔ اس کے ضمن میں ہم نے بہت سی احادیث عام کی ہیں اور ان احادیث پر مشتمل کتابچے ہم نے لاکھوں کی تعداد میں شائع کر کے تقسیم کیے ہیں۔

(۲) اس بات کے اشارے ملتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا نقطۂ آغاز ارضِ افغانستان اور پاکستان ہوں گے، اگرچہ حالات ان کے لیے بھی بہت سخت ہیں اور ہمارے لیے بھی بہت کڑے ہیں۔ لیکن ان دونوں ممالک کا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ دستوری اعتبار سے پاکستان میں خلافت کے تمام تقاضے پورے کیے جا چکے ہیں، اگرچہ

(۱) محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ خطاب ۳۱ دسمبر ۲۰۰۰ء کا ہے جب افغانستان میں طالبان حکومت قائم تھی۔

دستور کے اندر چور دروازے موجود ہیں' اسی لیے میں اسے ''منافقت کا پلندہ'' کہتا ہوں۔ لیکن اگر یہ چور دروازے بند کر دیے جائیں تو ہمارا دستور کامل اسلامی دستور ہو جائے گا۔ اس میں اللہ کی حاکمیت پر مشتمل قراردادِ مقاصد موجود ہے' جس میں واضح کیا گیا ہے کہ ہمارے پاس جو اختیار ہے وہ ہمارا ذاتی نہیں ہے' بلکہ یہ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی ایک مقدس امانت ہے اور یہ اختیار صرف حاکم حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کی معین کردہ حدود ہی میں استعمال ہوگا۔

اس دستور کی دفعہ ۲۲۷ بھی موجود ہے:

No legislation can be done here repugnant to the Quran and the Sunnah.

لیکن چور دروازے بھی ہیں۔ فیڈرل شریعت کورٹ موجود ہے لیکن اس پر ایک ہتھکڑی اور ایک بیڑی اب تک پڑی ہوئی ہے۔ ایک بیڑی (معاشی معاملات سے متعلق) اتفاق سے دس سال قبل کھل گئی تھی۔ تب اس نے فیصلہ دیا تھا کہ بینک انٹرسٹ سود ہے' ربا ہے اور حرام ہے۔ ابھی تک تو ہم اس پر عمل پیرا نہیں ہو سکے اور عملی اعتبار سے بہت دور ہیں' لیکن دستوری اعتبار سے آج ہم نظامِ خلافت کے بہت قریب ہیں۔ آج کی دنیا کے اعتبار سے دستور کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ سیاسی اور معاشی اعتبار سے نظری طور پر ہم نے بہت پیش رفت کر لی ہے لیکن حقیقتاً قوانین شریعت کا معاملہ بہت کمزور اور نہ ہونے کے برابر ہے' جبکہ افغانستان میں تو دستور اور نظام کا ابھی تصور ہی نہیں ہے۔ تاہم انہوں نے شریعت اسلامی کے ایک خاص مکتب فکر یعنی فقہ حنفی کی تنفیذ کر دی ہے۔

دونوں ملکوں کے حالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب قدرت ہمیں قریب سے قریب تر ہونے پر مجبور کر رہی ہے۔ افغانستان میں روس کا اپنی فوجیں داخل کر دینا' جواب میں وہاں سے شدید ردعمل کا اٹھنا' پھر ضیاء الحق کے دور میں امریکہ کو پاکستان کی ضرورت پڑ جانا اور پاکستان کے راستے روس کے خلاف افغان مجاہدین کی مدد کرنا' یہ سب معاملات ایسے تھے کہ ان کے نتیجے میں ہم نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایٹم بم بھی بنا لیا۔ پھر اس موقع نے ہمیں افغانستان کے قریب تر کر دیا۔ آپ تصور کیجیے کہ یہ وہ ملک

تھا جس کا شہر کابل بے حیائی' عریانی اور فحاشی میں پیرس کی مانند تھا۔ ظاہر شاہ جب پاکستان آئے تھے تو ان کی ملکہ سکرٹ میں ملبوس تھیں' نیم عریاں لباس میں تھیں اور اب وہاں برقع کے بغیر کوئی عورت نظر نہیں آتی۔ کیسی کیسی کرامات ظہور میں آ گئی ہیں۔ اب اگر وہاں پابندیاں لگتی ہیں تو پاکستان کڑے امتحان میں گرفتار ہو جائے گا۔ اب ہمارے لیے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو اقوامِ متحدہ کے خلاف بغاوت کیجیے۔ اور اگر نہیں کرتے اور افغانستان کے معاملات میں اس کی عائد کردہ پابندیوں کو قبول کرتے ہیں تو اس ملک کے اندر ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ اگر کسی کے اندر ذرا سی بھی بصیرت ہے تو وہ ایسی حماقت نہیں کرے گا۔ لہٰذا امریکہ خود ہمیں ایک رسّی کے ساتھ باندھ رہا ہے کہ تم ایک ہی ہو' باہم جڑ جاؤ' ایک ہو جاؤ۔[1]

نظامِ خلافت کی علمبردار دو تنظیموں حزب التحریر اور المہاجرون نے پاکستان میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا ہے۔ شہر بھر میں بہت بڑے پیمانے پر ان کے بینرز لگے ہیں اور بڑے خوبصورت اور نفیس ہینڈ بل شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں ای میل ایڈریس بھی دیے گئے ہیں۔ کم از کم ایک گروپ کا تو پورا پتہ بھی تحریر ہے۔ ایک صاحب نے جو جماعت اسلامی کے رکن ہیں' مجھ سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے جماعت اسلامی کا راستہ روکنے کے لیے حکومت کی ایجنسیز نے یہ سلسلہ اٹھایا ہے۔ انہیں شاید معلوم نہیں ہوگا' میں ان کا پس منظر جانتا ہوں۔ ان تنظیموں کا رشتہ الاخوان المسلمون سے قریباً وہی ہے جو تنظیم اسلامی کا رشتہ جماعت اسلامی سے ہے' بہت تھوڑا سا فرق ہے۔ میں جمعیت اور جماعت میں دس برس شامل رہا ہوں اور مولانا مودودیؒ سے بہت قریب رہا ہوں۔ علامہ تقی الدین نبہانیؒ الاخوان کے اوّلین مرشد عام اور مؤسس یعنی حسن البناء شہیدؒ کے قریبی دوستوں میں سے تھے' لیکن غالباً الاخوان میں یہ شامل نہیں ہوئے تھے' تاہم فکر ایک ہی تھا۔ اس کے

---

(۱) واضح رہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ خطاب ۳۱ دسمبر ۲۰۰۰ء کا ہے۔ افسوس کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد حکومت پاکستان نے امریکہ کے آلۂ کار ہونے کا کردار ادا کیا اور طالبان حکومت افغانستان میں اسلامی معاشرے کے قیام کی جس جدوجہد میں مصروف تھی اسے یکسر سبوتاژ کر دیا گیا۔

بعد انہوں نے اپنے طور پر ''حزب التحریر'' قائم کی۔ یہ اردن کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے کافی کتابیں لکھی تھیں اور خاص طور پر اسلامی فقہ ان کا موضوع تھا۔ یعنی اب اگر اسلامی نظام قائم ہوگا تو اس میں فقہی اعتبار سے کیا کیا امور غور طلب ہیں' اس حوالے سے انہوں نے کافی کام کیا ہے۔ چند سال پہلے حزب التحریر ہی سے ''المہاجرون'' کا ایک گروپ علیحدہ ہوا ہے۔ انگلینڈ میں حزب التحریر کے بہت بڑے لیڈر بکری تھے' جنہوں نے علیحدہ ہوکر المہاجرون قائم کی ہے۔ ان کا بنیادی فکر ایک ہی ہے۔ یہ اصل میں انہی احیائی تحریکوں کا تسلسل ہے جو ایک وقت میں عالم اسلام میں شروع ہوئی تھیں۔ انڈونیشیا میں مسجومی پارٹی' ہندوستان میں جماعت اسلامی' ایران میں فدائین' مصر میں الاخوان' لبنان میں عباد الرحمٰن اور ترکی میں سعید نورسی کی تحریک' یہ تمام تحریکیں ایک وقت میں شروع ہوئی تھیں۔ نعیم صدیقی مرحوم نے ان تحریکوں کے بارے میں بڑا پیارا شعر کہا تھا ؎

ہے ایک ہی جذبہ کہیں واضح کہیں مبہم
ہے ایک ہی نغمہ کہیں اونچا کہیں مدّھم!

ان تحریکوں میں ایک ہی نغمہ یعنی ایک ہی فکر اور ایک ہی سوچ کارفرما ہے۔ ان تحریکوں پر چونکہ ستر برس گزر گئے ہیں لہٰذا ان پر بڑھاپا بھی طاری ہوگیا ہے۔ اب تک کسی کو خاص کامیابی بھی حاصل نہیں ہوسکی۔ ان میں سے کچھ گروپ علیحدہ ہوئے ہیں۔ جیسے مَیں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوا تو میں نے ایک علیحدہ جماعت تنظیم اسلامی بنائی' لیکن میرا فکر تو وہی ہے' میں نے اس فکر سے کبھی اعلانِ براءت نہیں کیا۔ اسی طرح یہ تحریک حزب التحریر ہے۔ یہ لوگ خلافت کے عنوان سے کام کر رہے ہیں۔ ان کے اکثر لوگ امریکہ یا انگلینڈ میں ہیں' عالمِ اسلام میں ان پر ہر جگہ پابندی عائد ہے' سوائے پاکستان کے کہ یہاں کچھ آزادیاں حاصل ہیں۔[1] مولانا زاہد الراشدی صاحب نے ایک بار بتایا تھا کہ لندن میں ایک عالمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں پوری دنیا کی اسلامی تحریکوں کے کارکن جمع ہوئے اور وہاں اس بات پر اجماع ہوگیا تھا کہ پوری دنیا میں اسلام کے صحیح

اور مکمل نظام کا اگر کوئی امکان کسی ملک میں ہے تو وہ صرف اور صرف پاکستان میں ہے۔ اس کے ضمن میں یہ ایک مزید گواہی ہے کہ حزب التحریر اور المہاجرون نے یہ سمجھا ہے کہ کام کرنے کا موقع اگر کہیں ہے تو یہاں ہے' کیونکہ یہاں پر بہر حال حقوق ہیں۔ آپ بات کر سکتے ہیں' تقریریں کر سکتے ہیں' آپ جماعت بنا سکتے ہیں' جب تک امن و امان کا مسئلہ نہ کھڑا کیا جائے اور کوئی توڑ پھوڑ نہ کی جائے اس وقت تک آپ کو آزادیٔ اظہارِ خیال کے اختیارات حاصل ہیں۔ اس وجہ سے یہ تحریکیں یہاں آئی ہیں۔ اللہ کرے ان کے ذریعے سے بھی مزید کچھ لوگوں کے اندر آگاہی (awareness) پیدا ہو جائے۔
بہر حال یہ بھی درحقیقت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ۔

اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے!

اصل بات ہمت' ارادے اور عزم کی ہے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے استقامت طلب کرنی چاہیے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

❁❁❁

(۱) اب پاکستان میں یہ صورت حال برقرار نہیں اور یہاں بھی حزب التحریر پر پابندی عائد کی جا چکی ہے۔

جہاد بالقرآن

اور

اس کے پانچ محاذ

عنوانات

جہاد اور قرآن: دو مظلوم ترین حقیقتیں	409
فرائض دینی اور جہاد کی منازل	412
پہلی منزل: عبادتِ ربّ	412
پہلی منزل کے تین جہاد	414
دوسری منزل: شہادت علی الناس	418
دعوت وتبلیغ کی تین سطحیں	423
تیسری منزل: غلبہ واقامت دین	431
اقامت دین کا مرحلہ اور تصادم	433
ایمان اور جہاد لازم وملزوم ہیں	438
جہاد کی چوٹی: قتال فی سبیل اللہ	441
جہاد کے لیے جدید اصطلاح: انقلابی عمل	444
انقلابی عمل کے لیے تنظیم ناگزیر ہے	445
انقلابی دعوت وتربیت اور اس کا ذریعہ	451

☆☆☆

الحمد للّٰہ وکفی والصلوۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفی ...... امّا بَعد:

فاعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ـــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿فَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَجَاھِدْھُمْ بِہٖ جِھَادًا کَبِیْرًا ○﴾ صدق اللّٰہ العظیم

خطبۂ مسنونہ ' تلاوتِ آیات اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد:

جس آیتِ مبارکہ کی میں نے تلاوت کی ہے' اس میں دو چیزیں نہایت اہم ہیں۔ ایک لفظ ''جہاد'' جو اِس آیتِ مبارکہ میں دو مرتبہ آیا ہے' ایک فعل امر کے طور پر ''جَاھِدْ'' اور دوسرے مفعول مطلق کے طور پر ''جِھَادًا کَبِیْرًا'' ـــ یعنی نہ صرف جہاد بلکہ شدید جہاد' بہت بڑا جہاد۔ یہاں دوسرا اہم لفظ ''بِہٖ'' آیا ہے۔ اس آیت میں حکم دیا جا رہا ہے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو: ﴿وَجَاھِدْھُمْ بِہٖ جِھَادًا کَبِیْرًا﴾ ''آپؐ ان سے جہاد کیجیے اس (قرآن) کے ذریعے سے بہت بڑا جہاد''۔

یہاں ''بِہٖ'' کا جو چھوٹا سا ٹکڑا آیا ہے' میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اکثر و بیشتر ہمارے اہلِ علم حضرات بھی اس کی اہمیت پر غور و فکر کیے بغیر سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ جہاں بھی قرآن کے لیے ''بِہٖ'' بطور ضمیر مجرور آیا ہے' ہمارے اہلِ علم' الّا ماشاء اللہ' اس کا حق ادا نہیں کرتے۔

اس ''بِہٖ'' کی اہمیت کے اظہار کے لیے دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

پہلی مثال سورۃ بنی اسرائیل سے ہے' جہاں فرمایا: ﴿وَمِنَ الَّیْلِ فَتَھَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ ق﴾ (آیت ۷۹) ''اور (اے نبیؐ!) کچھ رات جاگتے رہیے اس (قرآن) کے ساتھ'

یہ بڑھوتری ہے آپؐ کے لیے''۔ میرا اندازہ ہے کہ تہجّد کی فضیلت' اس کی اہمیت اور اس کا مقام و مرتبہ تو ہمارے یہاں معروف اور مشہور ہے' کسی کو اس کی توفیق ملی ہو یا نہ ملی ہو' لیکن اس کی عظمت اور برکات سے ہر وہ مسلمان بخوبی واقف ہوگا جس کا تھوڑا بہت بھی دینی مزاج ہے۔ لیکن یہاں بھی ''بِہٖ'' پر اتنی توجہ نہیں ہوتی جتنی ہونی چاہیے۔ تہجد میں اہم ترین شے قیام' وہ بھی طویل قیام' اور اس میں ترتیل کے ساتھ تلاوتِ قرآن ہے:

یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُۙ۝۱ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًاۙ۝۲ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًاۙ۝۳ اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًاؕ۝ (المزّمل)

''اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو' مگر کم' آدھی رات' یا اس سے کم کرلو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔''

لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ اس کا اہتمام کرتے ہیں عموماً وہ عام نوافل کی طرح آٹھ رکعتیں پڑھ لیتے ہیں' پھر بیٹھ کر مختلف اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے ہیں اور زیادہ وقت اس میں صرف کرتے ہیں (الّا ماشاء اللہ)۔ یہ بھی بہت غنیمت ہے' لیکن اس کی برکات سے کماحقہٗ استفادہ تب ہوگا جب اِس میں طویل قیام ہو اور اس میں ترتیل کے ساتھ قرآنِ مجید کی تلاوت ہو۔

دوسری مثال سورۂ مریم کی ہے' جہاں فرمایا:

فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِیْنَ وَ تُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا۝

''پس یقیناً (اے نبیؐ!) اس کلام کو ہم نے تمہاری زبان میں آسان کر کے نازل کیا ہے' تاکہ تم اس (قرآن) کے ذریعے پرہیزگاروں کو خوشخبری دے دو اور ہٹ دھرم لوگوں کو اس کے ذریعے سے خبردار کرو۔''

یہاں بھی غور فرمایئے کہ تبشیر و انذار کے لیے قرآن مجید ہی کو ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ہوتا کیا ہے! یہ کہ ہمارے یہاں وعظوں اور خطبوں میں اکثر و بیشتر یہ کام اولیاء اللہ کے تذکروں یا مولانا رومؒ کی مثنوی سے لیا جاتا ہے۔ قرآن کی طرف بہت ہی کم توجّہ دی جاتی ہے۔ بعینہٖ یہی معاملہ زیرِ نظر آیتِ کریمہ کا ہے: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا

كَبِيْرًا﴾ معلوم ہوا کہ یہاں جس جہاد کا حکم دیا جا رہا ہے اس شدومد کے ساتھ' اس اہتمام کے ساتھ' اس تاکید و زور (emphasis) کے ساتھ' تو اس کے لیے ایک ذریعہ' ایک آلہ' ایک ہتھیار ہے جو جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو عطا ہوا ہے۔ اس کے لیے بھی ایک تلوار ہے جو آپؐ کے دستِ مبارک میں تھمائی گئی ہے اور وہ ہے قرآن حکیم۔ لہٰذا ارشاد ہوا: ''اور (اے نبیؐ!) ان (مشرکین و کفار) کے ساتھ جہاد کیجیے اس (قرآن) کے ذریعے سے بہت بڑا جہاد''۔

جہاد اور قرآن: دو مظلوم ترین حقیقتیں

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے قبل یہاں لفظ ''جہاد'' کی تھوڑی سی وضاحت کر دی جائے۔ پہلی بات یہ کہ میرے نزدیک جہاد ہمارے دین کا مظلوم ترین تصوّر (concept) ہے۔ مظلوم ہونے کے اعتبار سے اس کے ہم پلّہ دوسری شے جو آتی ہے وہ قرآن ہے۔ ہمارے دین کی یہ دو مظلوم ترین حقیقتیں ہیں۔ جہاد کے بارے میں اتنے مغالطے ذہنوں میں ہیں کہ حد و شمار نہیں۔ پھر خاص طور پر ہماری تاریخ میں ایک دور وہ بھی آیا کہ جب ہم براہِ راست محکوم ہوئے' نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ ذہنی و فکری اعتبار سے بھی۔ یعنی ہم دوطرفہ غلامی کے پنجے میں گرفتار ہوئے۔ اُس وقت اہلِ مغرب کی طرف سے ہم پر جہاد کے حوالے سے بڑے جارحانہ حملے ہوئے اور استہزاء و تمسخر کا معاملہ ہوا۔ انہی کا یہ الزام ہے کہ: ع ''بُوئے خوں آتی ہے اِس قوم کے افسانوں سے!'' چنانچہ اس ضمن میں ہمارا انداز معذرت خواہانہ (apologetic) رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگرچہ اب یہ دَور اصلاً گزر چکا ہے' لیکن تاحال اس کے باقیات السیّئات کچھ لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں' اور جب تک ہم اُن کو اچھی طرح کُھرچ نہیں دیں گے اُس وقت تک دین کی کوئی مثبت' پائیدار اور فعّال تحریک جو نتیجہ خیز بھی ہو' اٹھانا ممکن نہیں ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ جہاد کے بارے میں سب سے پہلا مغالطہ ذہنوں میں یہ بٹھا دیا گیا اور اس کے نتائج بہت دُوررس ہیں کہ جہاد کے معنی ''جنگ'' ہیں۔ اس بارے میں میری رائے ہے کہ اغیار اور بیگانوں کی کارستانی کے ساتھ ساتھ یگانوں اور اپنوں کی بھی

غلطیاں ہیں۔ اپنوں کی بڑی اکثریت نے بھی جہاد کو ''جنگ'' ہی قرار دیا جب کہ قرآن مجید مستقل طور پر دو اصطلاحات استعمال کرتا ہے' ایک ''جہاد فی سبیل اللہ'' اور دوسری ''قتال فی سبیل اللہ''۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر و بیشتر ہمارے دینی لٹریچر میں جنگ کے تمام مدارج و مراحل کے لیے بطورِ عنوان لفظ جہاد استعمال ہو جاتا ہے اور جنگ کو ''جہاد'' ہی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہوتے ہوتے ہمارے ذہنوں میں جہاد اور قتال مترادف کی حیثیت سے جاگزیں ہو گئے اور عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ جہاد کے معنی جنگ ہیں۔

تیسری بات یہ کہ ظاہر ہے جنگ ہر وقت اور ہمیشہ تو نہیں ہوتی' لہٰذا جہاد فرضِ کفایہ رہ گیا اور فرضِ عین کی فہرست سے خارج ہو گیا۔ جب کبھی جنگ کا مرحلہ آتا تھا تو جتنی نفری کی ضرورت ہوتی تھی وہ نکل آتی تو بقیہ لوگوں کی طرف سے وہ فرض ادا ہو جاتا تھا۔ یہی فرضِ کفایہ کا تصوّر ہے اور بالکل صحیح تصوّر ہے۔ لیکن جہاد و قتال کو مترادف سمجھ لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے یہاں جو فقہی تصورات و معیارات اور سوچ کے جو پیمانے ہیں ان میں جہاد گویا صفِ اوّل کی شے رہا ہی نہیں۔ اس کا فرضِ عین ہونا پس منظر میں چلا گیا' حتیٰ کہ ذہنوں سے اوجھل اور محو ہو گیا۔ الاّ ماشاء اللہ!

چوتھی بات یہ کہ اس پر ستم بالائے ستم اور بناء الفاسد علی الفاسد یہ ہوا کہ ہم نے یہ تصور کر لیا کہ مسلمان جب بھی جنگ کرے تو گویا وہ جہاد فی سبیل اللہ کر رہا ہے۔ حالانکہ ایک مسلمان ذاتی حیثیت سے جہاں فاجر و فاسق ہو سکتا ہے وہاں ظالم بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کا کوئی بادشاہ یا کوئی سربراہ یا کوئی گروہ ظالم بھی ہو سکتا ہے اور ایک ناحق جنگ بھی شروع کر سکتا ہے' صرف اپنے مفادات کے لیے' صرف اپنے اقتدار کو وسعت دینے کے لیے' اپنی حدودِ سلطنت کی توسیع کے لیے' جبکہ اُن کے پیشِ نظر دین کی کوئی خدمت نہ ہو' اعلائے کلمۃ اللہ کا کوئی مقصد نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی جنگ جہاد یا قتال فی سبیل اللہ کیونکر شمار ہو جائے گی' جبکہ ہمارے سامنے نبی اکرم ﷺ کی یہ واضح حدیث موجود ہے:

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: الرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلذِّکْرِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ

لِيُرٰى مَكَانُهٗ فَمَنْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ؟ قَالَ : ((مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) (۱)

حضرت ابوموسیٰ ؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک شخص آیا' اس نے دریافت کیا کہ حضور! ایک شخص جنگ کرتا ہے مالِ غنیمت کے لیے' ایک شخص جنگ کرتا ہے اپنے ذکر اور شہرت کے لیے اور ایک شخص جنگ کرتا ہے اپنی (یا اپنے قبیلہ کی) سربلندی دیکھنے کے لیے' تو کس کی جنگ اللہ کے راستے میں ہوگی؟ حضورؐ نے (جواب میں) ارشاد فرمایا: ''صرف اس کی جنگ فی سبیل اللہ ہوگی جو اس لیے جنگ کرے تاکہ اللہ کا کلمہ سب سے بلند ہو جائے۔''

خیال رہے کہ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ تو قتال فی سبیل اللہ وہ جنگ ہے جو اللہ کے جھنڈے کی سربلندی کے لیے کی جائے' نہ کہ ہر مسلمان کی یا مسلمانوں کی حکومت کی ہر نوع کی جنگ جہاد و قتال فی سبیل اللہ قرار دی جائے گی۔ بہرحال یہ ہیں وہ مغالطے جو کچھ تو اغیار کی کرم فرمائی سے اور کچھ اپنوں کی ستم ظریفی سے تہہ در تہہ ذہنوں میں بیٹھ گئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس تصوّر کو نکھار کر سامنے لایا جائے کہ جہاد فی سبیل اللہ درحقیقت ہے کیا' اور جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ میں فرق کیا ہے!

میں نے اس پر بہت غور کیا کہ ایک عام اردو دان کے لیے وہ لفظ کون سا ہوگا جو لفظ جہاد کے مفہوم کو صحیح صحیح ادا کر دے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ لفظ جہاد بابِ مفاعلہ سے ہے اور باب مفاعلہ کے اکثر مصادر میں فریقین کی شرکت ہوتی ہے۔ پھر ایک دوسرے پر غالب آنے کا مفہوم بھی اس میں شامل ہوتا ہے' جیسے بحث سے مباحثہ' جُہد سے مجاہدہ اور جہاد' اور قتل سے مقاتلہ اور قتال۔ قتال میں بات دوطرفہ ہو جاتی ہے جبکہ قتل یک طرفہ عمل ہے۔ کوئی شخص جا رہا ہے' کسی نے گولی مار دی یا خنجر گھونپ دیا درآنحالیکہ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ یہ حادثہ ہو جائے گا' یہ قتل ہے۔ لیکن جب دو فریق آمنے سامنے ہو کر ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے ہو جائیں تو یہ ان فریقین کے مابین

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب من قاتل لتکون کلمة الله هی العلیا۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب من قاتل لتکون کلمة الله هی العلیا ......

قتال یا مقاتلہ ہے۔ اسی طرح جُہد کا عمل ہے۔ یہ عام فہم لفظ ہے اور اردو میں کوشش کے معنی میں مستعمل ہے۔ اس سے جہاد و مجاہدہ کے معنی و مفہوم ہوں گے کوششوں کا تصادم' کوششوں کا ٹکراؤ' کوششوں کا مقابلہ ـــــ جس کے لیے ایک لفظ ہو گا ''کشمکش'' یا ''کشاکش''۔ انگریزی میں اسے کہیں گے struggle:۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ اس کے بعد صلہ (preposition) کے طور پر against کا لفظ آتا ہے۔ یعنی کوئی رکاوٹ ہے' کوئی چیز درمیان میں راستہ روکنے والی ہے تو اسے ہٹانے اور دُور کرنے کے لیے اس سے کشمکش کرنا۔ درحقیقت جہاد یا مجاہدہ کا صحیح صحیح لغوی مفہوم یہی ہے۔

فرائضِ دینی اور جہاد کی منازل

میں اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے اپنے غور و فکر کے نتائج پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس مسئلہ پر غور و فکر کے نتیجے میں جہاد کے تین بڑے بڑے درجے اور ہر درجہ کے تین پہلو یا تین قسمیں میرے سامنے آئی ہیں ـــــ میں ان کو اہلِ علم کے سامنے ان کی تائید و توثیق یا اصلاح کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ میں قرآن مجید کا ادنیٰ طالب علم ہوں' مجھے اہلِ علم کی رہنمائی حاصل ہونے پر دلی مسرت ہوگی۔ میں خلوصِ دل سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مجھ پر میری غلطی واضح کر دی جائے تو میں سرِ تسلیم خم کرنے میں ایک لمحہ کے لیے بھی تردّد نہیں کروں گا' بلکہ غلطی کی نشاندہی کرنے والے صاحب کا صمیمِ قلب سے احسان مند ہوں گا۔

میرے نزدیک یہ تین بڑے بڑے درجے ان بنیادی فرائض سے متعلق ہیں جو ہمارا دین اپنے ماننے والوں پر عائد کرتا ہے۔ دین کی طرف سے ہر مسلمان پر جو تین بنیادی فرائض عائد ہوتے ہیں ان کی بنیادی تفہیم کے لیے ایک تین منزلہ عمارت کی تمثیل یا تشبیہہ بہت ہی مفید ہے۔

پہلی منزل: عبادتِ ربّ

فرائض دینی کی پہلی منزل ہے خود اللہ کا بندہ بننا۔ اور یہ بندگی ہمہ وجوہ' ہمہ تن اور

ہمہ وقت ہوگی' جزوی نہیں ہوگی۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً (البقرة:۲۰۸)

''اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

وَاَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (الزمر)

''اور اپنے ربّ کی طرف رجوع کرو اور اس کی فرمانبرداری قبول کرلو (اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کردو) اس سے پہلے پہلے کہ تم پر عذاب آ جائے' پھر تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔''

اس رویّہ کا دینی اصطلاح میں نام ہے اسلام' سرِ تسلیم خم کرنا' گردن نہادن' to surrender۔ اسی کے لیے مزید دو اصطلاحات ہیں: اطاعت اور تقویٰ۔ اطاعت کا مفہوم ہے مقاومت و مدافعت ترک کر کے برضا و خوشی فرمانبرداری قبول کر لینا' جس کے لیے قرآن مجید میں بار بار حکم دیا گیا: ﴿اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ ''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی''۔ اسے انگریزی میں یوں کہیں گے:

"To give up all kinds of resistance whole heartedly."

یعنی ''خوش دلی سے ہر نوع کی مقاومت و مزاحمت ترک کر دینا۔''

جبکہ ''تقویٰ'' کا مفہوم ہے اللہ کے احکام کو توڑنے سے بچنا' اس کی نافرمانی سے باز رہنا۔ تقویٰ کا حکم قرآن مجید میں بڑی تکرار اور تاکید سے آیا ہے۔ اس ضمن میں چوٹی کی آیت ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ

(آل عمران)

''اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے اور تم پر موت نہ آئے مگر حالتِ فرمانبرداری میں۔''

اطاعت اور تقویٰ میں بالترتیب مثبت اور منفی رویّہ سامنے آتا ہے۔ بات ایک ہی ہے۔ گویا ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔

اس پہلی منزل کے لیے چوتھی اور آخری جامع ترین اصطلاح ہے ''عبادت''۔ اس میں اسلام' اطاعت اور تقویٰ کے تمام مفاہیم آ جاتے ہیں۔ اس لفظِ عبادت کے سمجھنے کے لیے فارسی کے دو الفاظ کو جو اردو میں مستعمل ہیں' جمع کریں گے تو مفہوم ذہن نشین ہو جائے گا۔ وہ الفاظ ہیں ''بندگی'' اور ''پرستش''۔ بندگی غلامی کو کہتے ہیں اور اس میں اطاعت کا پہلو غالب ہے' جبکہ پرستش کے معنی ہیں مخلصانہ اور والہانہ محبت۔ سورۃ الزمر میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝۲﴾ ''پس (اے نبیؐ!) اللہ کی بندگی کیجیے اس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے''۔ پھر سورۃ البیّنۃ میں ان دونوں کو نہایت حسین وجمیل اسلوبِ بیان میں بایں طور جمع کر دیا گیا: ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ......﴾ (آیت ۵) ''اور اُن کو اِس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین (اطاعت) کو اس (اللہ تعالیٰ) کے لیے خالص کرتے ہوئے' بالکل یکسو ہو کر''۔ قرآن مجید میں جن و اِنس کی تخلیق کی غایت یہی عبادتِ ربّ قرار دی گئی ہے' از روئے آیت مبارکہ: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝۵۶﴾ (الذّٰریٰت) ''میں نے جنوں اور انسانوں کو فقط اپنی بندگی کے لیے تخلیق کیا ہے''۔

فرائض دینی کی اس پہلی منزل کو سَر کرنے کے لیے ایک بندۂ مؤمن کو سہ گونہ جہاد کرنا پڑے گا' یعنی مجاہدہ و کشمکش کرنی پڑے گی۔

پہلی منزل کے تین جہاد

اس پہلی منزل پر سب سے پہلے کشمکش کرنی پڑے گی اپنے نفس سے۔ نفس کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف: ۵۳) ''یقیناً نفس تو بدی پر اُکساتا ہی ہے''۔ ''اَمَّارَۃ'' اَمر سے مبالغہ کا صیغہ ہے' یعنی بہت ہی زیادہ اُکسانے والا' نہایت سختی سے حکم دینے والا۔ لہٰذا اللہ کا بندہ بننے کے لیے پہلی کشمکش خود اپنے نفس کے ساتھ کرنی پڑے گی۔ ایک حدیث میں نفس کے خلاف جہاد کو ایک اعتبار سے ''افضل الجہاد'' قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول

اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَفْضَلُ الْجِهَادِ اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ وَهَوَاكَ فِيْ ذَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى))(۱) ''افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو اللہ کا مطیع بنانے کے لیے ان کے خلاف جہاد کرو''۔ حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ((اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ))(۲) ''اصل مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے''۔ پس پہلی کشمکش ہر اُس شخص کو اپنے نفس سے کرنا ہوگی جو واقعتاً اللہ کا بندہ بننا چاہتا ہے۔ اسی نفس کے متعلق مولانا رومؒ نے کیا خوب بات کہی ہے:

نفسِ ما ہم کمتر از فرعون نیست
لیکن اُو را عون ایں را عون نیست!

یعنی میرا یہ نفس بھی فرعون سے کم نہیں ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ فرعون کے پاس لاؤلشکر تھا لیکن اس کے پاس لاؤلشکر نہیں ہے' ورنہ میرا نفس اندر سے وہی کچھ دعویٰ کر رہا ہے جو فرعون نے کیا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا ملکِ مصر کے بارے میں: ﴿اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ﴾ (الزخرف:۵۱) ''کیا مصر کی بادشاہت میری نہیں ہے؟'' اسی طرح میرا نفس میرے وجود پر حکومت کا دعوے دار ہے۔ پس سب سے پہلا اور سب سے بڑا جہاد ''مجاہدہ مع النفس'' ہے۔ جس نے اس منزل کو سر نہیں کیا اور وہ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے تو میرے نزدیک اس کے لیے ہلکے سے ہلکا لفظ ''حماقت'' ہے۔

نفس امارہ کو تقویت دینے کے لیے ایک طاقت موجود ہے' وہ ہے شیطانِ لعین اور اس کی صُلبی و معنوی ذریت۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ اِس نفس کو تقویت پہنچائے' اس میں پھونکیں مارے اور اس میں جتنے بھی سفلی محرکات ہیں انہیں مشتعل کرے۔ ایک حدیث کی ابتدا میں الفاظ آتے ہیں:

((اِنَّ اِبْلِيْسَ لَهٗ خُرْطُوْمٌ كَخُرْطُوْمِ الْكَلْبِ وَاضِعُهٗ عَلٰى قَلْبِ ابْنِ آدَمَ

---

(۱) رواہ الدیلمی' بحوالہ کنز العمال ۲۶۹/۴۔

(۲) سنن الترمذی' ابواب فضائل الجہاد۔

يُذَكِّرُهُ بِالشَّهَوَاتِ وَاللَّذَّاتِ وَيَأْتِيهِ بِالْاَمَانِيِّ وَيَأْتِيهِ بِالْوَسْوَسَةِ عَلٰى قَلْبِهٖ لِيُشَكِّكَهُ فِيْ رَبِّهٖ))(۱)

''ابلیس کی بھی تھوتھنی ہے کُتّے کی تھوتھنی کی طرح۔ وہ اسے ابنِ آدم کے دل پر رکھ دیتا ہے اور اسے خواہشاتِ نفس اور مرغوب چیزوں پر اُبھارتا ہے' وہ اس کو لمبی لمبی امیدیں (wishful thinkings) دلاتا اور اس کے دل میں وسوسے پیدا کرتا ہے' تاکہ اسے اپنے ربّ کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا کردے۔''

ایک اور متفق علیہ حدیث ہے:

((اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَجْرِيْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ))(۲)

''شیطان انسان کے اندر خون کی مانند دوڑتا ہے۔''

قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے بے شمار مقامات پر شیطان کے اغوا اور فریب سے خبردار اور متنبہ کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر فرمایا: ﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ﴾ (فاطر:۶) ''(لوگو!) یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے' پس تم بھی اسے دشمن سمجھو (دشمن جانو)''۔ اور سورۃ الکہف میں بڑا پیارا انداز ہے' جس میں ایک لطیف سا طنز بھی موجود ہے۔ فرمایا:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝

''اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ

(۱) رفع البأس عن حديث النفس للشوكاني' ح:۴۰' راوی : معاذ بن جبل ﷛۔

(۲) صحیح البخاری' كتاب الاعتكاف' باب زيارة المرأة زوجها فی اعتكافه۔ اس کے علاوہ صحیح بخاری میں یہ حدیث متعدد مقامات پر الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ متعدد طرق سے وارد ہوئی ہے۔ وصحيح مسلم' كتاب السلام' باب بيان انه يستحب لمن رؤى خاليا بامرأة وكانت زوجته او محرما له ان يقول : هذه فلانة ' ليدفع ظن السوء به۔ وسنن ابی داوٗد'كتاب الصيام' باب المعتكف يدخل البيت لحاجته۔

کیا سوائے ابلیس کے۔ وہ جِنّوں میں سے تھا' سو اُس نے اپنے ربّ کے حکم
سے روگردانی کی۔ کیا تم مجھے چھوڑ کر اس کو اور اس کی ذُرّیت (صلبی ومعنوی)
کو اپنا دوست بناتے ہو؟ حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔ ایسے ظالموں کے لیے
بہت ہی برا بدلہ ہے۔''

چنانچہ کشمکش کرنا ہوگی' مجاہدہ کرنا ہوگا شیطان اور اس کی صُلبی ومعنوی ذُرّیت کے ساتھ اور اس کو شکست دینا ہوگی۔ اس لفظ ''شکست'' سے میرا ذہن اچانک علامہ اقبال کے فارسی کلام میں اُن کی نظم ''نالہ ابلیس'' کی طرف منتقل ہوا جو مجھے بہت پسند ہے۔ شیطان اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتا ہے کہ پروردگار! یہ انسان تو میری چوٹ کا نہیں' میرے مقابلے کا نہیں' ایک مُشتِ خس ہے جس کے لیے میری ایک چنگاری کافی ہے۔ اس انسان کو اگر سوکھی گھاس ہی بنانا تھا تو مجھ میں اس قدر تیز و تند آگ رکھنے کا کیا فائدہ ہوا!

ابنِ آدم چیست؟ یک مُشتِ خس است! مُشتِ خس را یک شرار از من بس است
اندریں عالم اگر جز خس نبود ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود؟

نظم کا آخری شعر تڑپا دینے والا ہے۔

اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست لذّتے شاید کہ یابم در شکست!

''الٰہی! کوئی تو زندہ مردِ حق پرست ایسا ہو جو مجھے شکست دے دے' تا کہ میں
بھی تو کبھی شکست کا لذت آشنا ہوسکوں۔''

تو دوسری کشمکش اور دوسرا مجاہدہ یہ ہوگا۔

تیسری کشمکش ایک بگڑے ہوئے معاشرے کا جو سماجی دباؤ (social pressure) ہے' اس سے ہوگی۔ معاشرے کا دباؤ آپ کو ایک خاص رُخ پر دھکیلے گا۔ اس لیے کہ ایک ہجوم جس سمت میں جا رہا ہو اُس سمت میں چلنا بہت آسان ہے۔ آپ کو کوئی زور نہیں لگانا پڑے گا' وہ آپ کو خود دھکیل کر لے جائے گا۔ ع

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز!

''زمانہ تمہارے ساتھ موافقت نہیں کرتا تو تم اس کے ساتھ موافقت کرلو!''

اس طرح کوئی تصادم نہیں ہوگا' کوئی کشمکش نہیں ہوگی' کوئی مزاحمت نہیں ہوگی۔ دُنیوی

نقطۂ نظر سے عافیت اسی میں ہے' چین اور سکون سے زندگی بسر ہو گی کہ زمانہ تم سے موافقت نہیں کر رہا تو تم زمانے کے ساتھ موافقت کر لو۔ لیکن غیرت وحمیت کا تقاضا بالکل برعکس ہے۔ ع

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز!

''زمانہ تم سے موافقت نہیں کرتا تو تم اس سے لڑو!''

پس دینی فرائض کی پہلی منزل پر تین اطراف وجوانب میں یہ تین کشمکشیں ہیں جو ہر اُس شخص کو کرنی ہوں گی جو واقعۃً اللہ کا بندہ بننے کا ارادہ اور عزم رکھتا ہو۔

دوسری منزل: شہادت علی الناس

فرائض دینی کی دوسری منزل ہے اس دین کو عام کرنا' دوسروں تک پہنچانا' اسے پھیلانا۔ اس کے لیے چار اصطلاحات اہم ہیں۔ پہلی دو اصطلاحات ہیں: ''تبلیغ'' اور ''دعوت''۔ یہ بھی اطاعت وتقویٰ کی طرح تصویر کے دو رُخ اور مثبت ومنفی مفہوم کے حامل الفاظ ہیں۔ تبلیغ سے مراد پہنچانا اور دعوت سے مراد لوگوں کو کھینچ کر راہِ حق پر لے آنا ہے۔ یہ بھی ایک ہی عمل کے دو رُخ ہیں۔ تبلیغ کے لیے نبی اکرمﷺ کو یہ تاکیدی حکم ہوا:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ (المائدۃ:٦٧)

''اے رسول (ﷺ)! پہنچایئے جو آپ کی طرف آپ کے ربّ کی جانب سے نازل ہوا ہے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو (گویا) اپنی رسالت کا حق ادا نہ کیا۔''

نبی اکرمﷺ نے حجۃ الوداع میں اُمّت کو جو آخری تاکیدی حکم دیا وہ اسی تبلیغ کا تھا۔ فرمایا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ))(۱) ''پس جو موجود ہے (مخاطب ہے) اسے چاہیے کہ (یہ پیغام) اس کو پہنچائے جو یہاں موجود نہیں ہے!'' مزید برآں آنحضورﷺ نے یہ فرما کر ہر مسلمان کے لیے فریضۂ تبلیغ آسان ترین فرما دیا: ((بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ

(۱) صحیح البخاری' کتاب الحج' باب الخطبہ ایام منی۔ وصحیح مسلم' کتاب القسامۃ والمحاربین والقصاص والدیات' باب تغلیظ تحریم الدماء والاعراض والاموال۔

آیَةً))(۱) ''میری طرف سے پہنچاؤ چاہے ایک آیت ہی کیوں نہ ہو''۔ دعوت کے لیے
نبی اکرم ﷺ کو تاکیدی حکم ہوا:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ط (النحل:۱۲۵)

''(اے نبیؐ!) اپنے ربّ کے راستے کی طرف بلایئے حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان (کفار و مشرکین) کے ساتھ مجادلہ کیجیے احسن طریقے سے۔''

یہ بڑی مہتم بالشان آیت ہے' اس پر میں بعد میں کچھ عرض کروں گا۔ یہاں اتنا سمجھ لیجیے کہ اس آیت میں دعوت کی تین سطحیں (levels) بیان ہوئی ہیں۔

دعوت کے ضمن میں ایک مزید اٹل اور رہنما اصول اس آیت مبارکہ میں بیان کر دیا گیا:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (حٰمٓ السجدۃ)

''اور اُس سے بڑھ کر اچھی بات کس کی ہوسکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے یقیناً میں خود بھی فرمانبرداروں (مسلمانوں) میں سے ہوں!''

یعنی دعوت اللہ کی طرف ہو' اس کے ساتھ ہی داعی کی سیرت و کردار عملِ صالح کا مظہر ہو۔ مزید برآں وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھے' مسلمان کہلائے۔ اس کی دعوت کسی فقہی مسلک کی طرف نہ ہو اور نہ ہی اس کا لیبل چسپاں ہو۔ جو شخص اللہ کی طرف دعوت دے اس سے بہتر بات اور کسی کی نہیں ہوسکتی۔

اسی دوسری منزل کے لیے دو اصطلاحات مزید ہیں جو بڑی اہم ہیں' لیکن ان کا ادراک و شعور قریباً معدوم کے درجے میں آ گیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں' الا ماشاء اللہ' چند ہی لوگ ہوں گے جو اِن کی اہمیت کو سمجھتے ہوں گے اور ان پر عمل کرتے ہوں گے۔ ان میں تیسری اصطلاح ہے: ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر''' یعنی نیکیوں کا پرچار'

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔ وسنن الترمذی' ابواب العلم' باب ما جاء فی الحدیث عن بنی اسرائیل۔

نقطۂ نظر سے عافیت اسی میں ہے' چین اور سکون سے زندگی بسر ہو گی کہ زمانہ تم سے موافقت نہیں کر رہا تو تم زمانے کے ساتھ موافقت کر لو۔ لیکن غیرت وحمیت کا تقاضا بالکل برعکس ہے۔ ع

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز!

''زمانہ تم سے موافقت نہیں کرتا تو تم اس سے لڑو!''

پس دینی فرائض کی پہلی منزل پر تین اطراف و جوانب میں یہ تین کشمکشیں ہیں جو ہر اُس شخص کو کرنی ہوں گی جو واقعۃً اللہ کا بندہ بننے کا ارادہ اور عزم رکھتا ہو۔

دوسری منزل: شہادت علی الناس

فرائض دینی کی دوسری منزل ہے اس دین کو عام کرنا' دوسروں تک پہنچانا' اسے پھیلانا۔ اس کے لیے چار اصطلاحات اہم ہیں۔ پہلی دو اصطلاحات ہیں: ''تبلیغ'' اور ''دعوت''۔ یہ بھی اطاعت وتقویٰ کی طرح تصویر کے دو رُخ اور مثبت و منفی مفہوم کے حامل الفاظ ہیں۔ تبلیغ سے مراد پہنچانا اور دعوت سے مراد لوگوں کو کھینچ کر راہِ حق پر لے آنا ہے۔ یہ بھی ایک ہی عمل کے دو رُخ ہیں۔ تبلیغ کے لیے نبی اکرم ﷺ کو یہ تاکیدی حکم ہوا:

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ‌ؕ وَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسٰلَـتَهٗ‌ؕ (المائدۃ:٦٧)

''اے رسول (ﷺ)! پہنچایئے جو آپ کی طرف آپ کے ربّ کی جانب سے نازل ہوا ہے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو (گویا) اپنی رسالت کا حق ادا نہ کیا۔''

نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں اُمّت کو جو آخری تاکیدی حکم دیا وہ اسی تبلیغ کا تھا۔ فرمایا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ))(۱) ''پس جو موجود ہے (مخاطب ہے) اسے چاہیے کہ (یہ پیغام) اس کو پہنچائے جو یہاں موجود نہیں ہے!'' مزید برآں آنحضور ﷺ نے یہ فرما کر ہر مسلمان کے لیے فریضۂ تبلیغ آسان ترین فرما دیا: ((بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ

(۱) صحیح البخاری' کتاب الحج' باب الخطبہ ایام منی۔ وصحیح مسلم' کتاب القسامۃ والمحاربین والقصاص والدیات' باب تغلیظ تحریم الدماء والاعراض والاموال۔

آيَةً))(۱) ’’میری طرف سے پہنچاؤ چاہے ایک آیت ہی کیوں نہ ہو‘‘۔ دعوت کے لیے نبی اکرم ﷺ کو تاکیدی حکم ہوا:

اُدْعُ اِلٰی سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ (النحل:۱۲۵)

’’(اے نبیؐ!) اپنے ربّ کے راستے کی طرف بلایئے حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان (کفار و مشرکین) کے ساتھ مجادلہ کیجیے احسن طریقے سے۔‘‘

یہ بڑی مہتم بالشان آیت ہے‘ اس پر میں بعد میں کچھ عرض کروں گا۔ یہاں اتنا سمجھ لیجیے کہ اس آیت میں دعوت کی تین سطحیں (levels) بیان ہوئی ہیں۔

دعوت کے ضمن میں ایک مزید اٹل اور رہنما اصول اس آیت مبارکہ میں بیان کر دیا گیا:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (حٰمٓ السجدۃ)

’’اور اُس سے بڑھ کر اچھی بات کس کی ہوسکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے یقیناً میں خود بھی فرمانبرداروں (مسلمانوں) میں سے ہوں!‘‘

یعنی دعوت اللہ کی طرف ہو‘ اس کے ساتھ ہی داعی کی سیرت و کردار عملِ صالح کا مظہر ہو۔ مزید برآں وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھے‘ مسلمان کہلائے۔ اس کی دعوت کسی فقہی مسلک کی طرف نہ ہو اور نہ ہی اس کا لیبل چسپاں ہو۔ جو شخص اللہ کی طرف دعوت دے اس سے بہتر بات اور کسی کی نہیں ہوسکتی۔

اسی دوسری منزل کے لیے دو اصطلاحات مزید ہیں جو بڑی اہم ہیں‘ لیکن ان کا ادراک و شعور قریباً معدوم کے درجے میں آ گیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں‘ الا ماشاء اللہ‘ چند ہی لوگ ہوں گے جو اِن کی اہمیت کو سمجھتے ہوں گے اور ان پر عمل کرتے ہوں گے۔ ان میں تیسری اصطلاح ہے: ’’امر بالمعروف و نہی عن المنکر‘‘ یعنی نیکیوں کا پرچار‘

---

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب احادیث الانبیاء‘ باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔ وسنن الترمذی‘ ابواب العلم‘ باب ما جاء فی الحدیث عن بنی اسرائیل۔

اُن کی تلقین، اُن کا حکم اور برائیوں سے، بدی سے لوگوں کو روکنا، بدی اور برائی کے راستہ میں آڑے آنا۔ ہماری ایک دینی تحریک میں امر بالمعروف پر ایک درجہ میں عمل بھی ہو رہا ہے تو اس میں نہی عن المنکر سے صرفِ نظر ہے۔ حالانکہ حدیث شریف میں نہی عن المنکر پر زیادہ زور اور تاکید ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) (۱)

''(اے مسلمانو!) تم میں سے جو کوئی کسی منکر کو دیکھے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ (یعنی طاقت) سے روکے، اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے (یعنی نصیحت و تلقین کرے) اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو (کم از کم) دل میں اسے برا جانے (اس پر کڑھے اور پیچ و تاب کھائے) اور یہ کمزور ترین ایمان (کی نشانی) ہے۔''

ہمارے اس دَور کے لحاظ سے مسلم شریف کی ایک اور حدیث بہت اہم اور قابلِ التفات ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا مِنْ نَبِیٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِیْ اُمَّةٍ قَبْلِیْ اِلاَّ کَانَ لَهٗ فِیْ اُمَّتِهٖ حَوَارِیُّوْنَ وَاَصْحَابٌ یَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَیَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ، ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ وَیَفْعَلُوْنَ مَالَا یُؤْمَرُوْنَ، فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِیَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَیْسَ وَرَآءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ)) (۲)

''مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا، اس کی امت میں اس کے ایسے حواری اور ساتھی ہوا کرتے تھے جو اس نبی کی سنّت پر عمل کرتے تھے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ پھر اُن حواریّین کے بعد ایسے نالائق جانشین آ جاتے تھے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور ایسے کام کیا کرتے تھے جن کا

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النهی عن المنکر من الایمان (۲) حوالہ سابقہ

انہیں (اللہ کی طرف سے) حکم نہیں ہوا کرتا تھا۔ تو ایسے لوگوں سے جو ہاتھ سے جہاد کرے تو وہ مؤمن ہے' اور جو زبان سے جہاد کرے تو وہ بھی مؤمن ہے' اور جو دل سے جہاد کرے تو وہ بھی مؤمن ہے' اور اس کے ورے تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔''

یہ ہے ہمارے دین میں نہی عن المنکر کی اہمیت۔

اس دوسری منزل کے لیے چوتھی جامع ترین اصطلاح ہے ''شہادت علی الناس''۔ جیسے پہلی منزل کے لیے جامع ترین اصطلاح میں نے ''عبادت'' بیان کی تھی' دوسری منزل کے لیے ''شہادت علی الناس'' جامع ترین اصطلاح ہے۔ جناب محمد ﷺ آخری نبی اور آخری رسول ہیں۔ لہٰذا آپؐ کی اُمت بھی آخری اُمت ہے۔ یہ اُمت اس لیے برپا کی گئی ہے کہ تا قیامِ قیامت نوعِ انسانی پر اپنے قول وعمل سے حق کی شہادت دے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط (البقرۃ:۱۴۳)

''اور اس طرح (اے مسلمانو!) ہم نے تمہیں بہترین اُمت بنایا ہے تاکہ تم نوعِ انسانی پر گواہ ہو جاؤ اور رسول تم پر گواہ ہو جائیں۔''

سورۃ الحج کی آخری آیت اس موضوع پر بڑی عظیم آیت ہے۔ فرمایا:

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ط هُوَ اجْتَبٰىكُمْ

''اور جہاد کرو اللہ کے لیے جیسا کہ (اور جتنا کہ) اس کے لیے جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے (پسند کر لیا ہے' ایک خاص مقصد کے لیے تمہارا انتخاب ہو گیا ہے)۔''

درمیان میں ایک جملہ معترضہ ہے:

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ط مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ط هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا

اس کے بعد اُمت کے اجتباء (چُن لیے جانے) کا مقصد بایں الفاظ بیان ہوا:

لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

''تا کہ رسول تم پر گواہ ہوں اور تم پوری نوعِ انسانی کے لیے گواہ بن جاؤ۔''

یعنی لوگوں پر اپنے قول وعمل سے حق کی شہادت دے کر حجت قائم کرو تا کہ قیامت کے دن عدالتِ خداوندی میں گواہی دے سکو' testify کرسکو کہ پروردگار! ہم نے تیرا دین ان تک پہنچا دیا تھا۔ سورۃ البقرۃ کی آیت میں پہلے اُمت کا ذکر ہوا اور پھر رسولؐ کا' لیکن یہاں پہلے رسولؐ اور پھر اُمت کا ذکر ہے۔

شہادت علی الناس وہ اصطلاح ہے کہ یہاں آ کر اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا تعلق کارِ رسالت سے جڑ جاتا ہے۔ چونکہ آنحضور ﷺ آخری نبی اور آخری رسول ہیں لہٰذا یہ آپؐ کی ذمہ داری ہے کہ دعوت وتبلیغ کے ذریعے اور اپنے قول وعمل کی ہم آہنگی کی شہادت کے ذریعے ''دین الحق'' کو بالفعل قائم کرکے اس کی برکات کے ذریعے لوگوں پر حجت قائم کریں۔ اس شہادت کی اہمیت کا اندازہ سورۃ النساء کی اس آیت سے لگایئے' فرمایا:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿٤١﴾

(النساء)

''اس دن کیا حال ہوگا جس دن ہم ہر اُمت پر ایک گواہ کھڑا کریں گے' اور (اے نبیؐ!) ان سب پر آپؐ کو گواہ بنا کر لائیں گے!''

عدالتِ خداوندی میں رسولؐ دراصل استغاثہ کے گواہ ہوں گے' وہ کہیں گے اے پروردگار! میں نے تیرا پیغام اپنے قول وعمل سے شہادت دیتے ہوئے بنی نوعِ انسان تک پہنچا کر اُن پر حجت قائم کر دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد شہادت علی الناس کی یہ ذمہ داری اُمت کے کاندھوں پر ہے۔

شہادت علی الناس کی ذمہ داری کی نزاکت کو سمجھ لیجیے۔ اگر بالفرض رسولؐ اللہ تعالیٰ کا پیغام نہ پہنچاتے تو اللہ کے یہاں وہ مسئول ہوتے۔ انہوں نے پہنچا دیا تو وہ بری

ہو گئے۔اب لوگ جواب دہ ہوں گے (۱)۔ نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سوا لاکھ کے مجمع سے گواہی لے لی: ((اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ؟)) اور پورے مجمع نے بیک زبان ہو کر گواہی دی: قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ۔تین بار یہ سوال و جواب ہوئے۔اس کے بعد حضورؐ نے آسمان کی طرف' پھر مجمع کی طرف اپنی انگشتِ مبارک سے اشارہ کرتے ہوئے تین بار فرمایا: ((اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ)) ''اے اللہ تو گواہ رہنا! پھر حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا: ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ))'' —— اُمّت کا اِجتباء جہاں بہت بڑا اعزاز ہے وہاں بہت بڑی ذمہ داری بھی ہے۔اگر اُمّت نے اس شہادت علی النّاس کا فریضہ انجام نہیں دیا تو بنی نوعِ انسان کی گمراہی کے وبال سے عدالتِ خداوندی میں بچنا محال ہو جائے گا اور نبی اکرم ﷺ کی گواہی ہمارے خلاف ہو جائے گی۔

دعوت و تبلیغ کی تین سطحیں

اس تبلیغ و دعوت کی بھی تین سطحیں ہیں جن کو سمجھنا ضروری ہے' ورنہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس مغالطہ میں مبتلا رہیں کہ ہم تو تبلیغ کا حق ادا کر رہے ہیں' درآں حالیکہ وہ صورتِ تبلیغ ہو' حقیقی تبلیغ نہ ہو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ الحمد للہ اس دور میں ایک خاص سطح پر تبلیغ و دعوت کے لیے ایک بہت وسیع حرکت ہو چکی ہے۔اس کے حجم کا جہاں تک تعلق ہے وہ بڑا متاثر کن ہے اور ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد اس گلوب پر ہر وقت حرکت میں رہتے ہیں۔لیکن میں پوری ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ تبلیغ اور دعوت کے لیے اگر ہم نے قرآنی ہدایات کو اپنا امام نہ بنایا اور ان کے مطابق کام نہ کیا جا سکا تو مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہوں گے۔اس ضمن میں وہی دو آیات دوبارہ ملاحظہ کیجیے جو میں پہلے پیش کر چکا ہوں۔ پہلی آیت ہے:

---

(۱) یہی بات سورۃ الاعراف میں اس اسلوب سے بیان فرمائی گئی:

﴿فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْھِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ ۝﴾

''پس یہ لازماً ہو کر رہنا ہے' کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں جن کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور رسولوں سے بھی پوچھیں (کہ انہوں نے ہمارا پیغام پہنچا دیا تھا یا نہیں اور ان کو کیا جواب ملا)''۔ (جمیل الرحمٰن)

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ (المائدۃ:٦٧)

اس آیتِ مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کو جس تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے وہ قرآن مجید ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ﴾ ''تبلیغ کیجیے اس کی (یعنی قرآن کی) جو آپ پر اتارا گیا ہے آپ کے ربّ کی جانب سے''۔ پس تبلیغ کا اصل محور و مرکز قرآن مجید ہونا چاہیے۔ پھر حضور ﷺ کے ارشادِ مبارک نے ہر مسلمان کے لیے قرآن حکیم کی تبلیغ کے کام کو آسان بنا دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَةً)) ''پہنچاؤ میری جانب سے چاہے ایک ہی آیت پہنچاؤ''۔ یہاں ''عَنِّیْ'' کا لفظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ یہ لفظ یہاں جس معنی و مفہوم کا حامل ہے اسے انگریزی میں ادا کیا جائے تو وہ ہوگا ''on my behalf''۔ قرآن مجید کی تبلیغ کی اصلاً ذمہ داری ہے نبی اکرم ﷺ کی۔ چنانچہ اسی آیتِ مبارکہ کے اگلے حصہ میں فرمایا: ﴿وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ﴾ ''اور اگر آپ (ﷺ) نے بالفرض یہ کام نہیں کیا تو آپؐ نے تبلیغِ رسالت کا حق ادا نہ کیا''۔ میں نے ترجمہ میں لفظ ''بالفرض'' کا اضافہ اس لیے کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق ذرا سا یہ گمان کہ آپ قرآن حکیم کی تبلیغ میں کوتاہی فرمائیں گے' ایمان کے منافی ہو جائے گا۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ۔ یہ اسلوبِ بیان درحقیقت امّت کے انتباہ (warning) کے لیے اختیار فرمایا گیا ہے کہ کہیں وہ اس ذمہ داری سے غافل نہ ہو جائے جو پوری اُمّت پر بحیثیت کُل اور ہر مسلمان پر بحیثیتِ اُمّتیِ رسولؐ عائد ہوتی ہے۔

دوسری آیت جس کی تفصیل میں نے مؤخر کر دی تھی' اس کے حوالے سے دعوت کی تین سطحوں کا سمجھنا ضروری ہے۔ آیت مبارکہ ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ (النحل:١٢٥)

''(اے نبیؐ) دعوت دو اپنے ربّ کے راستہ کی طرف حکمت و دانائی کے ساتھ'

اور عمدہ وعظ ونصیحت کے ساتھ' اور (ہٹ دھرم' ضدی اور حجتی) لوگوں کے ساتھ
مجادلہ کرو اس طریق پر جو بہت ہی عمدہ ہو۔''

ہر دور اور ہر معاشرے میں آپ کو لوگوں کی تین سطحیں ملیں گی۔ ایک سب سے بلند سطح کے لوگ ہوتے ہیں' یعنی ذہین اقلیت (intellectual minority)۔ اسی کو intelligentsia بھی کہتے ہیں۔ یہی brain trust کہلاتا ہے۔ یہ طبقہ اگرچہ قلیل ترین اقلیت میں ہوتا ہے لیکن معاشرے میں مؤثر ترین ہوتا ہے اور معاشرے کا رُخ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جیسے انسان کے جسم میں دماغ ہے جو وزن کے لحاظ سے کم وبیش آدھ سیر کا ہو گا' لیکن یہ اس کے پورے وجود اور پورے تن وتوش کو کنٹرول کرتا ہے۔ ہاتھ پکڑ سکتا ہے' لیکن کس شے کو پکڑے' کس کو نہ پکڑے' اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا' اس کا فیصلہ دماغ کرتا ہے۔ ٹانگیں اسے لے کر چل سکتی ہیں' لیکن کس سمت میں چلیں' کس میں نہ چلیں' اس کا فیصلہ دماغ کرتا ہے۔ اسی طرح معاشرے کا رُخ درحقیقت یہی ذہین اقلیت متعین کرتی ہے۔ اس کو جب تک دعوت دینے کا تقاضا دلیل کے ساتھ' برہان کے ساتھ پورا نہیں کیا جائے گا' یہ طبقہ کوئی اثر قبول نہیں کرے گا۔ جیسے قرآن حکیم یہود کو کھلا چیلنج کرتا ہے:

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (البقرۃ)

''(اے نبیؐ! ان سے) کہہ دو کہ اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔''

اگر اس ذہین اقلیت کو اعلیٰ علمی وفکری سطح پر مدلّل طور پر آپ دین کی دعوت پیش نہیں کریں گے اور اسے by pass کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ ذہین اقلیت دین کے حق میں ہموار نہ ہو سکے گی۔ اگرچہ by pass دل کے آپریشن میں بہت مفید ہوتا ہے' لیکن اسلامی انقلابی عمل میں یہ طرزِ عمل بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اگر عوامی سطح پر بات پھیلتی چلی جارہی ہے لیکن ذہین اقلیت میں وہ بار نہیں پا رہی تو کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا' اجتماعی سطح پر کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ لہٰذا یہاں ہدایت آئی: ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ﴾ ''اے نبی! (لوگوں کو) حکمت کے ساتھ اپنے ربّ کے راستے کی طرف دعوت

دیجیے"۔اس حکمت کے ساتھ جس کے متعلق ایک مقام پر فرمایا:﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ط﴾ (البقرۃ:۲۶۹) ''اور جس کو حکمت و دانائی ملی' اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی (بہت خیر مل گیا)''۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ بعض لوگوں نے یہاں ''حکمت'' کو حکمتِ عملی کے معنی میں لے کر اس آیتِ مبارکہ کی بڑی حق تلفی کی ہے۔ حکمتِ عملی بالکل دوسری چیز ہے' اگرچہ وہ بھی یقیناً مطلوب شے ہے' لیکن یہاں جس شان کے ساتھ یہ لفظ آیا ہے' درحقیقت اس کا مفہوم حکمت عملی نہیں ہے' بلکہ دلائل و براہین کے ساتھ' دانائی کے ساتھ' اس دعوت کو پیش کرنا ہے۔اگر سوسائٹی کی ذہین اقلیت کو اِس وقت اور اس دَور کی اعلیٰ علمی و فکری سطح پر دعوت پیش نہ کی جا سکے تو معاشرہ بحیثیت مجموعی کبھی متأثر نہیں ہوسکتا۔

دعوت کی دوسری سطح ''عوامی'' ہے۔عوام کو دعوت عمدہ وعظ اور دل نشین نصیحت کے ذریعے دی جائے گی' کیونکہ انہیں کسی دلیل اور حجت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ان کے لیے ضرورت ہے موعظۂ حسنہ کی' وہی ان کے لیے کفایت کرے گی۔

اس سطح پر یہ بات نہایت اہم ہے کہ سننے والے یہ محسوس کریں کہ جو وعظ کر رہا ہے وہ ہم پر اپنی دین داری' علمیّت اور شخصیّت کی دھونس نہیں جمانا چاہتا' بلکہ وہ مخلص ہے اور ہماری خیرخواہی کے لیے بات کہہ رہا ہے۔اسے کسی دُنیوی اجر اور صلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ساتھ ہی انہیں یہ اعتماد ہو کہ وہ بہروپیا نہیں ہے' ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ والا معاملہ نہیں ہے' بلکہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے اپنی ذاتی اور نجی زندگی میں اس پر خود بھی عمل پیرا ہے۔یہ دو چیزیں جمع ہو جائیں' ایک موعظۂ حسنہ اور دوسرے واعظ کا اعلیٰ کردار تو معاملہ ہوگا: از دل خیزد بر دل ریزد' اور ع

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے!

یہ ہے عوامی سطح پر دعوت و تبلیغ۔ میں جانتا ہوں کہ اس دور میں اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کے ایک بڑے طبقے میں عام طور پر وعظ کو ایک گالی کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ بڑے ہی استحقار کے انداز میں کہا جاتا ہے ''اجی وعظ کہہ رہے ہیں''۔حالانکہ وعظ بڑی

عظیم اور مؤثّر شے ہے اور قرآنی اصطلاح ہے' لیکن اس کا ایک مقام اور محل ہے جہاں یہ تاثیر دکھاتا ہے۔ یہ عمل غیر موقع اور بے محل ہوگا تو غیر مؤثّر رہے گا۔ ظلم کا مطلب ہی یہ ہے: وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ مَحَلِّہٖ۔ یعنی "کسی چیز کو اپنے اصل مقام کی بجائے کسی اور جگہ رکھنا"۔ ان عوام کو آپ فلسفہ پڑھائیں گے تو حماقت ہوگی اور intellectuals کو آپ وعظ پلائیں گے تو یہ کام بھی غیر معقول ہوگا۔ ہر شے کو اپنی جگہ پر رکھنا ہی عدل ہے۔

تیسری سطح جو ہر معاشرے میں موجود ہوتی ہے' وہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو ہٹ دھرم ہوتے ہیں' جو کبھی مان کر نہیں دیتے' جن کے اپنے مفادات ہوتے ہیں' جن کی امدادِ باہمی کی انجمنیں بنی ہوتی ہیں' جن کے مفادات باطل نظام سے وابستہ ہوتے ہیں اور وہ اپنے مفادات کی وجہ سے کور چشم ہو چکے ہوتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات علیٰ وجہ البصیرت لوگوں کو گمراہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کے زہر کا تریاق فراہم نہ کیا جائے تو یہ عوام الناس کو گمراہ کرتے چلے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں مناظرہ کا فن وجود میں آیا۔ پھر اس نے باقاعدہ ایک خاص تکنیک اور تخصّص (specialization) کی شکل اختیار کی۔ موجودہ دور میں کچھ لوگوں نے اسے پیشہ ہی بنا لیا تو اس میں چند خرابیاں در آئیں۔ مثلاً مجمع عام ہے' داد مل رہی ہے' تحسین ہو رہی ہے' تالیاں بج رہی ہیں' نعرے لگ رہے ہیں۔ گویا اتنی بڑی جیوری (Jury) ہے جس کے سامنے دو پہلوان عقلی کشتی لڑ رہے ہیں۔ یہ مناظرہ اور مجادلہ کا احسن انداز نہیں۔ قرآن مجید جسے مجادلہ کہتا ہے وہ احسن طریق پر محکم دلائل اور برہان کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔

دعوت کی یہ تیسری سطح لازمی ہے۔ اگر یہ کام آپ نہیں کریں گے تو اغیار سے شکست کھا جائیں گے۔ کون نہیں جانتا کہ ہمارے معاشرے میں عیسائیت کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ ہم کنویں کے مینڈک کی طرح ایک ہی دائرے میں چکر لگاتے رہے اور فقہی تعبیرات' راجح و مرجوح' افضل و مفضول کے ردّ و قبول میں آپس میں ہی مناظرے اور دنگل جماتے رہے اور جما رہے ہیں' جبکہ اندر ہی اندر عیسائیت دیمک کی طرح ہمارے معاشرے کو کھاتی چلی جا رہی ہے۔ اسی طرح دعوتی سطح پر اس دور میں قادیانیت بہت

فعّال ہوگئی ہے[1] قادیانی مبلغین کا انداز بڑا جارحانہ ہوتا ہے اور ایک عام آدمی تو کجا اچھا بھلا پڑھا لکھا' بلکہ عالمِ دین بھی ان کے مناظرین و مبلغین کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ الّا ماشاء اللہ۔ ان قادیانی مناظرین و مبلغین کو جس طرح خاص موضوعات پر تربیت دی گئی ہے' اس کے ردّ اور ابطال کے لیے جب تک ہمارے ذہین و فطین لوگوں کو اسی طرح ٹریننگ نہ ملے یہ مسئلہ حل نہ ہوگا۔ ایک وقت میں جب یہاں انگریزی حکومت کی سرپرستی میں بڑے زور و شور کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ شروع ہوئی تھی اور پادری فینڈر نے برصغیر میں تہلکہ مچا دیا تھا' اگر اُس وقت وہ مردِ حق کھڑا نہ ہوگیا ہوتا جس کا نامِ نامی مولانا رحمت اللہ کیرانوی ہے' رحمۃ اللہ علیہ' تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہندوستان میں مسلمان کس طرح عیسائیت کے اس سیلاب کی نذر ہو جاتے۔ اس پادری فینڈر نے پورے ہندوستان کے علماء کو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر للکارا اور کھلے طور پر دعوتِ مبارزت دی۔ مولانا کیرانویؒ خم ٹھونک کر میدان میں آئے اور پادری فینڈر کو میدان چھوڑ کر ہندوستان سے بھاگنا پڑا۔ پھر وہ ترکی پہنچا اور وہاں بھی اس نے یہی ہتھکنڈے شروع کیے۔ عثمانی سلطنت نے مولانا کیرانویؒ کو ترکی آنے کی دعوت دی۔ مولانا جب وہاں پہنچے تو پادری فینڈر وہاں سے بھی فرار ہوگیا۔ تو دعوت کی یہ بھی ایک سطح ہے۔ یہ تیسری سطح ہے۔ کچھ لوگ اس کا تحقیر کے انداز میں ذکر کرتے ہیں' حالانکہ یہ بھی کرنے کا کام ہے۔ البتہ واضح رہے کہ قرآن اس کے لیے ہمیں ایک امتیازی اخلاقی معیار قائم رکھنے کا حکم دے رہا ہے: ﴿جَادِلۡهُمۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ﴾۔ یعنی اس مجادلے میں بھی بالکل مخالفین کی سطح پر نہ اتر آؤ' بلکہ تمہارا داعیانہ کردار اور اس کی ایک اخلاقی شان ضرور برقرار رہنی چاہیے۔

ظاہر بات ہے کہ ایک شخص ان تینوں سطحوں پر کام نہیں کر سکتا۔ ہر کام کے اپنے اپنے تقاضے ہیں۔ جو سب سے اونچا کام ہے اس کے لیے اس دور میں ''علم کو مسلمان بنانے'' کی ضرورت ہے۔ آج علم ملحد ہو چکا ہے۔ اس کے بارے میں بڑی پیاری بات علامہ اقبال نے کہی ہے ؎

---

(۱) یہ تقریر قادیانیوں کے بارے میں صدارتی آرڈیننس سے قبل کی ہے۔ (مرتب)

عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

معرفتِ خداوندی کی تلوار اس علم کی نیام میں سے نکل گئی ہے۔ یہ نرا خول ہے' اور محض خالی نہیں ہے' بلکہ اس میں الحاد کا خنجر اس تلوار کی جگہ پیوست کر دیا گیا ہے۔ اس علم کو مسلمان بنانا آسان نہیں ہے۔ لوگ نظامِ تعلیم کی بات کیا کرتے ہیں۔ میں یہ کہا کرتا ہوں کہ نظام اتنی بڑی بات نہیں ہے' یہ تو تعلیم دینے کا ایک ذریعہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی علم کہاں ہے جسے پہنچایا جائے؟ محض دینیات کا ایک پیریڈ یا اسلامیات کا ایک شعبہ قائم کرنے سے کام نہیں چلے گا' جبکہ طبیعیات' معاشیات' عمرانیات' سیاسیات اور جو دوسرے علوم ایک طالب علم حاصل کر رہا ہے' ان کے رگ و پے میں الحاد اور مادہ پرستی سرایت کیے ہوئے ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ اِلا اللہ!

توحید کی بنیاد پر جب تک پورے علم کی تدوینِ نو نہیں ہو گی' تمام علوم کو جب تک مسلمان نہیں بنایا جائے گا' ہماری نئی نسل کے اذہان کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا ممکن نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ آسان کام نہیں ہے۔ جب تک سینکڑوں اور ہزاروں اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ))(۱) کو اپنا اصولِ عمل (motto) بنا کر میدان میں نہیں آئیں گے اور ان کو اداروں اور حکومت کی جانب سے مناسب ذرائع مہیا نہیں کیے جائیں گے اُس وقت تک یہ کام کیسے ہوگا! ہاں وعظ کی سطح پر ہمیں زیادہ جو ہر قابل (talent) مل سکتا ہے۔ رہا مجادلہ کی سطح پر افراد کی ضرورت تو اس کے لیے خصوصی تربیت گاہوں کی ضرورت ہے۔

دعوت کی تینوں سطحوں پر کام کرنے کے لیے ضرورت اِس امر کی ہے کہ وہ

(۱) صحیح البخاری' کتاب فضائل القرآن' باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ۔ وسنن الترمذی' ابواب فضائل القرآن' باب ما جاء فی تعلیم القرآن۔

فعّال ہوگئی ہے(۱) قادیانی مبلغین کا انداز بڑا جارحانہ ہوتا ہے اور ایک عام آدمی تو کجا اچھا بھلا پڑھا لکھا' بلکہ عالمِ دین بھی ان کے مناظرین و مبلغین کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ اِلّا ماشاءاللہ۔ ان قادیانی مناظرین و مبلغین کو جس طرح خاص موضوعات پر تربیت دی گئی ہے' اس کے ردّ اور ابطال کے لیے جب تک ہمارے ذہین و فطین لوگوں کو اسی طرح ٹریننگ نہ ملے یہ مسئلہ حل نہ ہوگا۔ ایک وقت میں جب یہاں انگریزی حکومت کی سرپرستی میں بڑے زور و شور کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ شروع ہوئی تھی اور پادری فینڈر نے برصغیر میں تہلکہ مچا دیا تھا' اگر اُس وقت وہ مردِ حق کھڑا نہ ہوگیا ہوتا جس کا نامِ نامی مولانا رحمت اللہ کیرانوی ہے' رحمتہ اللہ علیہ' تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہندوستان میں مسلمان کس طرح عیسائیت کے اس سیلاب کی نذر ہو جاتے۔ اس پادری فینڈر نے پورے ہندوستان کے علماء کو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر للکارا اور کھلے طور پر دعوتِ مبارزت دی۔ مولانا کیرانویؒ خم ٹھونک کر میدان میں آئے اور پادری فینڈر کو میدان چھوڑ کر ہندوستان سے بھاگنا پڑا۔ پھر وہ ترکی پہنچا اور وہاں بھی اس نے یہی ہتھکنڈے شروع کیے۔ عثمانی سلطنت نے مولانا کیرانویؒ کو ترکی آنے کی دعوت دی۔ مولانا جب وہاں پہنچے تو پادری فینڈر وہاں سے بھی فرار ہوگیا۔ تو دعوت کی یہ بھی ایک سطح ہے۔ یہ تیسری سطح ہے۔ کچھ لوگ اس کا تحقیر کے انداز میں ذکر کرتے ہیں' حالانکہ یہ بھی کرنے کا کام ہے۔ البتہ واضح رہے کہ قرآن اس کے لیے ہمیں ایک امتیازی اخلاقی معیار قائم رکھنے کا حکم دے رہا ہے: ﴿جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾۔ یعنی اس مجادلے میں بھی بالکل مخالفین کی سطح پر نہ اتر آؤ' بلکہ تمہارا داعیانہ کردار اور اس کی ایک اخلاقی شان ضرور برقرار رہنی چاہیے۔

ظاہر بات ہے کہ ایک شخص ان تینوں سطحوں پر کام نہیں کر سکتا۔ ہر کام کے اپنے اپنے تقاضے ہیں۔ جو سب سے اونچا کام ہے اس کے لیے اس دور میں ''علم کو مسلمان بنانے'' کی ضرورت ہے۔ آج علم ملحد ہو چکا ہے۔ اس کے بارے میں بڑی پیاری بات علامہ اقبال نے کہی ہے ؎

(۱) یہ تقریر قادیانیوں کے بارے میں صدارتی آرڈیننس سے قبل کی ہے۔ (مرتب)

عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

معرفتِ خداوندی کی تلوار اس علم کی نیام میں سے نکل گئی ہے۔ یہ نرا خول ہے' اور محض خالی نہیں ہے' بلکہ اس میں الحاد کا خنجر اس تلوار کی جگہ پیوست کر دیا گیا ہے۔ اس علم کو مسلمان بنانا آسان نہیں ہے۔ لوگ نظامِ تعلیم کی بات کیا کرتے ہیں۔ میں یہ کہا کرتا ہوں کہ نظام اتنی بڑی بات نہیں ہے' یہ تو تعلیم دینے کا ایک ذریعہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی علم کہاں ہے جسے پہنچایا جائے؟ محض دینیات کا ایک پیریڈ یا اسلامیات کا ایک شعبہ قائم کرنے سے کام نہیں چلے گا' جبکہ طبیعیات' معاشیات' عمرانیات' سیاسیات اور جو دوسرے علوم ایک طالب علم حاصل کر رہا ہے' ان کے رگ و پے میں الحاد اور مادہ پرستی سرایت کیے ہوئے ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ اِلا اللہ!

توحید کی بنیاد پر جب تک پورے علم کی تدوینِ نو نہیں ہو گی' تمام علوم کو جب تک مسلمان نہیں بنایا جائے گا' ہماری نئی نسل کے اذہان کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا ممکن نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ آسان کام نہیں ہے۔ جب تک سینکڑوں اور ہزاروں اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ))(۱) کو اپنا اصولِ عمل (motto) بنا کر میدان میں نہیں آئیں گے اور ان کو اداروں اور حکومت کی جانب سے مناسب ذرائع مہیا نہیں کیے جائیں گے اُس وقت تک یہ کام کیسے ہو گا! ہاں وعظ کی سطح پر ہمیں زیادہ جوہر قابل (talent) مل سکتا ہے۔ رہا مجادلہ کی سطح پر افراد کی ضرورت تو اس کے لیے خصوصی تربیت گاہوں کی ضرورت ہے۔

دعوت کی تینوں سطحوں پر کام کرنے کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب فضائل القرآن' باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ۔ وسنن الترمذی' ابواب فضائل القرآن' باب ما جاء فی تعلیم القرآن۔

باصلاحیت نوجوان جن کے دل میں واقعی دین کا کام کرنے کی تڑپ ہے' ولولہ ہے' اُمنگ اور جذبہ ہے' وہ آگے بڑھیں' ان اعلیٰ وارفع مقاصد کے لیے اپنا دُنیوی کیریئر قربان کریں اور اپنی جانیں ان مقاصد کے حصول میں کھپائیں' تب جاکر ہی یہ کام ہوگا۔ اور یہ ہے جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری منزل ــــ دین کی تبلیغ اور دعوت کے لیے مال و جان کو ان تینوں سطحوں پر کھپانا۔

عجب حسنِ اتفاق ہے کہ میں نے نہی عن المنکر سے متعلق جو دو حدیثیں بیان کی ہیں ان میں نہی عن المنکر کے کام کی انجام دہی کے لیے تین سطحوں ہی کا بیان ہوا ہے۔ پہلی سطح یہ ہے کہ بدی اور برائی کو ہاتھ یعنی قوت و طاقت سے روک دینا۔ دوسری یہ کہ اگر طاقت نہ ہو تو زبان سے' وعظ سے اور تلقین و نصیحت سے اس کو روکنا' اس کی مذمّت کرنا۔ اور تیسری سطح یہ ہے کہ اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل میں اسے برا جاننا' اس پر گھٹن محسوس کرنا' اس پر پیچ و تاب کھانا۔ اور یہ آخری سطح ایمان کے کمزور ترین ہونے کی دلیل ہے۔ دوسری حدیث میں ان تینوں سطحوں کے لیے نبی اکرم ﷺ نے ''جہاد'' کا لفظ استعمال فرمایا۔

اس دوسری منزل کے لیے ایک دوسرا عنوان ''نظریاتی کشمکش'' یا ''فکری تصادم'' ہے۔ اگر آپ توحید کو پھیلانا چاہتے ہیں تو مشرکانہ اوہام رکھنے والے موجود ہیں' ان سے نظریاتی سطح پر تصادم اور مقابلہ ہوگا۔ آپ کو walk over نہیں مل جائے گا۔ کس قدر اہم بات ہے کہ قرآن مجید نے یہی لفظ ''جہاد'' مشرک والدین کے ضمن میں دو جگہ استعمال کیا ہے' ایک سورۃ لقمان میں اور دوسرے سورۃ العنکبوت میں۔ جو نوجوان نبی اکرم ﷺ پر ایمان لے آئے تھے تو ان کے مشرک والدین ان پر دباؤ ڈالتے تھے کہ وہ واپس اپنے آبائی دین پر آجائیں۔ سورۃ لقمان میں ارشاد ہے:

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا (آیت ۱۵)

معلوم ہوا کہ مشرک بھی مجاہد تھے۔ وہ مجاہد فی سبیل الشرک اور مجاہد فی سبیل الطاغوت تھے اور نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے اصحاب رضی اللہ عنہم بھی مجاہد تھے اور وہ تھے مجاہد فی سبیل اللہ اور مجاہد فی التوحید۔ یہ جہاد اور یہ کشمکش آپ کو ہر دور میں ملے گی اور یہ بات بغیر استثناء کے

حقیقتِ نفس الامری ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی!

تیسری منزل: غلبہ واقامتِ دین

جہاد کی تیسری منزل سب سے کٹھن' سب سے بھاری اور سب سے مشکل ہے۔ اور یہ ہے دین کو غالب کرنے' قائم کرنے اور نافذ کرنے کے لیے' اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے' اس مقصد کے لیے کہ دین کا تجزیہ اور اس کے حصے بخرے کیے بغیر وہ کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے' جہاد کرنا۔ جیسے انفرادی سطح پر فرمایا گیا: ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ﴾ ویسے ہی اجتماعی سطح پر دین کے غلبہ کے لیے جہاد وقتال کا حکم دیا گیا۔ فرمایا: ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾۔ یہ ہے جہاد کی بلندترین چوٹی اور سب سے کٹھن اور مشکل مرحلہ۔ اس کی وجہ بھی اظہر من الشمس ہے۔ پہلی منزل پر ذاتی سطح پر نفس کے ساتھ کشمکش تھی۔ دوسری منزل پر اہل زیغ کے ساتھ نظریاتی اور فکری سطح پر کشمکش تھی۔ اس تیسری منزل پر طاغوتی نظام کو ہٹانے کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے' اس لیے کہ دو نظام کسی حال میں بھی co-exist نہیں کر سکتے۔ پچاس مذاہب بھی ایک بالاتر نظام کے تحت اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ مذاہب باہمی اختلافات کے علی الرغم پُرامن طور پر پہلو بہ پہلو زندگی گزار سکتے ہیں۔ یہ بالکل قابلِ عمل ہے — اس لیے کہ دنیا کا غالب تصور یہی ہے کہ مذہب تو لوگوں کے انفرادی اور نجی مسائل ومعاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ اجتماعیات کے تمام امور میں مذہب کا عمل دخل اِس دور میں تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ یہ سیکولر فیلڈ ہے۔ جیسا کہ انگریز کے دور میں ہندوستان میں اصل نظامِ اجتماعی (Law of the Land) سرکارِ انگلشیہ کا تھا۔ ہندوستان میں رہنے والے تمام مذاہب کے لوگوں کو آزادی تھی کہ وہ اپنے شخصی معاملات میں اپنے اپنے مذہب پر عمل کریں۔ انگریزی حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ جیسے دستوری اور نظری طور پر موجودہ بھارت میں بھی یہ بات تسلیم شدہ ہے اور تمام مذاہب کے حقوق دستور میں معین ہیں۔

بہرحال ایک ملک میں دین یعنی نظامِ اجتماعی ایک ہی رہ سکتا ہے۔ دو نظام نہ رہ سکتے ہیں نہ چل سکتے ہیں۔ جس طرح ایک نیام میں بیک وقت دو تلواریں نہیں سما سکتیں' اسی طرح ایک ملک میں دو نظام نہیں چل سکتے۔ ایک گدڑی میں بہت سے درویش سما سکتے ہیں' لیکن ایک شال میں دو بادشاہ نہیں سما سکتے۔ معلوم ہوا کہ ہر نظام اپنا غلبہ چاہتا ہے اور اگر اسلام محض مذہب نہیں' بلکہ دین ہے' جیسا کہ فی الواقع وہ ہے: ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ﴾ تو اس کو غلبہ درکار ہے۔ یہ منزل انگریزوں کی دو سو سالہ غلامی کی وجہ سے ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہو گئی تھی اور اب بھی بڑی مشکل سے یہ تصور لوگوں کے ذہنوں کے سامنے آ رہا ہے۔ چونکہ غلامی کے تقریباً دو سو سال کے درمیان اسلام دین نہیں رہا تھا' صرف مذہب بن گیا تھا' لہٰذا ہمارا سارا تصور اکثر و بیشتر تو پہلی منزل تک محدود ہے' یعنی عبادات اور حلال و حرام کے موٹے موٹے احکام ہم جانتے ہیں۔ دوسری منزل کی طرف بھی پیش رفت ہوئی' یعنی تبلیغ' دین کو پہنچانا' اسے عام کرنے کی کوشش کرنا۔ لیکن یہ بات ذہنوں سے اوجھل ہو گئی کہ ہمارا دین اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ اَلْحَقُّ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی عَلَیْہِ۔ اسلام دین ہے اور دین ہوتا ہی وہ ہے جو غالب ہو۔ علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی!

میں بڑے جزم کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام جب غالب ہوتا ہے تو دین ہوتا ہے اور جب مغلوب ہوتا ہے تو صرف مذہب رہ جاتا ہے۔ ہماری دو سو سالہ سیاسی اور فکری غلامی نے اس مذہبی تصور کو اس طریقے سے ہمارے ذہنوں میں نقش اور راسخ کر دیا ہے کہ اگر بڑی محنت کے بعد کسی کے سامنے یہ تصوّر واضح ہوتا ہے کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے تو تھوڑے عرصہ کے بعد مضمحل ہو کر ذہنوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور پھر توجہ اس کے مذہبی تصور تک محدود ہو جاتی ہے۔ ہمارا اسلام کا محض مذہبی تصور انگریزی دَور میں اتنا راسخ ہو چکا تھا کہ ہمارے بعض زُعماء نے انگریز حکومت کی بھی بڑی مدح کی تھی کہ اس نے ہمیں بڑی مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ لہٰذا حکومت کے خلاف کوئی تحریک چلانا یا

اس میں حصہ لینا مسلمانوں کے لیے قطعی نامناسب ہے۔ اسی پر مردِقلندر اقبال نے یہ پھبتی چست کی تھی ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

اسلام کا غلبہ اور اسلام کا ایک دین کی حیثیت سے بالفعل قائم و نافذ کرنا' یہ ہے ہمارے فرائض دینی کی تیسری اور بلند ترین منزل۔

اقامتِ دین کا مرحلہ اور تصادم

اب آیئے ایک قاعدہ کلیہ اور اٹل اصول کی طرف! وہ یہ کہ آپ اپنا نظام لانا چاہتے ہیں تو فی الوقت نافذ و قائم نظام کو ہٹانا ہوگا۔ جیسا کہ مولانا رومؒ نے کہا ؎

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند
می ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

انقلاب کے لیے یہ عمل لازم ولابدی اور ناگزیر ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جو نظام بھی کہیں قائم ہوتا ہے' اس کے ساتھ کچھ لوگوں کے مفادات' چودھراہٹیں' سیادتیں اور قیادتیں وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ مراعات یافتہ طبقات جن کو اپنے حق سے زیادہ مل رہا ہے' جو دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں' جن کے پاس اختیارات اور حقوق کا ناجائز ارتکاز ہو گیا ہے' وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے کہ کوئی اس نظام کو چھیڑے' اسے ہاتھ لگائے۔ وہ تو اس کے تحفظ کے لیے فوراً اٹھ کھڑے ہوں گے کہ ع

''نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے''

ہوش میں آؤ' اپنی قوتوں کو مجتمع کرو' یہ ایک آندھی آ رہی ہے جو تمہارے مفادات اور تمہاری مراعات کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر لے جائے گی۔ یہ کشمکش بڑی شدید ہے۔ قرآن مجید میں تین مقامات پر یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ

(التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' الصف:۹)

اور ان میں سے دو مقامات پر آیت کا خاتمہ ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ کے الفاظ پر ہوا ہے۔ یعنی یہ ایک اٹل قانون ہے کہ مشرک کبھی دینِ حق کا غلبہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔ تصادم ہو کر رہے گا۔ اب نظریاتی تصادم اگلے مرحلہ میں داخل ہوگا اور بالفعل (Physical) تصادم ہوگا۔ اب طاقت' طاقت سے ٹکرائے گی۔

اس بالفعل تصادم (Physical Collision) کے بھی تین مرحلے ہیں۔ اس کے پہلے مرحلہ کو ہم کہیں گے ''صبر محض'' کہ ماریں کھاؤ مگر اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ بارہ برس مکہ میں یہی حکم رہا کہ اگر تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر ننگی پیٹھ لٹایا جا رہا ہے تو لیٹ جاؤ' مگر جوابی کارروائی نہیں کر سکتے۔ اس کو جدید اصطلاح میں کہیں گے: Passive Resistance —— یعنی کلمۂ توحید اور کلمۂ طیبہ پر قائم رہو' لیکن ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔

اس تصادم کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اگر طاقت اتنی فراہم ہوگئی ہے کہ اقدام کیا جا سکتا ہے تو آگے بڑھو اور باطل کو للکارو اور چیلنج کرو۔ اس نظام کی کسی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دو۔ اسے جدید اصطلاح میں کہا جائے گا Active Resistance یعنی اقدام۔

اس کا تیسرا اور آخری مرحلہ ہے Armed Conflict یا مسلح تصادم یعنی اب ہاتھ بھی کھول دیے گئے ہیں اور اذنِ قتال دے دیا گیا ہے:

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝

(الحج)

''(آج سے) ان لوگوں کو اجازت دے دی گئی جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے' کیونکہ وہ مظلوم ہیں' اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر پوری قدرت رکھتا ہے۔''

مکی دور صبرِ محض کا دور تھا۔ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے بعد نبی اکرم ﷺ نے اقدام فرمایا اور چھاپے مار دستے بھیج کر قریش کی تجارت کے دونوں راستوں کو' جو مکہ سے یمن اور مکہ سے شام کی طرف جاتے تھے' مخدوش بنا دیا۔ گویا قریش کی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا' کیونکہ ان کی معاش کا بہت بڑا انحصار ان ہی راستوں کے ذریعہ تجارت پر تھا۔

صبرِ محض کے بعد ہر انقلابی عمل میں ''مسلّح تصادم'' کا لازمی اور آخری مرحلہ آتا ہے۔ یہ انقلابی دعوت وقت کے جن فراعنہ کے مفادات کو چیلنج کرتی ہے' وہ جب اس دعوت کو توسیع پذیر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس کو کچلنے کے لیے اپنی عسکری طاقت کو میدان میں لاتے ہیں اور اس طرح مسلّح تصادم کا تیسرا اور آخری مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہر انقلابی دعوت کو لازماً اس آخری مرحلہ سے سابقہ پیش آکر رہتا ہے۔ اس لیے کہ یہ انقلابی دعوت وقت کے رائج و نافذ نظام کے ساتھ retaliate کرتی ہے۔ اب تک تو وہ جھیل رہی تھی' برداشت کر رہی تھی' لیکن جب وہ اقدام کا مرحلہ شروع کرتی ہے تو نظامِ باطل اس کو کچلنے کے لیے اپنی پوری طاقت کے ساتھ بڑھتا ہے اور آخری مرحلے پر مسلّح تصادم کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اسلامی انقلاب کی صورت میں یہی مسلّح تصادم جہاد کی آخری چوٹی ''قتال فی سبیل اللہ'' بن جاتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کی انقلابی جدوجُہد میں ایک وقت وہ تھا کہ اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی' لیکن آخری مرحلے پر وہ وقت بھی آیا کہ جس کے متعلق حکمِ الٰہی آتا ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ (البقرۃ)

''(مسلمانو!) تم پر جنگ فرض کر دی گئی ہے' اور وہ تمہیں ناپسند ہے' اور ہوسکتا ہے کہ تمہیں کوئی چیز ناپسند ہو درآنحالیکہ اسی میں تمہارے لیے خیر ہو' اور ہوسکتا ہے کہ کوئی چیز تمہیں پسند ہو درانحالیکہ اس میں تمہارے لیے شر ہو۔ اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔''

اس قتال کا ہدف (target) یہ ہے کہ مسلمانو! اب جبکہ تمہاری تلوار نیام سے باہر آگئی ہے' تو یہ اُس وقت تک نیام میں نہیں جائے گی جب تک فتنہ و فساد بالکل فرو نہ ہو جائے اور اللہ کے خلاف بغاوت بالکل کچل نہ دی جائے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے نہ ہو جائے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ

کُلُّهٗ لِلّٰهِ ﴾ (الانفال:۳۹) یہاں فتنہ سے مراد کیا ہے' اس کی ہمارے اکثر اصحابِ علم مختلف تشریحات وتوجیہات کرتے ہیں۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ چونکہ ہمارا دین کا تصور غیر انقلابی بن گیا ہے لہٰذا جہاں کہیں بھی انقلابی بات آتی ہے تو پہلو بچا کر نکلنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فتنوں کا شمار مشکل ہے' استحصال بھی فتنہ ہے' ناانصافی بھی فتنہ ہے' لیکن وہ اصل فتنہ کیا ہے جو اِس آیت میں مراد ہے اور جو اُمّ الفتن ہے؟ وہ یہ ہے کہ یہ زمین اللہ کی ہے' اس کا جائز حاکم صرف اُس کی ذات ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اگر زمین پر تشریعی معاملات اور اجتماعی نظامِ حیات میں اللہ کے سوا کسی اور کا حکم چل رہا ہے تو یہ اس کے خلاف صریح بغاوت ہے۔ یہی سب سے بڑا فتنہ ہے۔

یہاں فتنہ سے اصلاً یہی فتنہ مراد ہے۔ اسی کے متعلق ایک مقام پر فرمایا گیا: ﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ﴾ (البقرۃ:۱۹۱) اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا گیا: ﴿وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۱۷) غور کیجیے وہاں قتال ومقاتلہ کن کے خلاف تھا! اپنی ہی قوم اور اپنے قبیلہ کے لوگ' اپنے ہی بھائی بند' اپنے ہی اعزّہ واقارب مدّمقابل تھے' لیکن وہ طاغوتی نظام کے علمبردار تھے اور اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اس بات پر مامور کی گئی تھی کہ اجتماعی نظام خالصتاً توحید کے انقلابی نظریے پر قائم ہو۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ﴾ (الزمر:۳) اور: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ﴾ (الشوریٰ:۱۳) سورۃ التوبہ اور سورۃ الصّف میں جہاں خاتم النبیّین والمرسلین ﷺ کی بعثت کی امتیازی شان یہ بیان ہوئی ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ تو دونوں مقامات کے آخر میں فرمایا گیا: ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝﴾ ''اور چاہے مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو!''

جن لوگوں کے مفادات اور جن کی قیادت وسیادت نظامِ باطل سے وابستہ ہو وہ اس بات کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ ان کا طاغوتی نظام بیخ وبُن سے اکھاڑ کر توحید پر مبنی نظامِ عدل وقسط قائم کیا جائے۔ وہ تو مزاحمت کریں گے' مخالفت کریں گے اور اپنی

پوری طاقت دین اللہ کے قیام و نفاذ کو روکنے کے لیے صَرف کر دیں گے۔ لہٰذا اللہ کے فرماں برداروں کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اللہ کے باغیوں سے پنجہ آزمائی کریں' ان سے نبرد آزما ہوں اور اللہ تعالیٰ کی تشریعی حکومت کو قائم کرنے کے لیے اپنا تن' من' دھن سب کچھ قربان کر دیں' تاکہ ''حق بحق دار رسید'' والا معاملہ ہو جائے۔ جو لوگ یہ قربانی دیں تو وہ سرخرو ہیں۔ از روئے الفاظ قرآنی:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ (الاحزاب)

''اہلِ ایمان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے (اس کی راہ میں گردنیں کٹا کر سرخرو ہو چکے ہیں) پس ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی اپنی باری آنے کا منتظر ہے' اور ان اہل ایمان نے اپنے اس رویے اور طرزِ عمل میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں کی۔''

لیکن اگر ایمان کے دعوے دار بیٹھے رہیں' باطل کے ساتھ کوئی کشمکش نہ کریں' بلکہ اس کے زیر عافیت چین کی بانسری بجائیں' اپنے معیارِ زندگی کی بلندی ہی مقصود و مطلوب بن جائے تو یہ طرزِ عمل دُنیوی قانون میں بھی اعانتِ جرم ہے۔ یہ باغیوں کے ساتھ ایک نوع کا تعاون قرار دیا جاتا ہے۔ ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ کا سب سے بڑا سبب یہی بغاوت ہوتی ہے۔ کائنات کے تکوینی نظام پر جس اللہ کی حکومت قائم ہے' یہ زمین اُسی اللہ کی ہے' لہٰذا اس پر اس کی تشریعی حکومت بھی قائم ہونی چاہیے۔ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ﴾ حکم دینے کا اختیار صرف اسی کو حاصل ہے۔ لیکن اس اصل الاصول کو چھوڑ کر خواہ کوئی فردِ واحد ہو' کوئی قوم ہو' عوام ہوں' کسے باشد' کوئی بھی ہو' وہ اگر اپنا حکم چلوا رہا ہے تو درحقیقت وہ خدائی کا مدعی ہے اور اللہ کا باغی ہے۔ مسلمان تو وہ ہے جو صرف اللہ کا وفادار ہو۔ اس موقع پر اچانک میرا ذہن اس مقدمۂ بغاوت کی طرف منتقل ہوا جو ہمارے ہی شہر کراچی کے خالق دینا ہال میں ہمارے چند اکابر کے خلاف پہلی جنگ عظیم کے دوران قائم ہوا تھا۔ یہ مقدمہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ ہماری تاریخ

پوری طاقت دین اللہ کے قیام و نفاذ کو روکنے کے لیے صَرف کر دیں گے۔ لہٰذا اللہ کے فرماں برداروں کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اللہ کے باغیوں سے پنجہ آزمائی کریں' ان سے نبرد آزما ہوں اور اللہ تعالیٰ کی تشریعی حکومت کو قائم کرنے کے لیے اپنا تن' من' دھن سب کچھ قربان کر دیں' تا کہ ''حق بحق دار رسید'' والا معاملہ ہو جائے۔ جو لوگ یہ قربانی دیں تو وہ سرخرو ہیں۔ از روئے الفاظ قرآنی:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾ (الاحزاب)

''اہلِ ایمان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے (اس کی راہ میں گردنیں کٹا کر سرخرو ہو چکے ہیں) پس ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی اپنی باری آنے کا منتظر ہے' اور ان اہل ایمان نے اپنے اس رویے اور طرزِ عمل میں ذرّہ برابر تبدیلی نہیں کی۔''

لیکن اگر ایمان کے دعوے دار بیٹھے رہیں' باطل کے ساتھ کوئی کشمکش نہ کریں' بلکہ اس کے زیرِ عافیت چین کی بانسری بجائیں' اپنے معیارِ زندگی کی بلندی ہی مقصود و مطلوب بن جائے تو یہ طرزِ عمل دُنیوی قانون میں بھی اعانتِ جرم ہے۔ یہ باغیوں کے ساتھ ایک نوع کا تعاون قرار دیا جاتا ہے۔ ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ کا سب سے بڑا سبب یہی بغاوت ہوتی ہے۔ کائنات کے تکوینی نظام پر جس اللہ کی حکومت قائم ہے' یہ زمین اُسی اللہ کی ہے' لہٰذا اس پر اس کی تشریعی حکومت بھی قائم ہونی چاہیے۔ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط﴾ حکم دینے کا اختیار صرف اسی کو حاصل ہے۔ لیکن اس اصل الاصول کو چھوڑ کر خواہ کوئی فردِ واحد ہو' کوئی قوم ہو' عوام ہوں' کسے باشد' کوئی بھی ہو' وہ اگر اپنا حکم چلوا رہا ہے تو درحقیقت وہ خدائی کا مدعی ہے اور اللہ کا باغی ہے۔ مسلمان تو وہ ہے جو صرف اللہ کا وفادار ہو۔ اس موقع پر اچانک میرا ذہن اس مقدمۂ بغاوت کی طرف منتقل ہوا جو ہمارے ہی شہر کراچی کے خالق دینا ہال میں ہمارے چند اکابر کے خلاف پہلی جنگِ عظیم کے دوران قائم ہوا تھا۔ یہ مقدمہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ ہماری تاریخ

میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کے ذکر سے ہمیں کسی درجے میں سہارا ملتا ہے کہ انہوں نے وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو ایک مسلمان کے شایانِ شان ہے۔ ان اکابر نے پہلی جنگ عظیم کے اس ٹربیونل کے سامنے جو انگریزی حکومت نے بغاوت کے مقدمہ کے لیے قائم کیا تھا' برملا کہا تھا کہ ہاں ہم انگریزی حکومت کے باغی ہیں' اس لیے کہ مسلمان صرف اللہ کا وفادار ہوسکتا ہے' وہ کبھی غیر اللہ کا وفادار نہیں ہوسکتا!

ایمان اور جہاد لازم وملزوم ہیں

بہرحال یہ ہیں جہاد کے تین درجے۔ ان کو مزید پھیلائیں گے تو نو (۹) درجے بن جائیں گے اور نویں منزل پر جا کر یہ جہاد قتال بنتا ہے جو اس کی چوٹی اور اس کا نقطۂ عروج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الصّف میں جہاں جہاد کی بات ہوئی وہاں یہ بات صراحت سے سامنے آتی ہے کہ جہاد تو ایمان کی بنیاد (base) ہے۔ جہاد نہیں کرو گے تو عذابِ جہنم سے چھٹکارا پانے کی امید محض امید موہوم ہے۔ ﴿تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ﴾ ''یہ محض تمہاری خوش فہمیاں ہیں''۔ اس کی کوئی برہان اور دلیل تمہارے پاس نہیں ہے۔ عذابِ الیم سے رُستگاری کے لیے ایمان اور جہاد لازم وملزوم ہیں۔ چنانچہ اسی سورۂ مبارکہ میں فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (الصف)

''اے اہلِ ایمان! میں بتاؤں تمہیں وہ تجارت جو تم کو عذابِ الیم سے نجات دلا دے؟ (وہ یہ ہے کہ) ایمان (پختہ) رکھو اللہ اور اُس کے رسول پر اور جہاد کرو اُس کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے' یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔''

معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ جہاد ناگزیر ہے۔ اس سے تو مفر ہے ہی نہیں۔ یہ تو نجات کی شرطِ لازم ہے۔ قرآن مجید تو یہ بتاتا ہے کہ جہاد نہیں تو ایمان نہیں۔ دلیل کے لیے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ دیکھئے! فرمایا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ

وَاَنۡفُسِهِمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ اُولٰٓـئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ‏﴿۱۵﴾

''مؤمن تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر اس شان سے ایمان لائے کہ ان کے قلوب تشکیک اور خلجان میں نہیں پڑے (بلکہ ان کو یقینِ قلبی حاصل ہو گیا) اور جنہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں۔ بس صرف یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔''

اس آیتِ مبارکہ میں حصر کے دو اسلوب آئے ہیں' ایک اِنَّمَا اور دوسرے اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ اسی لیے میں نے ترجمانی میں اس اسلوب کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

آگے چلیے۔ اگر کوئی دُنیوی محبت اللہ کی راہ میں جہاد سے روکنے کے لیے پاؤں میں بیڑی بن کر پڑ گئی تو قرآن مجید کا فتویٰ کیا ہے! اس کے لیے سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ ملاحظہ کیجیے:

قُلۡ اِنۡ كَانَ اٰبَآؤُكُمۡ وَاَبۡنَآؤُكُمۡ وَاِخۡوَانُكُمۡ وَاَزۡوَاجُكُمۡ وَعَشِيۡرَتُكُمۡ وَاَمۡوَالُ ۟اقۡتَرَفۡتُمُوۡهَا وَتِجَارَةٌ تَخۡشَوۡنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرۡضَوۡنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيۡكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَجِهَادٍ فِىۡ سَبِيۡلِهٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰى يَاۡتِىَ اللّٰهُ بِاَمۡرِهٖ‌ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ‏﴿۲۴﴾

اللہ کی محبت' اس کے رسول (ﷺ) کی محبت اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت کی عظمت و اہمیت پر قرآن حکیم کی یہ بڑی جامع اور مہتم بالشان آیت ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کے سامنے ایک معیار اور کسوٹی رکھ دی گئی ہے۔ ان سے فرمایا گیا ہے کہ اپنے باطن میں ایک ترازو نصب کر لو اور پھر جائزہ لے لو کہ تمہاری اصلی دلی محبتوں کا کیا حال ہے۔ فرمایا کہ اے نبی ﷺ! ان مسلمانوں سے کہہ دیجیے کہ اپنے دل میں نصب شدہ میزان کے ایک پلڑے میں آٹھ محبتیں ڈالو۔ یعنی اپنے باپوں کی محبت' اپنے بیٹوں کی محبت' اپنے بھائیوں کی محبت' اپنی بیویوں کی محبت اور اپنے رشتہ داروں اور اعزہ و اقارب کی محبت۔ ماں' بیٹی' بہن اور شوہر کی محبتوں کا بھی ان میں احاطہ ہو گیا۔ یہ پانچ محبتیں علائقِ دُنیوی سے متعلق ہیں۔ پھر ان کے ساتھ چھٹی محبت اس مال کی جو بڑے چاؤ کے ساتھ تم نے جمع کیا ہے' ساتویں اس کاروبار کی محبت جو تم نے بڑی محنت سے جمایا ہے'

جس میں تم نے خون پسینہ ایک کیا ہے' جس کے متعلق تم کو اندیشے لاحق رہتے ہیں کہ کہیں کساد بازاری نہ آ جائے' کہیں گھاٹا نہ ہو جائے' اور آٹھویں ان مکانوں کی محبت جو تم نے بڑے ارمانوں سے تعمیر کیے ہیں' جن کی زیبائش و آرائش پر تم نے پانی کی طرح پیسہ لگایا ہے۔ یہ تین محبتیں اسباب و سامانِ دُنیوی سے متعلق ہیں۔ اب تقابل کے لیے دوسرے پلڑے میں تین محبتیں ڈالو۔ ایک اللہ کی محبت' دوسری اس کے رسول (ﷺ) کی محبت اور تیسری اس کی راہ میں جہاد کی محبت۔ اب دیکھو کون سا پلڑا بھاری پڑا' کون سا جھکا! اگر ان آخر الذکر محبتوں کا پلڑا ہلکا رہ گیا اور علائق و سامانِ دُنیوی کی محبتوں والا پلڑا بھاری پڑ گیا تو جاؤ گومگو کی حالت میں مبتلا رہو اور انتظار کرو! میں محاورے کے طور پر فَتَرَبَّصُوْا کا صحیح مفہوم ادا کرنے کے لیے کہا کرتا ہوں کہ ''جاؤ دفع ہو جاؤ'' ﴿حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۴﴾ ''حتیٰ کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے' اور اللہ ایسے فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

یہاں فاسق کا لفظ انتہائی قابل توجّہ ہے۔ جس مسلمان کا دل جہاد کی محبت سے خالی اور اس کی اہمیت وعظمت سے غافل ہے اس کا شمار بھی فاسقوں میں ہوتا ہے۔ میرا ظنِّ غالب ہے کہ اسی آیت مبارکہ سے متاثر ہو کر اقبال نے یہ شعر کہا تھا: ؎

یہ مال و دولتِ دُنیا' یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الاّ اللہ!

معلوم ہوا کہ جہاد سے تو مفر ہے ہی نہیں۔ سورۃ الحجرات کی متذکرہ بالا آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے' بلکہ میرے غور وفکر کی حد تک نصِّ قطعی ہے کہ ایمانِ حقیقی کے دو رکن ہیں: ایک ہر نوع کے ریب وتشکیک اور ذہنی خلجان سے مبرّا یقینِ قلبی اور دوسرا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد۔

بلاشبہ کلمۂ شہادت' اقامتِ صلوٰۃ' ایتائے زکوٰۃ' حج اور صومِ رمضان' پانچ ارکانِ اسلام ہیں۔ ان میں شہادتَین کو بنیاد اور دوسرے چار کو ستون کا مقام حاصل ہے۔ بنیاد اور ستون کے بغیر کسی عمارت کی تعمیر کا تصور ممکن ہی نہیں' لہٰذا میں فرائض دینی کے جامع

تصور کو ظاہر کرنے کے لیے جو تین منزلہ عمارت کی مثال پیش کیا کرتا ہوں اس کی ہر منزل کے لیے یہ ارکانِ اسلام ناگزیر ہیں۔ لیکن ایمانِ حقیقی کے دو رکن ہیں۔ ایک قلبی یقین اور دوسرا جہاد فی سبیل اللہ۔ جہاں تک میں نے غور و فکر کیا ہے' نجات کا کوئی دوسرا راستہ اس جہاد کے بغیر مجھے نظر نہیں آتا۔ سورۃ العصر میں نجاتِ اُخروی کے جو ناگزیر لوازم بیان فرمائے گئے ہیں ان میں تیسرا لازمہ اور تیسری ناگزیر شرط ''تواصی بالحق'' قرار دی گئی ہے۔ سورۂ ہود کی پہلی آیت مبارکہ میں یہ اصول بیان فرمایا گیا ہے:

الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ﴿۱﴾

''ال ر۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں' پھر صاف صاف بیان کی گئی ہیں ایک حکیم باخبر کی طرف سے۔''

چنانچہ قرآن حکیم اسی تواصی بالحق کی شرح کے لیے مزید کئی اصطلاحات بیان کرتا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح بھی اس کی توضیح و تشریح اور تفصیل ہے۔

جہاد کی چوٹی: قتال فی سبیل اللہ

قتال فی سبیل اللہ اسی جہاد فی سبیل اللہ کی چوٹی اور اس کا ذروۂ سنام ہے۔ یہ مقامِ محبوبیت ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿۴﴾﴾ (الصّف) ''یقیناً اللہ اُن لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اُس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔''

سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں' اُنہیں مُردہ مت کہو' وہ زندہ ہیں' مگر تمہیں (ان کی زندگی کا) شعور نہیں ہوتا۔''

اور سورۂ آل عمران میں فرمایا:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں اُنہیں مُردہ نہ سمجھو' وہ تو حقیقت میں

زندہ ہیں' اپنے ربّ کے پاس رزق پا رہے ہیں۔''

یہ وہ اعلیٰ و ارفع مرتبہ ہے کہ خود نبی اکرم ﷺ اس کی تمنّا اور آرزو فرمایا کرتے تھے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ)) (۱)

''میرے دل میں بڑی آرزو اور بڑی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں۔''

کتبِ احادیث میں نبی اکرم ﷺ کی یہ دعائیں منقول ہیں:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ))

اور:

((اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ))

لیکن سورۃ المجادلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ سُنّت بیان فرمائی ہے:

کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۲۱﴾

''اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے (یعنی طے فرما دیا ہے) کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہو کر رہیں گے۔ یقیناً اللہ ہی زور آور اور زبردست ہے۔''

رسولوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص تحفّظ حاصل ہوتا ہے اور وہ مقتول نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ عالمِ ظاہری میں اس طرح رسول کے مغلوب ہونے کا پہلو نکلتا ہے' البتہ انبیاء علیہم السلام کو یہ خصوصی تحفّظ نہیں دیا گیا۔ چنانچہ ان میں سے بعض قتل بھی کیے گئے' جس کی سب سے بڑی مثال حضرت یحییٰ علیہ السلام کا قتل ہے۔

ضمناً یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ رفعِ آسمانی کی یہ بھی ایک دلیل ہے' کیونکہ وہ بھی ایک رسول تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی یہ سنّت بھی ہے کہ جس قوم کی طرف رسول مبعوث کیا جاتا ہے وہ قوم اگر رسول کا انکار کر دے' اس پر صرف

(۱) صحیح البخاری' کتاب التمنی' باب ما جاء فی التمنی ومن تمنی الشھادۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب فضل الجھاد والخروج فی سبیل اللّٰہ۔

معدودے چند لوگ ہی ایمان لائیں تو اہلِ ایمان کو بچا کر اس قوم کو عذابِ استیصال کے ذریعہ اسی دنیا میں ہی تباہ و برباد اور ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کیے گئے تھے۔ ﴿وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ﴾ بنی اسرائیل نے آنجنابؑ کا انکار کیا لیکن انہیں عذابِ استیصال سے نیست و نابود نہیں کیا گیا۔ یہ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے لیے دلیل ہے۔ حضرت مسیحؑ قربِ قیامت میں جناب محمد ﷺ کے اُمتی کی حیثیت سے نزول فرمائیں گے اور ان شاء اللہ انہی کے ہاتھوں تمام یہودی عذابِ استیصال و ہلاکت کا مزہ چکھیں گے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ ایمان اور جہاد لازم و ملزوم ہیں اور جہاد کی چوٹی قتال ہے۔ البتہ قتال ہر وقت نہیں ہوتا‘ موقع و محل کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی اسلامی حکومت بالفعل قائم ہو اور اسے غیر مسلموں سے فی سبیل اللہ جنگ کا مرحلہ درپیش ہو اور حالات کے لحاظ سے حسبِ ضرورت فوج موجود ہو یا مزید ضرورت کے لیے لوگ جنگ کے لیے نکل آئیں تو قتال فرضِ عین نہیں فرضِ کفایہ ہو جائے گا۔ لیکن ’’جہاد‘‘ وہ چیز ہے جو ایک مسلمان پر شعور کی عمر کو پہنچتے ہی فرض ہو جاتا ہے۔ اس جہاد کے مختلف مدارج ہیں‘ جن میں سے بعض کا میں قدرے تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں اور بعض کی طرف میں نے محض اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ ’’قتال‘‘ اس جہاد کے عمل کی آخری چوٹی اور اس کا ذروۂ سنام ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے لگایئے جو صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

> قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ((مَنْ مَّاتَ وَلَمْ یَغْزُ وَلَمْ یُحَدِّثْ بِہٖ نَفْسَہٗ مَاتَ عَلٰی شُعْبَۃٍ مِّنْ نِّفَاقٍ)) (۱)
>
> رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جو شخص اس حال میں مر جائے کہ نہ تو اُس نے اللہ کی راہ میں جنگ کی ہو اور نہ ہی اس کے دل میں اس کا خیال آیا ہو (اس کی تمنا اور آرزو بھی پیدا نہ ہوئی ہو) تو ایسے شخص کی موت ایک نوع کے نفاق پر ہو گی‘‘۔

---

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الامارۃ‘ باب ذم من مات ولم یغزو ولم یحدث نفسہ بالغزو۔

بقول اقبال ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت' نہ کشور کشائی!

جہاد کے لیے جدید اصطلاح: انقلابی عمل

اگرچہ میں بھی اس بات کا قائل ہوں کہ ہمیں حتی الامکان جدید اصطلاحات سے احتراز کرنا چاہیے اور کتاب وسنت کی اصل اصطلاحات سے چمٹے رہنا چاہیے' عافیت اسی میں ہے' ورنہ بالکل غیر شعوری اور غیر محسوس طور پر غلط نظریات اذہان میں رینگ کر آ جاتے ہیں اور پیوست ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک یہ دشواری بھی پیش آتی ہے کہ ہر دَور کی اپنی زبان ہوتی ہے' ہر دور کی چند مخصوص اصطلاحات ہیں جو بات کی تفہیم کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اگر اس زبان میں ان اصطلاحات کے ساتھ بات نہیں کی جائے گی تو ابلاغ کا حق ادا نہیں ہوگا۔ لہٰذا میرے نزدیک درمیانی راہ یہ ہے کہ وقتی طور پر ابلاغ اور افہام کے لیے ان اصطلاحات کو استعمال ضرور کیا جائے ــــــ لیکن اپنے فکر کو مستقلاً اُن اصطلاحات کے حوالے سے استوار کیا جائے جو کتاب وسنت کی ہیں۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر میں یہ بات عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ ''جہاد'' کے لیے آج کے دور کی اصطلاح ہے ''انقلاب''۔ انقلابی عمل ہی دراصل جہاد ہے۔ البتہ اس میں تھوڑا سا فرق واقع ہوتا ہے۔ میں نے جہاد کے حوالے سے جو تین سطحیں (levels) بیان کی ہیں' انقلابی عمل میں ان کی ترتیب بدل جائے گی۔ جب ہم انقلاب کی بات کریں گے تو سب سے پہلے دعوت کا مرحلہ آئے گا۔ اس لیے کہ ہر انقلابی فکر کی propagation' اس کی نشر واشاعت' اس کو پھیلانا' اس کو عام کرنا' اسے ذہنوں میں اُتارنا' اس کو دلائل کے ساتھ حق ثابت کرنا' اس انقلابی عمل کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ لہٰذا اس طرح درمیانی منزل اب پہلی ہوگئی ہے۔

انقلابی عمل کے لیے تنظیم ناگزیر ہے

انقلابی عمل کا دوسرا مرحلہ کیا ہوتا ہے! یہ کہ جو لوگ اس فکر کو قبول کریں انہیں منظّم کیا جائے۔ اس لیے کہ انقلاب بغیر جماعت کے نہیں آتا۔ میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ انفرادی طور پر دین کا کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ انفرادی سطح پر تبلیغ ہوسکتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی سب سے اعلیٰ اور درخشاں مثال حضرت نوح علیہ السلام کی ہے کہ ساڑھے نو سو برس دعوت دیتے رہے۔ سورۂ نوح کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب علیہ السلام نے کس کس طور اور طریقے سے دعوت و تبلیغ کے فریضہ کی انجام دہی کے لیے مساعی کیں اور پھر کتنی حسرت کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا:

رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا ۝٥ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا ۝٦ وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝٧ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝٨ ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝٩

''اے میرے ربّ! میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز تیری طرف بلایا' مگر میری دعوت نے اُن کے فرار ہی میں اضافہ کیا۔ اور جب بھی میں نے اُن کو بلایا تاکہ تو انہیں معاف کر دے' انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے مُنہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اَڑ گئے اور بڑا تکبر کیا۔ پھر میں نے انہیں بآوازِ بلند دعوت دی۔ پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔''

لیکن قوم مُردہ ہو چکی تھی۔ اس نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوتِ توحید کو قبول نہیں کیا' بلکہ اس سے اعراض و انکار کیا۔ ساڑھے نو سو برس کی دعوت و تبلیغ کا جو نتیجہ نکلا اس کو سورۂ ہود کی آیت ۴۰ کے آخر میں بیان کیا گیا ہے: ﴿وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ﴾ ''اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اس (نوحؑ) کے ساتھ ایمان لائے تھے''۔ یہاں ''قلیل'' وہ معنی دے رہا ہے جو انگریزی میں a little دیتا ہے' یعنی بہت ہی کم' معدودے چند۔ قرآن حکیم میں

تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؑ پر ان کے گھر والے ہی ایمان لائے تھے اور ان میں سے بھی ایک بیٹے نے دعوتِ حق قبول نہیں کی تھی‘ وہ کفر پر ہی اڑا رہا تھا۔ ممکن ہے کہ انگلیوں پر گنے جانے والے چند اور لوگ بھی ایمان لائے ہوں‘ بہرحال ساتھی نہ ملے‘ جمعیت فراہم نہیں ہوئی‘ لہٰذا اگلا قدم کیسے اٹھتا! اعوان و انصار نہ ہوں تو اگلی منزل کی طرف پیش رفت کیسے ہو! لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی استقامت و مصابرت دیکھئے کہ ساڑھے نو سو برس دعوت و تبلیغ میں کھپا دیے اور اپنا فرضِ منصبی ادا کر دیا۔ ہمارے لیے اس میں یہ سبق ہے کہ ایک مخلص شخص اپنی پوری زندگی اس کام میں لگا دے‘ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سرخرو اور کامیاب ہوگا۔ معاشرہ اگر مر چکا ہے‘ حق کو قبول کرنے کی صلاحیت معدوم ہو چکی ہے تو کوئی مثبت جواب نہیں ملے گا‘ ساتھی میسر نہیں آئیں گے۔ اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔ چونکہ اگلا قدم اٹھانے اور اگلی منزل کی طرف پیش رفت کرنے کا موقع ہی نہیں ملا‘ لہٰذا وہ بری الذمہ ہے۔

اسی طرح تربیت و تزکیہ‘ تدریس و تعلیم اور تصنیف و تالیف یہ سارے کام دین کے ہیں اور یہ انفرادی طور پر بھی ہو سکتے ہیں اور بحمد اللہ ہمارے یہاں یہ سب ہی کام ہو رہے ہیں۔ لیکن جب آخری منزل اور اصل ہدف کی بات ہوگی جس کو میں اب انقلاب سے تعبیر کر رہا ہوں‘ یعنی دین کا غلبہ‘ دین کا قیام‘ دین کا نفاذ‘ دین کی سربلندی‘ تو کوئی احمق شخص ہی ہو سکتا ہے جو یہ سمجھے کہ یہ کام انفرادی طور پر ممکن ہے۔ بلکہ ایسا خیال رکھنے والا شخص فاتر العقل ہی ہو سکتا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ تنظیم کے بغیر کوئی اجتماعی کام نہیں ہو سکتا‘ چاہے وہ خیر کے لیے ہو چاہے شر کے لیے ہو۔ جو اشخاص لوگوں کی جیبیں کاٹتے ہیں‘ ان کی بھی تنظیم ہوتی ہے۔ ڈاکوؤں کے بھی گروہ (gangs) ہوتے ہیں‘ تنظیم ہوتی ہے۔ تخریب کاری کے لیے بھی تنظیمیں قائم ہیں۔ لہٰذا اقامتِ دین اور اظہارِ دین کے لیے تنظیم اور جماعت ناگزیر ہے‘ اس سے مفر نہیں۔ بقول فیض احمد فیضؔ ؎

جُز دار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ
ناچار گنہگار سوئے دار چلے ہیں!

حضرت نوح علیہ السلام کے بالکل برعکس دوسری مثال میں حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیا کرتا ہوں۔ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ میں جن پانچ اولوالعزم رسولوں کا ذکر ہوا ہے' ان میں زمانی ترتیب کے لحاظ سے اوّلین ہیں حضرت نوح علیہ السلام اور آخری ہیں جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ درمیان میں تین رسول ہیں' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام بالکل وسط میں آتے ہیں۔ اب دیکھئے' اوّل و آخر میں کتنی متضاد کیفیت ہے کہ ایک نے ساڑھے نوسو برس دعوت دی' لیکن کوئی اعوان و انصار نہیں ملے۔ جمعیت ہی فراہم نہیں ہوئی تو اگلا قدم کیسے اٹھے! اور دوسرے کا معاملہ یہ ہے کہ کل بیس برس میں دنیا کا عظیم ترین صالح انقلاب برپا فرما دیا۔ میں بیس سال فتح مکہ اور اس کے بعد غزوۂ حنین کی کامیابی کے اعتبار سے کہہ رہا ہوں' کیونکہ اس کے ساتھ ہی جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلابِ اسلامی کی تکمیل ہو گئی تھی۔ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدّوجُہد میں مابہ الامتیاز اور فیصلہ کن چیز کیا ہے! اسے سورۃ الفتح کی آیات ۲۸'۲۹ کے حوالے سے سمجھئے۔ فرمایا:

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ؕ﴿۲۸﴾ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ......

''وہ (اللہ) ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت کاملہ اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے' اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں......''

بقول شاعر مشرق ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جمعیت اور تنظیم کو تصور میں تو لائیے۔ وہ لوگ کہ جن کی دین سے وابستگی اور دین کے لیے ایثار کا یہ عالم تھا کہ وہ اس شان سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعوان و انصار بنے ہیں کہ ؏ ''ہر چہ باداباد ما کشتی در آب انداختیم'' والا نقشہ ہے۔ جو

غزوۂ بدر سے قبل ایک مشاورت میں کہہ رہے ہیں کہ ''اے اللہ کے رسول (ﷺ)! آپ ہم سے کیا پوچھ رہے ہیں! بسم اللہ کیجیے جو بھی آپ کا ارادہ ہو' کیا عجب کہ اللہ ہمارے ذریعے آپ کو آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما دے۔ جو کہہ رہے ہیں کہ حضورﷺ! آپ ہمیں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھیوں پر قیاس نہ فرمایئے جنہوں نے کہا تھا:

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۝ (المائدۃ)

''پس (اے موسیٰ!) تم جاؤ اور تمہارا ربّ جائے اور دونوں جنگ کرو' ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے۔''

جہاں آپؐ کا پسینہ گرے گا وہاں اپنا خون بہانا ہمارے لیے سعادت ہوگی۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جملہ یاد کیجیے جو کہہ رہے ہیں کہ حضورؐ! آپ ہم سے کیا مشورہ لے رہے ہیں' اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ۔ ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں' ہم آپؐ کی تصدیق کر چکے ہیں' ہم آپؐ کو اللہ کا رسول تسلیم کر چکے ہیں۔ اب خدا کی قسم! اگر آپؐ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں سمندر میں ڈال دیں گے۔ اگر آپؐ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی اونٹنیوں کو دبلا کر دیں گے لیکن برک الغماد تک جا پہنچیں گے (جو عرب کا ایک دور دراز علاقہ ہے جس کی راہ میں لق ودق صحرا پڑتا ہے۔)

یہ ہے وہ فیصلہ کن اور مابہ الامتیاز بات کہ اگر جمعیت نہ ہو' اس میں بنیانِ مرصوص کی کیفیت نہ ہو' اس میں سمع وطاعت کا وصف وجوہر نہ ہو' اس میں نظم وضبط نہ ہو' وہ تربیت یافتہ نہ ہو' اس کو اللہ کی رضا ہر چیز سے زیادہ محبوب نہ ہو' اس کو زندہ رہنے سے زیادہ اللہ کی راہ میں جان دینا عزیز نہ ہو تو اگلی منزلوں کی طرف پیش رفت اور پیش قدمی کے مراحل آئیں گے ہی نہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کو ایسے ساتھی نہ ملے' لہٰذا اگلے مرحلے کا معاملہ درپیش ہی نہ ہوا۔ لیکن آنحضورﷺ کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسے اعوان وانصار مل گئے جنہوں نے دعوتِ توحید پر لبیک کہا' دعوتِ حق کو قبول کیا' اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالا اور انہوں نے دعوت الی اللہ' اعلائے کلمۃ اللہ' شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کے لیے شدائد ومصائب' فقر وفاقہ' کشمکش وتصادم' جہاد وقتال کے مراحل میں جاں نثاری'

قربانی وایثار، صبر وتحمل اور استقامت کی وہ مثالیں قائم کیں کہ ان کی نظیر تاریخ انسانی نہ آج تک پیش کر سکی ہے اور نہ آئندہ پیش کر سکے گی۔ اللہ کی طرف سے حضور ﷺ کو ایسے جاں نثار اصحاب کا ملنا اس لیے بھی تھا کہ اظہارِ دین الحق آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھا' بفحوائے ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾۔ چونکہ آپؐ آخری نبی اور رسول ہیں لہٰذا بنفس نفیس دینِ حق کو ایک نظامِ اجتماعی کی حیثیت سے قائم اور نافذ کر کے تا قیامِ قیامت نوعِ انسانی پر حجت قائم کرنا بھی آپؐ کے فرائض منصبی میں ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔

اب آیئے سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ کی طرف۔ اولوالعزم من الرسل میں سے بالکل وسط میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ آنجنابؑ کی بعثتیں بھی دونوعیتوں کی حامل تھیں۔ ایک آنجنابؑ آلِ فرعون کی طرف رسول تھے۔ ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾﴾ (طٰہٰ) اور دوسرے آپؑ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ آنجنابؑ کی دعا پر آپ کی معاونت کے لیے آپؑ کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت سے سرفراز فرمایا گیا تھا۔ مصر میں دونوں حضرات دعوت وتبلیغ اور بنی اسرائیل کی تربیت و تزکیہ میں ہمہ وقت وہمہ تن لگے رہے' حتیٰ کہ فرعون کے اعراض' سرکشی' دشمنی اور انکار کے باعث ہجرت کا مرحلہ آ گیا اور آپؑ کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکل جائیں۔ آپؑ کے ساتھ لاکھوں کی جمعیت تھی۔ جب آپؑ بنی اسرائیل کے ہمراہ صحرائے سینا پہنچے تو اگلا اور آخری مرحلہ دین کے قیام اور غلبہ کے لیے قتال کا درپیش ہوا اور وحیٔ الٰہی کے ذریعے حکم ہوا کہ ارضِ مقدس (فلسطین) میں داخل ہو جاؤ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا:

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۱﴾ (المائدۃ)

''اے برادرانِ قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے' اور پشت پھیر کر پیچھے مت پلٹو' ورنہ ناکام ونامراد لوٹو گے۔''

لیکن قوم بزدل اور تھڑدلی نکلی اور اس نے کورا جواب دے دیا:

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ (المائدۃ)

''انہوں نے کہا: اے موسیٰ! ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے جب تک وہ (زبردست لوگ) وہاں موجود ہیں۔ بس تم اور تمہارا ربّ' دونوں جاؤ اور لڑو' ہم یہاں بیٹھے ہیں۔''

نتیجہ یہ نکلا کہ انقلابی عمل وہیں رک گیا۔ اگر اقامتِ دین کا کام اجتماعی قوت اور منظم جمعیت کے بغیر ممکن ہوتا تو اللہ کے دو جلیل القدر پیغمبروں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام) کے مبارک ہاتھوں سے تکمیل پا جاتا۔ لیکن ساتھیوں کی بزدلی اور پیٹھ دکھانے کے باعث انقلابی عمل تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو اللہ کی طرف سے بشارت دی تھی کہ ارضِ مقدس تمہارے لیے لکھی جا چکی ہے' اب تمہاری ہمت درکار ہے' پیٹھ دکھاؤ گے تو ناکام و خاسر ہو جاؤ گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کی اس ڈھٹائی' نافرمانی' بزدلی اور کورے جواب سے اتنے آزردہ اور دل گرفتہ ہوئے کہ ان کی زبان پر آ گیا:

رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ (المائدۃ)

''اے میرے ربّ! مجھے تو سوائے اپنی ذات اور اپنے بھائی کے کسی اور پر کوئی اختیار نہیں' پس تو ہم میں اور ان نافرمانوں میں جدائی ڈال دے۔''

قوم کی اس بزدلی اور کم ہمتی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے بطورِ پاداش اپنا حکم سنا دیا:

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ (المائدۃ: ۲۶)

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (ان کی نافرمانی اور بزدلی کی وجہ سے) ان پر ارضِ مقدس چالیس سال تک حرام کر دی گئی ہے۔ اب یہ اسی صحرا میں (اس مدت تک) بھٹکتے رہیں گے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ سے سبق ملتا ہے کہ اگر جمعیت موجود ہو لیکن وہ غیر منظم ہو' اس میں سمع و طاعت کا جوہر نہ ہو' اس میں نظم و ضبط نہ ہو تو بھی انقلابی عمل آخری مرحلہ میں داخل

نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لیے وہ جماعت درکار ہے جس کے متعلق آنحضورﷺ نے فرمایا:

((آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ))(۱)

''(مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ التزامِ جماعت کا' اور سننے اور ماننے کا' اور اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کا۔''

ایک اور روایت میں ((آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ)) کے بعد الفاظ آتے ہیں: ((اَللّٰهُ اَمَرَنِيْ بِهِنَّ)) ''اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے''۔ اس طرح یہ حکم مزید مؤکد ہو جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اقامتِ دین کے مرحلے کو طے کرنے کے لیے ٹھیٹھ اسلامی اصولِ سمع و طاعت پر مبنی ایک منظّم جماعت ناگزیر ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ جہاد کی میں نے جو سطحیں بیان کی ہیں' اُن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بھی جماعتی زندگی لازم ہے۔ اکیلا شخص معاشرے کے دباؤ' نفس کی ترغیبات اور ابلیسِ لعین کی تحریصات کے مقابلے میں مشکل ہی سے ٹھہر سکتا ہے۔

انقلابی دعوت وتربیت اور اس کا ذریعہ

انقلابی جدوجہد میں دعوت کے ساتھ تربیت کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کی اہمیت کو اکبر الٰہ آبادی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
اِن خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر!

علامہ اقبال نے اکبرالٰہ آبادی کو اپنا مرشدِ معنوی مانا ہے۔ اسی حقیقت کو اقبال نے جس طرح ادا کیا ہے اس کی اپنی ایک شان ہے۔ فرمایا: ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹّی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تُو!

اور علامہ کی فارسی شاعری میں یہ مضمون نقطۂ عروج پر آتا ہے۔ ؎

(۱) مسند احمد ۱۳۰/۴۔ وسنن الترمذی' ابواب الامثال' باب ما جاء فی مثل الصلاۃ والصیام والصدقۃ۔

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن!
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!!

یہ تربیت ہے‘ یہ تزکیہ ہے‘ یہ تعلق باللہ ہے‘ یہ رضائے الٰہی کے حصول کی آرزو اور تمنّا ہے۔ ان چیزوں سے وہ اجتماعی طاقت وجود میں آتی ہے جس کو سلطنتِ جم پر دے مارنا ہے‘ جس کو باطل اور طاغوت سے جاٹکرانا ہے۔

انقلابی عمل کے اگلے تین مراحل وہی ہیں جو بیان ہو چکے ہیں: صبرِ محض‘ اقدام اور مسلّح تصادم۔ لیکن یہ جو پہلا مرحلہ ہے‘ جسے انقلابی عمل میں اصل حیثیت و اہمیت اور اوّلیت حاصل ہوتی ہے‘ اس کے دو مرحلے وہ ہیں جہاں جہاد قرآن کے ذریعے ہوگا۔ پہلا مرحلہ نظریاتی تصادم اور نظریاتی کشمکش کا ہے اور اس کے لیے بندۂ مؤمن کے ہاتھ میں جو تلوار ہے وہ قرآن ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا۝﴾ اس کے ساتھ حکمت بھی ہو۔ فرمایا: ﴿ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوْحٰۤى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ کہ اس حکمت کے ذریعے دعوت و تبلیغ ہو۔ یہ قرآن موعظۂ حسنہ بھی ہے۔ فرمایا: ﴿قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ اسی میں جدال بھی ہے۔ مشرکین‘ ملحدین‘ منافقین اور اہل کتاب کے ساتھ مجادلہ کا ذریعہ بھی یہی قرآن ہے۔ سورۃ النحل کی اس آیت میں یہ تمام طریقے نہایت حسین انداز سے آ گئے ہیں: ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ﴾ (آیت ۱۲۵) پس قرآن کی تلوار ہاتھ میں لے کر نظریاتی تصادم اور کشمکش کے میدان میں کود پڑو۔ انذار قرآن کے ذریعے سے ہو۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ﴾ (الانعام:۱۹) تبشیر قرآن کے ذریعے سے ہو۔ میں آپ کو سورۂ مریم کی آیت سنا چکا ہوں جس میں انذار اور تبشیر دونوں کا ذریعہ قرآن ہی کو قرار دیا گیا ہے: ﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا۝﴾ میں اپنے اس احساس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ اس ''بِہٖ'' پر ہمارے اکثر اہلِ علم نے کماحقہٗ توجہ نہیں دی۔ سورۃ الکہف کی پہلی دو آیات میں بھی نہایت خوبصورت اسلوب سے انذار و

تبشیر کے لیے ذریعہ قرآن ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ﴿ؔ۱﴾ قَیِّمًا لِّیُنۡذِرَ بَاۡسًا شَدِیۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡہُ وَ یُبَشِّرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ اَجۡرًا حَسَنًا ۙ﴿۲﴾

''کل حمد و ثنا اور شکر و سپاس اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل فرمائی اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہ رکھی۔ ٹھیک ٹھیک سیدھی بات کہنے والی کتاب' تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کر دے اور ایمان لا کر نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے۔''

تذکیر ہو تو قرآن سے ہو۔ فرمایا: ﴿فَذَکِّرۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مَنۡ یَّخَافُ وَعِیۡدِ ﴿۴۵﴾﴾ (ق)

''پس تم اس قرآن کے ذریعہ سے ہر اُس شخص کو نصیحت کر دو جو میری تنبیہہ سے ڈرے''۔ معلوم ہوا کہ دعوت و تبلیغ کہہ لیں یا نظریاتی تصادم و کشمکش کہہ لیں' اس کا ذریعہ' اس کا آلہ قرآن ہے۔ جبکہ ہم نے تو اِس قرآن کو وعظ کا ذریعہ بھی نہیں بنایا۔ اقبال نے اس کا مرثیہ کہا ہے۔

واعظِ دستاں زن و افسانہ بند معنیٔ اُو پست و حرفِ اُو بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ اُو با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو

یعنی واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھتا ہے۔ اس کے الفاظ بھی پُرشکوہ اور بلند و بالا ہوتے ہیں لیکن معنی و مفہوم کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے۔ اس کا سارا وعظ قرآن کے بجائے خطیب بغدادی اور دیلمی سے ماخوذ ہوتا ہے اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف' شاذ اور مرسل روایات سے رہ گیا ہے۔ ہمارے عام واعظین نہ معلوم کہاں کہاں سے ضعیف حدیثیں لاتے ہیں۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے ہمارے دور میں ضعیف حدیثوں کے حوالے سے تبلیغ ایک باقاعدہ ادارے کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ فضائل کے بیان اور نیکیوں کی تلقین کے لیے اولیائے کرام کی غیر مصدّقہ کرامات کا ذکر ہے۔ وعظ و نصیحت کے لیے ضعیف بلکہ موضوع حدیثوں کا سہارا ہے' حالانکہ موعظہ حسنہ تو یہ قرآن ہے۔ دل کی کایا پلٹ دینے کے

وصف کا حامل یہ قرآن ہے' لیکن تلقین یہ کی جاتی ہے کہ اس کو سمجھنا بھی مت! تفسیر تو درکنار اس کا ترجمہ بھی نہ پڑھنا! اس کی تو بس تلاوت کر کے ثواب حاصل کر لیا کرو! وعظ ونصیحت کے لیے ضعیف روایات یا بے سروپا قصے کہانیاں ہیں' جن کو ایک عام معقول انسان کا ذہن بھی قبول نہ کرے اور ان کو تسلیم کرنے پر اس کا دل تیار نہ ہو۔ اس کے ذریعہ سے ابلاغ کیا ہوگا؟

جیسے کہ میں نے عرض کیا' انقلابی عمل میں پہلا مرحلہ دعوت کا ہے' جس کے لیے نظریاتی تصادم میں ہماری تلوار قرآن ہے اگرچہ اس کا حق ادا کرنا اور اس کو صحیح طور پر استعمال کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ)) کی بشارتِ نبویؐ کو چند سعید روحیں اپنا مقصدِ زندگی بنائیں۔ اُن کو اس کے لیے زندگیاں لگانی ہوں گی۔

دوسرا مرحلہ ہے تربیت۔ اس کے لیے بھی ہمارے پاس اصل تلوار قرآن ہے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ قرآن مدّعی ہے اس حقیقت کا کہ ﴿شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ میں ہوں۔ لیکن ہم نے تزکیۂ نفس کے لیے کہاں کہاں بھیک مانگی ہے اور پھر اس کے لیے فلسفے اور پورے پورے نظام مدوّن کیے ہیں۔ مگر اِس کوچے میں گزر نہیں ہے تو قرآن کا نہیں ہے۔ اقبال نے اس کا بھی نوحہ کیا اور مرثیہ کہا ہے ؎

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست   از شرابِ نغمہ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش   در نمی سازد بقرآں محفلش

''پشمینہ پوش صوفی اپنے حال میں مست اور قوالی کی شراب سے مدہوش ہے۔
اس کے دل میں عراقی کے شعر سے آگ بھڑک اُٹھتی ہے لیکن اس کی محفل میں
قرآن کا کہیں گزر نہیں ہے۔''

اور بالفرض کچھ ہو بھی تو اس کا کوئی اثر نہیں' جو مدّعی ہے ''شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ'' ہونے کا اور جس کے بارے میں اُس کا نازل کرنے والا خود ارشاد فرماتا ہے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ (بنی اسراء یل: ۸۲)

''ہم اس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو اہل ایمان کے لیے شفا اور رحمت ہے۔''

لیکن اس کی ناقدری کا یہ عالم ہے کہ ہم نے سارے کوچے کھنگال لیے' دردر سے بھیک مانگ لی' لیکن یہ دروازہ بند ہے۔ حالانکہ تربیت و تزکیہ بھی اسی قرآن کے ذریعے ہوگا! میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کو بھی اس دور میں اقبال نے خوب پہچانا ہے۔ میں علمائے کرام کی عظمت اور ان کے مقام و مرتبہ کا معترف ہوں' لیکن اس حقیقت کو بیان کیے بغیر بھی چارہ نہیں کہ ان حقائق کا جو انکشاف اقبال پر ہوا ہے اور ان کا جو شعور و ادراک علامہ کو حاصل ہوا ہے وہ مجھے اس دور میں اور کہیں نظر نہیں آتا۔ کس خوبصورتی سے کہتے ہیں: ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است　　زانکہ اُو گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کُنی　　کشتۂ شمشیرِ قرآنش کُنی!

''شیطان کو بالکل ہلاک کر دینا بہت مشکل کام ہے۔ اس لیے کہ وہ انسان کے دلوں میں ڈیرا لگا لیتا ہے اور اس کی رسائی انسان کے دل کی گہرائیوں تک ہے۔ بہتر راستہ یہ ہے کہ اسے قرآن کی حکمت و ہدایت کی شمشیر سے گھائل کر کے مسلمان بنا لیا جائے۔''

غور کیجیے ہر شعر میں احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مفہوم کو کس خوبی سے سمو دیا ہے! یہ حدیث نبویؐ گزر چکی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

((اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ)) (متفق علیه)

''شیطان انسان کے وجود میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے جیسے کہ خون۔''

پہلے شعر میں اس کا حوالہ ہے۔ دوسرا شعر بھی ایک حدیثِ نبویؐ سے ماخوذ ہے۔ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے۔ کسی صحابی نے بڑی ہمت اور جرأت کی (اللہ تعالیٰ انہیں اجر دے' وہ دریافت نہ کرتے تو یہ حکمت ہم تک کیسے پہنچتی) انہوں نے سوال کیا کہ حضور ﷺ! کیا آپ کے ساتھ بھی ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا: ''ہاں ہے' لیکن میں نے اسے مسلمان کر لیا ہے!'' یہ ہے وہ بات جو

دوسرے شعر میں علامہ نے کہی ہے کہ اس قرآن کی شمشیر سے گھائل کر کے شیطان کو مسلمان بنایا جا سکتا ہے۔

اگر زہر ایسا ہے جو پورے وجود میں سرایت کرتا ہے تو یہ قرآن بھی وہ تریاق ہے جو پورے وجود میں سرایت کرتا ہے۔ ظاہر ہے اگر تریاق زہر سے زیادہ مؤثر نہ ہو تو زہر کا اثر کیسے زائل ہوگا! اس بات کو بھی اقبال نے اس طرح کہا ہے ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

یعنی یہ قرآن جب کسی کے اندر سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب آ جاتا ہے۔ اب وہ انسان بالکل بدلا ہوا انسان بن جاتا ہے۔ یہ باطنی انقلاب ہے' اندر کی تبدیلی ہے۔ یہ باطنی انقلاب' یہ اندر کی تبدیلی ایک عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بنتی ہے' ورنہ انقلاب کہاں سے آئے گا۔ ''جہاں دیگر شود'' کا اصل مفہوم تو یہ ہوگا کہ جس انسان کے اندر قرآن کے ذریعے تبدیلی آ گئی اس کے لیے جہاں بدل گیا' اس کی دیکھنے والی نگاہ بدل گئی' اس کا زاویہ نظر بدل گیا' اس کی اقدار بدل گئیں۔ اب اس کے لیے یہ جہاں وہ نہیں ہے' بلکہ ''جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا یہ عالمِ پیر مر رہا ہے'' والا معاملہ ہے۔ جب کسی کے دل میں قرآن اتر جائے تو اس کے لیے اب یہ عالَم نیا عالَم ہے۔ اس کا نقطۂ نظر اور مطلوب و مقصود بدل گیا ہے۔ اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ اگر ایسے فدائین کی ایک منظّم جماعت وجود میں آ جائے جن کے دلوں میں قرآن جاگزیں ہو جائے تو یہ تبدیلی عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اندر جوشِ ایمانی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ اسی قرآن کی بدولت ہی پیدا ہوا تھا۔ یہ مختصر سی اور بے سروسامان جماعت ایک ہاتھ میں قرآن اور ایک ہاتھ میں تلوار لے کر کسریٰ و قیصر یعنی وقت کی دو عظیم سلطنتوں سے جا ٹکرائی تھی اور بیس سال کے مختصر عرصہ میں اول الذکر کو بالکل نیست و نابود کر کے رکھ دیا تھا' جبکہ آخر الذکر کو مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ سے بالکلیہ بے دخل کر دیا تھا اور ان علاقوں پر اللہ کے دین کا جھنڈا لہرانے لگا تھا۔

حاصلِ کلام یہ کہ انقلابی عمل کی دو سطحیں ہیں' یا یوں کہہ لیں کہ جہاد کے دو levels ہیں۔ مجاہدہ مع النفس کے لیے ہمارا آلۂ جہاد قرآن ہے اور نظریاتی کشمکش اور تصادم کے لیے بھی ہماری تلوار قرآن ہے۔

تحدیث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اسی جہاد بالقرآن کا عزم لے کر میں ۱۹۶۵ء کے اواخر میں ساہیوال سے لاہور منتقل ہوا تھا' ورنہ ۱۹۵۴ء میں لاہور سے ایم بی بی ایس کر کے میں ساہیوال میں مقیم ہو گیا تھا۔ لاہور آ کر میں نے بالکل تن تنہا اس کام کو شروع کیا۔ اُس وقت کوئی ساتھی' کوئی ادارہ اور کوئی انجمن نہیں تھی۔ ''میثاق'' کا چارج سنبھالا تو تنہا خود ہی اس کا ایڈیٹر' خود ہی مالک' خود ہی پروف ریڈر' حتیٰ کہ خود ہی اس کا کلرک اور چپڑاسی۔ پھر دارالاشاعت الاسلامیہ قائم کیا تو وہ بھی تنہا' وہی ''میثاق'' والی صورت حال تھی۔ ساتھ ہی مولانا حسرت موہانی کے اس مصرعہ ع ''ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی'' کے مصداق مطب بھی کر رہا تھا' نبضیں بھی دیکھ رہا تھا اور نسخے بھی لکھ رہا تھا۔ اسی دوران کئی علاقوں میں مطالعۂ قرآن کے حلقے قائم کیے اور منتخب نصاب کا درس شروع کیا۔ قرآن کی دعوت کا یہ اعجاز کہ اعوان و انصار ملتے چلے گئے۔ ۱۹۷۲ء کے اوائل میں مَیں نے میثاق میں ''مرکزی انجمن خدام القرآن'' اور اس کے زیرِ انتظام قرآن اکیڈمی کے قیام کا خاکہ پیش کیا۔ الحمدللہ بعض دردمند اور اہلِ دل حضرات نے اس پر لبیک کہی اور ۱۹۷۲ء کے وسط میں باقاعدہ انجمن قائم ہو گئی۔ میں نے انجمن کے خاکے اور پھر دستور کی تقدیم میں یہ شعر درج کیا تھا ؂

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں!
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں!

الحمدللہ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۴ء تک قریباً بارہ سال انجمن کے قیام پر گزر گئے ہیں۔ اس عرصہ میں جو بھی بن پایا ہے اور جس کام کی بھی اللہ کی طرف سے توفیق ملی ہے وہ آپ حضرات کے سامنے ہے۔ انجمن کا قیام' اس کے لیے دفاتر' رہائشی کوارٹرز' ہاسٹل' جامع القرآن قرآن اکیڈمی کی تعمیرات' علوم و معارفِ قرآن کی نشر و اشاعت کے لیے مکتبہ کا

قیام' دعوت رجوع الی القرآن کا پیغام پہنچانے کے لیے پاکستان کے دوسرے شہروں کے دورے اور دروس وخطابات کے ذریعے دین کے جامع تصور کو اُجاگر کرنے کی کوشش' قرآن کانفرنسوں اور محاضراتِ قرآنی کا انعقاد' مختلف شہروں میں قرآنی تربیت گاہوں کا انتظام' ساتھ ہی اسی پیغام کے لیے بیرون پاکستان کے اسفار' میں نے یہ کام صرف اس مقصد کے لیے گنوائے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ ان سب کاموں کو آپ ''جہاد بالقرآن'' کے عنوان کے تحت اپنے حافظے میں درج کر لیں۔

ایک وقت وہ بھی آیا جب خالصتاً اللہ ہی کی طرف سے اس دور کے سب سے مؤثر ذریعہ ابلاغ ٹیلی ویژن پر پورے پندرہ ماہ تک ''الہدیٰ'' کے نام سے قرآن مجید کا پیغام ملک کے گوشے گوشے تک پہنچا۔ پہلی مرتبہ جب اسلام آباد سے ٹی وی کے ایک پروڈیوسر صاحب مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے دفتر میں رمضان المبارک میں روزانہ ''الکتاب'' کے عنوان سے تقاریر کی تجویز لے کر تشریف لائے تو اُس وقت انجمن کی مجلسِ منتظمہ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کر ان سے ملنے گیا۔ انہوں نے کہا کہ پورے رمضان میں روزانہ بارہ منٹ کا ''الکتاب'' کے عنوان سے ایک پروگرام ہوگا' اس میں آپ کو ایک پارے کے بارے میں کچھ بیان کرنا ہوگا۔ میں نے کہا مجھے ایک آیت کے لیے بسا اوقات ایک گھنٹہ درکار ہوتا ہے اور آپ ایک پارے کے لیے مجھے بارہ منٹ عطا کر رہے ہیں' میں اس مختصر سے وقت میں کہوں گا کیا؟ میں نے معذرت کی کہ مجھ میں اس کی نہ صلاحیت ہے اور نہ جرأت۔ آپ کسی اور کو تلاش کیجیے۔ میں دفتر والوں سے یہ کہہ کر کہ ان کی چائے وغیرہ سے تواضع کر کے ان کو رخصت کر دو' انجمن کے اجلاس میں واپس آ گیا۔ ساتھیوں نے پوچھا کہ کون صاحب تھے؟ کیا معاملہ تھا؟ میں نے جب بتایا تو سب اراکین میرے سر ہو گئے کہ آپ نے یہ کیا کیا' وہ پانچ منٹ بھی دیں تو ضرور لے لیں! وہ اس ذریعہ ابلاغ کی اہمیت سے واقف تھے۔ بہرحال اراکین کے اصرار پر میں دوبارہ اٹھ کر گیا' وہ صاحب ابھی چائے پی رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ساتھیوں کے اصرار پر میں یہ پیشکش منظور کرتا ہوں۔

چنانچہ دو سال رمضان المبارک میں روزانہ ''الکتاب'' کا پروگرام ٹی وی پر نشر ہوا' پھر تیسرے سال رمضان ہی میں ''الٓمٓ'' سیریز چلی' پھر ''الہدیٰ'' کا ہفتہ وار پروگرام نشر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے یہ راستہ پیدا فرما دیا۔ پھر بالکل درمیان میں ''الہدیٰ'' کا پروگرام ختم ہو گیا۔ درمیان میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ میں اس پروگرام میں ''مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب'' سلسلہ وار بیان کر رہا تھا۔ وہ نصف ہوا تھا کہ اچانک اس پروگرام کو بند کر دیا گیا۔ لیکن میں قطعی مطمئن ہوں کہ یہ اللہ ہی کا فیصلہ ہے اور اس میں یقیناً خیر ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ (البقرۃ)

''ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔''

اس ''الہدیٰ'' کے پروگرام کے ذریعے ملک بھر میں ایک پیاس پیدا ہوگئی۔ لوگوں کی یہی پیاس ہے جو مجھے کھینچ کر جگہ جگہ لے جا رہی ہے اور عرصہ سے صورت حال یہ ہے کہ میں عموماً لاہور سے ہفتہ کی صبح کو نکلتا ہوں اور جمعرات کی رات یا جمعہ کی صبح کو یہاں واپس پہنچتا ہوں۔ اگر آج شہر شہر جا کر میں قرآن کا پیغام پہنچا رہا ہوں تو ظاہر بات ہے کہ اس کے لیے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ''الہدیٰ'' کے پروگرام کو بنایا' ورنہ ہمیں کون جانتا تھا' اور اگر ہم پچاس برس بھی لگے رہتے تو اپنے محدود ذرائع و وسائل سے اتنا وسیع حلقۂ تعارف پیدا نہیں ہوسکتا تھا اور معاشرے میں اتنی پیاس پیدا نہیں ہوسکتی تھی جو بظاہر احوال نظر آ رہی ہے۔

بہر کیف میں گفتگو کے اختتام سے قبل عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن ہی ہمارا ذریعۂ دعوت ہے۔ نظریاتی تصادم اور کشمکش کے لیے ہماری تلوار قرآن حکیم ہے۔ جہاد بالقرآن ہی ہمارا طریقۂ کار ہے۔ نفس اور شیطان سے کشمکش کے لیے بھی ہمارے ہاتھ میں واحد

تلوارقرآن مجید ہے۔تزکیۂ نفس کے لیے قرآن نے جو پروگرام دیا ہے' اس میں دو مؤثر ترین چیزیں ہیں' ایک قیام اللیل' دوسری اس قیام میں ترتیل کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قرآن کی تلاوت وقراءت۔ ابتدا میں قیام اللیل کا حکم اطلاقی شان کے ساتھ آیا تھا:

يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ (المزمّل)

''اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے (ﷺ)! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم۔ آدھی رات' یا اس سے کچھ کم کرلو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔''

بعد میں جب اس نے ایک معیّن شکل اختیار کی تو حکم آیا:

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ (بنی اسراء یل:۷۹)

''اور رات کو اِس (قرآن) کے ساتھ قیام کرو' یہ تمہارے لیے نفل ہے۔''

رات کا جاگنا اور مجرد جاگنا نہیں' بلکہ قیام میں قرآن کی طویل قراءت وتلاوت' یہ دو ہتھیار ہیں جن سے ایک بندۂ مؤمن کی جہاد بالقرآن کے لیے سیرت کی تعمیر ہوتی ہے اور اس دعوتِ موعظہ اور مجادلہ میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس قرآن کو ہاتھ میں لے کر ہمیں باطل کے خلاف نبرد آزما ہونے اور خود اپنے شیطان اور اپنے نفس سے لڑنے کے لیے اس قرآن کی تلوار کو استعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اَللّٰهُمَّ آنِسْ وَحْشَتَنَا فِيْ قُبُوْرِنَا' اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنَا بِالْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ' وَاجْعَلْهُ لَنَا اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّهُدًى وَّرَحْمَةً ' اَللّٰهُمَّ ذَكِّرْنَا مِنْهُ مَا نَسِيْنَا وَعَلِّمْنَا مِنْهُ مَا جَهِلْنَا' وَارْزُقْنَا تِلَاوَتَهٗ آنَاءَ الَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ وَاجْعَلْهُ لَنَا حُجَّةً يَّا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ ۝۝

۞۞۞

جہاد بالقرآن

کے پانچ محاذ

عنوانات

۞ محاذِ اوّل: جاہلیت قدیمہ	464
جاہلیت قدیمہ کے اجزائے ترکیبی	465
جاہلیت قدیمہ کے خلاف قرآن کی تلوار کا استعمال	468
۞ محاذِ دوم: جاہلیت جدیدہ	470
جاہلیت جدیدہ کا ذکر قرآن میں	472
جاہلیت جدیدہ کے لامحدود گوشے	474
۞ محاذِ سوم: بے یقینی	477
علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی!	478
نورِ وحی سے قبل آنحضور ﷺ کے ایمان کی ماہیت	479
دلکش ترین ایمان کس کا ہے؟	480
۞ محاذِ چہارم: نفس پرستی اور شیطانی ترغیبات	483
کشتۂ شمشیر قرآں نشں کنی	485
۞ محاذِ پنجم: فرقہ واریت	489
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست	490
حاصلِ کلام	493

☆☆☆

الحمد للّٰہ وکفی والصّلوۃ والسّلام علی عبادہ الذین اصطفی
خصوصا علی افضلھم سید المرسلین وخاتم النّبیین
محمدٍ الامین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین...... امّا بعد:
فاعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تَبٰرَكَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِهٖ لِیَكُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرًا ۝
وَقَالَ الرَّسُوۡلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِی اتَّخَذُوۡا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَهۡجُوۡرًا ۝
فَلَا تُطِعِ الۡكٰفِرِیۡنَ وَجَاهِدۡهُمۡ بِهٖ جِهَادًا كَبِیۡرًا ۝ (الفرقان)
وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا (آل عمران:۱۰۳)

صدق اللّٰہ العظیم

خطبۂ مسنونہ' تلاوتِ آیات اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد:

میں نے جہاں تک غور کیا ہے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہماری دینی' ملّی' قومی اور معاشرتی زندگی میں اِس وقت پانچ محاذ ایسے ہیں جو جہاد بالقرآن کے شدید طور پر متقاضی ہیں ـــــ رہا مسلمانوں سے باہر کا دائرہ تو وہ ابھی بڑی دُور کی بات ہے۔ پہلا مسئلہ تو ''Physician heals thyself'' کے مصداق خود اپنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو پوری نوعِ انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے لیے برپا فرمایا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿كُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ﴾ ''تم وہ بہترین اُمت ہو جس کو نوعِ انسانی کے لیے نکالا گیا ہے'' ـــــ دنیا کی دوسری قومیں اپنے لیے جیتی ہیں لیکن تمہیں ان کے لیے جینا ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے' جام رہے؟

ہماری مثال تو اس ساقی کی سی ہے جس کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا جامِ ہدایت تھما دیا ہے اور ایک ایک فردِ نوعِ بشر کو اس سے سیراب کرنا ہماری ذمہ داری ٹھہرائی ہے۔ لیکن میں عرض کرر رہا ہوں کہ یہ تو بہت دور کی بات ہے۔ اِس وقت یہ خیرِ اُمّت اور اُمّتِ وَسَط خود کئی طرح کے ذہنی، فکری، اعتقادی، نفسیاتی، جذباتی اور عملی انتشار سے دوچار ہے اور اسے مختلف روگ لگ گئے ہیں۔ یہ اس وقت نہایت مہلک اور مزمن امراض میں مبتلا ہوچکی ہے ___ اور یہ کوئی دو چار برس کی بات نہیں ہے، ہمارا یہ زوال وانحطاط صدیوں پر پھیلا ہوا ایک عمل ہے۔

لہٰذا پہلی اور مقدّم ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنی ملّت اور معاشرے کے دائرے کے اندر جائزہ لیں کہ اِس وقت وہ کون کون سے فکری، نظریاتی اور عملی محاذ ہیں جن پر ہمیں قرآن مجید کی شمشیرِ بُرّاں کو ہاتھ میں لے کر صف آراء ہونا ہے اور ان کے بارے میں ہمیں قرآن مجید اور سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے کیا بنیادی و اساسی ہدایات ملتی ہیں۔ نیز ان ہدایات کے انطباق کے عملی طریقے اور تقاضے کیا ہیں؟ اس مسئلہ پر غور و فکر کے نتیجے میں اِس وقت پانچ محاذ میرے سامنے آئے ہیں۔

محاذ اوّل

جاہلیّتِ قدیمہ

اس ضمن میں سب سے بڑا محاذ جاہلیّتِ قدیمہ کا ہے۔ بڑا اس اعتبار سے کہ یہ ہمارے عوام کی اکثریت کا معاملہ ہے۔ عوام النّاس کی بڑی عظیم اکثریت کے اندر جاہلیّتِ قدیمہ رچی بسی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ جاہلیّتِ قدیمہ کی اس اصطلاح کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ قرآن مجید اور احادیث شریفہ کی رو سے اسلام سے پہلے کے دور کو ''دورِ جاہلیت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس اصطلاح کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کی حقّانیت، صداقت اور ہدایت کے برعکس جو کچھ بھی پہلے تھا اور جو کچھ اب ہے وہ ''جاہلیت'' ہے۔ جاہلیت کو جہالت کے معنوں میں مت لیجیے گا، یہ خلط مبحث ہو جائے گا۔ ویسے

جہالت کے بھی عربی میں وہ معنی نہیں ہیں جو ہم اُردو میں استعمال کرتے ہیں۔ اُردو میں ہم اَن پڑھ انسان کو جاہل کہتے ہیں' یعنی عالم کے مقابلے میں اُردو میں جاہل کا لفظ مستعمل ہے' جبکہ عربی میں جاہل کا لفظ حلیم کے مقابلے میں بولا جاتا ہے۔ ایک وہ انسان ہے جو بردبار ہے' صاحبِ عقل ہے' غور وفکر کرتا ہے' محض جذبات سے مغلوب نہیں ہوتا' بلکہ عقل کی رہنمائی میں فیصلے کرتا ہے اور اسی کے مطابق اپنی زندگی کا رُخ متعین کرتا ہے۔ عقلی دلیل کی بنیاد پر کسی بات کو قبول یا مسترد کرتا ہے۔ یہ ہے حلیم انسان۔ اور ایک شخص وہ ہے جو جذباتی ہے' اکھڑ ہے' غیر مہذب ہے' ناشائستہ ہے' شہوات وجذبات کی رَو میں بہہ جاتا ہے۔ اس کی عقل پر تعصبات وخواہشات کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا شخص پی ایچ ڈی ہو' بہت تعلیم یافتہ انسان ہو' لیکن اسلام کی رُو سے یہ شخص جاہل ہے۔ جاہل سے ''جہالت'' بنے گا' لیکن اسی لفظ جہل سے ''جاہلیت'' کی اصطلاح بنتی ہے' جس کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام کے ماوراء اور اسلام کے سوا جو کچھ ہے اور جو کچھ تھا!

جاہلیّتِ قدیمہ کے اجزائے ترکیبی

اس جاہلیت کو میں اس وقت دو حصوں میں تقسیم کر کے آپ حضرات کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ ایک جاہلیت قدیمہ ہے۔ یہ وہ جاہلیت ہے جو عرب معاشرے میں اُس وقت نہایت غالب عنصر کی حیثیت سے موجود تھی جس وقت نبی اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی تھی۔ یہ جاہلیت قدیمہ دو چیزوں سے مرکب تھی۔ ایک شرک' یعنی مشرکانہ اوہام' جو توحید کی ضد ہے ــــ اور دوسرے ''شفاعتِ باطلہ'' کا تصور وعقیدہ' جو ایمان بالآخرۃ کی ضد ہے۔

جاہلیتِ قدیمہ میں اللہ کا انکار نہیں تھا۔ مشرکین مکہ اللہ کو مانتے تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والا شخص جو گاہ بگاہ بھی ترجمہ دیکھ لیتا ہے اُس پر یہ حقیقت روشن ہوگی کہ قرآن نے متعدد بار یہ بات کہی ہے کہ اے نبیؐ! اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو یہ لوگ فوراً پکار اٹھیں گے کہ اللہ نے!(۱) اور اے نبیؐ! اگر

---

(۱) ﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ﴾ (لقمان:۲۵)

آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان سے بارش کون برساتا ہے اور اس کے ذریعے سے مردہ زمین سے نباتات کون اُگاتا ہے تو فوراً کہیں گے کہ اللہ![2] —— تو وہ اللہ کے منکر نہیں تھے۔ البتہ انہوں نے اللہ کے ساتھ دیگر معبودوں کی ایک فوج تصنیف کر رکھی تھی۔ کہیں وہ اللہ کے ساتھ جنات کو پوجتے تھے‘ کہیں انہوں نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دے کر اُن کے نام پر دیویاں تراش لی تھیں اور ان کے لیے استھان بنا لیے تھے‘ جہاں وہ چڑھاوے چڑھاتے تھے‘ وہاں جا کر منتیں مانتے تھے اور دعائیں کیا کرتے تھے۔ یہ تھا اُن کا شرک! یہ شرک آج بھی آپ کو اپنے عوام میں بتمام وکمال ملے گا‘ ایک شوشے کا فرق نہیں ہے۔ اس شرک نے صرف ہیئت بدل لی ہے کہ آج پتھر کی بنی ہوئی مورتیاں سامنے نہیں رکھی جاتی ہیں‘ لیکن قبروں کے ساتھ وہی معاملہ ہو رہا ہے جو اُس دَور میں بُتوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ سرِ مُو فرق نہیں۔ عرسوں کے نام سے یہ جو بڑے بڑے میلے ہوتے ہیں ذرا ان میں جا کر دیکھئے کہ وہاں کیا ہوتا ہے! میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ نے عرب کے دورِ جاہلیت کے میلوں کی رودادیں پڑھی ہوں تو وہ شاید ان سے کہیں پیچھے رہ جائیں۔ تو اس جاہلیتِ قدیمہ کا ایک جزو تو یہ شرک ہے!

جاہلیتِ قدیمہ کا دوسرا جزو شفاعتِ باطلہ کا عقیدہ وتصور ہے۔ جب ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ تم مانتے ہو کہ اللہ ہی خالق ہے‘ اللہ ہی مالک ہے‘ اُسی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے‘ اُسی نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے تو ﴿فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ﴾[3] اور ﴿فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ﴾[4] یہ سب کچھ مان کر کہاں سے اندھے ہوئے جا رہے ہو؟ کہاں سے پھرائے جا رہے ہو؟ کہاں سے تمہیں اُچکا جا رہا ہے؟ تمہاری مَت کیوں ماری جا رہی ہے؟ اس کے جواب میں قرآن مجید نے ان کے متعدد اقوال نقل کیے ہیں۔ سورۂ یونس میں ان کا یہ قول نقل ہوا: ﴿وَیَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (آیت ۱۸) کہ ہم ان بتوں کو خالق اور

---

(۲) ﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ (العنکبوت:۶۳)

(۳) ﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ﴾ (غافر)

(۴) ﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ﴾ (الزمر)

مالک تو نہیں مانتے، لیکن ہم کچھ برگزیدہ ہستیاں ضرور مانتے ہیں جن کے نام پر ہم نے یہ بُت بنالیے ہیں۔ یہ ہستیاں مقربین بارگاہِ ربّ العزت ہیں۔ یہ اللہ کے لاڈلے اور چہیتے ہیں۔ فرشتے جن کو ہم نے دیویاں بنایا ہے، یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، اور بیٹیاں بہت لاڈلی ہوتی ہیں، کوئی لاڈلی بیٹی اگر فرمائش کرے تو کوئی باپ اس کی فرمائش کو رد نہیں کرتا۔ لہٰذا ہم جو اِن بُتوں کو پوجتے ہیں تو صرف اس لیے کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی بنیں گے، ہماری شفاعت کریں گے اور وہاں ہمیں چھڑوا لیں گے۔ گویا اللہ کے عدل و انصاف کے آگے یہ روک بن جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الزّمر کی تیسری آیت میں ان کے اس باطل عقیدے کا ذکر فرما کر اس کی قطعی طور پر نفی فرما دی۔ وہاں ارشاد ہوتا ہے:

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ڛ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝

''آگاہ رہو کہ دین خالص اللہ ہی کا حق ہے (ہر نوع کی عبادت، طاعت کا سزاوار اور مستوجب و مستحق صرف اللہ ہے)۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے اس کے سوا دوسروں کو اپنا پشت پناہ اور مددگار بنا رکھا ہے (اس یقین کے ساتھ) کہ ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں، وہ اللہ کے ہاں ہمارے اور اُس کے درمیان عفو و مغفرت کا واسطہ اور ذریعہ بن جائیں اور ہمیں اس کا قرب دلا دیں۔ اے نبیؐ! ان کو متنبہ کر دیجیے کہ) اللہ اُن کے درمیان ان تمام باتوں کا (آخرت میں) فیصلہ فرما دے گا جن میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا، منکرِ حق اور ناشکرا ہوا۔''

تو وہ لوگ آخرت کے منکر نہیں تھے، البتہ آخرت میں محاسبہ سے محفوظ رہنے کے لیے شفاعتِ باطلہ کا تصور رکھتے تھے۔

یہ دو چیزیں یعنی شرک اور شفاعتِ باطلہ کا عقیدہ اصلاً تو ایک ہی ہے۔ انہیں تصویر کے دو رُخ کہہ لیجیے۔ میں نے بغرضِ تفہیم انہیں علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے کہ جاہلیتِ قدیمہ ان دو اجزاء سے مرکب تھی۔ قرآن مجید میں اس جاہلیت قدیمہ کا ذکر نہایت جلی انداز

میں ہے۔ چونکہ اُس دور میں یہی شرک غالب تھا اور اصل گمراہی یہی تھی' لہٰذا مکی سورتوں کا سب سے بڑا مضمون یہی ہے۔ اور جن حضرات کو بھی قرآن مجید سے شغف ہے وہ اس بات کو جانتے ہوں گے کہ قرآن مجید کا دو تہائی حصہ مکی سورتوں پر مشتمل ہے۔ قرآن حکیم میں بار بار مختلف پیرایوں اور مختلف اسالیب میں' مختلف انداز سے اس شرک اور شفاعت باطلہ کے عقیدے کی تردید کی گئی ہے۔ کہیں تمثیلات کے انداز میں سمجھایا جا رہا ہے' کہیں عقلی دلائل کے ذریعے سے جھنجھوڑا جا رہا ہے' کہیں ان ہی کے موقف سے اُن پر حجت قائم کی جا رہی ہے۔ سورۃ الکہف میں تصریف الآیات کے متعلق جو الفاظ آئے ہیں: ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ﴾ (آیت ۵۴) اور ذرا سی ترتیب کی تبدیلی کے ساتھ یہی بات سورۃ الاسراء میں بایں الفاظ آتی ہے: ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؗ﴾ (آیت ۸۹)۔ یہ الفاظ اس بات کے اظہار کے لیے آئے ہیں کہ ہم نے کوئی طرزِ اسلوب اور کوئی اندازِ بیان چھوڑا نہیں ہے کہ جس کے ذریعے اس ضلالت وگمراہی کی نفی نہ کر دی ہو اور اس کا ابطال نہ کر دیا ہو۔ آج اگر کوئی شخص آنکھیں کھول کر اپنے معاشرے کا تنقیدی جائزہ لے تو اسے صاف نظر آ جائے گا کہ ہمارے معاشرے کی عظیم اکثریت بھی انہی دونوں گمراہیوں میں مبتلا ہے۔ اس عظیم اکثریت کا دین اولیاء پرستی' عرس میلے اور تعزیہ پرستی کا دین ہے' قبروں پر حاضری اور وہاں چڑھاوے چڑھانے' منتیں ماننے اور دعائیں مانگنے کا دین ہے۔ نماز روزہ تو اس دین میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ اگر ہو جائے تو بڑی بات ہے' ورنہ یہ اس عوامی دین کے لزوم میں داخل نہیں۔ یہ اکثریت اس وہم میں مبتلا ہے کہ یہ اولیاء کرام جن کی قبروں پر ہم نذر و نیاز چڑھاتے ہیں' آخرت میں ہمارے سفارشی بن جائیں گے' اور پھر ہمارے سب سے بڑے شفیع خود رسول اللہ ﷺ ہوں گے جن کے ہم نام لیوا ہیں۔ چنانچہ کسی محاسبۂ اُخروی کے خوف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جاہلیتِ قدیمہ کے خلاف قرآن کی تلوار کا استعمال

پہلا محاذ یہ جاہلیتِ قدیمہ ہے جس کے خلاف ہمیں تلوار اٹھانی ہوگی۔ لیکن تلوار کون

سی؟ قرآن کی تلوار!...... اس محاذ پر ابلیس کے اس فریب واغوا کے لیے قرآن ہی تلوار کا کام دے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس جاہلیت قدیمہ کے محاذ کے لیے کسی دقیق یا بھاری بھر کم علمی منصوبے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر صرف دورۂ ترجمۂ قرآن کی مہم ہمارے معاشرے میں چل جائے تو وہ لوگوں کے عقائد کی تطہیر کے لیے کافی ہو جائے۔ اس کے لیے دقیق و عمیق تفاسیر کی ضرورت نہیں۔ خوش قسمتی سے ہمارے یہاں ایک کام عظیم پیمانے پر ہو رہا ہے' لیکن کاش کہ وہ کام فضائل سے متعلق ضعیف وشاذ روایات سے بلند تر ہو اور اس کا تعلق ترجمۂ قرآن کے ساتھ قائم ہو جائے کہ ہر مسجد میں فرض نمازوں کے بعد لوگ جمع ہو جائیں اور قرآن حکیم کے متن کے ساتھ کوئی مستند ترجمہ لوگوں کو سنایا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ (ان شاء اللہ العزیز) قرآن مجید کے متن کے ساتھ مجرد ترجمہ اس جاہلیتِ قدیمہ کا قلع قمع کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ اس کے لیے قرآن حکیم کی حکمت کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زنی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لیے میں مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر سمندر میں کہیں تیل گر جائے' فرض کریں کہ تیل کا کوئی ٹینکر پھٹ جائے تو تیل سطح سمندر کے اوپر ہی رہتا ہے۔ بالکل اسی طریقے سے قرآن مجید میں جاہلیت قدیمہ کا جو ابطال اور اس کی جو تردید ہے اور توحید خالص کی جو دعوت اور اس کے لیے جو استدلال ہے وہ بالکل سطح پر ہے' سامنے موجود ہے۔ اس کے لیے گہرائی میں اترنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تو یہ بات جان لیجیے کہ اس محاذ پر جب تک قرآن مجید کے ساتھ جہاد نہیں ہوگا تب تک مشرکانہ اوہام اور شفاعتِ باطلہ کے عقیدے کی تردید ممکن نہیں ہے۔ پھر یہ کہ ہمارے یہاں فرقہ وارانہ انداز سے ان عقائد کے حاملین پر جو تنقیدیں ہوتی ہیں اور جس انداز سے ان کی نفی کی جاتی ہے' اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس طرح تو ضد اور ہٹ دھرمی میں اضافہ ہوتا ہے اور کدورت اور تلخی مزید پختہ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ پھر وہاں معاملہ آ جاتا ہے فرقہ وارانہ عصبیت اور فرقہ وارانہ مفادات کا۔ چنانچہ اس رنگ اور اس انداز میں تردید کرنا اور چند مخصوص چیزوں کو نشانہ بنا کر انہی پر مسلسل گولہ باری کرتے چلے جانا' اس سے کچھ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ قرآن مجید نے اس مسئلہ کا جو "Panoramic View"

لیا ہے اور اسے اس کے پس منظر میں جس قابلِ فہم اور فصیح و بلیغ انداز اور بدیہیاتِ فطرت کے تاروں کو چھیڑنے والے اسلوب میں بیان کیا ہے' اس کے مقابل میں کون مسلمان یہ گمان کرسکتا ہے کہ وہ اس سے بہتر اور دلنشین انداز اور ناقابل تردید دلائل اختیار کر سکتا ہے؟ اور اگر یہ گمان کرے تو کیا اس کا ایمان سلامت رہ جائے گا؟ معاذ اللہ! کیا کوئی مسلمان بقائمیٔ ہوش وحواس یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کا بیان کردہ فلسفہ اور اس کے پیش کردہ دلائل قرآن حکیم کی حکمت اور آیاتِ بیّنات سے زیادہ محکم اور روشن ہیں؟ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ! ..... آیاتِ بیّنات تو وہ ہیں جن کے متعلق سورۃ الحدید میں ارشاد فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝

''وہی (اللہ تبارک و تعالیٰ) تو ہے جو اپنے بندے (محمدؐ رسول اللہ ﷺ) پر روشن اور واضح آیات نازل فرما رہا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور قرآن حکیم کا نزول اُس کی شانِ رأفت اور شانِ رحمانیت و رحیمیت کے مظاہرِ اتم ہیں۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝﴾ (الرحمٰن)

پس اگر ملک گیر پیمانے پر قرآن مجید کے ترجمے کی مہم شروع ہو جائے تو میرے نزدیک یہ ہے پہلے محاذ کے روگ کا مداوا۔ میں نے اس کو نمبر ایک پر اس لیے رکھا ہے کہ عددی اعتبار سے ہماری ملّت اور ہماری قوم کی عظیم ترین اکثریت درحقیقت اسی جاہلیتِ قدیمہ کا شکار ہے۔

محاذ دوم

جاہلیّتِ جدیدہ

جہاد بالقرآن کا دوسرا محاذ جاہلیتِ جدیدہ کے خلاف ہے۔ جاہلیت جدیدہ الحاد و مادہ پرستی کا دوسرا نام ہے۔ اس میں اللہ کا انکار بھی ہے اور بعث بعد الموت کا بھی۔ اس میں مادے (matter) سے ماوراء کسی شے کو تسلیم کرنے سے اعراض اور احتراز ہے۔

اسی جاہلیت جدیدہ کے لیے میں طبیعیاتی عقل پرستی یا Scientific Rationalism کا لفظ بھی استعمال کیا کرتا ہوں۔

جدید دَور کی اس جاہلیت کی عمر قریباً تین سو برس ہے۔ یورپ کے دو ممالک فرانس اور جرمنی میں دو تحریکیں بیک وقت شروع ہوئی تھیں: ایک تحریک اصلاحِ مذہب (Refor m a ion) اور دوسری تحریک احیاء العلوم (Renaissance)۔ بدقسمتی سے اُس وقت یورپ میں عیسائیت کے نام سے جو مذہب تھا وہ نہایت ظالمانہ و جابرانہ اور انتہائی غیر معقول اور بعید از انصاف نظام کا حامل تھا۔ اس میں ملوکیت (Monarchy) اور پاپائیت (Theocracy) کا گٹھ جوڑ تھا۔ اس کی وجہ سے لوگوں میں ردِّعمل کے طور پر مذہب سے ایک نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ اس پس منظر اور اس فضا میں جب سائنس کی ترقی شروع ہوئی تو سائنس کی جڑوں میں الحاد پیوست ہو گیا اور سائنسی نقطۂ نظر یہ بن گیا کہ جو چیز verifiable نہیں ہے جس کی ہم توثیق یا تردید نہیں کر سکتے' اس کی طرف کوئی توجہ نہیں ہونی چاہیے' یہ چیزیں لائق اعتناء نہیں ہیں۔ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ ہم یقین کے ساتھ یہ جان سکیں کہ اللہ موجود ہے یا نہیں ہے' تو اس پر ایمان چہ معنی دارد! اسی طرح ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں کہ ہم کہہ سکیں کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں ہے۔ اس کا ہمارے پاس نہ کوئی سائنسی ثبوت ہے اور نہ کسی نے موت کی سرحد پار کرنے کے بعد پھر واپس آ کر ہمیں خبر دی ہے۔ لہٰذا اس کو چھوڑیئے' یہ خواہ مخواہ کے ڈھکوسلے ہیں۔ کوئی اسے "Dogma" کے طور پر مانتا ہے تو مانتا رہے' لیکن یہ کوئی قابل توجہ مسئلہ نہیں ہے۔ اسی طریقے سے کوئی ثابت نہیں کر سکتا کہ ہمارے جسم میں جو جان (life) ہے' اس کے علاوہ روح نام کی بھی کوئی شے ہے۔ اس کی آج تک کوئی توثیق (verification) نہیں ہو سکی' لہٰذا اس مسئلہ کو چھوڑ دو۔ معقول طرزِ عمل یہی ہے کہ جو چیزیں موجود ہیں' ٹھوس ہیں' قابل تصدیق ہیں' ہمارے حواسِ خمسہ کے دائرے میں آتی ہیں اُن ہی پر توجہ مرتکز رکھو۔ لہٰذا طبیعیاتی عقل پرستی کا فارمولا یہ بنا کہ چونکہ اللہ ایک خیالی و تصوّراتی چیز ہے جب کہ کائنات ایک حقیقت ہے' روح بھی ایک تصوراتی چیز

ہے جب کہ مادہ اور جسم ایک ٹھوس حقیقت ہے' اور حیاتِ اُخروی بھی اسی قبیل کی شے ہے جب کہ حیاتِ دُنیوی ایک حقیقت ہے اور اس سے ہر وقت' ہر لمحہ اور ہر لحظہ سابقہ ہے' لہٰذا ماورائے حواس اور خیالی وتصوراتی باتوں پر غور کرنا وقت کا زیاں ہے۔ اس کے بجائے ہماری توجہات کا ارتکاز اُن چیزوں پر ہونا چاہیے جو ٹھوس ہیں' نگاہوں کے سامنے ہیں' حواس کی گرفت میں آنے والی ہیں' قابل توثیق ہیں اور جن سے ہمیں ہر دم واسطہ پڑتا ہے۔ یہ ہے اصل میں اِس دَور کی جاہلیت' یعنی جاہلیتِ جدیدہ کا صغریٰ کبریٰ۔

جاہلیّتِ جدیدہ کا ذکر قرآن میں

اس موقع پر میں آپ سے یہ عرض کردوں کہ یہ نہ سمجھئے کہ یہ بالکل نئی جاہلیت ہے۔ دبے دبے انداز میں ایک محدود پیمانے پر الحاد و مادہ پرستی پر مشتمل یہ جاہلیت' جس کے لیے موزوں ترین لفظ ''دہریت'' استعمال کیا جاسکتا ہے' بعثتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے وقت بھی موجود تھی۔ میں حیران ہوں کہ قرآن مجید میں ایک ہی جملہ میں اُس قلیل گروہ کے فلسفہ دہریت کو اس طور سے بیان کر دیا گیا ہے کہ دورِ جدید کی ہر نوع کی جاہلیت اور دہریت کی طرف بھی اس میں واضح اشارات موجود ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے' جس کے متعلق نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس میں پچھلے زمانے کی خبریں بھی ہیں اور آنے والے زمانے کی بھی۔ تو قرآن کا یہ ایک جملہ دہریت والحاد کے تمام مکاتیب فکر کی نمائندگی کرتا ہے: ﴿وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ﴾ (الجاثیہ:۲۴) اس مکتبِ فکر کا قول نقل فرمایا گیا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی تو بس ہماری یہی دنیا کی زندگی ہے۔ یعنی ہم نہیں مانتے کہ اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہے۔ پھر یہ کہ ایسی کوئی بالاتر طاقت یا ہستی نہیں ہے جس کے فیصلے سے ہمارا یہ مرنا اور جینا ہو رہا ہو۔ ہم خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی زندہ ہوتے ہیں...... جبکہ قرآن مجید میں اس کے بالکل برعکس حقیقت بیان ہوتی ہے: ﴿يُحْيِ وَيُمِيْتُ﴾ ''وہ (اللہ) ہی زندہ رکھتا ہے اور وہی موت دیتا ہے''۔ یہ کارگاہِ موت وحیات اُسی کی تخلیق ہے: ﴿اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ﴾ ''وہی ہے

جس نے موت اور زندگی کی تخلیق فرمائی''۔ لیکن یہاں نسبت اپنی طرف ہے: ﴿نَمُوْتُ وَنَحْيَا﴾ ''ہم خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی جیتے ہیں''۔ ﴿وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ﴾ ''اور ہمیں ہلاک کرنے والی چیز بھی سوائے گردشِ افلاک کے اور کچھ نہیں''۔ ایک نظام رواں دواں ہے۔ کچھ قوانینِ طبیعیہ (Laws of Nature) ہیں جن کے تحت اس کائنات کا کارخانہ چل رہا ہے۔ لوگ پیدا ہوتے ہیں' جیتے ہیں' مرتے ہیں۔ کسی بالاتر طاقت اور موت کے بعد دوبارہ وجود اور کسی دوسری زندگی کو ہم نہیں مانتے.....!

بتایئے کہ اِس دَور کی جدید جاہلیّت اس سے آگے اور کہاں جائے گی؟ بلکہ آج کے دور کے سائنٹیفک ذہن رکھنے والے لوگ تو پھر بھی محتاط الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ باتیں حقیقت رکھتی ہیں یا نہیں! ہم کوئی حتمی حکم نہیں لگا سکتے کہ اللہ ہے یا نہیں! آخرت ہے یا نہیں! اس طرح سے وہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو شکوک وشبہات میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل اس دَور کے عظیم ترین اور نہایت مسلّمہ فلسفیوں میں سے تھا اور اس نے الحاد و مادیت اور دہریت کے فلسفے کا پرچار اور اللہ' آخرت' روح اور اخلاق کا ابطال جس بڑے پیمانے پر اور جس مقبولِ عام اور دلنشیں اسلوب و انداز سے کیا ہے' اس کا صحیح اندازہ ہم کو نہیں ہے۔ اس نے ہماری نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اکثریت کے اذہان کو مغلوب کر رکھا ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی سورۃ الجاثیہ کی ایک آیت کے ابتدائی حصے کے حوالے سے بیان کیا ہے' اس نوع کی جاہلیت کے جراثیم اگرچہ وہاں بھی موجود تھے' لیکن اُس دور میں ایسے مسخ شدہ ذہنیت والے دانشور آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ وہاں جو غالب جاہلیت تھی اسے میں جاہلیت قدیمہ کے ضمن میں بیان کر چکا ہوں۔ یعنی اللہ کو ماننے کے ساتھ جھوٹے معبودوں کا اقرار اور اُن کی پوجا پاٹ' اور آخرت کو ماننے کے ساتھ شفاعتِ باطلہ کا تصور وعقیدہ ـــــ جس پر قرآن میں نہایت واضح اور نمایاں انداز میں بحث کر کے اُس کا پوری طرح سے ابطال کیا گیا ہے۔ البتہ جاہلیتِ جدیدہ کا معاملہ چونکہ وہاں بہت کم تھا لہٰذا اس پر قرآن مجید میں بحث اس انداز میں نہیں ہے جس طرح

جاہلیت قدیمہ کے ضمن میں کی گئی ہے۔ لیکن اس معاملے میں بھی قرآن حکیم بھرپور رہنمائی فراہم کرتا ہے اور یہ رہنمائی اُن باصلاحیت' باہمت اور ذہین لوگوں کے لیے ہے جو کمر کس لیں اور پھر قرآن حکیم کی آیات بیّنات میں غوطہ زنی کریں اور جدید اسلوب و انداز کے ساتھ اس کا ابلاغ واعلام کریں اس لیے کہ زمانہ اور اس کے تقاضے بدل گئے ہیں' جن اصطلاحات میں لوگ بات سمجھتے ہیں وہ اصطلاحات بدل گئی ہیں۔ اگر آپ بہترین اور مُسکِت بات قدیم اصطلاحات میں کہیں گے تو یہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس کے لیے استدلال آپ کو جدید اصطلاحات میں ڈھال کر پیش کرنا ہوگا۔ پھر یہ کہ اس جاہلیت جدیدہ کے لیے اس دور میں جو عقلی مواد فراہم کیا گیا ہے' اس کے ابطال کے لیے آپ کو عقلی دلائل لانے ہوں گے۔ اگرچہ ان تمام کاموں کے لیے اصل تلوار قرآن ہی کی استعمال ہوگی' لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ اس میدان میں سخت محنت کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لیے قرآن حکیم میں غوطہ زنی کرنی ہوگی جس کے لیے کچھ نوجوانوں کو اپنی پوری پوری زندگیاں وقف کرنی ہوں گی۔

جاہلیّتِ جدیدہ کے لامحدود گوشے

جاہلیّتِ قدیمہ کے برعکس جاہلیت جدیدہ کئی گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ بے خدا سائنس اور فکر و فلسفہ کی جولانگاہیں لامحدود ہیں۔ اس دور میں علم الحیاتیات اور علم الحیوانات کی طرح کی "Physical Sciences" بھی ہیں' پھر "Social Sciences" بھی ہیں' جن کا دائرۂ کار وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے۔ اور یہ بات جان لیجیے کہ ڈارون کا فلسفۂ ارتقاء اب صرف حیاتیات کے میدان تک محدود نہیں رہا ہے' اس نے انسان کی معاشرتی اقدار اور تمدنی و تہذیبی فکر' حتیٰ کہ فلسفۂ اخلاقیات تک کو تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ اور یہ فلسفہ انسان کو محض ایک ترقی یافتہ حیوان کی سطح پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اس فلسفہ نے حیوانی شہوات و داعیات کی تسکین کے لیے انسان کو حیوانات کی طرح کھلا لائسنس دے دیا ہے۔ چنانچہ ہمیں اس زہر کا تریاق فراہم کرنا ہوگا۔ پھر ماہرین نفسیات نے نفسیات (Psychology) کے میدان میں جو گل کھلائے ہیں اور جس طرح کی

گمراہیاں پھیلائی ہیں‘ ان سب کا ابطال کرنا ہوگا۔ اس میدان میں سب سے بڑی گمراہی فرائیڈ کی پیدا کردہ ہے جس نے انسان کے تمام محرکاتِ عمل کو جنسی جذبے کے تابع قرار دے دیا ہے۔ اسی طرح عمرانیات (Socialogy) کے میدان میں جو بھی باطل اور گمراہ کن نظریات درآئے ہیں‘ ان سب کا توڑ کرنا ہوگا۔

مارکسزم (Marxism) اِس دَور کا سب سے مقبول فکر ہے جس کا صرف اذہان ہی پر نہیں‘ بلکہ دنیا کے قابل ذکر ممالک پر عملاً اس نظامِ فکر کا استیلاء وتسلّط ہے۔ مارکسزم اور کمیونزم کے متعلق یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ مادیت ہی کا نقطۂ عروج ہے۔ مادیت (Materialism) ہی اپنی انتہا کو پہنچ کر جدلی مادیت (Dialectical Materialism) کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اور جیسے ڈارون کے نظریے نے اخلاقیات‘ معاشرت اور عمرانیات میں نفوذ کر رکھا ہے‘ اسی طرح مارکسزم کے نظریے نے انسان کی اخلاقی قدروں اور انسانی تہذیب کے تصورات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس نے دین و مذہب کے عقائد کی بنیادیں ڈھا کر رکھ دی ہیں اور اپنے ماننے والوں کو مکمل طور پر دہریہ و ملحد بنا کر رکھ دیا ہے۔ انسان کے ماورائی عقائد اور اخلاقی قدریں اس فکر و نظریہ کے تحت آ کر بالکل نیا رُخ اختیار کر گئی ہیں۔

الغرض اس تیسرے محاذ یعنی جاہلیت جدیدہ کی کوکھ سے بہت سے فتنے جنم لے چکے ہیں۔ ان سب کے خلاف محاذ آرائی کرنی ہوگی۔ اس جاہلیتِ جدیدہ کے ابطال کے لیے خود اس کے اندر بہت سے محاذ کھولنے ہوں گے۔ لہٰذا ان میں سے ہر ایک کے مقابلے کے لیے ضرورت ہے کہ چند باصلاحیت نوجوان اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ باہمت‘ محنتی اور کام میں غرق ہو جانے والے ہوں۔ ایسے نوجوانوں کے لیے نبی اکرم ﷺ کی بشارت ہے: ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ)) ’’تم میں سے بہترین انسان وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں‘‘۔ قرآن حکیم کے معارف و حکم سے خود بھی بہرہ مند ہوں اور خلقِ خدا کو بھی مستفید کریں۔

جاہلیت قدیمہ کا ابطال‘ جیسا کہ میں نے عرض کیا‘ محض ترجمۂ قرآن سے بھی

ہو جائے گا' لیکن اس جاہلیت جدیدہ کے ابطال اور اس کی بیخ کنی کے لیے قرآن حکیم میں غور و تدبّر کرنا ہوگا اور اس کے معانی و مفاہیم کے جواہر کی بازیافت کے لیے قرآن کے بحرِ بیکراں میں غوطہ زنی کرنی ہوگی۔

ایک طویل حدیث میں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' قرآن حکیم کی شان میں یہ الفاظ آئے ہیں:

((وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ))(۱)

''علماء کبھی اس کتاب سے سیر نہ ہو سکیں گے' نہ کثرت و تکرارِ تلاوت سے اس کے لطف و تأثیر میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات (یعنی نئے نئے علوم و معارف) کا خزانہ کبھی ختم ہو سکے گا۔''

قرآن مجید کی یہ تین شانیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمائی ہیں' ان میں سے آخری شان میری اس گفتگو سے بہت زیادہ متعلق ہے۔ایک ہیرے کی کان کا تصور کیجیے' جس میں کارکن لگے ہوئے ہیں اور ہیرے برآمد کر رہے ہیں۔لیکن ایک وقت ایسا آ کر رہتا ہے کہ کان خالی ہو جاتی ہے اور ہیرے دستیاب نہیں ہوتے۔لیکن قرآن ایسی معدن' ایسی کان نہیں ہے کہ جس کے متعلق کبھی یہ کہا جا سکے کہ حکمت کے موتی اب اس میں سے مزید نہیں نکل سکتے۔قرآن تو اُس اتھاہ سمندر کے مانند ہے کہ انسان اس کی جتنی گہرائیوں میں جائے گا اتنے ہی اعلیٰ دُرِّ شہوار نکال کر لائے گا اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیش جاری و ساری رہے گا۔لیکن ظاہر ہے کہ قرآن کی حکمت کے سمندر میں غوطہ زنی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔اس بحر کی گہرائیوں سے حکم و معارف کے موتی نکال لانے کے لیے جان گسل کوشش اور پتّا مار کر محنت کرنا ہوگی۔لہٰذا ذہین و باصلاحیت اور دولتِ ایمانی کے حامل حضرات کو اس بحرِ زخّار کی غوّاصی سے ہر دَور کے تمام باطل نظریات اور خدا ناآشنا افکار کے ابطال کے لیے نہایت محکم دلائل اور قاطع براہین ملتے رہیں گے' جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((وَلَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ)) پس اس دوسرے محاذ پر یعنی جاہلیت جدیدہ سے نبرد آزما ہونے کے لیے بھی ہمیں قرآن کی شمشیرِ برّاں ہاتھ میں لے کر مورچہ لگانا ہوگا۔

(۱) سنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء فی فضل القرآن۔

محاذ سوم

بے یقینی

ہمارے معاشرے میں معتد بہ تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو بحمداللہ شعوری سطح پر جاہلیت قدیمہ اور جدیدہ دونوں سے بچے ہوئے ہیں' لیکن ان کی بیماری ایک تیسری نوع کی بیماری ہے اور وہ ہے بے یقینی کی بیماری۔ یعنی مثبت طور پر جو یقین ہونا چاہیے انہیں وہ میسّر نہیں ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ محض منفی چیزوں سے اگر آپ نے خود کو بچا بھی لیا تو اس سے آپ کے اخلاق و کردار پر اور آپ کی زندگی کے رُخ پر کوئی فیصلہ کن اثر مترتّب نہیں ہوسکتا جب تک کہ مثبت طور پر یقین نہ ہو۔ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ کے درس کے ضمن میں مَیں نفاق اور ایمان کے بارے میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ ان دونوں کو یوں سمجھئے کہ نفاق ایک منفی قدر (minus value) ہے اور ایمان ایک مثبت قدر (plus value) ہے۔ پھر اس مثبت قدر میں درجہ بدرجہ اضافہ ہوتا ہے۔ ایک میرا اور آپ کا ایمان ہے' ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم' عشرہ مبشّرہ اور بالخصوص انبیاء و رُسل علیہم الصّلوٰۃ والسلام کا ایمان ہے۔ تو یوں سمجھ لیجیے کہ یہ معاملہ لا محدود درجے (plus infinity) تک چلتا جائے گا۔ اسی طرح نفاق کا معاملہ ہے۔ اس کا ایک نقطۂ آغاز بھی ہے اور اس کا تیسرا درجہ بھی ہے' جہاں پہنچ کر یہ ٹی بی کے مرض کی طرح لاعلاج ہو جاتا ہے۔ نفاق اور ایمان کے مابین ایک اور مقام ہے جسے میں "zero level" سے تعبیر کرتا ہوں۔ میں نے جس تیسرے طبقے کا ذکر کیا ہے' بدقسمتی سے اس کی اکثریت اسی سطح پر کھڑی ہے۔ یعنی کوئی منفی چیز بھی نہیں ہے' نہ جاہلیتِ قدیمہ ہے نہ جاہلیتِ جدیدہ ___ کم از کم شعوری سطح پر نہیں ہے ___ لیکن مثبت طور پر یقینِ محکم والا ایمان بھی نہیں ہے اور اس کی طرف کوئی پیش قدمی بھی نہیں ہو رہی۔ تو ضرورت اسی یقینِ محکم اور ایمانِ کامل والے ایمان کی ہے' جیسے کہ علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

ایمان جب یقین کی شکل اختیار کرے گا جب ہی تو اس میں ایک قوت پیدا ہوگی! جب ہی وہ شخصیت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالے گا اور پوری شخصیت کی کایا پلٹ دے گا!

سورۃ الحجرات ہی کی آیت ۷ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ ''اللہ نے ایمان کو تمہارے نزدیک بہت محبوب کر دیا ہے اور اس کو تمہارے دلوں کے اندر مزین کر دیا ہے''۔ نورِ ایمان نے تمہارے دلوں کو منور کر دیا ہے۔ یہ ایمان اللہ کے فضل و کرم سے تمہارے دلوں میں راسخ اور جاگزیں ہو گیا ہے۔ جب تک یہ کیفیت نہ ہو' ایمان کے اثرات انسان کے سیرت و کردار' معاملات اور عملی رویے پر مترتب نہیں ہوں گے۔ اب اس بے یقینی کا علاج کہاں سے لایا جائے؟ اس کا دارو کہاں ملتا ہے؟

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

اسی قرآنِ حکیم کی آیاتِ بیّنات ہی سے اس بے یقینی کا علاج ہوگا۔ بقول مولانا ظفر علی خان مرحوم:

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئے دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں!

یقین والے ایمان کا اصل ذریعہ (source) قرآن ہے۔ اگرچہ اس کا ایک ذریعہ اور بھی ہے' لیکن وہ ثانوی ہے۔ صاحبِ یقین کی صحبت سے بھی یقین والا ایمان پیدا ہوتا ہے ؏ ''صحبتِ صالح ترا صالح کند''۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صاحبِ یقین کے قرب کی مثال ایسے ہے جیسے آگ کی ایک بھٹی دہک رہی ہو' آپ اس کے قریب جائیں گے تو حرارت آپ کو پہنچ کر رہے گی۔ یہ قانونِ طبعی ہے۔ برف کی سل کے پاس بیٹھیں گے تو برودت تو آپ سے آپ پہنچے گی۔ تو اگر کسی کے دل میں یقین والے ایمان

کی شمع روشن ہے تو آپ اگر اُس کے قریب رہیں گے، اس کی صحبت سے فیض اٹھائیں گے تو آپ کو بھی یقین کی دولت ملے گی۔ لیکن میں اس کو جو ابھی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہمیں پہلے یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ صاحبِ یقین کہاں سے آئے؟ تو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ ایسے صاحبِ یقین پیدا کرنے کا واحد ذریعہ بھی قرآن حکیم ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت میں یہ دوں گا کہ دنیا کے سب سے عظیم صاحبِ یقین، جن سے بڑا کوئی صاحبِ یقین ہو ہی نہیں سکتا، خاتم النّبیّین، سیّد المرسلین حضرت محمد ﷺ ہیں۔ قرآن مجید میں سورۃ الشوریٰ کی آخری سے پہلی آیت یعنی آیت ۵۲ میں نبی اکرم ﷺ کے ایمان و یقین کا تجزیہ کر کے بتا دیا گیا کہ حضور ﷺ کو ایمان و یقین کہاں سے ملا! ارشاد فرمایا گیا:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۙ

''اور (اے نبیؐ!) اسی طرح ہم نے اپنے امر سے ایک روح (یعنی یہ قرآن مجید) آپؐ کی طرف وحی کیا ہے' (اس سے پہلے) آپؐ کو معلوم نہ تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے! لیکن ہم نے اس (قرآن) کو نور بنا دیا جس کے ذریعہ سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں اور (اب جبکہ آپ ﷺ حاملِ قرآن بن گئے تو) آپؐ یقیناً نوعِ انسانی کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیں گے۔''

نورِ وحی سے قبل حضور ﷺ کے ایمان کی ماہیت

یہاں مجھے تھوڑی سی وضاحت کرنی ہوگی' مبادا مغالطہ ہو جائے۔ یہاں اشکال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضور ﷺ وحی کے نزول سے قبل مؤمن نہیں تھے؟ اسی نوع کی ایک بحث ہمارے یہاں حضور ﷺ کے آباء و اجداد کے بارے میں بھی چلتی ہے کہ کیا جناب عبداللہ' جناب عبدالمطلب' جناب آمنہ کو ہم کافر یا مشرک کہیں گے؟ یہ بحثیں عوامی سطح پر ہوتی ہیں اور اس میں بڑی جذباتیت آ جاتی ہے۔ تو جان لیجیے کہ قرآن مجید ہمیں سورۃ النور کی آیتِ نور کے ذریعے یہ بتاتا ہے کہ نورِ ایمان کے دو اجزائے ترکیبی ہیں' ایک نورِ فطرت

اور ایک نورِ وحی ۔نورِفطرت کی مثال صاف شفاف روغن کی ہے جو گویا بھڑ کنے کے لیے بے تاب ہوتا ہے چاہے دیا سلائی ابھی اس کے قریب نہ آئی ہو جیسے پٹرول ۔تو درحقیقت انسان کی فطرت میں ایمان کا نُور بالقوّہ (potentially) موجود ہوتا ہے' البتہ اس پر پردے پڑ جاتے ہیں ۔بعض لوگوں کے وہ پردے اتنے دبیز اور بھاری ہوتے ہیں کہ اٹھائے نہیں اٹھتے ۔نورِ وحی بھی آ کر اُن لوگوں کے ان پردوں کو چیر کر دل کے اندر موجود نورِفطرت کے روغن تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا ۔لہٰذا ایسے لوگ نورِ ایمان سے محروم رہ جاتے ہیں ۔لیکن اس کے برعکس وہ شخص جس کے قلب پر کوئی حجاب نہیں' یعنی سلیم الفطرت اور سلیم القلب انسان' (جیسا کہ قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ﴾ (الصّٰفّٰت) تو اس کے پاس جیسے ہی نورِ وحی آتا ہے تو یوں سمجھئے جیسے کہ آئینے کے سامنے روشنی آ گئی ۔لہٰذا نورِ وحی سے اس کا آئینہ قلب جگمگا اٹھتا ہے ۔تو یہ ہے مثال نورِفطرت اور نورِ وحی کی ۔اسی کو سورۃ النّور میں نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔لہٰذا ہم یوں کہیں گے کہ نبی اکرم ﷺ کے قلب مبارک میں ایمان بالقوہ یا dormant form میں تو موجود تھا' لیکن اس کو تحریک وحی سے ملی' وحی نے اسے متحرک کیا' اسے actualise کیا ۔یہ ہے مفہوم ان الفاظِ مبارکہ کا: ﴿مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ﴾

سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات جن کے متعلق صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ یہ آیات حضور ﷺ کو شبِ معراج میں اُمت کے لیے بطور تحفۂ خاص عطا ہوئی تھیں' ان میں سے پہلی آیت میں قرآن حکیم پر پہلے خود نبی اکرم ﷺ کے ایمان لانے کا ذکر ہے اور پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان لانے کا: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ﴾

دلکش ترین ایمان کس کا ہے؟

اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کی ایک بڑی پیاری حدیث مشکوٰۃ شریف کے آخری باب: باب ثواب هٰذِهِ الْاُمَّة میں امام بیہقیؒ کی ''دلائل النبوۃ'' کے حوالے سے آئی ہے۔ اس حدیث کو حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد کے واسطے سے اپنے دادا سے روایت کرتے

ہیں۔ چشمِ تصوّر سے دیکھیے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ مسجد نبوی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مجلس میں رونق افروز ہیں۔ آپؐ صحابہؓ سے سوال کرتے ہیں: ((اَیُّ الْخَلْقِ اَعْجَبُ اِلَیْکُمْ اِیْمَانًا)) ''مجھے بتاؤ تمہارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے؟'' اعجب' عجیب سے اسم تفضیل ہے۔ اردو میں عجیب کا لفظ حیران کن یا غیر معمولی بات کے لیے مستعمل ہے' لیکن عربی میں عجیب دل کو لبھانے والی شے کو کہتے ہیں' یعنی دلکش اور دل خوش کن چیز۔ سورۃ الاحزاب میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ فرمایا گیا: ﴿وَلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ﴾ (آیت ۵۲) ''اور چاہے ان کا حسن آپؐ کے دل کو کتنا ہی لبھانے والا کیوں نہ ہو''۔ سورۃ المنافقون میں ارشاد ہوا: ﴿وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ﴾ (آیت ۴) ''اور جس وقت آپؐ ان کو دیکھتے ہیں تو اُن کے بدن آپ کو خوش لگتے ہیں''۔ تو حضور ﷺ نے صحابہؓ سے دریافت فرمایا کہ تمہارے نزدیک سب سے زیادہ دلکش' دل کو لبھانے والا اور حسین ایمان کس کا ہے؟ یہ بھی حضور ﷺ کی تعلیم و تربیت کا ایک انداز ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: ''فرشتوں کا''۔ حضور ﷺ نے اس کو ردّ فرما دیا: ((وَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ)) ''وہ ایمان کیسے نہیں لائیں گے جبکہ وہ اپنے ربّ تعالیٰ کے پاس ہیں!'' ان کے لیے تو غیب کا پردہ حائل نہیں ہے۔ وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں تو اس میں کون سا کمال ہے؟ پھر صحابہؓ نے عرض کیا: فَالنَّبِيُّوْنَ ''پھر نبیوں کا ایمان ہے!''

حضور ﷺ نے فرمایا: ((وَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَالْوَحْيُ يَنْزِلُ عَلَيْهِمْ)) ''وہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے جبکہ اُن پر وحی نازل ہوتی ہے!'' انبیاء علیہم السلام پر اللہ کا فرشتہ وحی لے کر نازل ہوتا ہے' انہیں غیب کی خبروں سے مطلع کرتا ہے' پھر اللہ ان کو اپنی نشانیوں میں سے کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کراتا ہے۔ لہٰذا وہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے اور ان کا ایمان ''اعجب'' کیسے ہوگا! تیسری بار صحابہ کرامؓ نے بڑی ہمت و جرأت کر کے اور ڈرتے ڈرتے عرض کیا: فَنَحْنُ ''پھر ہم ہیں''۔ ہمارا ایمان اعجب ہے۔ حضور ﷺ نے اس کو بھی ردّ فرما دیا: ((وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ وَاَنَا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ)) ''تم کیسے ایمان نہ لاتے جب کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں''۔ یعنی اللہ کی سب سے بڑی نشانی اور اس کا سب سے بڑا معجزہ

تمہارے سامنے ہے۔تم کو میرے دیدار اور میری صحبت کا فیض حاصل ہے۔ میری ذات سے جن برکات کا ظہور اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا جو نزول ہو رہا ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ انتہائی قلیل تعداد اور بے سروسامان ہونے کے باوجود اللہ کی نصرت و تائید سے تمہیں مشرکین و کفار پر جو فتوحات حاصل ہو رہی ہیں' ان کا تم اپنی چشم سر سے ہر لمحہ مشاہدہ کرتے ہو۔ میں نے بنفسِ نفیس تمہیں توحید کی دعوت پہنچائی ہے' تم پر قرآن مجید کی تبلیغ اور اس کے معارف وحکم کی تبیین کی ہے' تو تم کیسے ایمان نہ لاتے! اب حضور ﷺ خود جواب ارشاد فرماتے ہیں: ((اِنَّ اَعْجَبَ الْخَلْقِ اِلَیَّ اِیمَانًا لَّقَوْمٌ یَّکُوْنُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ)): ''میرے نزدیک تو سب سے زیادہ دلربا' دلکش اور حسین ایمان اُن لوگوں کا ہوگا جو میرے بعد ہوں گے'' ((یَجِدُوْنَ صُحُفًا فِیْھَا کِتَابٌ)) ''ان کو تو اوراق ملیں گے جن میں ایک کتاب (قرآن مجید) درج ہوگی''((یُؤْمِنُوْنَ بِمَا فِیْھَا)) ''وہ اس پر ایمان لائیں گے جو کچھ اُن اوراق میں ہوگا''۔ یعنی وہ نہ میرے دیدار سے شاد کام ہوئے' نہ انہوں نے میری صحبت سے فیض اٹھایا' نہ انہوں نے ان برکات' معجزات' نزولِ رحمت اور نصرتِ الٰہی کا بچشمِ سر مشاہدہ کیا' لیکن وہ اس قرآن پر ایمان لانے کے ذریعے سے ان تمام حقائق کونیہ وتشریعیہ پر ایمان لائیں گے جو میں لے کر آیا ہوں۔

اس مقام پر ایک اہم بات کی وضاحت ضروری ہے۔ یہاں افضلیت کی بات نہیں ہو رہی۔ انبیاء کے بعد افضل ترین ایمان لاریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کا ہے۔ یہاں حسین ودلکش ایمان کی بات ہو رہی ہے' ان کے ایمان کی جنہوں نے نہ اللہ کی سب سے عظیم نشانی یعنی نبی اکرم ﷺ کے چہرۂ انور کا دیدار کیا اور نہ دنیا کے عظیم ترین مربّی ومزکّی کی صحبت سے مستفیض ہوئے' لیکن انہوں نے نورِ ایمان قرآن مجید سے حاصل کیا جو درحقیقت منبع وسرچشمۂ ایمان ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ نور قرار دے رہا ہے: ﴿جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ تو ایک سند قرآن مجید سے اور ایک سند حدیث شریف سے کافی ہے۔ معلوم ہوا کہ بے یقینی کے اس روگ کا واحد علاج قرآن حکیم ہی ہے۔ یہی بے یقینی کو ختم کرنے والی واحد تلوار ہے۔ چنانچہ ''بے یقینی'' کے خلاف بھی ''جہاد بالقرآن'' کرنا ہوگا۔ اس کے سوا ہمارے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں!

محاذ چہارم

نفس پرستی اور شیطانی ترغیبات

اس دَور میں نفس پرستی اور شیطانی ترغیبات کا محاذ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ضمن میں عام لوگوں کی نفس پرستی اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ اس کا سبب تو وہی ہے جس پر جاہلیّتِ قدیمہ' جاہلیّتِ جدیدہ اور بے یقینی کے محاذوں کے ضمن میں گفتگو کے دوران اشارات ہو چکے ہیں' اور پھر اس نفس پرستی کا تعلق زیادہ تر افراد کی اپنی ذاتی زندگی سے ہے' لیکن ہمارے یہاں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس نے اسے باقاعدہ ایک منظّم ادارے (institution) کی شکل دے رکھی ہے اور کلچر اور ثقافت کے نام پر منکرات وفواحش کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ایک مسلمان کے دل میں اباحیت اور منکرات سے جو بُعد اور نفور ہوتا تھا اور حرام چیزوں کے خلاف دل میں جو جذبۂ نفرت ہوتا تھا اسے ثقافتی طائفوں' ریڈیو اور ٹی وی ڈراموں' راگ و رنگ کی محفلوں اور تعلیمی' کاروباری' دفتری اور صنعتی اداروں میں مرد وزن کے مخلوط طریقِ کار کے ذریعے ختم کر دیا گیا ہے۔ اور اس سارے نظام کو ایک طرف اباحیت پسند طبقے اور دوسری طرف خود سرکاری سطح پر سرپرستی حاصل ہے۔ اس کو تہذیب' ثقافت' فنونِ لطیفہ اور مرد وزن کی مساوات کے خوشنما نام دیے گئے ہیں۔ اب بے پردگی' نیم عریانی' خواتین کی رنگین ومزیّن تصاویر کو تہذیب وتمدن کی ناگزیر ضرورت قرار دیا گیا ہے اور اس طرح عورت کو چراغِ خانہ سے شمعِ محفل اور اس سے بڑھ کر اشتہاری جنس بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ ہمارے اخبارات و رسائل (اِلاّ ماشاء اللہ) اور دوسرے ذرائع ابلاغ اس میں مسابقت کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں' اس کو وقت اور زمانے کا تقاضا سمجھ لیا گیا ہے۔ دین تو رہا ایک طرف' ہماری جو معاشرتی' تہذیبی اور مجلسی اقدار تھیں' ان سب کو بھی پامال کیا جا رہا ہے۔

جو لوگ یہ سب کچھ کر رہے ہیں وہ اگرچہ اقلیت پر مشتمل ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کا

تمہارے سامنے ہے۔ تم کو میرے دیدار اور میری صحبت کا فیض حاصل ہے۔ میری ذات سے جن برکات کا ظہور اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا جو نزول ہو رہا ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ انتہائی قلیل تعداد اور بے سروسامان ہونے کے باوجود اللہ کی نصرت و تائید سے تمہیں مشرکین و کفار پر جو فتوحات حاصل ہو رہی ہیں' ان کا تم اپنی چشم سر سے ہر لحہ مشاہدہ کرتے ہو۔ میں نے بنفسِ نفیس تمہیں توحید کی دعوت پہنچائی ہے' تم پر قرآن مجید کی تبلیغ اور اس کے معارف وحکم کی تبیین کی ہے' تو تم کیسے ایمان نہ لاتے! اب حضور ﷺ خود جواب ارشاد فرماتے ہیں: ((اِنَّ اَعْجَبَ الْخَلْقِ اِلَیَّ اِیْمَانًا لَّقَوْمٌ یَّکُوْنُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ)): ''میرے نزدیک تو سب سے زیادہ دلربا' دلکش اور حسین ایمان اُن لوگوں کا ہوگا جو میرے بعد ہوں گے'' ((یَجِدُوْنَ صُحُفًا فِیْھَا کِتَابٌ)) ''ان کو تو اوراق ملیں گے جن میں ایک کتاب (قرآن مجید) درج ہوگی'' ((یُؤْمِنُوْنَ بِمَا فِیْھَا)) ''وہ اس پر ایمان لائیں گے جو کچھ اُن اوراق میں ہوگا''۔ یعنی وہ نہ میرے دیدار سے شادکام ہوئے' نہ انہوں نے میری صحبت سے فیض اٹھایا' نہ انہوں نے ان برکات' معجزات' نزولِ رحمت اور نصرتِ الٰہی کا بچشمِ سر مشاہدہ کیا' لیکن وہ اس قرآن پر ایمان لانے کے ذریعے سے ان تمام حقائق کونیہ وتشریعیہ پر ایمان لائیں گے جو میں لے کر آیا ہوں۔

اس مقام پر ایک اہم بات کی وضاحت ضروری ہے۔ یہاں افضلیت کی بات نہیں ہو رہی۔ انبیاء کے بعد افضل ترین ایمان لاریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کا ہے۔ یہاں حسین ودلکش ایمان کی بات ہو رہی ہے' ان کے ایمان کی جنہوں نے نہ اللہ کی سب سے عظیم نشانی یعنی نبی اکرم ﷺ کے چہرۂ انور کا دیدار کیا اور نہ دنیا کے عظیم ترین مربّی ومزکّی کی صحبت سے مستفیض ہوئے' لیکن انہوں نے نورِ ایمان قرآن مجید سے حاصل کیا جو درحقیقت منبع وسرچشمۂ ایمان ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ نور قرار دے رہا ہے: ﴿جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ تو ایک سند قرآن مجید سے اور ایک سند حدیث شریف سے کافی ہے۔ معلوم ہوا کہ بے یقینی کے اس روگ کا واحد علاج قرآن حکیم ہی ہے۔ یہی بے یقینی کو ختم کرنے والی واحد تلوار ہے۔ چنانچہ ''بے یقینی'' کے خلاف بھی ''جہاد بالقرآن'' کرنا ہوگا۔ اس کے سوا ہمارے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں!

محاذ چھارم

نفس پرستی اور شیطانی ترغیبات

اس دَور میں نفس پرستی اور شیطانی ترغیبات کا محاذ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ضمن میں عام لوگوں کی نفس پرستی اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ اس کا سبب تو وہی ہے جس پر جاہلیتِ قدیمہ' جاہلیتِ جدیدہ اور بے یقینی کے محاذوں کے ضمن میں گفتگو کے دوران اشارات ہو چکے ہیں' اور پھر اس نفس پرستی کا تعلق زیادہ تر افراد کی اپنی ذاتی زندگی سے ہے' لیکن ہمارے یہاں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس نے اسے باقاعدہ ایک منظم ادارے (institution) کی شکل دے رکھی ہے اور کلچر اور ثقافت کے نام پر منکرات وفواحش کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ایک مسلمان کے دل میں اباحیت اور منکرات سے جو بُعد اور نفور ہوتا تھا اور حرام چیزوں کے خلاف دل میں جو جذبۂ نفرت ہوتا تھا اسے ثقافتی طائفوں' ریڈیو اور ٹی وی ڈراموں' راگ و رنگ کی محفلوں اور تعلیمی' کاروباری' دفتری اور صنعتی اداروں میں مرد وزن کے مخلوط طریقِ کار کے ذریعے ختم کر دیا گیا ہے۔ اور اس سارے نظام کو ایک طرف اباحیت پسند طبقے اور دوسری طرف خود سرکاری سطح پر سرپرستی حاصل ہے۔ اس کو تہذیب' ثقافت' فنونِ لطیفہ اور مرد وزن کی مساوات کے خوشنما نام دیے گئے ہیں۔ اب بے پردگی' نیم عریانی' خواتین کی رنگین ومزین تصاویر کو تہذیب وتمدن کی ناگزیر ضرورت قرار دیا گیا ہے اور اس طرح عورت کو چراغِ خانہ سے شمعِ محفل اور اس سے بڑھ کر اشتہاری جنس بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ ہمارے اخبارات و رسائل (اِلاّ ماشاء اللہ) اور دوسرے ذرائع ابلاغ اس میں مسابقت کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں' اس کو وقت اور زمانے کا تقاضا سمجھ لیا گیا ہے۔ دین تو رہا ایک طرف' ہماری جو معاشرتی' تہذیبی اور مجلسی اقدار تھیں' ان سب کو بھی پامال کیا جا رہا ہے۔

جو لوگ یہ سب کچھ کر رہے ہیں وہ اگرچہ اقلیت پر مشتمل ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کا

ذرائع ابلاغ پر پوری طرح غلبہ اور تسلط ہے۔ اس اقلیتی گروہ نے کچھ وقتی تقاضوں اور کچھ لوگوں کے دینی رجحان کے پیش نظر ان ذرائع ابلاغ کا کچھ حصہ اسلامی اور دینی پروگراموں کے لیے بھی مخصوص کر رکھا ہے جو اکثر و بیشتر محض بہلاوے اور دکھاوے کے لیے ہوتے ہیں' اور بڑی چابک دستی' ہوشیاری اور احتیاط یہ برتی جاتی ہے کہ کہیں کوئی ایسا کام نہ ہو جائے کہ ان ذرائع ابلاغ سے عوام الناس تک دین کا حقیقی پیغام پہنچ جائے۔ مبادا اعجازِ قرآنی لوگوں کے اذہان و قلوب میں نفوذ کر کے ان کو مسخر کر لے۔ یہ وہی خوف ہے جس کا اظہار علامہ اقبال مرحوم نے اپنی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں ابلیس کی زبان سے اس طرح کرایا ہے ؎

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

لہٰذا سرکاری ذرائع ابلاغ میں دین و مذہب کے نام سے جو پروگرام رکھے جاتے ہیں یا اخبارات و رسائل میں جو صفحات مختص کیے جاتے ہیں ان میں بظاہر احوال کوشش یہ ہوتی ہے کہ غیر محسوس طریقے سے انتشار (confusion) کو ہوا دی جائے۔ چنانچہ کوئی مشرق کی بات کہتا ہے تو کوئی مغرب کی بات لکھتا ہے۔ کوئی شمال کی بات کہے گا تو اگلا جنوب کی بات کرے گا' تاکہ دین و مذہب کے بارے میں نفسیاتی الجھاؤ اور ذہنی انتشار بڑھتا چلا جائے۔ پھر بالفرض کوئی مؤثر بات آ ہی جائے تو فوری طور پر اس کے متصلاً بعد کچھ ایسے پروگرام رکھ دیے جائیں گے جن کے ذریعے یہ اثرات زائل ہو جائیں' ذہن سے محو ہو جائیں' یعنی ؏

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب

پھر ان تمام ذرائع ابلاغ و وسائلِ ابلاغ کے کرتا دھرتا اُن خواتین کے بیانات' مضامین' انٹرویوز' تصاویر اور خبروں کو انتہائی نمایاں کرتے ہیں جو مغرب زدہ اور اباحیت پسند ہیں اور ہمارے ملک میں انتہائی اقلیت میں ہیں۔ لیکن تأثر یہ دیا جاتا ہے کہ گویا ہمارے ملک کی خواتین کی اکثریت اسی طرزِ فکر کی حامل خواتین کی ہے جن کے نزدیک

دین و مذہب اور ہماری تہذیب و معاشرتی اقدار پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت اور حیثیت نہیں رکھتیں۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کی عظیم اکثریت ان دین پسند خواتین پر مشتمل ہے جن کے نظریات ان مغرب زدہ خواتین کے نظریات کے بالکل برعکس ہیں۔ لیکن معاملہ چونکہ یہ ہے کہ ع ''ولیکن قلم در کفِ دشمن است'' لہٰذا خواتین کے اس قلیل ترین طبقے کو وسائلِ ابلاغ کے ذریعے اس طرح project اور نمایاں کیا جاتا ہے گویا پاکستان میں بسنے والی تمام خواتین اسی نظریہ و خیال کی حامی ہیں۔ یہ ہے اس جہاد کا چوتھا محاذ۔ اب سوال یہ ہے کہ اس محاذ پر ہم کیا کر سکتے ہیں!

کشتۂ شمشیرِ قرآنش کُنی

ان ذرائع ابلاغ سے معاشرے میں نفس پرستی کا جو نفوذ ہو رہا ہے اور انسان کی سوچ اور رجحانات و میلانات کو جس طرح غلط رُخ پر ڈالا جا رہا ہے اس سے مقابلے کے لیے بھی ہمارے پاس ڈھال اور تلوار قرآن ہی ہے۔ میں نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے اس عزم کو بہت عام کیا ہے جس کا حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۹۲۰ء میں اسارتِ مالٹا سے رہائی کے بعد دار العلوم دیوبند میں علماء کے ایک اجتماع میں اظہار کیا تھا:

> ''میں وہیں (مراد ہے اسارتِ مالٹا) سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کر دوں کہ قرآن کریم کو لفظاً و معناً عام کیا جائے۔ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے......''

لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے علمائے حقّانی و ربّانی جو اپنا تعلق امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہما اللہ سے قائم کرنے کو اپنے لیے موجب اعزاز و افتخار سمجھتے ہیں' وہ فقہی و کلامی تعبیر اور استنباط کی بحثوں سے صرفِ نظر کر کے ایک منظّم تحریک کی شکل میں حضرت شیخ الہندؒ کے عزم کو عملی شکل دینے کے لیے کمر ہمت کس لیں۔ شہر شہر' محلّہ محلّہ' کوچہ کوچہ' قریہ قریہ عوامی درسِ قرآن کے حلقے قائم کریں اور قرآن مجید' فرقانِ حمید کی شمشیرِ برّاں کے

ذریعے نفس پرستی اور اباحیت پسندی کے خلاف جہاد کریں اور اس سیلاب کے آگے سدِّ ذوالقرنین بن جائیں۔ یہی پیغام اس مردِقلندر نے آج سے قریباً نصف صدی قبل دیا تھا جس کو بجا طور پر حکیم الامت کہا جاتا ہے‘ یعنی ڈاکٹر علامہ اقبال مرحوم ومغفور۔ ان کا پیغام تھا ؎

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم تاکجا در حجرہ ہا باشی مقیم!
در جہاں اسرارِ دیں رافاش کن نکتہ ٔ شرعِ مبیں را فاش کن!

''اے وہ شخص جسے حاملِ قرآن عظیم ہونے پر فخر ہے‘ آخر کب تک حجروں اور گوشوں میں دَبکے رہو گے؟ اٹھو اور دنیا میں دینِ حق کے اسرار و رموز اور عرفان و فیضان کو عام کرو اور شریعت اسلامی کے حِکم وعبر کی نشر واشاعت کے لیے سرگرم عمل ہو جاؤ!''

یہ ہے علامہ مرحوم کا پیغام حاملِ قرآن اُمت اور بالخصوص علمائے حق کے لیے۔ بفضلہٖ تعالیٰ ملک کا کوئی قابلِ ذکر شہر ایسا نہیں ہے جس میں غالب اکثریت ایسے علمائے کرام کی نہ ہو جن کا امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ یا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین جیسے اکابر سے ارادت وعقیدت کا تعلق نہ ہو۔ آخر الذکر بھی درحقیقت ولی اللّٰہی اور دیوبند کے مکتبِ فکر سے وابستہ رہے ہیں اور تھانوی مکتب فکر ہو یا ندوی‘ یہ سب ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں۔ اسی طرح مسلکِ سلفی کا تعلق تو براہِ راست حضرت شاہ اسماعیلؒ جیسے غازی ومجاہد اور شہید اور امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے قائم ہے۔ اگر ہمارے یہ علماءِ عظام منظّم ہو کر عوامی درسِ قرآن کی تحریک برپا کر دیں تو اِن شاء اللہ العزیز نفس پرستی‘ اباحیت پسندی اور خدا ناآشنا ثقافت وفنونِ لطیفہ کے نام سے جو زہر ہمارے معاشرے میں پھیلایا جا رہا ہے اس کا سدّ باب بھی ہو جائے گا اور جیسے جیسے قرآن حکیم اُمت کے اذہان وقلوب میں نفوذ اور سرایت کرے گا تو نتیجتاً ذرائع ابلاغ پر قابض اباحیت پسند قلیل طبقہ یا تو اپنا رویہ تبدیل کرنے پر یا اسلام کے سچے خادموں کے لیے جگہ خالی

کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ البتہ اس کے لیے ناگزیر شرط یہ ہے کہ تمام انواع کے فقہی و کلامی اختلافات و تاویلات سے دامن بچایا جائے اور قرآن حکیم کا انقلابی پیغام عامۃ الناس تک پہنچایا جائے۔ اگر اس احتیاط کو ملحوظ نہ رکھا گیا تو ابلیس کا وہ مشورہ کارگر ہوگا جو اُس نے اپنی شوریٰ میں بقول علامہ اقبال پیش کیا تھا کہ ؎

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے　　یہ کتاب اللہ کی تأویلات میں اُلجھا رہے

ذہن وفکر کی تطہیر اور سیرت و کردار کی تعمیر کی اساس اور نفس پرستی کے سیلاب کے آگے کوئی چیز اگر سدّ اور بند بن سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف قرآن مجید ہے۔ اباحیت و نفس پرستی کے قلع قمع کے لیے اگر ہمارے ہاتھ میں کوئی تیغ بے زنہار ہے تو وہ قرآن مجید ہے۔ علامہ اقبال کے یہ اشعار میں نے بارہا آپ کو سنائے ہیں' جن میں درحقیقت دو احادیث کی ترجمانی کی گئی ہے۔ یہ اشعار میرے مفہوم ومطلوب کو آپ کے اذہان و قلوب میں منتقل اور جاگزیں کرنے میں بہت ممدّ ومعاون ہوں گے ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است　　زانکہ اُو گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی　　کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی!

''ابلیس کو ہلاک کر دینا ایک نہایت مشکل کام ہے' اس لیے کہ اس کا بسیرا نفسِ انسانی کی گہرائیوں میں ہے۔ بہتر صورت یہ ہے کہ اسے قرآنِ حکیم کی حکمت و ہدایت کی شمشیر سے گھائل کر کے مسلمان بنا لیا جائے۔''

واقعہ یہ ہے کہ آج ہماری ملی وقومی زندگی کے شعور کی گہرائیوں میں آرٹ کونسلز' ثقافتی طائفوں کے مبادلوں' راگ و رنگ کی محفلوں' رومانی ڈراموں' افسانوں اور لٹریچر اور ٹیلی ویژن کے مختلف "Cultural Shows" نے ڈیرا لگا رکھا ہے۔ ہمارے ملک کی اعلیٰ ترین شخصیتیں اس میٹھے زہر کی سرپرستی کر رہی ہیں۔ ان سے نبرد آزما ہونا آسان کام نہیں ہے۔ بہتر شکل یہی ہے کہ قرآن کی تلوار سے ان اربابِ اختیار کو مسلمان بنانے کی کوشش کی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ نفسانیت اور شہوانیت تو ہمارے نفس کے اندر ہی ہیں۔ شیطان ان نفسانی خواہشات و داعیات کو بھڑکاتا ہے' انہیں مشتعل کرتا ہے' اس سے زیادہ اور

کچھ نہیں کرتا۔ چنانچہ آخرت میں جب فیصلے چکا دیے جائیں گے تو جو لوگ دنیا میں شیطان کے دجل و فریب کا شکار ہوئے تھے وہ اس کو ملامت کریں گے۔ شیطان اس کا جو طویل جواب دے گا اُسے اللہ تعالیٰ نے سورۂ ابراہیم میں نقل فرمایا ہے۔ اس جواب میں وہ کہے گا:

وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ
(آیت ۲۲)

''میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں' میں نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا کہ تمہیں اپنے راستے کی طرف بلایا (اسے خوش نما' دلفریب اور تمہارے نفس کے لیے لذت آفریں بنا کر پیش کیا) تو تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ پس اب مجھے ملامت نہ کرو' بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمہاری کوئی فریاد رسی کر سکتا (اور تمہارے کام آ سکتا) ہوں اور نہ ہی تم میری فریاد رسی کر سکتے (اور میرے کام آ سکتے) ہو۔''

معلوم ہوا کہ شیطان اپنے راستے کو بہت مزیّن کر کے انسان کو اس کی طرف بلاتا ہے' پھر انسان کے نفس میں' اس کے پورے وجود میں اس کی دعوت خوش نما زہر بن کر سرایت کر جاتی ہے۔ لہٰذا اس زہر کے لیے تریاق بھی وہ درکار ہے جو پورے وجود میں سرایت کر سکے اور پھر جس میں حلاوت اور تاثیر بھی ہو۔ ایسا کوئی تریاق سوائے قرآن کے اور کوئی نہیں ہے ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

''یہ قرآن اگر کسی کے اندر اتر جائے تو اُس کے باطن میں ایک انقلاب آ جائے' اور فرد کے اندر کا یہ انقلاب ایک بین الاقوامی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔''

محاذ پنجم

فرقہ واریت

ہمارا پانچواں محاذ جس پر ہمیں جہاد بالقرآن کرنا ہے' وہ فرقہ واریت' تشتت' انتشار اور باہمی اختلافات کا محاذ ہے۔ یہ عناصر وحدتِ اُمت کو صدیوں سے دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ انہی کے باعث دولتِ عباسیہ ختم ہوئی اور سقوطِ بغداد کا سانحہ پیش آیا۔ انہی کی وجہ سے بغداد کے گلی کوچوں میں اہل سنت کے دوگروہ دست بگریباں ہوئے' تلواریں بے نیام ہوئیں اور خون کی ندیاں بہائی گئیں۔ سلطنتِ ہسپانیہ کے زوال و انحطاط اور پھر کامل سقوط کے عوامل میں جہاں قبائلی عصبیتیں کارفرما تھیں وہاں اس تباہی میں فقہی و کلامی اختلافات کا عمل دخل بھی تھا۔ اور اب محسوس ہو رہا ہے کہ یہ اختلافات سلطنتِ خداداد پاکستان کے لیے بھی روز بروز زیادہ سے زیادہ نازک اور خطرناک صورت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔

ماضی قریب میں بادشاہی مسجد کے ایک مبیّنہ واقعہ بلکہ محض افواہ پر معرکہ آرائی کی جو تکلیف دہ صورتِ حال بنی تھی' یہ چنگاری جنگل کی آگ بن سکتی تھی اور ہم میں سے ہر شخص اپنے طور پر اس کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ آگ ہمارے لیے کتنی ہولناک اور تباہ کن ثابت ہوسکتی تھی۔ فرقہ واریت کا بارود اب بھی ہمارے یہاں موجود ہے' کوئی شرپسند گروہ اس کو کسی وقت بھی دیا سلائی دکھا سکتا ہے۔ اس نازک صورت حال میں ہماری ملی و سیاسی زندگی اور ہمارے وطن کے مستقبل کے لیے جو خطرات مضمر ہیں' میں اس وقت ان کے بارے میں بات نہیں کر رہا۔ پھر یہ کہ فی الوقت صورتِ حال جس ہلاکت خیزی کے دہانے تک پہنچی ہوئی ہے اس کے اسباب و علل کے متعلق بھی میں اس وقت کچھ عرض نہیں کروں گا۔ اِس وقت مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اس کا علاج صرف تشویش ظاہر کرنے سے تو نہیں ہو جائے گا' محض پریشان ہونے سے تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا! اس کے لیے مثبت کام کرنا

ہوگا۔اس کے لیے بھی جہاد کرنا ہوگا اور اس جہاد کے لیے بھی قرآن ہی واحد تلوار ہے۔

اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست!

فرقہ واریت کے اس عفریت کا سر قلم کرنے‘ اس کا قلع قمع کرنے اور اس کو نیست و نابود کرنے کے لیے واحد تلوار صرف قرآن ہے۔ یہی سبق ہم کو سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۳ کے ابتدائی الفاظ میں ملتا ہے: ﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا﴾ تمام مفسّرین اور تمام علماءِ عظام کا اس امر پر اجماع ہے کہ یہاں حبل اللہ سے مراد قرآن مجید ہے اور یہ رائے متعدد احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں قائم کی گئی ہے۔ آیتِ مبارکہ کے اس حصے سے علامہ اقبال مرحوم نے جو کچھ اخذ کیا ہے وہ میں آگے بیان کروں گا۔اس وقت میں اکبر الٰہ آبادی مرحوم کا ایک شعر سناتا ہوں جو ہمارے موجودہ حالات پر منطبق ہوتا ہے۔فرماتے ہیں: ع

صوم ہے ایمان سے‘ ایمان غائب صوم گم

یعنی آدمی روزہ تو ایمان ہی کے تقاضے کے تحت رکھ سکتا ہے۔ (خاص طور پر موسمِ گرما کے روزے) جب ایمان ہی نہیں رہا تو صوم تو آپ سے آپ گیا! پھر اس کا التزام و اہتمام کیسے ہوگا؟ اگلا مصرع نہایت قابلِ توجہ ہے: ع

قوم ہے قرآن سے‘ قرآن رخصت قوم گم

مسلمانوں کی ملّی اور قومی شیرازہ بندی قرآن سے ہے۔قرآن درمیان سے ہٹ گیا یا آپ کی توجہ قرآن سے ہٹ گئی تو نتیجہ ایک ہی ہوا‘ یعنی وحدتِ ملّی کا شیرازہ بکھر گیا۔ اسے اقبال نے اس طرح تعبیر کیا ہے ع

یا مسلماں مُرد یا قرآں بمُرد!

یعنی یا مسلمان مر چکا ہے یا (معاذ اللہ) قرآن مر چکا ہے۔اقبال دراصل یہ کہہ رہے ہیں کہ قرآن تو زندہ و پائندہ ہے‘ لیکن مسلمانوں کی توجہ مر چکی ہے۔قرآن سے ان کا شغف و التفات ختم ہو چکا ہے۔چنانچہ علامہ مرحوم نے مسلمانوں کو چونکانے کی غرض سے یہ پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے۔

عظمتِ قرآن کے بیان میں علامہ اقبال کے یہ اشعار بھی انتہائی قابل توجہ ہیں :-

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است　　این کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست این　　زندہ و پائندہ و گویاست این
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست　　عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست

''اس قرآن کے بارے میں جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اُسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں! حقیقت یہ ہے کہ یہ محض کتاب نہیں ہے' کچھ اور ہی شے ہے! یہ ذاتِ حق سبحانہ و تعالیٰ کا کلام ہے لہٰذا اُسی کی مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی۔ اور یہ کتاب جیتی جاگتی اور بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی ہے۔ اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہاں آباد ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے میں بے شمار زمانے موجود ہیں۔''

لیکن مسلمانوں کا اس کتابِ الٰہی' اس ''ھدًی للنّاس'' اس فرقانِ حمید' اس نسخۂ شفا کے ساتھ کیا سلوک و رویہ باقی رہ گیا ہے' اس کا نوحہ اقبال اس طرح کرتے ہیں :-

بآیاتش ترا کارے جز این نیست!　　کہ از یٰسینِ او آساں بمیری!

''لیکن افسوس کہ اے مسلمان! تجھے اس قرآن کی آیات سے اب اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ اس کی سورۂ یٰسین کے ذریعے موت کو آسان کر لے۔''

علامہ کے یہ اشعار بھی میں بارہا اپنی تقریر و تحریر میں پیش کر چکا ہوں جن میں انہوں نے بڑی دل سوزی کے ساتھ ہماری ذلّت و خواری' ہمارے انتشار' ہماری آپس کی چپقلش اور تنازعات کی تشخیص بھی کی ہے اور علاج بھی تجویز کیا ہے :-

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی　　شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ　　در بغل داری کتابِ زندۂ

حضرت شیخ الہندؒ نے اسارتِ مالٹا سے رہائی کے بعد پوری دنیا کے مسلمانوں کی دینی و دُنیوی تباہی و بربادی کا جہاں ایک سبب ''قرآن کو چھوڑ دینا'' قرار دیا تھا وہاں دوسرا سبب ''آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی'' بھی بیان کیا تھا۔ عوامی درسِ

قرآن کے حلقے قائم کرنے کے عزم کے ساتھ ساتھ آپ نے اس ارادہ کا اظہار بھی کیا تھا کہ مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو ختم کرنے کے کام میں بھی وہ اپنی باقی زندگی صرف کریں گے۔ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ جو اِس روایت کے راوی ہیں' انہوں نے اس پر اس طرح تبصرہ فرمایا تھا کہ ''حضرتؒ نے ہمارے زوال وانحطاط کے جو دو سبب بیان کیے تھے' غور کیا جائے تو یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ ہمارے باہمی اختلافات اور باہمی جنگ و جدال کا سبب بھی قرآن کو ترک کر دینا ہی ہے''۔ ان دو اکابر کا اس پر کامل اتفاق نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح اور ان کے باہمی اختلاف کو ختم یا کم از کم ان کی شدت کو کم کرنے اور ان میں اعتدال پیدا کرنے کا واحد ذریعہ اعتصام بالقرآن ہے۔

علامہ اقبال نے اسے جس پُر شکوہ انداز میں ادا کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

از یک آئینی مسلماں زندہ است — پیکرِ ملّت ز قرآں زندہ است
ماہمہ خاک و دل آگاہ اوست — اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست

''وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملت کے جسدِ ظاہری میں روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے' ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں' ہمارا یہ وجود مٹی ہے! ہاں اس میں دل ہے' جس کی دھڑکن اس کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ (ہمارا قلبِ زندہ اور ہماری روحِ تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے۔) اس کو مضبوطی کے ساتھ تھامو کہ یہی حبل اللہ یعنی اللہ کی مضبوط رسّی ہے۔''

اور فرماتے ہیں: ؎

چوں گہر در رشتۂ او سفتہ شو
ورنہ مانندِ غبار آشفتہ شو

''اے ملتِ اسلامی! اب بھی وقت ہے کہ تو اپنے آپ کو تسبیح کے موتیوں کی طرح قرآن کے رشتے میں بیندھ لے اور پرو لے' ورنہ پھر اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ خاک اور دُھول کی مانند پریشان و منتشر اور ذلیل وخوار رہ!''

میرا تاثر یہ ہے اور میں اسے تقریر میں بھی اور تحریر میں بھی برملا ظاہر کرتا رہا ہوں کہ ماضی قریب میں قرآن کی عظمت اور مرتبہ و مقام کا انکشاف جس شدت کے ساتھ علامہ اقبال پر ہوا شاید ہی کسی اور پر ہوا ہو۔ علامہ مرحوم نے اپنی شاعری بالخصوص فارسی شاعری میں نہایت دل گداز' مؤثر اور تیر کی طرح دل میں پیوست ہو جانے والے مختلف اسالیب سے ملتِ اسلامیہ کو جھنجھوڑا ہے اور اسے دعوت دی ہے کہ دین و دنیا کی فوز و فلاح چاہتے ہو تو قرآن کو تھامو۔ یہی تمہارے اتحاد اور تمہارے عروج کا واحد ذریعہ ہے۔ ان کا یہ شعر آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن!
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن!

''تو اگر مسلمان ہو کر جینے کا خواہش مند ہے' اس کی تمنا اور آرزو رکھتا ہے تو اچھی طرح جان لے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنی حیات کی بنیاد قرآن پر قائم کرے۔''

حاصل کلام

حاصل کلام یہ ہے کہ ہمارے سامنے پانچ محاذ ہیں جن کے خلاف منظم ہو کر جہاد بالقرآن کے لیے کمر کسنے کی ضرورت ہے۔ آپ میں سے اکثر لوگ جانتے ہیں کہ اسی جہاد کے لیے میں نے اپنا پروفیشن تج دیا۔ میں اپنی زندگی کے بہترین دن اسی کام میں لگا چکا ہوں۔ اب تو بڑھاپے میں قدم رکھ چکا ہوں۔ ع ''شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم!''۔ الحمدللہ میری زندگی کے جو بہترین ایام تھے وہ اس جہاد بالقرآن میں بسر ہوئے ہیں۔ میرے شب و روز اور میری صلاحیتیں اور توانائیاں دروسِ قرآن' تقاریر' خطباتِ جمعہ' انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے قیام' قرآن کانفرنسوں اور محاضراتِ قرآنی کے انعقاد' قرآنی تربیت گاہوں کے انصرام' قرآنی سلسلۂ اشاعت کے انتظام' قرآن کے پیغام پر مشتمل مطبوعات کی اشاعت اور ملک کے مختلف شہروں کے دعوتی دَوروں میں لگی ہیں۔

اور الحمدللہ قرآن کا پیغام لے کر میں دوسرے ممالک میں بھی گیا ہوں۔ صنم خانۂ ہند عالمِ عرب' امریکہ اور یورپ میں چراغ روشن کیے ہیں۔ لوگوں کو آمادہ کیا ہے کہ کمر کسیں اور اس جہاد بالقرآن کے لیے میدان میں آئیں۔ ظاہر بات ہے کہ کام کے نتائج ظاہر ہونے میں وقت لگتا ہے۔ آپ کے اسی شہر لاہور میں میں نے یہ کام چھ سال تنِ تنہا کیا' جبکہ کوئی ادارہ نہیں تھا' کوئی تنظیم نہیں تھی۔ مطب بھی کر رہا تھا اور یہ کام بھی کر رہا تھا۔ وہ جو حسرت موہانی نے کہا تھا ع ''ہے مشقِ سخن جاری اور چکی کی مشقت بھی'' تو یہ دونوں چیزیں میرے لیے بھی جاری تھیں۔ پھر ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن قائم ہوئی اور بقول اقبال ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں!

بہرحال میرا اور انجمن کا کام اسی جہاد بالقرآن کے گرد گھومتا رہا ہے۔ آج میں نے اس پورے کام کو پانچ محاذوں کی شکل میں مرتب کر کے آپ حضرات کے سامنے رکھ دیا ہے' ورنہ یہ باتیں تو میں نے بارہا کہی ہیں۔ میں ان کو مختلف موضوعات وعنوانات کے تحت اور مختلف پیرایوں میں بیان کرتا رہا ہوں۔

آج مجھے آپ حضرات سے یہ کہنا ہے کہ رمضان المبارک کے جمعہ کی اس مبارک ساعت [1] میں کچھ غور کیجیے' کچھ سوچیے' کچھ اپنے گریبانوں میں جھانکیے۔ میں عرض کروں گا کہ ہمارا پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ہم میں سے ہر شخص یہ معیّن (assess) کرے کہ میں قرآن کریم کے اعتبار سے کس مقام پر کھڑا ہوں۔ کیا میں قرآن پڑھتا ہوں؟ قرآن پر غور وتدبر کرتا ہوں؟ قرآن سے مجھے کتنا شغف اور تعلق ہے؟ پھر یہ کہ قرآن کا جو حکم سامنے آ جائے کیا بے چون و چرا اُسے مان لیتا ہوں؟ کیا قرآن کے پیغام کو آگے پہنچانے کا کوئی ارادہ' کوئی عزم میرے اندر ہے؟ اس ضمن میں تن من دھن سے کوئی خدمت میں نے آج تک کی ہے؟ یہ خود احتسابی ضروری ہے۔ انسان پہلے خود اپنا جائزہ لے' پھر فیصلہ کرے کہ بحیثیت مسلمان اس کو قرآن مجید کے جو حقوق ادا کرنے

(۱) واضح رہے کہ یہ خطاب رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ کے ایک مبارک جمعہ کے موقع پر کیا گیا تھا۔

ہیں' اس کام کے لیے اس کے دل میں کتنی لگن' تڑپ' ولولہ اور حوصلہ ہے! اگر نہیں ہے تو شعوری طور پر اس کے لیے کوشاں ہو۔ یہ بھی نہ کر سکے تو پھر اپنے ایمان کی خیر منائے۔

میں نے ۱۹۶۸ء میں ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کے موضوع پر تقریر کی تھی۔ اس میں قرآن مجید کے پانچ حقوق گنوائے تھے۔ پہلا یہ کہ اسے مانا جائے۔ دوسرا یہ کہ اسے پڑھا جائے۔ تیسرا یہ کہ اُسے سمجھا جائے۔ چوتھا یہ کہ اس پر عمل کیا جائے اور پانچواں یہ کہ اسے دوسروں تک پہنچایا جائے۔ یہ تقریر مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ ان حقوق کے حوالے سے اپنا محاسبہ خود کیجیے کہ کیا ہم ان کو ادا کر رہے ہیں! اگر نہیں کر رہے ہیں تو آج ہی یہ عزم کر کے اٹھیے کہ ہم ان شاء اللہ ان حقوق کو ادا کریں گے۔

یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ میں نے قرآن مجید کے پانچ حقوق گنوائے تھے اور آج میں نے پانچ ہی محاذ آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں جو ہماری اپنی ملت کی اصلاح اور اس کی دینی وملی زندگی کو سنوارنے کے لیے جہاد بالقرآن کے متقاضی ہیں۔ یہ تو ہماری جدّو جُہد کا پہلا مرحلہ ہے۔ ہمیں تو اس قرآن کی شمشیر بے زنہار' تیغ بُرّاں کو ہاتھ میں لے کر پورے کرۂ ارضی پر کفر' شرک' الحاد' دہریت' اباحیت' شیطنت اور ان کے ذریعے پیدا ہونے والے تمام امراض کا قلع قمع کرنا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ "Physician heals thyslef" کے مصداق اس کام کو اپنی ذات سے شروع کیجیے۔ پھر کمر کسیے کہ جہاد بالقرآن کے ذریعے پاکستان کے مسلم معاشرے کی اصلاح کے لیے اپنی بہترین توانائیاں' اپنی بہترین صلاحیتیں اور اپنے بہترین اوقات وقف کریں گے' اور اگر اللہ توفیق اور ہمت دے تو پوری زندگی اسی کے لیے وقف و مختص رہے گی' از روئے آیتِ قرآنیہ:

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝ (الانعام)

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو نیز تمام مسلمانوں کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ــــ اور ــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ــــ اور ــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ــ اور ــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ